

صالح اور مصلح

خیل القرآن اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا پروگرام



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ اَلْاِسْلَامِی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں!

نام کتاب:	صالح اور مصلح
مصنف:	ڈاکٹر حافظ محمد زبیر (0300-4093026)
ناشر:	دارالفکر الاسلامی
پرنٹنگ:	ٹوبان نعمان پرنٹنگ پریس، لاہور 0300-8661763
صفحات:	650
قیمت:	600 روپے
طبع اول:	جنوری، 2017ء
ای میل:	mzubair@ciitlahore.edu.pk hmzubair2000@hotmail.com

ملنے کا پتہ:

مکمل شہ اسلام

☆ (لاہور) G/F-26 ہادیہ علیہ سینہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور 042-37244973 - 37232369

☆ (بہاولپور) بالمقابل شیل پیٹرول پمپ کوٹوالی روڈ، فیصل آباد 041-2631204 - 2641204

☆ الحکمۃ انٹرنیشنل، نزد پائپ سٹاپ، نیو ٹاؤن شپ، لاہور۔ 0301-4843312

☆ مجلس تحقیق اسلامی، ج-99 ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 042-35839404

☆ قرآن اکیڈمی، یسین آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ 021-36337361

مصنف کی دیگر کتب:

☆ اسلام اور مستشرقین

☆ مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات

☆ فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

☆ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

☆ چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت؟

☆ مصنف کو فیس بک پر فالو کریں:

<https://www.facebook.com/drhafizmuhammadzubair/>

مصنف کی جملہ کتب کے پی ڈی ایف ورژن کا ڈاؤن لوڈ لنک:

<http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html>

صالح اور مُصلح

خیر القرون اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا پروگرام

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

اسسٹنٹ پروفیسر، کامنالس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور

ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، ماڈل ٹاؤن، لاہور

ریسرچ فیلو، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی، لاہور



دار الفکر الاسلامی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۖ

”تحقیق اس نے فلاح پائی کہ جس نے نفس کا
تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا کہ جس نے نفس کو بھلا دیا۔“

[الشمس: 9-10]

انتساب

پیارے بچوں عبداللہ، رجاء اور عروۃ کے نام
کہ جن کے بارے خواہش اور دعا ہے کہ
وہ ”عباد الرحمن“ اور ”اہل اللہ“ میں شامل ہوں۔

فہرست مضامین

10	 مقدمہ
20	 باب اول: اصلاح نفس
21	 صالح اور مصالح
28	 تزکیہ اور تعلیم: تخلیہ اور تحلیہ
32	 کتاب سے تربیت
34	 شیخ اور اتنا ذکا فرق
38	 تزکیہ نفس کے لیے رہنمائی ضرورت
40	 میرے مرشد، میرے حضرت
44	 مجاہدہ نفس کے چار اصول
49	 قبرستان کی زیارت
58	 سچا واعظ
60	 اپنائیت کی سوچ
62	 ٹوپی
68	 گناہ کا اعلان
69	 خوردبینی
71	 جنت الفردوس کے وارث
79	 باب دوم: اصلاح احوال
80	 تلون مزاجی
83	 خشیت کے آنسو
88	 ڈر کی نفسیات
93	 جذبات کا اظہار

96	قرآنی احوال
106	دین میں اعتدال
107	ہمدردی اور احترام
111	نیکی میں کمال
113	توبہ کا حال
119	سچ کا حال
123	تنہائی کا حال
126	زبان کی حفاظت
130	جنت کی طلب
135	جہنم کا خوف
141	دنیا سے بے رغبتی
148	عباد الرحمن کے احوال
157	باب سوم: اصلاح عبادات
158	توحید اور عبادت
170	نماز اور تزکیہ
175	نماز میں احسان
182	نماز میں ذہنی اور قلبی یکسوئی
183	عبادت کا ذوق پیدا کر دینے والے پانچ اعمال
186	نماز فجر کی باجماعت ادائیگی
189	مصلے کی کشش
192	نیکی کی مارکیٹنگ
195	نماز وتر میں اجتماعی دعا
202	اصلاح نفس میں روزے کا کردار

207.....	رمضان اور قرآن
208.....	تلاوت اور تزکیہ
217.....	ذکر و فکر اور تزکیہ
226.....	غفلت کا گناہ
229.....	تہجد اور تزکیہ
231.....	دعا اور تزکیہ
237.....	اسمائِ حسنیٰ کی برکت
240.....	دعا اور شکر
242.....	والدین کی دعا
244.....	شام کے بچوں کے نام
245.....	درودِ مسلم
245.....	صدقہ اور تزکیہ
253	باب چہارم: اصلاح خاندان
254.....	میاں بیوی کے اختلافات
262.....	میاں بیوی کے حقوق
264.....	طلاق اور خلع کی وجوہات: جنس اور عشق
267.....	بچوں کی تربیت کے دواصول
270.....	بچوں کی تربیت میں والدین کا کردار
278.....	والدین کے حقوق
283.....	اولاد کے حقوق
285.....	کورٹ میرج
287.....	صلہ رحمی
289.....	قرض کی نیکی

- 295 باب پنجم: اصلاح معاشرہ
- 296..... دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں فرق
- 297..... راستے کے حقوق
- 300..... بلاوجہ ہارن دینا
- 303..... اساتذہ اور مشائخ کے حقوق
- 306..... مزدور کی حوصلہ افزائی
- 307..... استخارہ اور مشاورت
- 310..... خود کشی
- 312..... اصلاح رسوم
- 321..... سا لگرہ مبارک
- 322..... نبی کریم ﷺ کا یوم پیدائش منانا
- 324..... جادو اور خواب
- 326..... جھاڑ پھونک: اثرات اور موانع
- 332..... تعلیم کا المیہ
- 334..... وقت سے پہلے تجربہ
- 338..... اردو ادب
- 342..... زاویہ نگاہ
- 346..... فکر کی کچی
- 352..... روایتی بیانیے کا اصل مسئلہ
- 355 باب ششم: اصلاح مسلک و تحریک
- 356..... تنقید یا تنقیص؟
- 363..... مسلکی اور جماعتی نام
- 365..... مسلکی اور جماعتی نام کی شرعی حیثیت

- 366..... فرقہ واریت
- 370..... میرا کوئی فرقہ نہیں ہے
- 373..... روایت سے تمسک
- 376..... نیکی پر تعاون
- 377..... تنقید میں اعتدال کا دامن
- 383..... جماعتی تعصب
- 384..... فریق مخالف کا رد یا اس کے لیے دعا؟
- 385..... رد عمل کی نفسیات
- 387..... انسان اور غلطی
- 391..... اہلحدیث کی اقسام
- 394..... غیر مقلد اور اہلحدیث کا فرق
- 394..... اصحاب الحدیث اور تزکیہ نفس
- 397..... توحید کے بیان میں غلو
- 398..... تقویٰ کی نفسیات میں رگاڑ
- 401..... اسلامی تہذیب کے دوستوں: دینی مدارس اور اسلامی تحریکیں
- 403..... مدرسہ اور تحریک کے زوال کا سبب
- 406..... جنت میں داخل کرنے والے اعمال
- 412..... باب ہفتم: اصلاح میڈیا و سوشل میڈیا
- 413..... سوشل میڈیا اور نیٹ فورمز کے جہادی
- 415..... فیس بک کا نشہ
- 417..... سیلفی کا نشہ
- 419..... فوٹو اور کامیڈی
- 420..... شہرت کا نشہ

- 421.....الحاد اور ہالی وڈ انڈسٹری
- 423.....قلم بنانا
- 425.....میڈیا چینلز کی رمضان کی دکان
- 428.....سائنسی حق
- 429.....بچوں کے لیے اسلامی ویڈیوز کی ضرورت
- 431.....اسلامک کارٹونز اور اسلامک رائٹرز
- 433.....مرغیاں
- 434**.....باب ہشتم: اصلاح تصوف
- 435.....تصوف کے پانچ ادوار
- 439.....وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ
- 442.....تجدید تصوف اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
- 444.....تصوف کے بارے خط وبحث
- 444.....اصول فقہ اور مصطلحات تصوف
- 446.....کتب تصوف کی اصلاح اور تہذیب
- 448.....حنفی صوفی سے مکالمہ
- 442.....تصوف کا وکیل
- 450.....تصوف اور تاریخ اسلام
- 452**.....باب نہم: اصلاح علماء
- 453.....اہل فتویٰ کی خدمت
- 456.....فقیہ کون ہے؟
- 458.....غیر نافع علم
- 460.....فقہی جمود
- 463.....فقہی حیلے

469.....	تحقق کے اوصاف
473.....	خطبا اور واعظین کی خدمت میں
475.....	علم کی فضیلت
478.....	باب دہم: تزکیہ اور تصوف
479.....	مراقبہ اور صوفیا
486.....	مراقبہ اور ارکان کا ذکر، ہنی
490.....	مشارطہ، مراقبہ اور محاسبہ
490.....	اندر کا سکون
492.....	تزکیہ نفس اور لطائف
502.....	قوائے ثلاثہ: قوت فکر، قوت غضب اور قوت شہوت
506.....	فنا اور بقا
509.....	سماع اور وجد
516.....	علائق دنیوی
518.....	مبشرات
521.....	کرامت اور عقیدت
523.....	صوفیا کی شطیحات
525.....	صوفی اور سلفی
527.....	تصوف اور ادب
529.....	اسلام اور پیری مریدی
531.....	باب یازدہم: اخلاق اور رذائل
532.....	تزکیہ نفس میں قلب کا کردار
537.....	طہارت اور صفائی
543.....	اخلاص کا وزن

550.....	تنہائی کی ریاکاری
551.....	ریاکاری اور سوئے ظن
553.....	سمجھدار ریاکاری
559.....	تکبر کی صورتیں
563.....	عاجزی کے احوال
567.....	حسد کے مقامات
557.....	مسلمانوں سے محبت
572.....	عجالت کا فساد
576.....	قناعت کی دولت
578.....	شکر کی نعمت
585.....	صبر کا مقام
593.....	حیا کا وصف
596.....	شجاعت کی عظمت
598.....	خوش مزاجی
599.....	اللہ کی محبت
602.....	تقویٰ کا لباس
630	مصادر و مراجع

مقدمہ

موضوع کا تعارف

یہ کتاب خیر القرون اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے بارے مرتب کی گئی ہے۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین رحمہم کے زمانے میں تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا طریق کار بہت ہی سادہ اور آسان تھا کہ فطری بنیادوں پر جو انسانی تعلقات اور رشتے استوار ہوتے تھے، وہ ایک دوسرے کی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ استاذ اپنے شاگردوں، والدین اپنی اولاد، پڑوسی اپنے پڑوسیوں، ساتھی اپنے ساتھیوں اور دوست اپنے دوستوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ اسلاف میں صالحین ایسے بزرگ نہیں تھے جو اپنی وضع قطع اور لباس سے معاشرے میں خلائی مخلوق (aliens) محسوس ہوتے ہوں، ان سے ملنے کے لیے آپ کو جھکنا پڑے، قطار میں لگنا پڑے، انتظار کرنا پڑے، ان کی بیعت کرنی پڑے، ان کا مرید بننا پڑے، ان کے سلسلے سے وابستہ ہونا پڑے، ان کی گدی سے وابستہ مزار پر حاضری دینی پڑے، اس پر نذر و نیاز پیش کرنی پڑے بلکہ وہ نیکی کا شوق رکھنے والے، نیک عمل کرنے والے، نیکی کی ترغیب دینے والے اور معاشرے میں عام انسانوں کی طرح گھل مل کر رہنے والے تھے۔

زیر مطالعہ کتاب خیر القرون کے منہج پر کتاب و سنت کی روشنی میں تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا ایک جامع پروگرام پیش کرتی ہے۔ تعلیم اور تزکیہ دونوں کی بنیاد کتاب و سنت اور صحبت ہے۔ تعلیم کی اصل اعتصام بالکتاب والسنۃ ہے یعنی کتاب و سنت کو تھام لینا اور ان سے جڑ جانا اور تزکیہ کی اصل اتباع بالکتاب والسنۃ ہے یعنی کتاب و سنت کی پیروی کرنا اور ان پر عمل کرنا۔

تزکیہ نفس میں دو چیزیں بہت اہم ہیں، طلب اور صحبت۔ اگر اپنی اصلاح کی طلب، خواہش اور آرزو نہ ہوگی تو نبی کی صحبت میں بھی بیٹھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا جیسا کہ منافقین کو کوئی فائدہ نہ ہوا اور حضرت نوح اور حضرت لوط علیہم السلام کی بیویوں کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور طلب پیدا کرنے کے بعد دوسری اہم چیز صالحین کی صحبت ہے۔ یہ کتاب ان

شاء اللہ! ایک طرف تو قاری میں تزکیہ نفس کی طلب پیدا کرے گی اور دوسرا صحبت صالحین کی کمی پوری کرنے کے رستے تجویز کر دے گی۔ تعلیم میں کتاب و سنت کا گہرا فہم اور سوجھ بوجھ رکھنے والے علما کی صحبت اور تزکیہ میں کتاب و سنت پر احسان کی کیفیت کے ساتھ عمل کرنے والے صالحین کی صحبت ضروری ہے۔ اور صالحین میں سے بھی آپ کے والدین، رشتہ دار، پڑوسی، استاذ اور وہ دوست کہ جو نیکی کا شوق رکھتے ہوں اور نیکی کی ترغیب دیتے ہوں، کی صحبت کا خاص طور اہتمام کیا جائے۔

پس آپ کتاب و سنت اور اپنے ارد گرد کے ان صالحین کی صحبت سے آپ اپنی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں، یہ اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔ اگر تو آپ ”بزرگ“ بننا چاہتے ہیں تو یہ کتاب آپ کے لیے ہر گز مفید نہیں ہے اور اگر آپ ”بندہ“ بننا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں کہ یہی اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔ یہ کتاب غوث، قطب، ابدال اور قلندر بننے کی خواہش رکھنے والوں کو مایوس کرے گی البتہ جو لوگ سلوک قرآنی کے مقامات صالحین، مصلحین، مسلمین، مومنین، محسنین، متقین اور عباد الرحمن وغیرہ میں شامل ہونے کا شوق اور جذبہ رکھتے ہوں تو ان کے لیے یہ کتاب انتہائی مفید ثابت ہوگی، ان شاء اللہ۔ مجھے اپنے پروردگار سے قوی امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ قاری کے اندر اصلاح نفس کے بیج کی بنیاد رکھ دے گا۔ یہ کتاب تقریباً 640 صفحات پر مشتمل ہے اور اگر آپ کے پاس مکمل کتاب کے مطالعہ کا وقت نہیں ہے تو کتاب کی فہرست مضامین کی روشنی میں ان منتخب موضوعات کا مطالعہ کر لیں کہ جن میں آپ کو دلچسپی ہو۔ اسی طرح اگر عبادت میں کمزوری محسوس ہوتی ہے تو اصلاح عبادت کے باب کا مطالعہ کر لیں۔ اور اگر گھریلو مسائل پریشان کر رہے ہیں تو اصلاح خاندان کے باب کو دیکھ لیں۔ اور اگر اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو اخلاق و رذائل کے باب کا مطالعہ کر لیں۔ اور اگر سوشل میڈیا کے نقصانات سے بچنا چاہتے ہیں تو اصلاح میڈیا کا باب دیکھ لیں وغیرہ۔

مجھے اپنے نیک ہونے کے بارے کوئی بڑی غلط فہمی تو نہیں ہے کہ اکثر ٹوپی بھی

اسی نیت سے اترار رکھتا ہوں کہ لوگ بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ معاشرے میں عمامہ اور سفید کرتہ شلوار تو گویا کہ نیک اور متقی کہلانے کے لیے ایک مکمل کٹ (kit) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ پس بعض اوقات اس سوچ اور رویے سے چڑان پیدا ہوتی ہے کہ ناصح بننے کا حق بعض خاص حلیے کے لوگوں کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔ اور ان لوگوں کے علاوہ اگر کوئی تزکیہ یا اصلاح کی بات کرے تو اس کا مذاق اڑایا جائے، اس سب کچھ کا تجربہ بعض اوقات سوشل میڈیا پر بعض تحریریں پیش کرنے کے بعد سوشل میڈیا کے متصوفین کے کمنٹس سے ہوتا رہتا ہے۔

تالیف کا پس منظر اور مقصد

محدث فورم انٹرنیٹ پر اردو زبان میں روایت پسند مذہبی طبقے کا ایک نمائندہ فورم ہے۔ راقم کئی سالوں تک اس فورم پر اپنے قلمی نام ابو الحسن علوی کی پہچان سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہے۔ یہ لکھنا لکھنا زیادہ تر اصلاحی موضوعات پر ہوتا تھا اور دوستوں کی طرف سے ان تحریروں پر تبصرے بھی موصول ہوتے تھے کہ کچھ لوگ پسند کرتے تو کچھ تصحیح فرماتے۔ اسی طرح کامسائٹس یونیورسٹی میں بھی خطبہ جمعہ کی ذمہ داری سابقہ تین برسوں سے میرے پاس ہی ہے اور اسی سلسلے میں ہر جمعہ کو کسی اصلاحی موضوع پر مواد جمع کر لیتا تھا۔ بعض اوقات بعض سامعین جمعہ کے خطبہ کے بعد مجھ سے تقریر کے نکات وغیرہ مانگتے تو وہ چونکہ عربی میں ہوتے تھے لہذا عوام الناس کے لیے مفید نہ تھے۔ پس ایک احساس تھا کہ یہ مرتب ہو جائیں تو شاید بہت سے لوگوں کے لیے اصلاح کا ذریعہ بن جائیں۔ علاوہ ازیں معروف دینی اسکالر جناب احمد جاوید صاحب کی جمعہ کے دن مغرب کے بعد کی اصلاحی مجلس میں تسلسل سے شرکت کا موقع ملا تو ان سے اس موضوع پر نہ صرف کافی کچھ سیکھنے کو ملا بلکہ اس موضوع کے بیان میں اپنے اسلوب تحریر کو بہتر بنانے میں بھی معاونت ملی۔ پس یہ احساس شدت پکڑ گیا کہ عام لوگوں کے لیے عام فہم انداز میں اصلاح نفس کے موضوع پر کوئی کتاب مرتب کرنی چاہیے۔ اور خاص طور پر یہ بھی فکر تھی کہ اپنی اولاد اور خاندان کے لیے کوئی ایسی تحریر مرتب کر جاؤں کہ جوان کی اصلاح

اور میرے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔

پس اسی خیال سے فورم پر موجود اپنی تحریروں اور خطابات جمعہ کے نوٹس کو تصحیح و اضافے کے ساتھ ایک کتاب کی صورت مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں، میں نے کتاب و سنت کی اتباع کے حوالے سے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے ان احوال، واقعات اور اقوال کو جمع کیا ہے کہ جن سے اپنے نفس کی اصلاح اور تربیت میں مجھے فائدہ ہو۔ اللہ عز و جل اس محنت کو قبول فرمائے اور راقم کے ان اساتذہ، ساتھیوں اور دوستوں کے درجات بلند فرمائے کہ جن کی تعلیم و ارشاد سے یہ اصلاحی نکات مرتب ہو سکے ہیں۔

آمین یا رب العالمین۔

اس کتاب کی تیاری میں، میں نے کافی محنت کی ہے۔ میں نہ تو یہ سمجھتا ہوں کہ اصلاح نفس کے موضوع پر یہ کوئی اخیر کتاب ہے اور نہ ہی میرا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب لکھ کر میں نے پڑھنے والوں کا پیہہ اور وقت ضائع کیا ہے۔ میں اس کتاب کے مقدمے میں کسی ایسی مصنوعی عاجزی کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا کہ جیسے احقر العباد، نگ خلّاق، فقیر الی اللہ، حقیر پر تقصیر نے یہ کتاب لکھ کر کوئی گناہ کا کام کیا ہو۔ اور نہ ہی میں اپنے قارئین کو یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ میں کوئی ”بزرگ“ اور ”بابا“ ہوں کہ جسے فرشتہ سمجھ کر لوگ قریب ہو جائیں اور پھر انسان سمجھ کر دور ہو جائیں۔ البتہ یہ خواہش ضرور رہتی ہے کہ ایسے لوگوں سے دوستی کروں کہ جو نیکی کا شوق رکھنے والے ہوں کہ یہی لوگ ہیں کہ جن سے مجھے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔

بات تو صرف اتنی سی ہے کہ میں ایک محقق اور ریسرچر ہوں اور مختلف موضوعات پر لکھتا رہتا ہوں اور اصلاح نفس کے موضوع پر کوئی ایسی تحریر اردو زبان میں نظر سے نہیں گزری تھی جو اسلاف کے منہج پر ہو تو سو یہ کتاب اس امید پر مرتب کر دی کہ اللہ عز و جل اسے قبول فرمائے، اور میرے اور میرے آبا و اجداد کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، خاص طور ہمارے اعوان قبیلہ کے جد امجد حضرت علیؓ اور قطب شاہ اعوان رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی نسل اور ذریت کے لیے، اور اسی طرح جمیع مسلمان مردوں اور عورتوں،

مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی صدقہ جاریہ بنائے۔

کتاب کے مطالعہ کا طریق کار

اس کتاب سے صحیح معنوں میں تربیتی فائدہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آپ اسے ایک نشست میں ختم کرنے کی بجائے اس کے دو چار صفحات کے مطالعہ کو روزانہ کا معمول بنائیں۔ اور پھر ان صفحات میں موجود حکمت کی باتوں کو اپنے عمل کا حصہ بنانے کے لیے کچھ دن مجاہدہ کریں۔ اور دوسری بات اگر ممکن ہو سکے کہ جن دو چار صفحات کا مطالعہ کریں تو اس گہرائی اور غور و فکر سے کریں کہ ان سے ایسے نئے نئے نکات پیدا ہوں کہ جو آپ کی اصلاح میں مدد و معاون ہوں۔ جب آپ کسی متن کو پڑھ کر ان معانی کو سیکھ لینے کی صلاحیت پیدا کر لیں گے کہ جو الفاظ کے لباس میں نہیں ہیں تو آپ اس متن کو اس سطح پر سمجھنا شروع کر دیں گے کہ جس سطح پر مصنف بیان کر رہا ہے کیونکہ ہر غور و فکر کرنے والے مصنف کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی تحریر میں کچھ ان کہا (unsaid) بھی موجود ہو کہ جسے جاننے کے تجسس میں قاری (reader) میں وہ صلاحیت بیدار ہو سکے کہ جسے مصنف نے اپنے اندر بیدار کرنے کی محنت کی ہے۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے دوستوں نے کتاب و سنت کی نصوص کو سمجھ کر جو نئے معانی اور احوال پیدا کیے ہیں، ہم انہیں جمع کر دیں تاکہ اس اسلوب پر کتاب و سنت میں غور و فکر کرنے کی تربیت بھی پیدا ہو۔ میرا اپنا بھی یہی ارادہ ہے کہ اس کتاب کو مسلسل اپنے مطالعہ میں رکھوں کہ اس میں کتاب و سنت کی ایسی نصوص ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں کہ جن سے عمل میں بہت ترغیب (motivation) ملتی ہے۔

ہم نے اس کتاب میں اپنے ایک لکھاری دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب کی بعض منتخب آب ویتوں کو جگہ دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک کام تو ہے کہ نیکی کی کوئی بات اصولی طور پر بیان کر دی جائے اور دوسرا یہ کہ اس اصول کی مثال بیان کر کے تطبیق (application) کر دی جائے۔ اب ایک کام تو یہ ہے کہ شکر کا موضوع کتاب و سنت سے بیان ہو جائے اور دوسرا کام یہ ہے کہ شکر کی معاصر انسانی زندگی سے کوئی ایسی

مثال بیان کر دی جائے کہ ہر شخص کے لیے شکر کے اصول کو اپنی زندگی سے متعلق کرنا آسان ہو جائے۔

عام آدمی کا ذہن ایسا نہیں ہوتا کہ وہ تجرید (abstraction) کو کا حقہ قبول کر سکے، عام شخص مثالوں سے بات زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہے لہذا عملی زندگی سے مثالیں دینا بہت ضروری ہے۔ اب کچھ مثالیں تو ہمیں اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں سے مل گئیں، وہ تو اسی طرح سے بیان ہو گئیں جبکہ بقیہ اصولوں کے بیان میں ایک حل تو یہ تھا کہ ہم تمام مثالیں ان بزرگوں کی زندگیوں سے دیتے کہ جنہیں لوگ ان کی کراماتوں اور نیکی کے بیان میں مبالغے کی وجہ سے پہلے ہی سے عبقری انسان (super human being) سمجھتے ہیں لہذا ان کی تعریف تو خوب کر سکتے ہیں لیکن اتباع نہیں۔ اور دوسرا یہ کہ ہم عام انسانوں کی مثالیں بیان کرتے، اپنے دوستوں کی۔ پس ہم نے اس کتاب میں اپنے دوستوں کی مثالیں زیادہ بیان کی ہیں کہ عام لوگوں کو رغبت ہو کہ وہ بھی یہ کر سکتے ہیں۔ اور اس وجہ سے بھی کہ عام انسانوں کی زندگی حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اصل بات یہ بھی ہے کہ ایک عام شخص کا اپنی کسی نیکی کے بیان سے مقصود یہ بھی ہوتا ہے کہ اس جیسے عام لوگ یہ سوچیں کہ یہ بھی تو ہماری طرح کا ہی ہے۔ ہمارا رشتہ دار، ہمارا دوست، ہمارا پڑوسی، ہمارا استاذ۔ اگر یہ کر سکتا ہے تو ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ پس صیغہ غائب میں ہم نے اپنے اور اپنے دوستوں کے واقعات نقل کر دیے ہیں کہ جن میں اہم بات یہ ہے کہ یہ سب عام انسانوں ہی کے سچے واقعات ہیں۔

اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہر عام شخص کی زندگی میں ایسی نیکیاں ہوتی ہیں کہ جن پر فخر کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم نے اپنے دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب کی زندگی سے چند مثالیں اس کتاب میں بیان کی ہیں۔ ہم اس سوچ کو توڑنا چاہتے ہیں کہ عام آدمی کی زندگی میں بڑی نیکیاں نہیں ہوتیں۔ عام آدمی کی زندگی میں بھی بعض اوقات وہ بڑی بڑی نیکیاں ہوتی ہیں جو بزرگوں کے لیے بھی قابل رشک ہو سکتی ہیں۔ تو عام انسانوں

کے واقعات بیان کرنے سے مقصود یہ بھی ہے کہ جس طرح غار میں قید ہو جانے والے تین اشخاص کو اپنی بعض نیکیوں کا مان تھا، اسی طرح عام افراد کو بھی اپنی نیکیوں کا مان رکھ کر نہ صرف اللہ سے مغفرت کی امید رکھنی چاہیے بلکہ ایسی نیکیاں مزید کرنے کی بھی ترغیب حاصل کرنی چاہیے۔ عظیم الرحمن عثمانی صاحب پاکستانی ہیں، نوجوان ہیں، انگلیڈ میں رہتے ہیں۔ آئی ٹی کے شعبے سے تعلق ہے، اسی میں ماسٹرز تک تعلیم انگلیڈ سے مکمل کی ہے اور اسی شعبے میں جاب کر رہے ہیں۔ دین کے داعی اور بلا گر ہیں۔¹

مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ کتاب اچھی نہیں لگے گی۔ اس کتاب کو پڑھ کر اگر تو کسی قلندر بابا، غوث اعظم، قطب عالم، ابدال شام، پیر طریقت، رہبر شریعت، سلطان الفقر، امام العارفین، خاتم الاولیا وغیرہ کو یہ احساس پیدا ہو کہ راقم ان موضوعات پر لکھنے کا اہل نہیں تھا کہ کہاں عالم ناسوت کے مکینوں کا زبانی جمع خرچ اور کہاں عالم لاہوت کے شاہینوں کی پروازیں، تو ان سے یہی گزارش ہے کہ یہ جان کر درگزر فرمادیں کہ یہ کتاب دراصل مصنف نے اپنی اور اپنے بچوں کی اصلاح کے لیے مرتب کی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ جب تک آپ اپنے مریدوں کو اس سلسلہ مراتب (hierarchy) کے خدا کی طرف سے ہونے کا یقین دلانے میں کامیاب رہیں گے، اس وقت تک آپ کے اس دینی کاروبار کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دنیا داروں نے اگر حب مال میں دنیا پرستی کی تو آپ نے حب جاہ میں۔ کاش! کہ آپ سمجھ سکیں کہ آپ کے بہترین کا پہلا اور آخری ذلیلہ حب مال نہیں ہے، حب جاہ ہے۔ اور جب تک آپ یہ نہ سمجھ سکیں کہ یہ سب القابات حب جاہ کے ہیں، چاہے آپ استعمال کریں یا آپ کے بڑے، اس وقت تک اہل تصوف دنیا پرستی کے اس جنگل سے باہر نہیں نکل سکتے۔

اگر میری مذکورہ بالا باتوں سے کسی کو یہ سمجھ آئی ہو کہ میں تصوف کا منکر ہوں تو بالکل غلط سمجھ آئی ہے۔ اور اگر کسی کو یہ سمجھ آئی ہے کہ میں تصوف کا وکیل ہوں تو یہ بھی غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کی تصوف سے مراد کیا ہے؟ اگر تو آپ کی

¹ <http://islamazeemnama.blogspot.co.uk/>

تصوف سے مراد عبادت میں احسان کی کیفیت پیدا کرنا، نفس کو ذائقہ سے پاک کرنا اور اخلاق حسنہ سے متصف کرنا ہے جیسا کہ متقدمین صوفیاء کا تصوف یہی تھا۔ اور عبادت اور اخلاق کی اصلاح کا یہ کام ان ذرائع سے کرنا مقصود ہے جو کتاب و سنت میں ثابت ہیں یعنی تہجد، تلاوت، ذکر، فکر، صدقہ، دعا، مجاہدہ نفس وغیرہ اور ہم نے اس کتاب میں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں تو میں ایسے تصوف کا وکیل ہوں۔ اور اگر تو تصوف سے مراد قلندر، قطب، ابدال، بزرگ بننا ہے اور اس کے ذرائع کے طور وحدت الوجود، وحدت الشہود، کشف قبور، کرامات، شعبہ، مراقبہ، تصور شیخ، لطائف، پاس انفاس، سماع، رقص اور وجد وغیرہ کے ذرائع کو اختیار کرنا ہے تو میں ایسے تصوف کا منکر ہوں۔

یہ بات بھی درست ہے کہ جب آپ لکھتے ہیں تو ایک خاص طبقے کے لیے لکھتے ہیں۔ جو سب کے لیے لکھتے ہیں، وہ دراصل کسی کے لیے نہیں لکھتے۔ اس لیے اگر کسی شخص کو محسوس ہو کہ کتاب میں رویوں اور احوال کے بارے جو تجزیات کیے گئے ہیں، ان کے احساسات اور مشاہدات ان سے مختلف ہیں، تو انہیں یہی سوچ لینا چاہیے کہ اس کتاب میں کچھ دوسرے لوگوں کے مسائل ڈسکس ہوئے ہیں۔

اسی طرح کتاب میں جہاں مصنف کا اپنا ذہن شامل ہوتا ہے، وہاں وہ معاشرے کے حقائق بھی بیان کر رہا ہوتا ہے۔ پس یہ رویہ متوازن نہیں ہے کہ ریڈر کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ہر جملے سے مصنف کا ذہن پڑھنے یا اس کے شخصی احوال جاننے کی کوشش کرے۔ کسی تحریر پر نقادوں کی طرح کے غور و فکر سے مصنف کی شخصیت کا جائزہ لینے کی بجائے اس تحریر سے مصنف کا جو مقصود ہے، اسے معلوم کر کے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسی طرح ادب میں تو یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ کسی ادیب نے ایک ناول لکھ دیا ہے یا شاعر نے کوئی کلام کہہ دیا ہے تو اب اس سے جو ممکنہ معافی نکل سکتے ہیں، وہ نکال لیے جائیں کہ یہاں لفظ اصل ہوتا ہے۔ لیکن مذہبیات میں پوسٹ ماڈر نسٹوں کی

تھیوری لگانے کی بجائے منشاء متکلم کو مد نظر رکھا جائے اور تحریر سے کوئی ایسا معنی نہ نکالا جائے جو مصنف کا مقصود نہ ہو کہ یہاں معنی اصل ہے۔ ادب میں لفظ سمندر ہو گا لیکن مذہب میں ایک دریا ہے جو ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے۔

اگر پڑھنے کے بعد آپ کو یہ کتاب اچھی اور مفید معلوم ہو تو اس کا ایک نسخہ اپنی مسجد، مدرسہ، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھ کر اپنے لیے صدقہ جاریہ کا سامان بنالیں۔ اور آپ یہ کتاب اپنے ان رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوستوں کو بھی گفت کر سکتے ہیں کہ جن کی اصلاح کے آپ خواہش مند ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان کی اصلاح کیسے کریں؟

منہج بحث و تحقیق

اقتباسات کے ضمن میں حوالہ جات کے درج کرنے میں ”دی شکاگو مینوئل آف اسٹائل“ (The Chicago Manual of Style) سے رہنمائی لی گئی ہے اور انہیں ہر صفحہ کے نیچے حواشی میں درج کیا گیا ہے۔ پہلی دفعہ کسی کتاب کا حوالہ مکمل نقل کیا گیا ہے کہ جس میں اس کتاب کے مصنف کا مکمل نام، کتاب کا مکمل نام، پبلشر کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت اور جلد اور صفحہ نمبر شامل کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد اس کتاب کا حوالہ نقل کرتے ہوئے اس کے مختصر نام اور متعلقہ جلد اور صفحہ نمبر کے بیان پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں اہتمام کیا ہے کہ صرف وہی احادیث نقل کی جائیں جو صحیح احادیث ہیں۔ احادیث کی صحت و ضعف میں علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر اعتماد کیا گیا ہے۔ پس احادیث کی کتب کے ان محقق نسخوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں کہ جو علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر معاصر عرب محقق علما کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ اور اگر کسی حدیث کی صحت میں علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کو متقدمین سے اختلاف تھا تو وہاں ان ائمہ محدثین کا ذکر کر دیا ہے کہ جنہوں نے اس روایت کو ”مقبول“ قرار دیا ہے اقتباسات میں بریکٹ میں جو عبارت ہے، وہ مصنف کی طرف سے اضافہ ہے اور اس کا مقصود قارئین

کے لیے اقتباس کی تفہیم کو آسان بنانا ہے۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ مشکل اردو الفاظ کے استعمال سے ممکن حد تک اجتناب کیا جائے لیکن پھر جہاں ناگزیر ہوا وہاں مشکل الفاظ کا انگریزی ترجمہ دے دیا گیا ہے کہ ہماری نوجوان نسل اب اردو سے اتنی واقفیت نہیں رکھتی ہے۔ اور جہاں ہماری زبان میں انگریزی لفظ زیادہ معروف ہے تو وہاں اردو کی بجائے انگریزی لفظ ہی نقل کر دیا گیا ہے کہ اصل مقصود تو تفہیم ہے نہ کہ کسی قسم کی ادبی گفتگو کرنا۔

اظہار تشکر

میں آخر میں ریکٹر کاسٹالس پروفیسر ڈاکٹر ایس ایم جنید زیدی صاحب، ڈائریکٹر لاہور کیمپس پروفیسر ڈاکٹر قیصر عباس صاحب اور ہیڈ آف ہیومنیزیشن ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر مدثر محمود صاحب کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے یونیورسٹی میں بحث اور تحقیق کے لیے مطلوبہ وسائل اور ماحول کی فراہمی میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی ہے۔ اور میں جناب شیخ ابن بشر الحسینی حفظہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

میں جناب عظیم الرحمن عثمانی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی چند آب بیتیاں اس کتاب میں نقل کرنے کی اجازت دی۔ اور میں اپنے دوست جناب عبدالمتین صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ جن کی محنت سے میری جملہ سابقہ کتابیں شائع ہو سکیں۔ اللہ عزوجل کی توفیق اور ان کے تعاون سے جب کوئی کتاب شائع ہو جاتی ہے تو مزید لکھنے کی ہمت اور عزم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہم سب کے علم میں ہے کہ فی زمانہ کتاب کی اشاعت کتنا مشکل کام ہے۔ نئے لکھاریوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے بلکہ ان میں سے اگر کوئی اپنے پیسوں سے بھی کتاب شائع کروانا چاہے تو بھی پبلشر حضرات ایسی شک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ جیسے مصنف کی ذات میں کسی سارق کی تلاش جاری ہو۔

میں ”اسلامی جمعیت طلبہ“ مقبوضہ جموں و کشمیر کے جملہ منتظمین کا بھی خاص طور

شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری اس کتاب کو سری نگر سے نہ صرف بڑے پیمانے پر شائع کیا بلکہ اس کو جمعیت کے نصاب میں بھی مقرر کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کتاب کی اشاعت میں دلچسپی لی اور بہت محبت کا اظہار فرمایا کہ جس کے لیے میں ان کا ممنون و مشکور ہوں۔ وادی کے مسلمان واقعتاً بہت محبت کا اظہار کرنے والے ہیں۔ اس سے پہلے ”الحر مین پبلیکیشنز“ نے راقم کی کتاب ”فکر غامدی“ کا پانچواں ایڈیشن سری نگر سے شائع کیا۔ ہندوستان ہی سے دو پبلشرز نے راقم کی کتاب ”مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات“ کو شائع کرنے کے لیے رابطہ فرمایا تھا بلکہ شاید یہ کتاب بھی وہاں سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ راقم کی کتاب ”چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت“ کا پشتو ترجمہ افغانستان سے شائع ہوا۔ ایک کتابچے ”اسلام میں زوجین کے حقوق“ کا ہندی ترجمہ انڈیا سے شائع ہو چکا۔ اور مضامین تو بکثرت ایسے ہیں جو ایک مجلہ میں شائع ہوئے اور بعد میں دوسرے مجلات نے انہیں دوبارہ شائع کیا۔ میں ان سب پبلشرز حضرات کا ممنون ہوں جو کہ نیکی کی اشاعت اور تبلیغ میں تعاون فرما رہے ہیں۔ تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت پر کتاب کی کبار علمائے تحسین فرمائی۔ مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ تعالیٰ نے بھی مبارکباد کا خط لکھا۔

یہ کتاب تحریک اسلامی مثلاً جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی، جماعة الدعوة، تبلیغی جماعت وغیرہ کے کارکنان اور نوجوانوں کو خوب اپیل کرے گے کہ اس کی بنیاد اور اس کے پیچھے موجود سوچ تحریکی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک تحریکی نوجوان کی اصلاح نفس کی سرگزشت اور آبِ بیتی ہے لہذا اپنی اصلاح کے لیے فکر مند ایک تحریکی نوجوان اس کتاب کے صفحات میں اپنا عکس ضرور دیکھے گا۔

آخر میں، میں اپنی اہلیہ محترمہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچ پائی۔

جزاکم اللہ خیرا
ابوالحسن علوی

باب اول اصلاح نفس

اس باب میں اصلاح نفس کے ضمن میں صحبت صالحین، مجاہدہ نفس، موت کی یاد، سوچ بچار، لباس کے کردار اور نماز کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔

صالح اور مصلح

صالح اسے کہتے ہیں جو اپنی اصلاح کے لیے فکر مند ہو اور مصلح وہ ہے جو دوسروں کی اصلاح میں مصروف ہو۔ کبھی کبھار یہ احساس غالب ہونے لگتا ہے کہ شاید ہم اپنی اصلاح سے زیادہ دوسروں کی اصلاح کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ ہم صالح کم اور مصلح زیادہ ہوتے ہیں۔ احساس یہ ہے کہ صالح شخص کی عبادات و مناجات یا اوراد و اشغال زیادہ ہوں گے جبکہ مصلح کے کام میں دعوت و تبلیغ یا درس و تدریس کا غلبہ ہوگا۔ اگر ہماری دینی سرگرمیوں میں درس و تدریس یا دعوت و تبلیغ کا پہلو ڈکرو تلاوت اور عبادت و ریاضت پر غالب ہوگا تو ہم صالح کم اور مصلح زیادہ کہلائیں گے۔

بلاشبہ صالح اور مصلح ہونا دونوں خیر کے کام ہیں لیکن اس کے باوجود دل و دماغ میں ایک کشمکش جاری رہتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ صالح ہونا مصلح ہونے کی صفت پر غالب آجائے لیکن ذہن کہتا ہے کہ مصلح ہونے کو ترجیح دو۔ جدید انسان کی مشین زندگی میں اب اتنا وقت نہیں رہا کہ وہ اپنی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کی تکمیل کے لیے بقدر ضرورت وقت نکال سکے۔ اسے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کے ان دو میں سے ایک پہلو کو دوسرے پر ترجیح دینا ہے اور اس سے دوسرے کو کسر ضرور لگتی ہے۔

دل کہتا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کا کیا فائدہ جبکہ اپنا بیڑا غرق ہو رہا ہے اور ذہن کہتا ہے کہ یہ تو خود غرضی ہوئی کہ اپنی ذات کو دوسروں پر ترجیح دو۔ صالح ہونے کی صفت جب غالب آنے لگتی ہے تو اصلاح سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے، دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس مارے باندھے کی اطاعت معلوم ہوتی ہے، مجلس کی نسبت تنہائی اچھی لگنے لگتی ہے، دنیا سے بے رغبتی اور پہاڑوں سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

ایسے وقت میں گوشہ نشینی کی طرف مائل دل کو ذہن قائل کرتا ہے کہ نبی اور رسول کے معانی میں بھی اصلاح ہی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ نبی، خبر دینے والے کو کہتے ہیں اور رسول پیغام پہنچانے والا ہے۔ پس نبیوں اور رسولوں کی زندگی کا غالب پہلو اصلاح ہی تھا کہ ان کا وہ وقت جو اللہ کے بندوں کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے مجلس میں گزرتا تھا، وہ

اس وقت سے زیادہ ہوتا تھا جو پروردگار کے ساتھ تنہائی کی عبادت اور مناجات کے لیے مخصوص تھا۔

ذہن کہتا ہے کہ نبی کے نقش قدم پر چل نہ کہ صوفی کے کہ جسے دوسروں کی نسبت اپنی اصلاح کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ دل کہتا ہے کہ ایسی اصلاح کا بھی کیا فائدہ کہ مصلح صاحب فیس بک پر چار لائین لکھنے کے بعد ہر دو گھنٹے میں پسندیدگیوں (likes) کی تعداد دیکھتے رہتے ہیں۔ ذہن کہتا ہے کہ ساری زندگی اپنے نفس کے رذائل (vices) شمار کرنے میں ہی گزار دینا بھی کون سی عقلمندی ہے؟ و علیٰ ہذا القیاس یہ مکالمہ جاری رہتا ہے۔ اور دل اور دماغ دونوں طرف سے دلائل آتے رہتے ہیں....

مبلغین، واعظین، مدرسین اور تحریکی کارکنان کے لیے صالح اور مصلح کے اس فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اس کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب ہی بعض اوقات ان میں ذاتی اصلاح کے لیے کوششیں مفقود نظر آتی ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی دیکھنے میں آیا کہ غلبہ دین کے لیے کچھ علما کی میٹنگ ہو رہی تھی، ادھر سے اذان ہوئی لیکن میٹنگ جاری رہی یہاں تک کہ جماعت کی نماز فوت ہو گئی۔ سیرت کا نفرنس ہو رہی تھی، ہزار افراد شریک تھے، ظہر کی اذان ہوئی اور صرف تین افراد نماز کے لیے اٹھے۔ یہ وہ پہلو ہے کہ جس کی طرف ہم یہ کہہ کر متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ بعض اوقات ہم دوسروں کی اصلاح کے غم میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ اپنی ذات کی اصلاح تک بھول جاتے ہیں۔

اسی طرح رمضان کے مہینہ میں یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک تحریکی کارکن رات گے تک تراویح کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کرنے میں مصروف رہے۔ اب رات کو جب قرآن مجید کی درس و تدریس سے دیر سے فارغ ہوئے اور دن بھر ملازمت کی مصروفیت بھی رہی تو صبح سحری کے لیے بروقت آنکھ نہ کھل سکی بلکہ بعض اوقات توفجر کی جماعت اور بعض اوقات نماز بھی قضا ہوتی رہی۔ ہمیں یہ نہیں کہنا کہ ایسی صورت میں ہمیں رمضان کی بابرکت راتوں میں قرآن مجید کے بیان کا بابرکت عمل ترک کر دینا چاہیے کہ جس سے بلاشبہ سینکڑوں لوگوں کی اصلاح ہو رہی ہوتی ہے

بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے حالات میں ہمیں اپنے درس و تدریس کے اوقات میں کمی کر لینی چاہیے کہ ہم قرآن مجید کا ترجمہ نصف رات بیان نہ کریں بلکہ ایک تہائی رات تک بیان کر لیں یا ایک دو گھنٹے بیان کر لیں تاکہ ہمارے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔

کہنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں دوسروں کی اصلاح کرنے کے حوالے سے جتنی ایکٹوٹی دیکھنے کو ملتی ہے، اتنی اپنی اصلاح کرنے کے حوالے سے دیکھنے میں نہیں آتی۔ اگر معاشرے میں سو افراد ہیں اور ان میں سے نوے دوسروں کی اصلاح میں مصروف ہیں تو سوسائٹی میں مصلحین زیادہ ہوں گے اور صالحین کم۔ ہمیں مصلحین ضرور چاہئیں لیکن اتنی تعداد میں بھی نہیں کہ کسی مجمعے میں خطاب کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہو اور سننے والوں کی کم۔ میڈیا میں بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہو اور دیکھنے والوں کی کم۔ اخبار میں لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو اور پڑھنے والوں کی کم۔ کم از کم سوشل میڈیا یعنی فیس بک اور واٹس ایپ کی حد تک تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ لکھنے والے زیادہ ہیں اور پڑھنے والے کم۔ پس اگر کسی معاشرے میں ہر شخص کو لکھنے اور بولنے کا جنون سوار ہے کہ وہ دوسرے کی اصلاح کر سکے تو ایسے میں کچھ لوگوں کو پڑھنے اور سننے کی ذمہ داری بھی سرانجام دینی چاہیے یا پھر وہی لکھنے اور بولنے والے بعض دنوں میں دوسروں کو پڑھنے اور سننے کا کام بھی کر لیا کریں تاکہ نہ صرف وہ اپنے ہم مکتب ساتھیوں کو اچھے قاری اور سامع مہیا کر سکیں بلکہ کبھی کبھار اپنی اصلاح کا سامان بھی پیدا کر سکیں۔

دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے ظلم ہو رہا ہو اور انسان ہاتھ یا زبان سے اس کو روکنے کی استطاعت بھی رکھتا ہو لیکن اس کے باوجود گو نگا شیطان بنا رہے۔ یا کسی پر بزرگ بننے کا اتنا شوق سوار ہو کہ خلوت کی عبادت کے لیے جنگلوں، دریا کے کناروں، صحراؤں، پہاڑوں اور غاروں کی طرف نکل جائے اور اس سے بڑھ کر بے وقوفی کیا ہوگی کہ خدا نے تو اپنا گھر مسجد بتلایا اور یہ جنگل میں خدا تلاش کر رہا ہے۔ اسے دراصل خدا نہیں تنہائی چاہیے تھی۔ اور اسے جو سکون ملتا ہے، اس کا سبب تنہائی ہے نہ کہ

خدا کیونکہ یہ سکون تنہائی میں مراقبہ کرنے والے پنڈتوں اور بھکشوؤں کو بھی مل رہا ہے۔ خدا کا گھر اگر مسجد میں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خدا بھی مجلس اور جماعت میں ہی ملے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنی خلوت کی عبادت کے مقابلے میں مجلس کی نصیحت نفس پرستی معلوم ہونے لگے۔ یا کسی کو اپنی اصلاح کی اتنی فکر لاحق ہو کہ اپنی اولاد کی اصلاح سے بھی غافل ہو جائے تو یہ بھی دوسری انتہا ہے۔ خود والد صاحب تو تہجد گزار بھی ہیں لیکن بچے فرض نماز تک نہیں پڑھتے اور والد صاحب ان کو پڑھنے کو کہتے بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح والد صاحب اپنی نظروں کی تو خوب حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنی بیٹی کے بارے کوئی فکر نہیں ہے کہ کس قسم کا لباس پہن کر یونیورسٹی جا رہی ہے۔ تو یہ بہت بڑی غفلت اور کوتاہی ہے کیونکہ والدین کی یہ ذمہ داری بلکہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو نیکی کرنے کی نصیحت اور برائی سے بچنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اور ان سے قیامت والے دن اپنی اولاد کے بارے پوچھ گچھ ہوگی جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، الْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»¹

”تم میں سے ہر ایک شخص نگران ہے اور اس سے قیامت والے دن ان کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ جن کا وہ نگران بنایا گیا تھا۔ حکمران سے اس کی رعیت کے بارے سوال کیا جائے گا۔ اور والد سے اس کی اولاد اور اہل خانہ کے بارے سوال کیا جائے گا۔ اور بیوی سے اس کے شوہر کے گھر کے بارے سوال کیا جائے گا کہ جو گھر اس کے شوہر نے اس کے حوالے کیا تھا۔ اور خادم سے اپنے مالک کے اس مال کے بارے سوال کیا جائے گا کہ جس پر اس نے اسے نگران بنایا تھا۔“

¹ البخاری، محمد بن إسماعیل أبو عبد الله الجعفی (المتوفی: 256ھ)، صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القرى والمدن، دار طوق النجاة، مصر، 1422ھ، 5/2

قرآن مجید نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ اپنی اولاد اور اہل خانہ کو بھی جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو اور ایسا کرنا اپنی فرض ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحریم: 6]

”اے اہل ایمان! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ اس آگ پر ایسے سخت اور تند خو فرشتے مقرر ہیں کہ جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، اس کو پورا کرتے ہیں۔“

یہ دونوں قسم کی باتیں اس لیے کر دی ہیں کہ اللہ عزوجل نے انسان کو جن آزمائشوں میں مبتلا کیا ہے، ان میں سے ایک بہت بڑی آزمائش یہ ہے کہ وہ صالح اور مصلح بننے میں توازن قائم رکھ سکے جو کہ اکثر لوگ قائم نہیں رکھ پاتے۔ اور اپنی اصلاح کے لیے فکر مند سچا مومن اس آزمائش کی شدت کو محسوس کرتا ہے جیسا کہ بعض ساتھیوں سے بات چیت میں اس کا اندازہ ہوا ہے۔ توازن بھی کیا عجیب شے ہے! بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ توازن اور اعتدال سے ہمارا اتنا ہی رشتہ ہے کہ جتنا پنڈولم کا اپنی حرکت کے دوران وسطی نکتہ سے۔ پس جس طرح ایک پنڈولم کو لمحے بھر کے لیے وسطی نکتہ کی صحبت نصیب ہوتی ہے، پس اتنے ہی عرصہ کے لیے ہم حالت اعتدال میں ہوتے ہیں اور ذرہ سی دیر میں دائیں بائیں ہو جاتے ہیں۔

تو اصلاح کی ترتیب بھی یہی ہے کہ اپنی ذات سے اصلاح شروع کی جائے۔ اس کے بعد اپنے بیوی بچوں اور اس کے بعد اپنے بہن بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اس کے بعد اپنے پڑوس، گلی اور محلے کی مسجد سے ابتدا کرے اور اس کے بعد اگر موقع ملے تو شہر بھر یا دوسرے شہروں میں بھی دعوت اور تبلیغ کی کوششیں کریں۔ لیکن یہ متوازن رویہ نہیں ہے کہ اپنی ذات اور اپنے گھر کی اصلاح کی طرف تو خاک بھر بھی توجہ نہیں ہے اور دوسرے شہر میں تبلیغی دوروں پر دورے ہو رہے ہیں۔

کچھ دیندار لوگوں کی زندگی میں صالح ہونے کا پہلو غالب ہوتا ہے اور کچھ کی زندگی میں مصلح ہونے کا پہلو۔ دونوں ہی صراطِ مستقیم پر ہیں جب تک کہ بہت زیادہ عدم توازن نہ ہو، نیت خالص ہو اور اللہ کی خشیت اور احسان کی کیفیت حاصل رہے۔ حدیث جبرئیل کے مطابق احسان کا معنی یہ ہے کہ ہم اللہ کی ایسے عبادت کریں کہ جیسے اللہ کو دیکھ رہے ہوں یا اللہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔ اللہ کو دیکھنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ کے بارے کوئی تصور اپنے ذہن میں لایا جائے بلکہ یہ مراد ہے کہ اگر ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اللہ کو دیکھ رہے ہوتے تو خشیت کی جو کیفیت ہوتی تو اس کیفیت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔

اور احسان کی کیفیت جس طرح کہ نماز میں ہونی چاہیے، اسی طرح درس قرآن دیتے ہوئے بھی ہونی چاہیے۔ قرآن مجید پڑھتے ہوئے اور قرآن مجید پڑھاتے ہوئے دونوں صورتوں میں ہمیں احسان کی کیفیت حاصل کرنے کا حکم ہے۔ پس اگر اصلاح کے عمل کے دوران اخلاص، خشیت اور احسان کی کیفیات حاصل رہتی ہیں تو مصلح ہر طور صالح سے بہتر ہے کہ احادیث کے مطابق عالم کو عابد پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اصلاح کے عمل کے دوران ان کیفیات کا حاصل ہونا اسی صورت ممکن ہے جبکہ آپ دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنے صالح ہونے پر خوب محنت کر چکے ہوں۔ قرآن مجید میں صالح انہیں کہا گیا ہے جو ایمان لانے کے بعد صالح عمل بھی کریں۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ﴾

[العنکبوت: 9]

”اور جو لوگ ایمان لے کر آئے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ہم لازماً ان کو صالحین میں شمار کریں گے۔“

اس آیت مبارکہ میں ایمان لانے کے بعد صالح عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے صالحین میں شامل ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے۔ اسی طرح مصلحین یعنی دوسروں کی اصلاح کرنے والوں کے بارے فرمایا کہ کسی قوم میں ان کی موجودگی اتنی بڑی رحمت ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے اس قوم پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِیُهْلِكَ الْقُرْیَ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ﴾ [ہود: 117]

”اور آپ کا رب بستیوں کو ظلم کے سبب سے تباہ کرنے والا نہیں ہے جبکہ ان میں رہنے والے اصلاح کرنے والے بھی ہوں۔“

یہ واضح رہے کہ اصلاح کا کام بھی ایک اعتبار سے عمل صالح ہی ہے۔ اللہ عزوجل ہمارا شمار ان صالحین میں فرمائے جو مصلحین بھی ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی صفات جو کہ صالح بھی ہوں اور مصلح بھی، قرآن مجید کی نظر میں درج ذیل ہیں:

﴿مَنْ أَهْلَ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ

يَسْمَعُونَ﴾ [113] يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾

[آل عمران: 114]

”اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو راتوں کو کھڑے رہتے ہیں اور اللہ کی

آیات کی رات کے مختلف اوقات میں تلاوت کرتے ہیں اور وہ راتوں کو سجدہ

کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے

ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ اور نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔

یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔“

رات کو قرآن مجید کی آیات کے ساتھ نماز تہجد میں طویل قیام اور لمبے سجدے صالح

بننے اور دن میں قرآن مجید کی آیات کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام مصلح بننے کی قرآنی بنیاد

ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک بہت ہی خوبصورت دعا

نقل ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ﴾

[النمل: 19]

”اے میرے پروردگار! مجھے اس بات کی توفیق دے کہ میں آپ کی ان نعمتوں

کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھ پر انعام کی ہیں اور ان نعمتوں کا بھی شکر ادا کروں

جو آپ نے میرے والدین پر انعام کی ہیں۔ اور مجھے اس بات کی بھی توفیق دیں

کہ میں ایسے نیک کام کروں جو آپ کو پسند ہوں۔ اور آپ مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شامل فرمائیں۔“

ہمیں چاہیے کہ ہم اس دعا کو اپنی نماز میں تشہد وغیرہ میں یا اپنے اذکار میں شامل کریں۔ یہ عمل صالح اور مصلح بننے کی بنیاد بن جائے گا، ان شاء اللہ!

تزکیہ اور تعلیم: تخلیہ اور تحلیہ

قرآن مجید میں چار مقامات پر اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرض بیان ہوا ہے کہ آپ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر قرآن مجید کی آیات کی تلاوت فرماتے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔

سورۃ البقرۃ آیت 129 میں بیان ہوا کہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کے بیٹے حضرت اسمعیل علیہ السلام کی نسل میں ایک ایسا نبی بھیجیں جو ان پر اللہ عز و جل کی آیات کی تلاوت کریں، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں۔ اس دعا کے الفاظ یہ ہیں:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [البقرۃ: 129]
 ”اے پروردگار! ان میں ایک رسول انہی میں سے بھیجیں جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کریں، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں۔ بے شک آپ غالب حکمت والے ہیں۔“

اس دعا میں تعلیم کا ذکر پہلے ہے جبکہ تزکیہ کا بعد میں ہے۔ اس کے برعکس بقیہ تین مقامات سورۃ البقرۃ آیت 151، سورۃ آل عمران آیت 164، سورۃ الجمعۃ آیت 2 میں اللہ کے نبی ﷺ کے بھیجنے کا جو مقصد بیان ہوا ہے، وہاں ان چاروں باتوں کا ذکر تو ہے لیکن تزکیہ کا ذکر پہلے ہے اور تعلیم کا بعد میں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ [الجمعة: 2]

”وہی ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں اپنا ایک رسول بھیجا جو انہی کی قوم میں سے ہے۔ اور وہ رسول ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔ انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور بے شک وہ قوم اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھی۔“

کیا تعلیم (education) اور تزکیہ (development) ایک ہی چیز ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا جواب نفی میں ہے۔ تعلیم اور تزکیہ دو علیحدہ اصطلاحات ہیں۔ تعلیم کا معنی تخلیہ ہے یعنی کسی کو آراستہ کرنا اور تزکیہ کا معنی تخلیہ ہے یعنی کسی کو خالی کرنا۔ مثلاً کسی شخص کو اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنا مقصود ہو تو تعلیم ہوگی اور رذائل (vices) سے پاک کرنا مطلوب ہو تو تزکیہ کہلائے گا۔ گویا کہ تعلیم اور تزکیہ دراصل انسانی شخصیت کی تعمیر (personal grooming) کے دورخ ہیں کہ ان دونوں کی اہمیت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پہلے تعلیم ہونی چاہیے یا تزکیہ؟ قرآن مجید میں تین مقامات پر جہاں اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں بیان ہوا کہ وہ صحابہ کی تربیت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں تو اس میں پہلے تزکیہ کا ذکر ہے اور بعد میں تعلیم کا جبکہ ایک مقام پر جہاں ابراہیم علیہ السلام کی اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں دعا کا ذکر ہے تو ان کی دعا میں پہلے تعلیم کا ذکر ہے اور بعد میں تزکیہ کا۔ بظاہر قرآنی اسلوب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ کو تعلیم پر مقدم کرنا چاہیے کیونکہ آپ ﷺ کا منہج یہی بیان ہوا ہے۔ واللہ اعلم

اگر صوفیا کی بات کریں تو ان میں دونوں نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ چشتیہ کا موقف یہ ہے کہ تخلیہ کو تخلیہ پر مقدم کیا جائے یعنی پہلے نفس کو رذائل سے پاک کیا جائے اور پھر تسبیحات و نوافل پر لگایا جائے جبکہ نقشبندیہ کا موقف یہ ہے کہ تخلیہ کو تخلیہ پر مقدم کیا جائے یعنی پہلے نفس کو نوافل اور تسبیحات کی عادت ڈالی جائے، پھر رذائل سے پاک کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ کچھ صوفیا کا کہنا ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ

ہونے چاہئیں۔¹

اللہ عزوجل نے تلاوت آیات کے ساتھ تزکیہ کا ذکر کیا ہے جبکہ تعلیم کتاب کے ساتھ حکمت کا۔ تلاوت آیات کے فوراً بعد تزکیہ کا ذکر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تلاوت آیات ہی تزکیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی نکتہ نظر تھا اور انہوں نے تزکیہ کے اسی طریقہ کار یعنی ”تزکیہ نفس بذریعہ تلاوت قرآن مجید“ کو اپنی تنظیم میں اصلاح نفس کی بنیاد بنایا۔ تزکیہ نفس بذریعہ تلاوت میں اگر ایک اور چیز شامل کر لی جائے یعنی صحبت صالحین تو صحیح معنوں میں اس منہج کا اثر نمایاں ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تلاوت آیات کے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بھی حاصل تھی۔ یہ صحبت ان کے قلوب میں وہ مادہ پیدا کرتی تھی جو آیات کی تلاوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ایمانی اور روحانی اثرات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ایک دوست کا کہنا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی تھی وہ پڑھنے سے متعلق تھی لہذا تعلیم کو تزکیہ پر مقدم کرنا چاہیے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ قراءت اور تعلیم میں فرق ہے۔ پڑھنا لکھنا ایک فن ہے نہ کہ علم لہذا پڑھنے اور لکھنے کے فن کو علم قرار دینا درست نہیں ہے۔ پس پہلی وحی کے پہلے لفظ سے فن کی ابتدا ہوئی ہے اور علم بعد میں دیا گیا ہے۔ اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ”امی“ ہے کہ آپ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن عالم سب سے بڑے تھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تزکیہ تو ان کے بچپن میں ہی کر دیا گیا تھا لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تزکیہ پہلے ہوا اور تعلیم بعد میں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَاهُ جِبْرِيلُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَلْعَبُ مَعَ الْغُلَّامَانِ، فَأَخَذَهُ فَصَرَعَهُ، فَشَقَّ عَنْ قَلْبِهِ، فَاسْتَخْرَجَ الْقَلْبَ، فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عِلْقَةً، فَقَالَ: «هَذَا حَظُّ الشَّيْطَانِ مِنْكَ، ثُمَّ غَسَلَهُ فِي طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ بِمَاءِ زَمْزَمَ،

¹ اشرف علی تھانوی، مولانا، شریعت و طریقت، مرتب مولانا محمد دین چشتی، ادارہ اسلامیات،

ثُمَّ لَأَمَّهُ، ثُمَّ أَعَادَهُ فِي مَكَانِهِ، وَجَاءَ الْغُلَمَانُ يَسْعَوْنَ إِلَى أُمِّهِ - يَعْنِي ظُفْرَهُ - فَقَالُوا إِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ، فَاسْتَقْبَلُوهُ وَهُوَ مُنْتَفِعُ اللَّوْنِ، قَالَ أَنَسٌ وَقَدْ كُنْتُ أَرَى أَثَرَ ذَلِكَ الْمُخِيطِ فِي صَدْرِهِ»¹

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام اس وقت تشریف لائے جبکہ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو پکڑ کر نیچے لٹایا اور آپ کا سینہ چیر کر دل باہر نکالا۔ اور اس دل میں سے خون کا ایک لو تھڑا باہر نکالنے کے بعد کہا کہ یہ شیطان کا حصہ تھا۔ انہوں نے آپ کا دل سونے کی رکابی میں زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر انہوں نے آپ کے دل کو اپنی جگہ رکھ دیا اور سینے کو سی دی۔ بچوں نے جب یہ معاملہ دیکھا تو آپ کی والدہ یعنی رضاعی ماں کو بتلانے کے لیے دوڑے اور کہنے لگے کہ محمد ﷺ کو قتل کر دیا گیا۔ پس آپ کے رضاعی والدین آپ کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ آپ کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے سینے میں سے جانے کے نشانات گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔“

ایک سلفی عالم دین دوست نے اس رائے کا اظہار کیا کہ تزکیہ نفس کے باب میں سلفی علما کو صوفیائی آراء نقل نہیں کرنی چاہئیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ سلفی علما کے ہاں صوفیائی کے رائے نقل کرنے کا مقصد ان کے اقوال سے استدلال نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی موضوع پر تقابلی مطالعہ میں اضافہ کی خاطر ایسا کیا جاتا ہے۔ اور دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ سلفیہ کے فریق مخالف کی ہر بات ہی غلط ہو بلکہ صوفیائے بھی بہت سی باتیں ایسی بیان کی ہیں جو کہ کتاب و سنت کے مطابق ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض سلفی علما اپنے فتاویٰ میں اہل الظاہر، جعفریہ، زیدیہ اور اباضیہ وغیرہ تک کی آراء بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ یا سلفی اہل علم اپنی عقیدہ کی کتب میں جہمیہ،

¹ مسلم بن الحجاج النیسابوری (المتوفی: 261ھ)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الإِشْرَاءِ بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى السَّمَاوَاتِ، دار إحياء التراث العربي، بیروت، 147/1

معتزلہ، مرجئہ اور قدریہ وغیرہ کا موقف بھی ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح علم اخلاق بھی ایک میدان ہے کہ جس میں صوفیاء کی آرا موجود ہیں اور ان کی رائے بیان کر دینے میں سلفیہ کو کوئی وحشت محسوس نہیں ہونی چاہیے جبکہ استدلال کی بنیاد کتاب و سنت ہو۔

کتاب سے تربیت

تجربہ شاہد ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے کتاب سے کہیں زیادہ مفید ”صحبت“ ہے یعنی ایسے لوگوں کی صحبت کہ جن کا تزکیہ ہو چکا ہو۔ صحبت سے احوال منتقل ہوتے ہیں جبکہ کتاب سے صرف معلومات منتقل ہوتی ہیں سوائے کتاب و سنت کے کہ جو علم کے ساتھ احوال بھی منتقل کرتے ہیں۔ مثلاً جب آپ برف کے پاس بیٹھیں گے تو اس کی ٹھنڈک آپ کو پہنچے گی اور اگر آپ آگ کے گرد ہوں تو آپ تک اس کی حرارت منتقل ہوگی۔ پس اسی طرح صاحب ایمان کی صحبت میں بیٹھنے سے ایمان منتقل ہوتا ہے بلکہ ایمان کے علاوہ احوال اور کیفیات بھی منتقل ہوتی ہیں۔

اس کو یوں سمجھیں کہ ایک ہے عاجزی کے موضوع کا کتب میں مطالعہ کرنا اور ایک ہے کہ کسی ایسے شخص کی صحبت میں بیٹھنا کہ جس میں واقعی عاجزی ہو۔ اگر آپ ایسے شخص کی صحبت میں ایک عرصہ تک بیٹھیں اور آپ کو اس سے نسبت بھی ہو تو عاجزی کے احوال اس سے آپ میں منتقل ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے تزکیہ کے لیے قرآن مجید کے علاوہ جو سب سے بڑا موقع حاصل تھا، وہ آپ ﷺ کی صحبت کا تھا۔ اور صحبت کا تزکیہ کے لیے مفید ہونا واضح امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپ کی مجلس سے اٹھ جاتے تھے تو اپنے ایمان کی کیفیت میں اس قدر تبدیلی پاتے کہ انہیں اپنے منافق ہونے کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي مُوسَى، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «إِنَّمَا مَثَلُ الْجَلِيسِ الصَّالِحِ، وَالْجَلِيسِ السَّوِّءِ، كَحَامِلِ الْمُسْكِ، وَنَافِخِ الْكَبِيرِ، فَحَامِلُ الْمُسْكِ: إِمَّا أَنْ يُحْذِيكَ، وَإِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ، وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيحًا طَيِّبَةً، وَنَافِخُ الْكَبِيرِ: إِمَّا أَنْ يُحْرِقَ ثِيَابَكَ، وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ رِيحًا

حَبِیْثَةٌ¹

”حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے رسول ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ اچھے اور برے ساتھی کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ عطر (perfume) اٹھانے والے اور بھٹی میں پھونک مارنے والے کی۔ عطر والا شخص یا تو تمہیں اپنے پرفیوم میں سے کچھ ہدیہ کر دے گا یا تم اس سے کچھ خرید لو گے یا دونوں صورتیں نہ ہوں تو کم از کم پرفیوم کی خوشبو تو تمہیں پہنچ ہی جائے گی۔ اور بھٹی میں پھونک مارنے والا یا تو تمہارے کپڑے جلادے گا یا یہ نہ بھی ہو تو کم از کم تمہیں اس کی بدبو تو ضرور پہنچے گی۔“

تزکیہ نفس اور تربیت پر لکھی گئی کتب پڑھ لینے یا اس موضوع پر تحقیقی مضامین مرتب کر لینے سے تزکیہ یا تربیت نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لیے نیک لوگوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا بھی ضروری ہے۔ اور نیک لوگوں سے ہماری مراد ”گدی نشین پیر“ یا ”خلیفہ محاذ فقیر“ نہیں بلکہ والدین اور وہ رشتہ دار، دوست، محلے دار اور مسجد کے نمازی ہیں جنہیں آپ نیکی میں اپنے سے بہتر خیال کریں۔

ذرا غور کریں کہ اس شخص سے بڑا بد نصیب کون ہو گا کہ جس کے گھر میں بوڑھے والد کی صورت میں اس کی جنت موجود ہو اور وہ کسی پیر کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے سینکڑوں کلو میٹر کا سفر طے کرنے کو اپنے لیے اعزاز سمجھ رہا ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ تو اس کے والد کو اس کے لیے جنت کا دروازہ قرار دیں اور یہ جنت بہشتی دروازے میں تلاش کر رہا ہو۔ تعجب ہے اس رویے پر! ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَأَضِعْ ذَلِكَ الْبَابَ أَوْ احْفَظْهُ»²

”والد جنت میں داخل ہونے والے دروازوں میں سے سب سے بہترین دروازہ ہے۔ پس چاہو تو اس دروازے کو [اہمیت نہ دے کر] ضائع کر دو اور چاہو تو اس کی حفاظت کر لو۔“

¹ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب مجالسة الصالحين، 2026/4

² ابن ماجہ، أبو عبد اللہ محمد بن یزید القزوينی، (المتوفی: 273ھ)، سنن ابن ماجہ، کتاب الأذنب، باب یز

الوالدین، دار إحياء الكتب العربية، فیصل عیسیٰ البابی الحلبي، 1208/2

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ جس کی پیاس جھوٹی ہو تو وہ دریا سے بھاگتا ہے اور سراب کی طرف دوڑتا ہے۔ پس جس کی طلب سچی نہیں ہے، وہ اپنی جنت کے یقینی راستوں کو چھوڑ کر جھوٹی امیدوں کی طرف دوڑے گا۔ پروردگار نے اس کی جنت عقیدہ توحید پر زندگی گزارنے، ارکان اسلام پر عمل پیرا ہونے، ماں کی خدمت کرنے اور والد کی جوتیاں سیدھی کرنے میں رکھی ہے جبکہ یہ اسے پیر کے قدموں اور مرشد کی جوتیوں میں تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

تزکیہ نفس کے موضوع پر کتابیں تو بہت سی ہیں اور سب سے اہم خود قرآن مجید ہے۔ عربی زبان اور دینی علوم میں اگر اتنی استعداد (capability) ہو کہ براہ راست قرآن مجید کی تلاوت سے اس کا مفہوم دل پر اترا محسوس ہو تو اس سے بہتر تزکیہ کی کتاب کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد ریاض الصالحین اچھی کتاب ہے جو اخلاق و ذائل (morals and vices) کی احادیث کا مجموعہ ہے۔ علاوہ ازیں احادیث کی دیگر کتب میں بھی آداب و رقائق کے نام سے ابواب (chapters) ہوتے ہیں، ان کا مطالعہ بھی بہت مفید ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں پر لکھی گئی کتب کو بھی پڑھیں۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر امام احمد بن حنبل، امام عبد اللہ بن مبارک اور امام ابن قیم رحمہ اللہ وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ کریں۔

شیخ اور استاذ کا فرق

اللہ کے رسول ﷺ کے قرآن مجید میں کئی مقامات پر چار فرائض بیان ہوئے ہیں، جن میں ایک تعلیم کتاب اور دوسرا تزکیہ نفس ہے۔ آپ ﷺ بیک وقت معلم (teacher) بھی تھے اور مربی (mentor) بھی اور یہی معاملہ صحابہ کا بھی تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب اتنی جامعیت نہ رہی تو معلم اور مربی کی تقسیم پیدا ہوئی۔ تابعین ہی کے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تقسیم شروع ہو چکی تھی مثلاً سعید بن مسیب اور حسن بصری رحمہ اللہ کی عوامی مجالس میں باہمی فرق کو ہم علمی اور اصلاحی مجالس کی اصطلاحات سے واضح کر سکتے ہیں۔

ماضی قریب کی مثال لینی ہے تو شیخ الکل حضرت نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے شاگرد عبد اللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے یہ قول ہے کہ عبد اللہ نے مجھ سے بخاری سیکھی اور میں نے اس سے نماز¹ اسی طرح شاہ اسمعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور معروف معنوں میں ان کے مرید کہلائے جبکہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ اسمعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا اور معروف معنوں میں ان کے شاگرد قرار پائے۔ مجاہدین کی یہ تحریک جب پشاور پہنچی تو وہاں یہ دیکھنے میں آیا کہ فجر کی نماز کے بعد سید احمد بریلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحی مجلس ہوتی تھی جس میں مسند پر تو سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ ہوتے جبکہ شاہ اسمعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ سامنے ایک طالب کی حیثیت سے موجود ہوتے تھے۔ اور ظہر کے بعد درس حدیث کی علمی مجلس ہوتی تھی کہ جس میں مسند پر تو شاہ اسمعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرماتے جبکہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ ایک شاگرد کی حیثیت سے سامنے بیٹھے ہوتے تھے۔²

ہم میں سے ہر شخص کو استاذ کے علاوہ ایک شیخ کی بھی ضرورت ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ معلم (teacher) ہمارے ذہن کی نشوونما کرتا ہے جبکہ مربی (mentor) قلب کی اصلاح۔ استاذ اختلاف کی استعداد بڑھاتا ہے تاکہ حرکت پیدا ہو جبکہ شیخ اتفاق کی طرف کھینچتا ہے تاکہ سکون کی طرف لائے۔ معلم ذہن کا محافظ ہے جبکہ شیخ قلب کا مالی۔ استاذ چلاتا ہے جبکہ شیخ روکتا ہے۔ استاذ اپنے سے اختلاف پر ابھارتا ہے تاکہ کند ذہن نہ رہے اور تخلیق کا باعث بنے جبکہ شیخ اختلاف کو دباتا ہے تاکہ تجدید کی راہوں پر نہ نکل جائے۔

عام طور لوگوں کا خیال ہے کہ حرکت میں ہی کل زندگی ہے لیکن کبھی پودوں اور درختوں پر غور کریں تو احساس ہو گا کہ ان کے برگ و بار اور پھل و پھول ان کے سکون ہی کا نتیجہ ہیں۔ اگر درخت ساکن نہ ہو تو پھل نہ دے اور پودے حرکت کرنے لگیں تو

¹ ابوبکر غزنوی، سید، داؤد غزنوی، فاران آکٹیمی، لاہور، 1994ء، ص 14

² ابو الحسن علوی ندوی، سید، سیرت سید احمد شہید، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، نواں

ایڈیشن، 2011ء، حصہ دوم، ص 234

پھول پیدا نہ ہوں۔ حرکت و سکون ہماری زندگی کے دو پہلو ہیں اور دونوں کے ملنے سے ہی جمال اور توازن پیدا ہوتا ہے۔

یہاں استاذ سے ہماری مراد ”باعمل عالم دین“ ہے لیکن تربیت، تعلیم کے علاوہ ایک میدان ہے جس کے اپنے رجال کار ہیں، یہ بات مجھے کافی عرصہ بعد سمجھ آئی۔ پہلے میری رائے بھی یہی تھی کہ تعلیم ہی تربیت کا دوسرا نام ہے اور معلم (teacher) ہی مربی (mentor) بھی ہوتا ہے لیکن کچھ مربی حضرات کی مجالس میں بیٹھنے کے بعد یہ رائے تبدیل ہو گئی۔

اب شدت سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح میں جو کردار شیخ ادا کر سکتا ہے، وہ استاذ کے حصے میں بہت کم آتا ہے۔ اور انسان کی ذہنی تربیت میں جو کردار استاذ کا ہے، وہ شیخ کا میدان نہیں ہے۔ ایک عالم دین، نیک ہو سکتا ہے لیکن عموماً وہ مربی نہیں ہوتے یعنی تربیت کرنے کے فن سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر کسی عالم دین ہی میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں یعنی وہ اچھا استاذ اور اچھا مربی بھی ہو تو بہت خوب! اور کیا چاہیے؟ استاذ مجلس میں بنتا ہے اور مربی تنہائی میں۔ تنہائی میں جس کا روزنامہ زیادہ ہو، مجلس میں اس کی بات میں اثر زیادہ ہوتا ہے۔

تربیت اور اصلاح کے حوالے سے تصوف اور اصلاحی تحریکوں کے لٹریچر کو کھنگالا تو اس سے یہ ذہن بنا کہ تربیت، تعلیم کے علاوہ ایک مستقل ضرورت ہے اور مدرس عام طور اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے۔ کسی عالم دین کا رات تہجد میں قیام کرنا یا اعلیٰ اخلاق سے متصف ہونا مربی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ مربی تو وہ ہے جو اپنے زیر تربیت افراد کو نیکی کی اس سطح پر یا اس کے قریب قریب لے آئے کہ جس پر وہ خود کھڑا ہے۔

فرشتے اس شخص کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں جو صرف علم منتقل نہ کرے بلکہ اپنے علم (knowledge) کو لوگوں کے لیے خیر (good) بنا دے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَنْتَظِرُونَ حَتَّىٰ تَقُومَ النَّمْلَةُ فِي جُحْرِهَا

وَحَتَّى الْحُوتِ لِيُصَلُّوْنَ عَلَى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرِ»¹

”یقیناً اللہ عزوجل، اس کے فرشتے، زمینوں اور آسمانوں کی جمیع مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں اور مچھلیاں تک اس شخص کے لیے رحمت کی دعا کرتی ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے۔“

یہ کتنی بڑی فضیلت ہے لیکن ہر عالم کے لیے نہیں بلکہ اس عالم کے لیے ہے جس نے اپنے علم کو لوگوں کے لیے خیر بنادیا یعنی اپنے علم سے لوگوں کو خیر کے رستے پر ڈال دیا اور ان کی تربیت کر کے دکھادی۔ اور انبیاء کی جماعت وہ پہلی جماعت ہے جس نے اپنے علم سے اپنے اصحاب کی تربیت کر کے دکھادی۔

اس حدیث میں ہمارے لیے عمل کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ جس کے لیے پروردگار اور فرشتے دعا کریں اور ہم اس کے لیے دعا نہ کریں۔ اسی لیے ہمیں سجدے کی حالت میں ان اصحاب علم کے لیے خاص طور دعا کا اہتمام کرنا چاہیے کہ جن کا علم لوگوں کے لیے خیر بن جاتا ہے۔ ہمیں عموماً سجدے کی حالت میں یہ دعا کرنی چاہیے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِمُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرِ۔ ترجمہ: اے اللہ! انہیں اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے کہ جو اپنے علم سے لوگوں کو خیر کے رستے پر ڈال دیتے ہیں۔

شیخ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی کو استاذ بنا کر اس سے دین کا علم حاصل کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں اللہ کے کسی ایسے نیک بندے سے اصلاحی تعلق بھی قائم کرنا چاہیے جو اصلاح قلب اور تزکیہ نفس میں ہماری رہنمائی اور معاونت کر سکے۔ پس اللہ کے کسی ولی کی مجلس یا صحبت میں کچھ وقت گزاریں اور اس کی رہنمائی میں اپنی اصلاح کریں۔ اور کوشش کریں کہ یہ ولی آپ کو اپنے والد، رشتہ دار، دوست، رفیق (colleague)، دینی جماعت کے نیک کارکن، محلے کی مسجد کے بزرگ نمازی یا قریبی مدرسہ کے عالم دین کی صورت میں میسر آجائیں۔

جبکہ پیری مریدی، گدی نشینی، خانقاہیں اور بیعت کا نظام مل کر جو ایک انسٹی ٹیوٹ

¹ الترمذی، محمد بن عیسیٰ (المتوفی: 279ھ)، سنن الترمذی، أبواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العلم، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر، 1975ء، 50/5

بن چکا ہے، ہمارے نزدیک اس کے پورے اسٹرکچر کا زمین بوس ہو جانا دین اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ ہم تزکیہ نفس کے نام پر قائم کیے جانے والے اس ظالمانہ اور استحصالی نظام (exploitative system) کے حق میں ہر گز نہیں ہیں۔

تزکیہ کے لیے رہنما کی ضرورت

ہمارے ایک انتہائی قابل احترام عالم دین دوست کا کہنا ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے رہنما ضروری ہے۔ تو اس اصولی بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے رہنما ضروری ہے۔ اصل جھگڑا یہ ہے کہ رہنما بنے گا کون؟

درباروں کے گدی نشین یہ کہتے ہیں کہ یہ رہنما ہم ہیں جبکہ ایک عامی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دین اور اخلاق کے معاملے میں خود ان گدی نشینوں کو رہنمائی لینے کی ضرورت ہے چہ جائیکہ کہ یہ کسی کی رہنمائی کریں۔ اسی طرح کسی سلسلے میں بیعت لینے والے پیر اور مرشد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ رہنما ہم ہیں جبکہ بہت سارے لوگوں کو ان کے نظریات اور اخلاقی رویوں سے بہت سے اختلاف ہیں۔

معاصر صوفی کی ایک جماعت کی شدید خواہش ہے کہ اصلاح نفس کی کرسی ان کے لیے خالی کر دی جائے حالانکہ ان کی یہ خواہش یہی بتلاتی ہے کہ یہ حب جاہ کے پجاری ہیں اور ان کی طرف تزکیہ کے لیے رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ اب جو خود مدعی ہو کہ اس کے پاس تزکیہ نفس کے لیے جایا جائے تو اسے خود تزکیہ نفس کی اشد ضرورت ہے نہیں کیا؟ قرآن مجید تو اپنے تزکیہ تک کا دعویٰ کرنے سے بھی منع فرماتا ہے چہ جائیکہ کہ دوسروں کو تزکیہ کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا تَزُكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى﴾ [النجم: 32]

”اور اپنے آپ کو پاک صاف مت جتلاؤ کہ پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم میں سے کون متقی ہے؟“

اگر صرف دعویٰ کرنے سے کوئی رہنما بن جاتا ہے تو یہ دعویٰ کوئی بھی شخص کر سکتا

ہے کہ تمام صوفیوں اور گدی نشینوں کو چاہیے کہ اپنے تزکیہ نفس کے لیے اس سے رہنمائی لیں۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ تصوف کی طرف نسبت رکھنے والوں میں سے بعض لوگ معتدل بھی ہیں لیکن بہت کم ہیں۔ جب کسی جماعت یا ادارے پر حکم لگایا جاتا ہے تو ان کی اکثریت کو سامنے رکھ کر حکم لگایا جاتا ہے اور ہمارا مذکورہ بالا حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے نہ کہ سب کے بارے میں۔ پس اکثر متصوفین میں تصوف ایک رسم سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اس رسم میں بھی اصل اہمیت اس مخصوص لباس (kit) کی بن چکی ہے جو پیر صاحب سے بیعت کرنے والوں کو بقیہ لوگوں سے ممتاز ثابت کرنے کے لیے پہنائی جاتی ہے۔ اور اب تو یہ مخصوص لباس اتنا امتیازی ہے کہ آپ عمامہ باندھنے کے اسٹائل اور ٹوپی کی قسم دیکھ کر بتلا سکتے ہیں کہ یہ صاحب فلاں سلسلے سے وابستہ ہیں یا فلاں پیر صاحب کے مرید ہیں۔

تصوف کا جو اصل مقصود تھا یعنی عبادت میں احسان کا حصول، رذائل سے اپنی صفائی کرنا اور اخلاق حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا، تو وہ تو اب تصوف کے حلقوں میں بھی مطلوب نہیں رہ گیا بلکہ مریدوں اور پیروں دونوں کا زور اس پر ہے کہ کسی طرح کشف قبور حاصل ہو جائے، عالم برزخ کا مشاہدہ کر لیں، نبی کریم ﷺ سے روحانی بیعت ہو جائیں، آسمانوں کی سیر کر لیں، اللہ اور جبرئیل علیہ السلام کا دیدار کر لیں، قطب اور ابدال بن جائیں، قلب جاری کر لیں وغیرہ وغیرہ

باقی کسی شخص کے دل میں کتنا تقویٰ اور ایمان ہے؟ کس کا اللہ کے ہاں کیا مقام اور مرتبہ ہے؟ اللہ کے ہاں مرشد کا مقام بلند ہے یا اس کے مرید کا؟ استاذ، اللہ کے زیادہ مقرب ہے یا شاگرد؟ تو یہ سب قیامت والے دن ہی معلوم ہو گا کہ جس دن بڑے بڑے برج الٹ جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ لَيْسَ لِمَنْ يَلْفَحُهَا كَافِرٌ ﴿٢﴾﴾ خَافِضَةً

رَافِعَةً ﴿[القيامة: 1-3]﴾

”جب واقع ہوگی، واقع ہونے والی [یعنی قیامت]۔ اس کے واقع ہونے کو کوئی

جھٹلانہ سکے گا۔ وہ کسی کو پست کر دے گی اور کسی کو بلند کر دے گی۔“

پس قیامت والے دن بہت سے ایسے لوگ بلند ہوں گے جو کہ دنیا میں پست شمار ہوتے تھے۔ اور قیامت والے دن بہت سے ایسے لوگ پست ہوں گے کہ جنہیں دنیا میں بلند سمجھا جاتا تھا۔ پس قیامت کا وقوع لوگوں کی پستی اور بلندی، چھوٹے اور بڑے، افضل اور مفضول ہونے کے بہت سے دنیاوی تصورات کو الٹ دے گا۔

میرے مرشد، میرے حضرت

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ آپ اصلاح نفس پر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات کو بہت اہمیت دیتے ہیں کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کریں۔ تو یہ لوگ کون ہیں کہ جن کی صحبت ہماری اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے؟

آج میں دو ایسے اکابر مرشدین کا تعارف کروانا چاہ رہا ہوں کہ جو ہماری اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ مرشد ایسے ہیں کہ اگر آپ کو نصیب ہو جائیں تو پھر آپ کو کسی بیعت یا خانقاہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہ دو مرشد ہمارے سچے دوست اور اہلیہ ہیں۔ بلاشبہ کسی بھی شخص کو اس کے سچے دوست اور اہلیہ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا لہذا وہ اس کی اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اہلیہ کو مرشد بنانے کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی بیعت کر لی جائے یا اسے گھر کا منتظم (administrator) بنالیا جائے بلکہ اس معنی میں مرشد کہ خاوند اس سے اپنی اصلاح میں رہنمائی لے سکے۔

ایک دوست اپنی اہلیہ کے ساتھ خوشگوار موڈ میں گھر میں موجود تھے کہ ان سے کہا: آپ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ جانتی ہوں گی، مجھے بتائیں کہ مجھ میں کیا خامی ہے؟ اور تنقید برائے تنقید نہ ہو کہ مجھے یہ نہیں ملا، یا گھر میں یہ نہیں ہے بلکہ ایسی بات کہیں جو میری اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکے۔ اہلیہ نے کہا: آپ متکبر ہیں۔ انہیں ایک جھٹکا لگا کیونکہ وہ اپنے جاننے والوں میں متواضع اور منکسر المزاج معروف تھے لیکن انہوں نے بات جاری رکھی۔ انہوں نے کہا: کیسا متکبر محسوس کرتی ہیں؟ اہلیہ نے کہا: آپ کو اپنے

علم اور نیکی دو چیزوں کا تکبر ہے۔

ان پر اس وقت یہ تبصرہ بہت گراں گزر رہا تھا، وہ بحث کر سکتا تھے اور اپنی عاجزی کو ثابت کرنے کے لیے شہادتوں کے انبار لگا سکتے تھے۔ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ بیوی تو فریق مخالف ہوتی ہے، اس نے تو ایسے کہنا ہی ہے، کہاں میاں بیوی میں اختلافات نہیں ہیں؟ لڑائی جھگڑے ہر جگہ ہوتے ہیں؟ بیوی اپنے شوہر کے معاملے میں متعصب (biased) ہوتی ہے، تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو، کسی غیر جانبدار شخص ہی کو مرشد بنا لیتے، بیوی کہاں غیر جانبدار ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن انہوں نے اپنے نفس کو سمجھایا کہ یہی کڑا مرحلہ ہے۔ اس بات کو حقیقت سمجھ کر مان لو۔ بھلے اب دنیا تمہیں عاجز کہے، تم متواضع نہیں ہو۔ جب کافی کشمکش کے بعد نفس نے اس عیب کو مان لیا تو اب اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ اور وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ انہوں نے اپنی اصلاح کر لی ہے یا ان کا تزکیہ ہو گیا ہے لیکن اس تسلیم پر اللہ نے انہیں جو انعامات دیے، ان میں چند ایک ضرور سامنے رکھنا چاہوں گا:

① اہلیہ کے اس تبصرے کو تسلیم کرنے کے بعد اللہ عز و جل نے عاجزی کے احوال کھول دیے یعنی عاجزی پہلے کتابوں میں پڑھتے تھے، اب اسے محسوس کرنا شروع کر دیا۔

② اب اگر کوئی متکبر کہے تو کچھ ملال نہیں ہوتا بلکہ دل میں خیال آتا ہے کہ صحیح ہی تو کہہ رہا ہے۔ اور دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ اے مالک! آپ ہی اصلاح بھی فرمائیں اور درگزر بھی کریں۔ پس تکبر کے الزام یا طعن پر رد عمل پیدا نہیں ہوتا بلکہ اپنے متکبر ہونے کا احساس ندامت پیدا ہوتا ہے اور زبان توبہ استغفار کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اب معلوم نہیں یہ کیفیت کب تک باقی رہتی ہے۔

③ اب رہ رہ کر یہ حدیث یاد آتی ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہے، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ اور دل میں یہ خیال آتا ہے کہ ان

کے دل میں تورائی کے دانے کے برابر تکبر تو لازماً موجود ہے کیونکہ رائی کا دانہ تو بہت چھوٹا ہوتا ہے اور اتنے کم تکبر سے بچاؤ کیسے ممکن ہے کیونکہ دل میں اپنے نفس کی بڑائی آہی جاتی ہے۔

③ اہلیہ کی بات سے ایک اور حال پیدا ہوا اور وہ یہ کہ رہ رہ کے یہ خیال ستانے لگا کہ آج تم مصنف ہو، خطیب ہو، مدرس ہو، بہت سے لوگ تم سے استفادہ کرتے ہیں۔ تمہاری درس و تدریس، وعظ و نصیحت، تحریر و تصنیف سے فائدہ اٹھانے والے اگر میدان حشر میں تم سے آگے کھڑے ہوں تو وہ تمہارے بارے کیا سوچیں گے؟ یا جنہیں تم اپنی تنقید سے غلط ثابت کرتے رہے، اگر قیامت والے دن وہی تم سے زیادہ سرخرو نکلے تو کہاں اپنا منہ چھپاؤ گے؟ اب ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ہر مقتدی (follower)، سامع (listener) اور قاری (reader) دین میں ان سے بہتر ہے۔

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اہلیہ نے اپنے خاوند کی اصلاح میں کیسے کردار ادا کیا۔ آپ بھی اپنی اہلیہ سے اصلاح لیں۔ اسی طرح بیوی اگر اپنے شوہر سے اس معنی میں اصلاح لے لے تو وہ بھی بہت مفید ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«الْمُؤْمِنُ مِرَاةُ الْمُؤْمِنِ، وَالْمُؤْمِنُ أَخُو الْمُؤْمِنِ، يَكْفُ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ، وَيَحْوَطُهُ مِنْ وَرَائِهِ»¹

”ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ اور ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے۔ مسلمان اپنے بھائی کو نقصان سے بچاتا ہے اور اس کی پشت پیچھے اس کا دفاع کرتا ہے۔“

بعض دوستوں نے بیوی کو مرشد بنانے کی تجویز کو ہنسی مزاح میں لیا۔ ہنسی مزاح اپنی جگہ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی ذاتی زندگی کے بارے جتنا آپ کی بیوی جانتی ہے، اتنا وہ مرشد نہیں جن سے آپ اصلاح کے لیے بیعت ہوئے ہوں۔

¹ أبو داؤد، سلیمان بن الأشعث التميمي (المتوفى: 275هـ)، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في النصيحة والحيطة، المكتبة العصرية، بيروت، 4/280

سر پر ٹوپی رکھے، سفید شلوار قمیص میں، شیخ بیعت کے سامنے سر جھکائے تو ہر شخص فرشتہ معلوم ہوتا ہے لیکن بیوی کو پتہ ہے کہ اس معصوم فرشتے کی فجر کتنے دن ادا ہوتی اور کتنے دن قضا، غصے کی حالت میں کیا ملفوظات منہ سے ارشاد فرماتے ہیں اور رات کا کتنا حصہ پاکیزہ فلمیں دیکھتے ہوئے گزرتا ہے۔

اس لیے آپ اگر اپنی حقیقی اصلاح چاہتے ہیں تو پہلے اپنی بیوی سے اپنے نفس میں موجود شر کے بارے معلوم کر لیں اور پھر اس شر کی اصلاح کریں۔ آپ کے نفس کے رذائل کے بارے آپ کی بیوی سے بہتر کوئی نہیں جانتا، معذرت کے ساتھ، صاحب بیعت شیخ اور مرشد بھی نہیں۔ نقشبندیہ سلسلے کے ایک بزرگ حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض ملفوظات میں تزکیہ میں بیوی کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

بہت سے دوست اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہیں لیکن ہوتی نہیں ہے۔ گناہ کی عادت ترک کرنا چاہتے ہیں لیکن گناہ چھوٹا نہیں ہے۔ تو جن دوستوں کو اپنے تزکیہ نفس کی خواہش اور شوق ہو لیکن اس کے باوجود کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوتی ہو تو ان کے لیے تجویز ہے کہ وہ اپنے سے سینئر کسی رفیق، مدرس، استاذ، عالم دین، بزرگ وغیرہ کو اپنا بڑا بنالیں اور ان سے اپنی اصلاح کے بارے مشاورت کرتے رہیں۔ ان شاء اللہ! سال بھر میں ہی نیکی کرنا آسان لگے گا اور گناہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی دوست مدرس قرآن ہیں اور ہفتہ بھر میں آٹھ دس درس دیتے ہیں تو انہیں ہفتہ میں ایک درس ایسا بھی رکھنا چاہیے کہ جس میں وہ سامع کی حیثیت سے شریک ہوں۔ جن لوگوں کی زندگی میں دوسروں کی اصلاح کا عمل بہت بڑھ جاتا ہے تو ان کی ذاتی اصلاح کا عمل رک جاتا ہے اور اس رکاوٹ کو دور کرنے کا بہترین حل یہی ہے کہ وہ صرف سنانے کی نیکی نہ کریں بلکہ سننے کی نیکی بھی جاری رکھیں۔

میں نے تزکیہ نفس میں ایک اصول کو بنیاد کی حیثیت سے جانا ہے اور یہ اصلاح نفس کے باب کا کل خلاصہ ہے کہ اگر خود سے تزکیہ کی طلب اور کوشش نہ ہوگی تو نبی کی

صحبت کا بھی فائدہ نہ ہو گا۔ بس اس کو جان کر کسی صاحب حال کی صحبت میں کچھ عرصہ گزاریں تو آپ کی زندگی تبدیل ہو جائے گی۔ کیا حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کو ان جلیل القدر انبیاء کی صحبت کا فائدہ ہوا؟ کیا ابو جہل اور منافقین کو نبی کریم ﷺ کی صحبت کا فائدہ ہوا؟ اگر نہیں تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اندر نیکی کی طلب موجود نہ تھی۔ تو مانا کہ آپ کے تزکیہ میں شیخ کا بھی کمال ہوتا ہے لیکن آپ کا کمال شیخ کے کمال سے زیادہ ہوتا ہے، بس اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

مجاہدہ نفس کے چار اصول

بعض صوفیائے کم کھانے، کم سونے، کم گفتگو کرنے اور لوگوں سے کم میل جول رکھنے کو مجاہدہ قرار دیا ہے جسے وہ قلت طعام، قلت منام، قلت کلام اور قلت اختلاط مع الانام کا نام دیتے ہیں۔ اہل علم کی رائے میں اس عنوان کو درست کرنے کی ضرورت ہے یعنی معتدل کھانا، معتدل سونا، معتدل گفتگو کرنا اور معتدل میل جول رکھنا۔ اور یہی شریعت کا تقاضا ہے۔

کم کھانا اور زیادہ کھانا دونوں شریعت کا مطلوب (required) نہیں ہیں۔ شریعت اسلامیہ نہ تو کم کھانے کا تقاضا کرتی ہے اور نہ ہی زیادہ کھانے کو پسند کرتی ہے بلکہ اس معاملے میں میانہ روی کا درس دیتی ہے۔ بعض صوفیائے کہا کہ آپ کم کھائیں تاکہ اپنی شہوت کی قوت کو توڑ سکیں۔ یہ سوچ درست نہیں ہے۔ ہمیں ایسا مجاہدہ نہیں چاہیے جو ہماری جبلتوں (instincts) کو ہی کمزور کر دے اور ہم اپنے نفس کو مار کر اس پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑیں بلکہ ہمیں ایسا مجاہدہ کرنا ہے جو ہمارے نفس کو زندہ رکھتے ہوئے اسے اپنے قابو میں رکھ کر دکھادے۔ کسی مریل جسم کی بجائے کسی صحت مند وجود پر اللہ کی اطاعت کا جھنڈا لہرانا زیادہ کمال کی بات ہے۔ اسلام کا تصور فنائے نفس (self-annihilation) کی بجائے ضبط نفس (self-control) کا ہے۔

اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ساری زندگی روزہ رکھا، اس نے روزہ ہی نہیں رکھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم

ﷺ نے مجھ سے کہا:

«إِنَّكَ لَتَصُومُ الدَّهْرَ، وَتَقُومُ اللَّيْلَ؟»، فَقُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: «إِنَّكَ إِذَا فَعَلْتَ ذَلِكَ هَجَمْتَ لَهُ الْعَيْنُ، وَنَفِهَتْ لَهُ النَّفْسُ، لَا صَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ، صَوْمَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ صَوْمَ الدَّهْرِ كُلِّهِ»، قُلْتُ: فَإِنِّي أُطِيقُ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ، قَالَ: «فَصُمْ صَوْمَ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، كَانَ يَصُومُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا، وَلَا يَفِرُّ إِذَا لَاقَى»¹

”مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم روزانہ روزہ رکھتے ہو اور ساری رات قیام کرتے ہو۔ میں نے کہا: جی ہاں، ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری آنکھیں کمزور ہو جائیں گی اور نفس بوجھل ہو جائے گا۔ اور جس نے روزانہ روزہ رکھا، اس کا کوئی روزہ نہیں ہے۔ مہینے میں صرف تین روزے رکھ لو، اس کا ثواب ایسا ہی ہے کہ جیسے تم نے ہمیشہ روزہ رکھا۔ میں نے کہا: مجھے تین روزوں سے زیادہ کی طاقت حاصل ہے۔ آپ نے فرمایا: تو پھر داؤد علیہ السلام کا روزہ رکھ لو کہ وہ ایک دن افطار کرتے تھے اور ایک دن روزہ رکھتے تھے اور میدان جنگ سے فرار نہیں ہوتے تھے۔“

پس مسلسل کم کھانا اگر عبادت کی نیت اور طریقے یعنی روزے کے ذریعے سے بھی ہو تو پھر بھی ناپسندیدہ عمل ہے۔ چونکہ لگاتار روزہ رکھنے سے نفس بھوکا رہنے کا عادی ہو جاتا ہے لہذا مجاہدہ یعنی نفس سے کشمکش بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ مجاہدہ تو اس وقت ہوتا ہے جبکہ خواہش برقرار ہو اور جبلت قائم ہو۔ جب آپ نے خواہش ہی کو مار دیا اور جبلت کو ختم کر دیا اور بھوکے رہنے کو عادت بنا لیا تو اب کیا مجاہدہ رہا؟

اور اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے زیادہ کھانے کو ناپسند فرمایا ہے اور کہا کہ کافر سات آنتوں سے کھاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص بہت زیادہ کھانا کھاتا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا کھانا کم ہو گیا۔ جب اللہ کے نبی ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

¹ صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب صَوْمُ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، 40/3

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ يَأْكُلُ فِي مَعَى وَاحِدٍ، وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ»¹

”یقیناً مومن ایک آنت سے کھاتا ہے جبکہ کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔“

اعتدال یہ ہے کہ خواہش کے مطابق بقدر ضرورت کھانا کھائے اور اس پر اللہ کا دل سے شکر ادا کرے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی کو حالات کے تحت خواہش کے مطابق یا بقدر ضرورت کھانا میسر نہ ہو جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ہاں دو دواہ چولہا نہیں جلتا تھا۔ تو ایسا واقعی طور تھا نہ کہ شرعی تقاضا تھا یعنی آپ اس پر عمل دینی حکم سمجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ تقدیر سمجھ کر صبر فرماتے تھے۔

کم کھانا یہ ہے کہ کھانا میسر ہو اور انسان خواہش یا ضرورت کے بقدر اس میں سے نہ لے تا کہ اپنی شہوت کو توڑ سکے تو ایسے کسی عمل کا ثبوت ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی سے نہیں ملتا ہے۔ کھانا کم کھا کر اپنی لذت کو توڑنے کی نسبت زیادہ مجاہدہ اس میں ہے کہ کھانا خواہش کے مطابق بقدر ضرورت کھا کر اللہ کا شکر ادا کرے۔ اگر ہمیں دل سے شکر ادا کرنا آجائے تو پھر شاید کم کھانے سے جو کیفیات حاصل ہوتی ہیں، تو معتدل طریقے سے کھانا کھا کر شکر ادا کرنے سے حاصل ہونے والے احوال ان پر غالب آجائیں۔ اگر انسان کھانا کھانے کے بعد اللہ کا دل سے شکر ادا کرے گا تو اللہ سے مزید بہتر کھانا طلب کرے گا تا کہ اللہ کا اور بھی شکر گزار بندہ بن سکے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا أَكَلْ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهِ، وَأَطْعِمْنَا خَيْرًا

مِنْهُ، وَإِذَا سَقَى لَبَنًا فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهِ، وَزِدْنَا مِنْهُ»²

”جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو یہ کہے: اے اللہ! ہمارے اس کھانے میں برکت ڈال دے اور ہمیں اس سے بھی بہتر کھانا کھلا۔ اور جب کسی کو دودھ پلایا جائے تو وہ یہ کہے: اے اللہ! ہمارے لیے اس دودھ میں برکت ڈال دے اور ہمیں اور بھی زیادہ عطا فرما۔“

¹ صحیح البخاری، کتاب الأطعمة، باب: الْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مَعَى وَاحِدٍ، 7/27

² سنن أبي داود، کتاب الأشربة، باب مَا يَقُولُ إِذَا شَرِبَ اللَّبَنَ، 3/339

اسی طرح سونے میں بھی افراط و تفریط نہیں بلکہ اعتدال مطلوب ہے اور ضرورت کے بقدر سونا چاہیے۔ ایک عام آدمی کے لیے اطبا کے نزدیک سات گھنٹے کی نیند لینا معتدل نیند کہلاتا ہے۔ باقی عمر، پیشے، کاروبار، صحت اور حالات کی نسبت اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کی حالت میں اونگھ طاری ہونے پر امت کو یہ حکم دیا ہے کہ پہلے نیند پوری کرو اور پھر نماز پڑھو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلْيَنَمْ، حَتَّى يَعْلَمَ مَا يَقْرَأُ»¹

”جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں اونگھے تو اسے جاگے کہ وہ پہلے سو جائے

اور اس وقت نماز پڑھے جبکہ اسے معلوم ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔“

گویا کہ نماز جیسی عبادت بھی نیند کی ضرورت پوری کیے بغیر مطلوب نہیں رہتی۔ اب یہ علیحدہ امر ہے کہ ایک شخص کو نیند ہی کم آتی ہے تو اسے ہمیں قلت منام نہیں کہیں گے۔ قلت منام یہ ہے کہ آپ اپنی ضرورت کی نیند کو اپنے نفس پر جبر کر کے کم کریں تاکہ آپ اس وقت کو اللہ کی عبادت میں گزار سکیں تو یہ دین میں مطلوب (required) نہیں ہے جیسا کہ روایت اوپر گزر چکی اور اس معنی میں کئی ایک اور روایات بھی موجود ہیں۔

جہاں تک قلت کلام کی بات ہے تو نہ تو زیادہ کلام کرنا ممنوع (prohibited) ہے اور نہ ہی کم گفتگو کرنا مطلوب ہے۔ اصل چیز خیر و شر ہے۔ اگر کوئی صاحب خیر، نیکی، تقویٰ کے بیان میں زیادہ گفتگو کرتے ہیں تو وہ کم گفتگو کرنے والے سے افضل ہیں۔ اسی طرح شر اور برائی کے ساتھ زیادہ اور کم دونوں طرح گفتگو کرنا ممنوع ہے۔ تو نہ تو زیادہ گفتگو ممنوع ہے اور نہ ہی کم گفتگو مستحسن ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ مجھے یہ امید ہے کہ قیامت والے دن وہ عالم افضل ہوگا جو اپنے علم سے زیادہ وقت کلام کرتا تھا بنسبت اس عالم کے جو اپنے علم کے ساتھ زیادہ دیر خاموش رہتا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص ابواسرائیل کو دھوپ میں کھڑے دیکھا تو صحابہ

¹ صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب الوضوء مِنَ النَّوْمِ، 53/1

کرامِ نبی ﷺ سے پوچھا کہ اس کا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے یہ منت مانی ہے کہ کسی سے گفتگو نہیں کرے گا اور سائے میں نہیں بیٹھے گا اور مسلسل روزے سے رہے گا۔ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے کہا:

«مُرُّهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَفْعُدْ، وَلْيَتِمَّ صَوْمُهُ»¹

”اس شخص سے کہو کہ یہ بات چیت کرے۔ اور سائے میں بیٹھے۔ اور اپنا روزہ کھول دے۔“

ایک روایت کہ جسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے ”حسن“ کہا ہے، کے الفاظ ہیں:

«رحم الله عبدا قال فغنم، أو سكت فسلم»²

”اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے کہ جس نے خیر کی بات کی اور فائدہ حاصل کیا یا شر کی بات کرنے سے خاموش رہا اور بچا رہا۔“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«إملاء الخیر خیر من الصمت، والصمت خیر من إملاء الشر»³

”خیر کا پھیلانا، خاموش رہنے سے بہتر ہے اور خاموش رہنا، شر کو عام کرنے سے بہتر ہے۔“

اسی طرح میل جول زیادہ یا کم رکھنا اصل نہیں ہے جبکہ اصل وہ رویے اور اخلاق (behaviors and attitudes) ہیں جنہیں میل جول میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے زیادہ اختلاط کو کم اختلاط کی نسبت پسند فرمایا ہے۔ ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ، وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ، وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ»⁴

”وہ مومن جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے اذیت پہنچنے

¹ صحیح بخاری، کتابُ الأیمانِ والثُّبُورِ، بابُ الثُّدْرِ فِيمَا لَا يَمْلِكُ وَفِي مَعْصِيَةِ، 143/8

² الألبانی، محمد ناصر الدین، بن الحاج نوح بن نجاتی بن آدم الأشقودری، سلسلة الأحادیث الصحیحة وشیء من فقهها وفوائدها، مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض، 1995ء، 510/2

³ الجاحظ، عمرو بن بحر الليثی، البیان والتبيين، دار ومكتبة الهلال، بيروت، 1423 هـ، 78/2

⁴ سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصُّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، 1338/2

پر اس پر صبر کرتا ہے تو وہ اجر و ثواب میں اس مومن سے افضل ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا اور ان کی طرف سے اذیت ملنے پر صبر نہیں کرتا۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں سے اذیت ملنے کی صورت میں اگرچہ اجازت دے دی ہے کہ ان سے میل جول ترک کر دیا جائے لیکن اسے مستحسن (preferred) قرار نہیں دیا۔ مستحسن امر یہی ہے کہ لوگوں سے اختلاط رکھا جائے، چاہے اس میل جول کے نتیجے میں ان کی طرف سے اذیت ہی کیوں نہ پہنچتی ہو لیکن ان رویوں کے ساتھ کہ جو شریعت میں مطلوب ہیں۔

قبرستان کی زیارت

شہروں میں تو خیر اتنا رواج نہیں رہا لیکن دیہی علاقوں میں اب بھی کسی حد تک یہ معمول (practice) جاری ہے کہ لوگ ہفتے یا مہینے میں ایک بار قبرستان میں اپنے پیاروں کی قبروں کی زیارت (visit) کو ضرور جاتے ہیں۔ ایک دفعہ قبرستان میں ایک نوجوان بے خودی کے عالم میں ایک قبر کے سرہانے کھڑے روتے، دعا کرتے اور خود کلامی (soliloquy) کر رہا تھا۔ قبرستان اگرچہ بڑا تھا لیکن اس وقت اس میں تقریباً ۱۰ کا عالم تھا۔ قبرستان سے ایک کچی سڑک کے گزرنے کے سبب سے کوئی مسافر یا راہ گیر کبھی کبھار پاس سے گزر جاتے تھے۔ اس نوجوان کی آواز پر کان دھرنے والوں کے لیے اس میں عجب نصیحت تھی۔ اگرچہ مجھے اس نوجوان کے بعینہ الفاظ تو یاد نہیں لیکن ذیل میں عبارت کی روانی اور سلاست برقرار رکھنے کے لیے ان کا مفہوم بیان کر رہا ہوں۔

اے میرے قبر کے ساتھیو! ہاں، تمہیں اپنا ساتھی نہ کہوں تو کسے کہوں؟ تم ہی تو حقیقی ساتھی ہو۔ کچھ دنوں ہی کی تو بات ہے کہ میں بھی تمہارے پاس یہاں آنے والا ہوں۔ یہیں کہیں، ادھر ادھر، میری بھی قبر بن جائے گی۔ دنیا والوں کا ساتھ تو عارضی ہے اور تمہارے ساتھ تو ایک لمبا عرصہ گزارنا ہے۔ پروردگار تمہاری مغفرت فرمائے۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! مالک تمہیں معاف فرمائے۔ میں تمہیں نہیں جانتا، بس اتنا ہی تعارف ہے کہ ہم سب انسان ہیں اور انسان خطا کار ہے۔ پروردگار تمہیں بھی معاف

فرمائے اور ہمیں بھی جبکہ ہم تم سے آلیں۔ دیکھو! میں تو تمہارے لیے اپنے پروردگار سے دعا ہی کر سکتا ہوں۔ وہ قبول کر لے تو اس کی عطا ہے۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ اگر تمہارے حق میں میری یہ دعا قبول ہو گئی جو میں اخلاص اور گریہ کے ساتھ کر رہا ہوں تو تمہیں بہت خوشی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ جب میں اس دنیا کو چھوڑ کر تمہیں آملوں تو تم سب اہل قبرستان مجھے خوش آمدید کہو۔ جب تمہارے رشتہ دار تمہیں بھلا چکے تھے تو ایک اجنبی نے تمہیں یاد رکھا، اس خواہش پر کہ شاید اسے بھی کوئی یاد رکھے۔

میں نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، صرف دعا ہی تو کی ہے۔ اور اللہ کی قسم! تم مجھ سے بہتر تھے۔ میری دعا کا اگر تمہیں کچھ فائدہ پہنچے تو وہ اس لیے نہیں کہ میں نیک ہوں بلکہ اس لیے کہ پروردگار کو تمہارا بھلا مقصود تھا کہ اس خطا کار کی دعا کو تمہاری مغفرت اور درجات کی بلندی کا ذریعہ بنادیا۔ سب کام تو مالک کے ہی ہیں۔ ہم تو ذریعہ ہیں بلکہ ہم تو ذریعہ بھی اس کی مشیت کے بغیر نہیں بن سکتے۔

اے پروردگار! میری والدہ کی مغفرت فرما۔ یہ وہی تو ہیں جو مجھے اپنے والد کی قبر کی زیارت کے لیے بھیجتی ہیں۔ بہت عرصے بعد ابا جان کی قبر پر آنا ہوا، شاید سالوں بعد۔ چاہے میں قبر پر نہیں آیا لیکن میں نے دعا ضرور کی ہے۔ ہر نماز میں دعا کی بلکہ ہر کسی کو یہ نصیحت کی کہ اپنے والدین کے لیے نماز میں تشہد کی حالت میں ضرور دعا کریں:

﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ [الإسراء: 24]

”اے میرے رب! میرے والدین پر ایسے ہی رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا پوسا۔“

میرے قبر کے ساتھ! دنیا بہت ظالم ہے، اس کی روشنیاں نگاہوں کو خیرہ کرنے والی اور رونقیں دلوں کو غافل کر دینے والی ہیں۔ شہروں کی طرح قبرستانوں کی آبادی بھی آئے روز بڑھ رہی ہے۔ یہ ایسی کالونی ہے کہ کوئی یہاں رہنا نہیں چاہتا لیکن پھر بھی اسے یہاں کا مکین بننا ہے۔ یہ ایسے شہر ہیں کہ کوئی انہیں دیکھنا نہیں چاہتا لیکن یہ ان کی قیامت

تک کی آرام گاہیں ہیں۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! میں نے تو تمہارے لیے اپنے مالک سے مغفرت مانگی ہے اور اپنے لیے تو میں پروردگار سے عاجزی کا طلب گار ہوں۔

یہاں تو زندہ ایک دوسرے کو دعا نہیں دیتے تو مردے کیا کریں گے؟ اللہ ہم سب کو معاف فرمائے۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! اللہ تمہیں بھی فرمائے۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! میں تمہیں بھولا نہیں ہوں۔ بھلا دینے سے بڑھ کر بھی کوئی بے وفائی ہوگی؟ میں بے وفا نہیں ہوں۔ تم ہی تو اُس شہر کے مکین ہو کہ جس میں، میں رہنے جا رہا ہوں۔ دیکھو! جو میں کر سکتا تھا، دعا، سو وہ میں نے کر دی، اب اللہ معاف فرمائے۔ تمہیں بھی اور ہم سب کو بھی۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! اللہ تمہیں معاف فرمائے۔

اس نوجوان کی یہ خود کلامی ابھی جاری تھی کہ میں نے چپکے سے اپنے گھر کی راہ لی۔ اور اس کا ایک جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے اور وہ جملہ ہے: ”اے میرے قبر کے ساتھیو“۔ ہمارے اصل ساتھی تو وہ ہیں جو قبرستانوں میں مدفون ہیں کہ جن کے ساتھ عالم برزخ میں ایک لمبا عرصہ ہم نے گزارنا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: زَارَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْرَ أُمِّهِ، فَبَكَى وَأَبْكَى مَنْ حَوْلَهُ، فَقَالَ: «فَرُودُوا الْقُبُورَ فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ»¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کی۔ پس آپ اتنا روئے کہ آس پاس والوں کو بھی رلا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کہا:.... قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ موت یاد کرواتے ہیں۔“

ایک صحیح اور طویل روایت میں نیک اور بد شخص کی روح قبض کرنے کے احوال یوں بیان فرمائے گئے ہیں:

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فِي جَنَازَةِ رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ، فَأَنْتَهَيْنَا إِلَى الْقَبْرِ، وَلَمَّا يُلْحَدُ، فَجَلَسَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ، كَأَنَّا عَلَى رُءُوسِنَا

¹ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ عز وجل فی زیارة قبر أمه، 671/2

الطَّيْرَ، وَفِي يَدِهِ عُودٌ يَنْكُتُ فِي الْأَرْضِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ، فَقَالَ: «اسْتَغِيثُوا بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ مَرَّتَيْنِ، أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَإِقْبَالٍ مِنَ الْآخِرَةِ، نَزَلَ إِلَيْهِ مَلَائِكَةٌ مِنَ السَّمَاءِ بِيضُ الْوُجُوهِ، كَأَنَّ وُجُوهُهُمْ الشَّمْسُ، مَعَهُمْ كَفَنٌ مِنْ أَكْفَانِ الْجَنَّةِ، وَحَنُوطٌ مِنْ حَنُوطِ الْجَنَّةِ، حَتَّى يَجْلِسُوا مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ، ثُمَّ يَجِيءُ مَلَكُ الْمَوْتِ، عَلَيْهِ السَّلَامُ، حَتَّى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَيَقُولُ: أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ، أَخْرِجِي إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ، قَالَ: فَتَخْرُجُ تَسِيلُ كَمَا تَسِيلُ الْقَطْرَةُ مِنْ فِي السَّقَاءِ، فَيَأْخُذُهَا، فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدْعُوهَا فِي يَدِهِ طَرْفَةً عَيْنٍ حَتَّى يَأْخُذُوهَا، فَيَجْعَلُوهَا فِي ذَلِكَ الْكَفَنِ، وَفِي ذَلِكَ الْحَنُوطِ، وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَأَطِيبِ نَفْحَةٍ مِنْكَ وَجِدْتَ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ قَالَ: فَيَصْعَدُونَ بِهَا، فَلَا يَمُرُّونَ، يَعْنِي بِهَا، عَلَى مَلَأٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ، إِلَّا قَالُوا: مَا هَذَا الرُّوحُ الطَّيِّبُ؟ فَيَقُولُونَ: فُلَانٌ بُنْ فُلَانٍ، بِأَحْسَنِ أَسْمَائِهِ الَّتِي كَانُوا يُسَمُّونَهُ بِهَا فِي الدُّنْيَا، حَتَّى يَنْتَهُوا بِهَا إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيَسْتَفْتَحُونَ لَهُ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ فَيُشَبِّعُهُ مِنْ كُلِّ سَمَاءٍ مَقَرَّبُوهَا إِلَى السَّمَاءِ الَّتِي تَلِيهَا، حَتَّى يَنْتَهَى بِهِ إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ، فَيَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: اكْتُبُوا كِتَابَ عَبْدِي فِي عِلِّيِّينَ، وَأَعِيدُوهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَإِنِّي مِنْهَا خَلَقْتُهُمْ، وَفِيهَا أُعِيدُهُمْ، وَمِنْهَا أُخْرِجُهُمْ تَارَةً أُخْرَى، قَالَ: فَتُعَادُ رُوحُهُ فِي جَسَدِهِ، فَيَأْتِيهِ مَلَكَانِ، فَيَجْلِسَانِهِ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُولُ: رَبِّي اللَّهُ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا دِينُكَ؟ فَيَقُولُ: دِينِي الْإِسْلَامُ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا هَذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِثَ فِيكُمْ؟ فَيَقُولُ: هُوَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَيَقُولَانِ لَهُ: وَمَا عِلْمُكَ؟ فَيَقُولُ: قَرَأْتُ كِتَابَ اللَّهِ، فَأَمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُ، فَيُنَادِي مُنَادٍ فِي السَّمَاءِ: أَنْ صَدَقَ عَبْدِي، فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَأَلْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ، قَالَ: فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا، وَطَبِيبُهَا، وَيُفْسَحُ لَهُ فِي قَبْرِهِ مَدَّ بَصَرِهِ، قَالَ: وَيَأْتِيهِ رَجُلٌ حَسَنُ الْوَجْهِ، حَسَنُ الثِّيَابِ، طَيِّبُ الرِّيحِ، فَيَقُولُ: أَبَشِّرْ بِالَّذِي يَسُرُّكَ، هَذَا يَوْمُكَ الَّذِي كُنْتَ تُوعَدُ، فَيَقُولُ لَهُ: مَنْ أَنْتَ؟ فَوَجَّهْكَ الْوَجْهَ يَجِيءُ بِالْخَيْرِ، فَيَقُولُ: أَنَا عَمَلُكَ

الصَّالِحُ، فَيَقُولُ: رَبِّ أَقِمِ السَّاعَةَ حَتَّى أَرْجِعَ إِلَى أَهْلِي، وَمَالِي. قَالَ: وَإِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَإِقْبَالٍ مِنَ الْآخِرَةِ، نَزَلَ إِلَيْهِ مِنَ السَّمَاءِ مَلَائِكَةٌ سُودُ الْوُجُوهِ، مَعَهُمُ الْمُسُوحُ، فَيَجْلِسُونَ مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ، ثُمَّ يَجِيءُ مَلَكُ الْمَوْتِ، حَتَّى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَيَقُولُ: أَتَيْتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيثَةُ، أَخْرَجِي إِلَى سَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَغَضَبٍ. قَالَ: فَتَفَرَّقُ فِي جَسَدِهِ، فَيَنْتَزِعُهَا كَمَا يُنْتَزَعُ السَّفُودُ مِنَ الصُّوفِ الْمُبْلُولِ، فَيَأْخُذُهَا، فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدْعُوهَا فِي يَدِهِ طَرْفَةً عَيْنٍ حَتَّى يَجْعَلُوهَا فِي تِلْكَ الْمُسُوحِ، وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَأَنَّ رِيحَ جِفَّةٍ وَجِدَتْ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ، فَيَصْعَدُونَ بِهَا، فَلَا يَمُرُّونَ بِهَا عَلَى مَلَأٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ، إِلَّا قَالُوا: مَا هَذَا الرُّوحُ الْخَبِيثُ؟ فَيَقُولُونَ: فَلَانُ بْنُ فَلَانٍ بِأَفْجَحِ أَسْمَائِهِ الَّتِي كَانَ يُسَمِّي بِهَا فِي الدُّنْيَا، حَتَّى يُنْتَهَى بِهِ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيُسْتَفْتَحُ لَهُ، فَلَا يُفْتَحُ لَهُ، ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: {لَا تُفْتَحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ} [الأعراف: 40] فَيَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: اكْتُبُوا كِتَابَهُ فِي سَجِّينٍ فِي الْأَرْضِ السُّفْلَى، فَتُطْرَحُ رُوحُهُ طَرْحًا. ثُمَّ قَرَأَ: {وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ، فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ} [الحج: 31] فَتُعَادُ رُوحُهُ فِي جَسَدِهِ، وَيَأْتِيهِ مَلَكَانِ، فَيَجْلِسَانِهِ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَنْ رُبُّكَ؟ فَيَقُولُ: هَاهُ هَاهُ لَا أَدْرِي، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا دِينُكَ؟ فَيَقُولُ: هَاهُ هَاهُ لَا أَدْرِي، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا هَذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِثَ فِيكُمْ؟ فَيَقُولُ: هَاهُ هَاهُ لَا أَدْرِي، فَيُنَادِي مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ أَنْ كَذَبَ، فَأَفْرِشُوا لَهُ مِنَ النَّارِ، وَافْتَحُوا لَهُ أَبَابًا إِلَى النَّارِ، فَيَأْتِيهِ مِنْ حَرِّهَا، وَسُمُومِهَا، وَيُضَيِّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتَّى تَخْتَلِفَ فِيهِ أَضْلَاعُهُ، وَيَأْتِيهِ رَجُلٌ قَبِيحُ الْوَجْهِ، قَبِيحُ الثِّيَابِ، مُنْتَبِئُ الرِّيحِ، فَيَقُولُ: أَنْبَشْ بِالَّذِي يَسُوءُكَ، هَذَا يَوْمُكَ الَّذِي كُنْتَ تُوعِدُ، فَيَقُولُ: مَنْ أَنْتَ؟ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيءُ بِالْشَّرِّ، فَيَقُولُ: أَنَا عَمَلُكَ الْخَبِيثُ، فَيَقُولُ: رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ»¹.

”حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک

انصاری صحابی کا جنازہ پڑھنے نکلے اور قبر پر پہنچے جبکہ ابھی تک ان کو دفن نہیں کیا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ ایک جگہ بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ کے گردیوں بیٹھ گئے جیسا کہ ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی کہ جس سے آپ زمین کرید رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ہمیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ عذاب قبر سے اللہ کی پناہ مانگو۔ آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ ایسے فرمایا۔ اور پھر فرمایا کہ جب بندہ مومن دنیا سے اپنا تعلق ختم کرنے کو ہوتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے (یعنی مرنے کے قریب ہوتا ہے) تو اس کے پاس آسمان سے نہایت روشن چہرے والے فرشتے اترتے ہیں (جن کے چہرہ کی چمک دمک ایسی ہوتی ہے) گویا کہ ان کے چہرے آفتاب ہیں۔ ان کے ہمراہ جنت کا کفن اور جنت کی خوشبو ہوتی ہے۔ اور وہ (روح نکلنے کے انتظار میں) میت کے سامنے اتنی دور کہ جہاں تک کہ اس کی نگاہ پہنچ سکے، بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں اور میت کے سر کے قریب بیٹھ کر کہتے ہیں کہ اے پاک جان! اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے مغفرت و بخشش اور اس کی خوشنودی کی طرف پہنچنے کے لئے جسم سے نکل! آپ ﷺ نے فرمایا کہ (یہ سن کر) بندہ مومن کی جان (اس کے جسم سے) اس طرح (آسانی اور سہولت سے) نکلتی ہے کہ جس طرح کہ مشک سے پانی کا قطرہ بہہ نکلتا ہے۔ پس ملک الموت اس کی روح کو لے لیتے ہیں۔ جب ملک الموت اسے لے لیتے ہیں تو دوسرے فرشتے اس روح کو ملک الموت کے ہاتھ میں پلک جھپکنے کی دیر بھی نہیں چھوڑتے۔ پس شوق میں فوراً اس روح کو ملک الموت کے ہاتھوں سے لے لیتے ہیں اور اس کو اس کفن اور خوشبو میں کہ جسے وہ اپنے ہاتھ میں لائے تھے، رکھ لیتے ہیں۔ اور اس جان سے وہ خوشبو نکلتی ہے جو روئے زمین پر پائی جانے والی مشک کی بہترین خوشبوؤں میں سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر وہ فرشتے اس روح کو لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں اور فرشتوں کی جس بھی جماعت کے قریب سے گزرتے ہیں تو وہ

جماعت پوچھتی ہے کہ یہ پاک روح کون ہے؟ وہ فرشتے جو اس روح کو لے جا رہے ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ فلاں شخص اور فلاں کا بیٹا ہے۔ اور وہ فرشتے اس کو بہترین نام و لقب سے یاد کرتے ہیں کہ جس کے ذریعہ اہل دنیا اس کا ذکر کرتے ہیں۔ پس وہ فرشتے اس پاکیزہ روح کو لے کر آسمان دنیا پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھولتے ہیں جو ان کے لئے کھول دیا جاتا ہے۔ (اسی طرح ہر آسمان کا دروازہ اس کے لئے کھولا جاتا ہے) اور ہر آسمان کے مقرب فرشتے دوسرے آسمان تک اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ساتوں آسمانوں تک (اسی اعزاز و اکرام کے ساتھ) پہنچا دیا جاتا ہے۔ پس اللہ عز و جل (فرشتوں سے) فرماتا ہے کہ اس بندہ کا نامہ اعمال علیین میں رکھ دو اور اس روح کو زمین کی طرف (یعنی اس کے بدن میں جو زمین میں مدفون ہے) واپس لے جاؤ (تاکہ یہ اپنے بدن میں پہنچ کر قبر کے سوال و جواب کے لئے تیار رہے) کیونکہ بیشک میں نے زمین ہی سے جسم کو پیدا کیا ہے اور زمین ہی میں اس کو واپس بھیجتا ہوں اور پھر زمین ہی سے اس کو دوبارہ نکالوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد وہ روح اپنے جسم میں پہنچا دی جاتی ہے پھر اس کے پاس دو فرشتے (یعنی منکر نکیر) آتے ہیں جو اسے بٹھلاتے ہیں۔ اور پھر سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ بندہ مومن جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ پھر وہ پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے۔ پھر وہ پوچھتے ہیں کہ یہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) کون ہیں؟ جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے، وہ جواب دیتا ہے کہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم نے کیسے جانا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب کو پڑھا، اس پر ایمان لایا اور دل سے اسے سچ جانا (جس کی وجہ سے مجھے آپ ﷺ کا رسول ہونا معلوم ہوا)۔ پھر ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے کہ میرا بندہ سچا ہے، اس کے لئے جنت کا بستر بچھاؤ، اسے جنت کا لباس پہناؤ اور اس کے لئے جنت کی طرف کا دروازہ کھول دو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی طرف جنت کا دروازہ

کھول دیا جاتا ہے کہ جس سے اسے جنت کی ہوا اور خوشبو آتی رہتی ہے۔ پھر اس کی قبر کو حد نظر تک کشادہ کر دیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد اس کے پاس ایک خوبصورت شخص اپچھے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ خوشخبری ہو تجھے اس چیز کی جو تجھے خوش کرنے والی ہے۔ آج وہ دن ہے جس کا (دنیا میں) تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ بندہ مومن اس سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ تمہارا چہرہ حسن و جمال میں کامل ہے اور تم بھلائی کو لائے ہو اور اس کی خوشخبری سناتے ہو۔ وہ شخص جواب دے گا کہ میں تیرا نیک عمل ہوں (جو اس شکل و صورت میں آیا ہوں)۔ آج وہ دن ہے جس کا (دنیا میں) تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا بندہ مومن (یہ سن کر) کہے گا کہ اے میرے پروردگار! قیامت قائم کر دے تاکہ میں اپنے اہل و عیال کی طرف جاؤں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کافر دنیا سے اپنا تعلق ختم کرنے اور آخرت کی طرف جانے کو ہوتا ہے (یعنی اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے) تو اس کے پاس سے آسمان سے (عذاب کے) سیاہ چہروں والے فرشتے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ ٹاٹ ہوتا ہے اور وہ اتنی دور کہ جہاں تک نگاہ پہنچ سکے، بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آتا ہے اور اس کے سر کے قریب بیٹھ کر کہتا ہے کہ اے خبیث جان! اللہ کی طرف سے عذاب (بتلا کئے جانے کے لئے جسم سے باہر) نکل! آپ ﷺ نے فرمایا کہ (کافر کی روح یہ سن کر) اس کے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ ملک الموت اس روح کو سختی اور زور سے باہر نکالتا ہے جیسا کہ گیلے کاٹن کے کپڑے سے کانٹے دار جھاڑی کو کھینچا جاتا ہو۔ جب ملک الموت اس روح کو پکڑ لیتا ہے تو دوسرے فرشتے اس روح کو ملک الموت کے ہاتھ پلک جھپکنے کی دیر بھی نہیں چھوڑتے بلکہ اسے لے کر ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں۔ اس روح میں سے ایسے (سڑے ہوئے) مردار کی بدبو نکلتی ہے جو روئے زمین پر پایا جائے۔ وہ فرشتے اس روح کو لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں چنانچہ جب وہ فرشتوں کی کسی جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ جماعت پوچھتی ہے

کہ یہ ناپاک روح کون ہے؟ وہ فرشتے جو اسے لے جا رہے ہوتے ہیں، جواب دیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا بیٹا ہے۔ اور اس کے برے نام اور برے اوصاف کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ جن ناموں اور اوصاف کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اسے آسمان دنیا تک پہنچا دیا جاتا ہے اور اس کے لئے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا جاتا ہے تو اس کے واسطے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی کہ ان کافروں کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس روح کا اعمال نامہ سحین میں لکھ دو، جو سب سے نیچے کی زمین ہے۔ پس کافر کی روح (نیچے) پھینک دی جاتی ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، وہ ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑا اور اسے پرندے اچک لیتے ہیں یا ہوا اسے اٹھا کر کہیں دور پھینک دیتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی روح اس کے جسم میں واپس لوٹا دی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہا ہا! میں نہیں جانتا۔ پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہا ہا! میں نہیں جانتا۔ پھر وہ فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں کہ یہ شخص (یعنی نبی کریم ﷺ) جو تمہارے درمیان بھیجے گئے تھے کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ ہا ہا! میں نہیں جانتا۔ (اس سوال و جواب کے بعد) پکارنے والا آسمان کی طرف سے پکار کر کہتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے لہذا اس کے لئے آگ کا بچھونا بچھاؤ اور اس کے لئے دوزخ کی طرف کا دروازہ کھول دو۔ چنانچہ (اس کے لئے دوزخ کی طرف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے) جس سے اس کے پاس دوزخ کی گرمی اور اس کی گرم ہوا آتی رہتی ہے اور اس کے لئے اس کی قبر اس پر اس قدر تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر نکل جاتی ہیں۔ پھر اس کے پاس ایک بد صورت

شخص آتا ہے جو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہوتا ہے اور اس سے بدبو آ رہی ہوتی ہے۔ اور وہ اس سے کہتا ہے کہ تو وہ بری خبر سن، جو تجھے رنج و غم میں مبتلا کر دے کہ آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے (دنیا میں) وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ پوچھتا ہے کہ تو کون ہے؟ تیرا چہرہ انتہائی برا ہے جو برائی لئے ہوئے آیا ہے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ میں تیرا برا عمل ہوں۔ (یہ سن کر) وہ مردہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار قیامت قائم نہ کیجیے۔“

سچا واعظ

آج کل بہت کم واعظ ایسے ہیں کہ جن کا وعظ انسان کی باطنی زندگی کو تبدیل کرنے میں کوئی کردار ادا کرے۔ لیکن خالق نے جس طرح ہر بستی کو ایک ہادی (guide) عنایت فرمایا، اسی طرح ہر شخص کو ایک سچا واعظ (preacher) بھی دیا ہے۔ یہ واعظ ایسا ہے کہ جس نے جب بھی اس کا وعظ سنا، اس نے اس کے دل کو نرم اور آنکھوں کو نرم کر دیا۔ اس واعظ کا وعظ مجلس میں ہو یا تنہائی میں، اس سے پیدا ہونے والی کیفیات اور احوال ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واعظ اپنے قول میں سچا ہے۔ یہ جو بات کرتا ہے، سچ کرتا ہے۔

اس نے جب بھی جسے وعظ کیا، وہ رو پڑا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ وعظ کرے اور دل پر اثر نہ ہو۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اس کا وعظ سننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ہم اپنے اندر کی تبدیلی سے ڈر رہے ہوتے ہیں کیونکہ اس کے وعظ کا محض سن لینا ہی گویا ہماری تبدیلی کو میرا مقدر بنا دیتا ہے۔ اگر ہمارے جی میں اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا عزم پیدا ہو جائے اور ہم اس واعظ کی باتوں پر کان دھرنے لگ جائیں تو تزکیہ ہماری تقدیر بن جائے۔ یہ واعظ کون ہے؟ یہ ”موت کا واعظ“ ہے۔ اس نے جب بھی کسی کو وعظ کیا، خوب رلایا۔

یہ کبھی ہماری تنہائیوں میں ہمارے پاس آتا ہے، جب ہم رات گئے اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹے ہوتے ہیں، کسی کو اس کے آنے کی خبر نہیں ہوتی، بیوی بچوں کو بھی

نہیں۔ یہ ہم سے سرگوشیاں کرتا ہے، ہمیں ہماری منزل دکھاتا ہے، قبر کی منزل۔ اور کبھی کبھار ہم اس کے وعظ کے لیے کچھ زیادہ وقت نکال پائیں تو ہمیں یہ بھی دکھا دیتا ہے کہ تمہارے عالم برزخ میں منتقل ہو جانے کے ایک آدھ ماہ بعد ہی ہمارے والدین، بہن بھائی، بیوی بچے اور دوست احباب ہمارے بارے کیا سوچتے اور باتیں کرتے ہوں گے؟ ان کی کیا سرگرمیاں (activities) ہوں گی؟ دنیا میں ہمارا تذکرہ کس قدر باقی رہ جائے گا؟

کبھی کبھار جبکہ ہم بہت خوش ہوں تو اس کی آمد پر جھلا اٹھتے ہیں۔ ہم اسے کہتے ہیں بھئی! یہ دنیا بہت خوبصورت ہے، ہمیں زندہ رہنا ہے، اور نہ سہی ہم اپنے پروردگار کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جہاد زندگانی کا مزامت خراب کرو۔ وہ ہماری بات کا برا نہیں مناتا، البتہ ہم اس کی اس اذیت کو محسوس کر سکتے ہیں جو شاید کسی اپنے کی بیوقوفی پر ہوتی ہے۔ ہمارے اس رد عمل پر وہ اپنے وعظ کو پھر کسی وقت تک کے لیے موخر کر دیتا ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اسے ہم سے محبت ہے اور اس کی محبت سچی ہے اور اسی محبت کو سچ کر دکھانے کے لیے وہ ایک دن ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اپنے ساتھ لے جائے گا، ایک دوسرے عالم میں، ایک دوسری دنیا میں، جسے ہم عالم برزخ کہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«كَفَى بِالْمَوْتِ وَاعْظًا، وَكَفَى بِالْيَقِينِ غَنًى، وَكَفَى بِالْعِبَادَةِ شُغْلًا»¹

”موت واعظ ہونے کے اعتبار سے، یقین غنی کے اعتبار سے اور عبادت

مصرفیت کے اعتبار سے کافی ہے۔“

قبرستان کی زیارت کے علاوہ ہسپتالوں کی زیارت بھی ایمان میں اضافے، آخرت کی یاد اور اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا باعث ہے۔ ان لوگوں کی زیارت بھی بہت مفید ہے جو موت کی دہلیز پر ہوں کہ ان کی صحبت ہمیں ایسے احوال نصیب کر سکتی ہے جو شاید بڑے بڑے بزرگوں کی صحبت سے حاصل نہ ہو سکیں۔ ہمارے دوست عظیم الرحمن

¹ عبد اللہ بن المبارک الخططی، الزهد والرفائق لابن المبارک، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 37/2

عثمانی صاحب اس بارے فرماتے ہیں:

”آج میں آپ کو ایک قیمتی راز کی بات اس نیت سے بتاتا ہوں کہ شاید کسی قاری کو عمل کی توفیق حاصل ہو۔ ایک ایسا عمل جس کے انمول ہونے کی پورے شرح صدر سے گواہی دیتا ہو۔ آپ کے وہ عزیز واقارب جو بڑھاپے کی آخری دہلیز کو چھوچکے ہیں یا کسی جان لیوا بیماری میں عرصے سے مبتلا ہیں، ان احباب کی ایک فہرست مرتب کر لیں۔ اب ایک ایک کر کے ان سب کے پاس وقت گزارنے کا اہتمام کیجیے۔ کم از کم ایک پورا دن ان میں سے ہر ایک کے ساتھ گزاریے۔ اس ملاقات میں آپ نے بولنا بہت کم ہے اور سننا بہت زیادہ ہے۔ انہیں موقع دیجیے کہ وہ آپ کو اپنی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات سنائیں۔ آپ بس پوری توجہ سے ان کی بات سمجھیں اور بحث میں پڑے بغیر محبت سے موزوں سوالات کیجیے۔ ان سے دریافت کریں کہ بڑھاپے یا اس مہلک بیماری سے انہیں کیا کیا سبق حاصل ہوئے؟ اور آخر میں پورے خلوص سے ان سے درخواست کریں کہ وہ آپ کو کوئی ایسی نصیحت کریں جو آپ کی کردار سازی یا دین کے لئے معاون ہو۔ واپسی پر جو کچھ سنایا سیکھا اسے کاغذ اور ذہن دونوں کی تختیوں پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر لیجیے۔ اسی طرح وہ بے ضرر سے پاکیزہ نفوس جو آپ کے حلقہ احباب میں موجود ہیں اور جو نصیحتیں کرنے کی بجائے خاموشی سے دین پر عمل پیرا رہتے ہیں، ان کے پاس بھی اسی طرح وقت گزاریے اور ان سے کم از کم ایک نصیحت خاص اپنے لئے حاصل کیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے دیانت داری سے اس عمل کو اپنایا تو حکمت کا ایسا بیش بہا خزانہ حاصل ہو گا اور وہ قیمتی ترین نصیحتیں نصیب ہوں گی جو شاید عمر بھر کی ریاضت بھی نہ دے پاتی۔“¹

اپنائیت کی سوچ

عموماً لوگ اپنی پرانی ملازمت کو چھوڑ کر نئی تقرری (joining) سے لطف اندوز

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

(enjoy) ہوتے ہیں لیکن اپنے پرانے گھر سے نئے گھر یا پرانے شہر سے نئے شہر میں منتقلی انسان کو اداس کر دیتی ہے۔ اگر ہم غور کریں تو محسوس ہو گا کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے ہمارا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری اپنی ہیں جیسا کہ گھر، شہر یا پالتو جانور وغیرہ۔ ان چیزوں سے ایسی مانوسیت پیدا ہو جاتی ہے کہ نیا گھر اگرچہ پرانے گھر سے بہتر ہی کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی ایک وقت تک تعلق پرانی چیز سے ہی قائم ہی رہتا ہے جبکہ اس کے برعکس کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے ہمارا احساس یہ نہیں ہوتا کہ یہ ہماری اپنی ہیں جیسا کہ ملازمت میں ہم ملازم ہوتے ہیں اور خدمات فراہم کرتے ہیں لہذا ملازمت چھوڑتے ہوئے کسی شخص کو اپنے ادارے سے، چاہے اس میں دس سال ملازمت کی ہو، وہ اداسی نہیں ہوتی جو اسے اپنا وہ گھر چھوڑنے سے ہوتی ہے کہ جس میں اس نے دس سال گزارے ہوں۔

یہی حال اس دنیا کا بھی ہے۔ جب ہم اسے اپنا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو موت کا سامنا مشکل لگتا ہے بلکہ اس سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ یہاں سے دوسری دنیا میں منتقلی کا احساس ہی اداسی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر دنیا کے ساتھ ہمارا تعلق ویسا قائم ہو جائے جیسا کہ ہمارا اس ادارے سے قائم ہوتا ہے، جس میں ہم ملازمت کرتے ہیں تو شاید اس دنیا کو چھوڑنے پر ہمیں اداسی کی کیفیت نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ اور ایسا تعلق ضرورت کا تعلق کہلاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ غَائِرٌ سَبِيلٍ»¹

”دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر۔“

احادیث کی کتابوں میں ”الرفاق“ کے عنوان کے تحت جتنی احادیث بیان ہوتی ہیں، ان کا خلاصہ ترک دنیا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ دنیا سے ضرورت کا تعلق قائم رکھو۔ ٹشو پیپر ایک ضرورت کی اور استعمال کی معمولی شے ہے۔ اگر ضائع ہو جائے تو افسوس نہیں ہوتا اور اگر کوئی مانگ لے گا تو اسے دیتے ہوئے تکلیف نہیں ہوتی کہ بہت ہی معمولی شے

¹ صحیح البخاری، کتاب الرفاق، باب قَوْلِ النَّبِيِّ «كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ غَائِرٌ سَبِيلٍ»، 8/89

ہے۔ پس دنیا کی حیثیت بھی مومن کے دل میں اتنی ہی ہوتی ہے کہ جتنی ایک عام انسان کی نظر میں ٹشو پیپر کی حیثیت ہوتی ہے۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ جب اٹھ کر بیٹھے تو آپ کے پہلو پر چٹائی کے نشانات تھے۔ یہ دیکھ کر بعض صحابہ نے آپ کے لیے ایک نرم بستر بنانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا لِي وَلِلدُّنْيَا، مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَائِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا»¹

”مجھے اس دنیا سے کیا لینا دینا۔ میرا تو اس دنیا سے صرف اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ایک گھڑسوار کا کسی درخت سے کہ جس نے اس درخت کے سائے میں کچھ دیر آرام کیا ہو اور پھر آگے چل پڑا ہو۔“

ٹوپی

ٹوپی کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بنگالی ٹوپی، ترکی ٹوپی، افریقی ٹوپی، سندھی ٹوپی، جالی دار ٹوپی، جناح کیپ وغیرہ۔ شاید ٹوپی کی جتنی قسمیں ہیں، اتنی ہی باتیں اس کے فوائد اور نقصانات کے بارے بھی کی جاسکتی ہیں۔

ٹوپی پہننا ایک دوست کا معمول تھا لیکن ان کی اہلیہ کو پسند نہ تھا اور وہ ان کی ٹوپی غائب کر دیتی تھیں۔ اس عمل سے انہیں کافی چڑان (irritation) ہوتی تھی کیونکہ انہیں مدرسہ اور دینی حلقوں میں درس و تدریس کرنی ہوتی تھی اور مدرسہ و تحریک اسلامی کے ماحول میں استاذ اور مبلغ کے سر پر ٹوپی نہ ہونا باعث عار سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اس مسئلے میں اہلیہ سے الجھنا مناسب نہ سمجھا، وہ ٹوپیاں غائب کرتی گئیں اور وہ خریدتے چلے گئے۔ اس طرح ٹوپی پہننے کے عمل کو مجاہدہ سمجھ کر ایک مہینے میں تین تین ٹوپیاں بھی خریدتے رہے۔

ایک وقت آیا کہ انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ میں ٹوپی کیوں پہنتا ہوں؟ تو

¹ سنن الترمذی، أبواب الزهد، 588/4

یہ جواب ملا کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا دیندار حلقوں میں ہوتا ہے جہاں سب یا اکثر نے ٹوپی پہنی ہوتی ہے۔ وہاں کا مذہبی رواج ٹوپی پہننے کا تقاضا کرتا ہے اور ان کا ٹوپی نہ پہننا انہیں اس ماحول میں اجنبی بنادیتا ہے۔ اور یہ اجنبیت ایسی تھی جسے لوگ ناپسند کرتے تھے اور بعض تو اس کا اظہار بھی کر دیتے کہ آپ ٹوپی کیوں نہیں پہنتے یا نصیحت کرنے والے اگر عمر میں بڑے ہوتے تو ٹوپی پہننے کو سنت قرار دیتے ہوئے اس سنت پر عمل کی تاکید بھی فرما دیتے۔ بہر حال اب کافی سوچ بچار کے بعد انہیں ٹوپی پہننے یا نہ پہننے میں کوئی حساسیت نہیں ہے۔ پہننا اس لیے درست سمجھتے ہیں کہ دین دار لوگوں کا عرف ہے اور نہ پہننا اس لیے مفید کہ اصلاح نفس میں اس کا بڑا کردار ہے۔

ٹوپی پہننا تو شاید مذہبی لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آجائے لیکن ٹوپی نہ پہننا انسان کی اصلاح کا کیسے ذریعہ بن سکتا ہے؟ یہ مذہبی طبقے کو سمجھانا واقعتاً مشکل کام ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے جسے بھی زبان و بیان کی کچھ صلاحیت دی ہو اور وہ کہیں درس قرآن کا حلقہ قائم کریں یا اصلاحی مجلس لگائیں یا کوئی عربی کلاس لینا شروع کریں تو ان کے ارد گرد آہستہ آہستہ ایک حلقہ بننا شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک تو مدرس اور خطیب کے مرید بھی بن جاتے ہیں اور کسی مدرس، مصلح یا خطیب کو بگاڑنے کے لیے ایک مرید بھی کافی ہوتا ہے۔ ان مریدوں میں سے کوئی آپ کی جوتیاں سیدھی کرنا شروع کر دیتا ہے اور کوئی آپ کے وعظ و تدریس کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آمیز باتیں کہنا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی آپ کو نمونہ بنانا (idealize) شروع کر دیتا ہے اور کوئی آپ کے افکار کا مبلغ بلکہ ”جیالا“ بننے کو تیار بیٹھا ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں کسی کو بطور مدرس یا مبلغ یہ احساس ہو سکتا ہے کہ اب وہ صاحب اپنی چرب زبانی سے کوئی علیحدہ مخلوق لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور لوگوں کی نظر میں شیخ اور مرشد بن گئے ہیں۔ پس ایسے میں ہمیں اپنا حلیہ مذہبی نظر آنے والے لوگوں کی بجائے عام مسلمانوں جیسا اختیار کرنا چاہیے تاکہ لوگ ہمیں وہی سمجھیں جو ہم حقیقت میں ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم عام لوگوں کے جیسے انہی میں سے ایک ہیں۔ میں

نے یہ عجب محسوس کیا ہے کہ اگر استاذ یا شیخ، واعظ یا خطیب اپنے مریدین کے حلقے میں ٹوپی اتار دے تو یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اس نے اپنے نفس پر پڑی تقدس کی چادر اتار دی ہے اور اگر آپ شلوار قمیص کی بجائے سوٹ پہن لیں تو پھر تو لوگ شاید آپ کے نیک ہونے میں بھی شبہ کرنا شروع کر دیں۔

ہماری اس تحریر پر دوستوں کی طرف سے مختلف قسم کے رد عمل ملے۔ بعض نے کہا کہ ڈاڑھی بھی تو مذہبی حلیہ ہے تو کیا اس کو بھی ترک کر دیں؟ تو ہماری رائے یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنا ایک دینی حکم ہے اور اس حلیے کو دینی حلیہ کہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک حلیہ ایسا ہے کہ جو دینی تو نہیں لیکن مذہبی لوگوں نے اسے اختیار کیا ہوا ہے مثلاً پاکستان میں اہل حدیث سر پر سرخ رومال رکھتے ہیں یا چونو اوڑھتے ہیں۔ تبلیغی جماعت اور تصوف کے حلقوں میں عمامہ باندھتے ہیں یا سفید کرتا پہنتے ہیں وغیرہ۔ اس قسم کے مذہبی حلیے کے بارے ہمارے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ لوگوں کے نزدیک تقویٰ کا معیار یہی ظاہری حلیہ بن چکا ہے جبکہ تقویٰ کا اصل مقام انسان کا دل ہے۔

اب اسی پر غور کر لیں کہ ایک شخص شلوار کرتا پہن کر، سفید عمامہ باندھ کر، موزے پہن کر اور جیب میں مسواک رکھ کر اچھا خاصا عالم دین یا ولی اللہ معلوم ہوتا ہے جبکہ واسطہ پڑنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو عالم دین ہے اور نہ ہی اللہ کا ولی۔ کیا یہ دھوکہ نہیں ہے کہ آپ اپنے ظاہر سے اتنے نیک معلوم ہوں جو آپ حقیقت میں نہ ہوں؟ اس لیے بعض لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ عمامہ باندھ کر عام لوگوں میں اللہ کا ولی دکھائی دیں۔ عرب معاشرے میں تو عمامہ ایک رواج تھا لہذا وہاں نہ باندھنے والا اجنبی تھا۔ پس لباس کے مسائل میں جہاں دین کا کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے تو وہاں مسلم معاشروں کے رواج کا لحاظ رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور جہاں دین کا کوئی واضح حکم موجود ہو تو وہاں حکم پر عمل ہو گا اور معاشرے کے رواج کی پرواہ نہ ہو گی۔ یہ ایک سوچ ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس بارے دوسری رائے پر بھی غور کرتے رہنا چاہیے۔

اور اہم تر بات یہ ہے کہ کسی معاشرے میں کسی قسم کے لباس اور حلیے مروج ہوتے

ہیں۔ ان میں سے ایک شرفا کا لباس ہوتا ہے جبکہ دوسرا صلحا کا۔ ہمیں شرفا کا لباس ضرور اختیار کرنا چاہیے کہ یہ دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے لیکن صلحا کا لباس اختیار کرتے وقت پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کیا میں اس لباس کے اہل بھی ہوں یا نہیں؟ کیا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں صلحا کا لباس اختیار کر کے زیادہ صالح نظر آنے کی لاشعوری کوشش کر رہا ہوں؟ ان سب باتوں پر غور کرنا ایک دینی ذمہ داری ہے کہ روایات میں شہرت کا لباس پہننے سے منع کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ لَبَسَ ثَوْبَ شَهْرَةٍ أَلْبَسَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ»¹

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے شہرت کا لباس پہنا تو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اسے ذلت کا لباس پہنائیں گے۔“

اور شہرت کے لباس سے مراد وہ لباس ہے کہ جس کے پہننے سے مقصود دنیاوی شہرت ہو یا دینی۔ یعنی دنیا کے معاملے میں لوگوں پر اس لباس کے ذریعے فخر کرے کہ اس جیسا قیمتی اور نایاب لباس کسی کا نہیں ہے یا دین کے معاملے میں اس لباس کے ذریعے شہرت حاصل کرے کہ لوگ اس کے لباس کے سبب اسے مفتی، فقیہ، قاضی، پیر اور مرشد سمجھیں۔

ایک اور اہم تر بات یہ ہے کہ مذہبی طبقے میں کسی کی نیکی اور تقویٰ کو ماپنے کے کل معیارات ڈاڑھی اور حجاب بن چکے ہیں۔ بلاشبہ ڈاڑھی اور حجاب کسی کی نیکی ماپنے کا ایک معیار تو ہے لیکن کل معیار نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایمان کی ستر سے اوپر شاخیں بیان فرمائی ہیں کہ جس کا معنی ہے کہ ایمان ستر سے زائد صورتوں میں کسی شخص میں پایا جاسکتا ہے۔ اب ایمان کا کل معیار اگر ڈاڑھی اور حجاب کو بنالیا جائے گا تو اس سے دین کا تصور مسخ ہو جائے گا۔ ہم روزمرہ زندگی میں بہت سے ایسے مردوں اور عورتوں کو ملتے ہیں یا جانتے ہیں کہ جن کے ڈاڑھی نہیں ہے یا حجاب نہیں ہے لیکن ان میں ایمان

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب مَنْ لَبَسَ شَهْرَةً مِنَ الثِّيَابِ، 1192/2

اور عمل صالح کی بہت سی ایسی شاخیں اور صورتیں پائی جاتی ہیں جو ڈاڑھی اور حجاب والوں میں نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایسے لوگوں میں اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ہوگی اور یہ بہت ہی قیمتی متاع ہے کہ جس کی قدر کرنی چاہیے۔ بعض میں بہت زیادہ صدقہ، خیرات کرنے کی عادت ہوگی اور بعض نماز، روزے کے بہت پابند ہوں گے وغیرہ۔

ٹوپی اتار کر اپنی اصلاح کرنا ایک عام شخص سے متعلق نہیں ہے بلکہ شیخ یا واعظ کے لیے ہے۔ بعض اوقات کچھ افراد ہمارے کسی درس یا وعظ سے متاثر ہو کر ہمیں نمونہ بنانا (idealize) شروع کر دیں تو ہمیں اپنے دل میں بہت ندامت ہونی چاہیے کہ معلوم نہیں یہ ہمیں کیا سمجھے جارہے ہیں؟ ایک مدرس کا کہنا ہے کہ ایسے میں مجھے سمجھ نہیں آتی کہ انہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ انہوں نے اپنی اہلیہ سے مشورہ کیا تو اہلیہ نے کہا کہ جو آپ کی تعریف میں مبالغہ کرے تو اسے کہہ دیں کہ میں گناہ گار آدمی ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں خواہ مخواہ اپنے عیوب لوگوں کو کیوں بتلاتا پھروں، یہ تو الٹا فساد ہے۔ البتہ حدیث میں ہے کہ اس کے منہ میں مٹی ڈال دو جو تمہاری تعریف تمہارے سامنے کرے۔ اور اس کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کے لیے بڑا ایمان چاہیے جو کہ میرے پاس نہیں ہے۔ اور اس میں رکاوٹ یہ بھی ہے کہ بعض اوقات تعریف کرنے والے آپ سے مقام یا عمر یا کسی بھی اعتبار سے بڑے ہوتے ہیں۔

تو ان مدرس کو اس کا حل یہی سوچا کہ عام لوگوں جیسے حلیے میں رہا کرو تا کہ لوگ انہیں کسی آزمائش میں نہ ڈالیں۔ واللہ اعلم۔ انہوں نے اس کا حل یہ بھی نکالا کہ اگر کوئی تعریف میں مبالغہ کرے تو یہ کہہ دیا کہ بھائی! میں اتنا ہی مفتی اور پرهیزگار ہوں کہ جتنا میری بیوی مجھے سمجھتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اگر کوئی تعریف کرے تو وہ اس کا وہم اور گمان ہے، اور میں اس بارے میں یہی کہتا ہوں کہ اللہ اس کے وہم اور گمان کو سچ کر دکھائے کہ مجھے ایسا بنادے۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ لوگ فرشتہ سمجھ کر قریب ہوتے ہیں اور انسان سمجھ کر دور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ قصور لوگوں کا ہے اور کچھ مدرس اور واعظ کا بھی ہے کہ اس نے اپنے بارے میں ایسا تاثر عام ہونے

ہی کیوں دیا کہ لوگ اسے فرشتہ سمجھنا شروع ہو گئے۔ اور یہ تاثر عام طور مدرس اور واعظ کے ظاہری حلیے سے پھیلتا ہے۔

پس ابھی تو معمول یہی ہے کہ کبھی ٹوپی پہن لی اور کبھی اتار لی جیسے کہ کوئی مباح کام کبھی کسی ضرورت سے کر لیا اور کبھی کسی وجہ سے نہ کیا۔ کبھی ریٹورنٹ میں جاتے ہوئے اس سوچ سے پہن لی کہ نظروں میں حیا رہے اور کبھی مسجد میں یہ سوچتے ہوئے پہن کر نہ گئے کہ لوگ امامت کے لیے مصلے پر نہ کھڑا کر دیں۔ اور کبھی اس کے برعکس بھی ترتیب رہتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلَى صُورِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ، وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ»¹

”یقیناً اللہ عز و جل تمہارے جسموں کی طرف نہیں دیکھتے اور نہ ہی تمہاری صورتیں دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ تمہارے دلوں کو دیکھتے ہیں۔ اور اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔“

حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام نے بھی یہود کے علما پر اس پہلو سے شدید تنقید کی تھی کہ وہ اپنے ظاہری مذہبی لباس کا تو بہت دھیان رکھتے تھے لیکن باطن کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دیتے تھے۔ معاصر انجیل میں ہے:

”اس وقت یسوع یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کیں کہ فقیہ اور فریسی، موسیٰ علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن انکے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں... وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں۔ اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے رُبی کہلانا پسند کرتے ہیں... اے ریاکارو

¹ صحیح مسلم، کتاب البرِّ وَالصَّلَاةِ وَالْأَذَابِ، بَابُ تَحْرِيمِ ظُلْمِ الْمُسْلِمِ، وَخُلْيَاهُ، وَاجْتِقَارُهُ وَذَمُّهُ، وَعِزُّهُ، وَمَالُهُ، 1986/4

فقہیو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو ذہ کی دیتے ہو،
 پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا
 ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے
 والو! جو چھڑ چھانتے ہو اور اونٹ نکل جاتے ہو... اے ریاکارو فقہیو اور فریسیو
 تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھیری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو
 خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست
 سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے
 ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔“¹

گناہ کا اعلان

سوشل میڈیا پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے
 گناہوں کا مجلس میں اظہار کرتے ہیں اور اس پر شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتے۔ ایسے
 لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو دنیا دار طبقہ ہے اور وہ اپنے گناہ پر فخر کرنے کے لیے
 مجلس میں ان کا اعلان کرتے ہیں کہ میں نے فلاں کے ساتھ ایسا کیا یا یہ کیا یا وہ کیا وغیرہ۔
 اور دوسرا مذہبی طبقہ ہے جو اپنے گناہ گار ہونے کے احساس کو دوسروں سے شیئر کرنے
 کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ تصوف کی تاریخ میں بھی ایک فرقہ ایسا پیدا ہوا تھا کہ جو اپنی
 نیکیوں کو چھپاتے اور اپنے گناہوں کا اعلانیہ اظہار کرتے تھے اور انہیں ”ملا متیہ“ کہا جاتا
 تھا کہ ان کا اس سے مقصود اپنے نفس کو ملامت کرنا تھا۔ اس فرقے کی نسبت حمدون
 القصار متوفی 271ھ کی طرف کی جاتی ہے۔

مذہبی طبقے کی طرف سے اس قسم کے اعلان کے دو قسم کے اثرات مرتب ہوتے
 ہیں: مثبت اور منفی۔ مثبت اثر تو یہ ہے کہ اس قسم کا اقرار انسان کی شخصیت سے تقدس کی
 مصنوعی چادریں اتار کر اسے ایک عام انسان کے درجے پر لے آتا ہے۔ اور منفی یہ ہے کہ
 چھپ کر گناہ تو اکثر لوگ کر ہی رہے ہوتے ہیں یا کم از کم گناہ کی خواہش رکھتے ہیں، لیکن

¹ متی کی انجیل: باب: 23، آیت: 1-3، بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور

کرنے والے نادم ہوتے ہیں اور خواہش رکھنے والے منتظر۔ اب جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں حضرت بھی ایسے ہیں کہ فلم دیکھ لیتے ہیں تو دیکھنے والوں کی ندامت رخصت ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جو دیکھنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے ہیں، اُن کی ہچکچاہٹ دور ہو جاتی ہے۔ پس اپنی معصیت اور گناہ کے اعلان سے اگر کوئی روحانی فائدہ ہوتا بھی ہو تو صرف اعلان کرنے والے کو ہو سکتا ہے جبکہ معاشرے کے لیے اس اعلان میں نقصان ہی نقصان ہے کہ گناہ اور معصیت پر لوگوں کی ہچکچاہٹ ختم ہوگی اور جرات بڑھ جائے گی۔ پس گناہ کا اعلان کرنا کسی طور درست نہیں ہے، چاہے گناہ کی ترغیب دینے کی غرض سے ہو، چاہے اپنے نفس کو ملامت کرنے کی نیت سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«كُلُّ أَمِّيٍّ مُعَافٍ إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ، وَإِنَّ مِنَ الْمُجَاهِرَةِ أَنْ يَعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلًا، ثُمَّ يُصْبِحُ وَقَدْ سَتَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ، فَيَقُولُ: يَا فُلَانُ، عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا، وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ، وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللَّهِ عَنْهُ»¹

”میری امت کے ہر گناہ گار کے لیے معافی ہے سوائے ایسے گناہ گار کے کہ جو اپنے گناہ کا اعلان کرتا ہے۔ یہ ایسا شخص ہے جو رات کو گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا گناہ چھپا لیتے ہیں لیکن وہ صبح ہوتے ہی کسی کو خود ہی بتلا دیتا ہے کہ میں نے رات کو فلاں فلاں کام کیا ہے۔ پس اس کی رات تو اس حال میں گزری کہ اس کے رب نے اس کے گناہ کو چھپا لیا تھا لیکن اس نے صبح اس حال میں گزاری کہ اس نے اپنے گناہ کا پردہ خود ہی چاک کر دیا۔“

خوردہ بنی

نفس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر غور ضرور کرنا چاہیے کہ اسی طرح ان کی اصلاح ممکن ہے لیکن اگر یہ غور و فکر حد سے بڑھ جائے تو خود ایک روحانی بیماری ہے کہ جسے احمد جاوید صاحب خوردہ بنی کا نام دیتے ہیں۔

¹ صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب سِتْرِ الْمُؤْمِنِ عَلَى نَفْسِهِ، 20/8

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ اگر خورد بینی نظر سے ہم اپنے سامنے پڑے ہوئے کھانے سے اٹھائے جانے والے نوالے کو بھی دیکھیں گے تو زمین پر گرا دیں گے کہ اس میں ہمیں عمومی نظر میں نہ دکھائی دینے والے ہزاروں بیکٹیریا نظر آنے لگیں گے۔ اسی طرح کی مثال نفس انسانی کی بھی ہے۔ نفس انسانی تو کمزوریوں اور کوتاہیوں کا انسائیکلو پیڈیا ہے لہذا اگر انسان اپنے رذائل ہی کو ہر وقت خورد بینی نگاہ سے دیکھنے لگ جائے گا تو اس کے سامنے نفس میں موجود خرابیوں کی ایک لامتناہی فہرست مرتب ہو کر آتی رہے گی اور وہ اسی فہرست میں ہی گم ہو کر رہ جائے گا۔ کچھ عرصہ تو شاید اسے فائدہ ہو لیکن ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کا یہی عمل اس کے تکبر کا ذریعہ بن جائے گا کہ دیکھو میں نے اپنے نفس کی وہ برائیاں دیکھ لی ہیں جو کسی کو نظر نہ آئیں یا مجھے اپنے نفس کی شرارتوں کا اتنا علم ہے جو کسی کو بھی اپنے نفس کے بارے میں نہیں ہے وغیرہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾ [النساء: 31]

”اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو گے کہ جن سے تمہیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی خطائیں خود سے ہی معاف کرتے رہیں گے اور تمہیں باعزت مقام میں جگہ دیں گے۔“

اس لیے ابتدائی سطح میں نفس کی اصلاح میں مناسب حد تک توجہ دیں اور موٹی موٹی چیزوں کی اصلاح کر لیں۔ ضرورت سے زیادہ توجہ اس کے بگاڑ میں تو کوئی کردار ادا کر سکتی ہے لیکن تعمیر میں نہیں۔ اللہ عز و جل ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے۔

اسی طرح اگر کوئی استاذ اور مربی اپنے طالب علم اور سالک سے آغاز میں ہی تبدیلی کی بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لے گا تو ہرگز اس کی اصلاح نہ کر پائے گا۔ تبدیلی اور بہتری وقت کے ساتھ آتی ہے، دنوں میں نہیں بلکہ سالوں میں آتی ہے۔ ابتدائی درجات میں طلباء اور سالکین کی ممکن حوصلہ افزائی کرنی چاہیے نہ کہ دھلائی اور بے عزتی۔ مربی کو شروع میں اگر اس کے نیک عمل میں کوئی ریاکاری بھی دکھائی دے تو

اسے نظر انداز کرے اور اسے نیک عمل سے نہ روکے۔ اللہ نے چاہا تو وقت کے ساتھ اس کا خلوص بڑھتا چلا جائے گا۔ واضح رہے کہ منزل بہر صورت اخلاص ہی ہے، اس کی طرف کا سفر کسی صورت رکنا نہیں چاہیے۔

جنت الفردوس کے وارث

قرآن مجید میں سورۃ المؤمنون کی شروع کی گیارہ آیات میں اللہ عز و جل نے مومنین کی چھ صفات بیان کی ہیں۔ جن لوگوں میں یہ چھ صفات ہوں تو قرآن مجید انہیں نہ صرف مومن ہونے کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے بلکہ ان کے جنت الفردوس میں جانے کی بشارت بھی اسی دنیا میں سنا دیتا ہے۔ یہ چھ صفات کسی بندہ مومن کی شخصیت کے ارتقا اور نمو (personality development) کے لیے بھی بہت ضروری ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ 1 ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ 2 ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ 3 ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ﴾ 4 ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ﴾ 5 ﴿إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ﴾ 6 ﴿فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾ 7 ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ 8 ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ 9 ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ﴾ 10 ﴿الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [المؤمنون: 11]

”یقیناً وہ لوگ کامیاب ہیں کہ جو مومن ہیں۔ اور مومن وہ لوگ ہیں کہ جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں۔ اور لغویات سے دور رہنے والے ہیں۔ اور اپنی جان اور مال کا تزکیہ کرنے والے ہیں۔ اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے اور ان کے بارے ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ لیکن جو کوئی ان دو کے علاوہ اپنی خواہش پوری کرنا چاہے گا تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت

کرنے والے ہیں۔ تو یہی لوگ وارث ہیں۔ جنت الفردوس کے وارث کہ جس میں یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔“

ان آیات میں اللہ عزوجل نے مومن کا عنوان (title) ان کو عطا کیا ہے کہ جن میں مذکورہ بالا چھ صفات ہوں۔ ان میں سے پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرنے والے ہوں یعنی نماز میں ان کی کامل توجہ اللہ کی ذات کی طرف مرکوز رہے اور نماز میں دھیان ادھر ادھر نہ جائے۔ اس بارے ہم آگے چل کر مستقل گفتگو کریں گے کہ نماز میں خشوع سے کیا مراد ہے اور یہ کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

مومنین کی دوسری صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ فضول باتوں اور لغو کاموں سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنا وقت بے ہودہ باتوں اور بے کار کاموں میں ضائع نہیں کرتے۔ وہ اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں اور اُس کے استعمال کو قیمتی بناتے ہیں۔ وہ تاش، ویڈیو گیمز، فلم بینی، براؤزنگ، میسجنگ، چیٹنگ وغیرہ میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ سنجیدہ، بامقصد اور تعمیری سرگرمیوں میں اپنا وقت استعمال کرتے ہیں۔

مومنین کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ تزکیہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے نفس کا بھی اور اپنے مال کا بھی۔ نفس کا تزکیہ یہ ہے کہ ہر وقت اس سوچ بچار میں رہے کہ اپنے اخلاق اور رویوں میں موجود خرابیوں اور کوتاہیوں کو کسی طرح دور کر سکتا ہوں اور ان کو دور کرنے کے لیے مجاہدہ بھی کرے۔ اور مال کا تزکیہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں زکوٰۃ اور صدقات نکالتا رہے۔

اور چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ بدکاری اور زنا سے بچتے ہیں۔ اور خواہش پوری کرنے کے جو جائز رستے ہیں یعنی بیویاں اور لونڈیاں تو اُن دو کے علاوہ وہ کہیں اور منہ نہیں مارتے۔ اپنی خواہش کو قابو میں رکھتے ہیں اور بے حیائی کے ایسے کاموں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے کہ جو زنا اور بدکاری کی طرف لے کر جانے والے ہوں۔

اور پانچویں صفت یہ ہے کہ جب ان کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت نہیں کرتے اور اگر کسی سے وعدہ کر لیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔ امانت صرف یہی

نہیں ہے کہ کسی نے آپ کے پاس کچھ رقم رکھوادی اور آپ نے اس کو بعینہ واپس کر دی بلکہ سرکاری عہدہ بھی ایک قسم کی امانت ہے۔ کسی سرکاری عہدے میں اختیارات کا ناجائز استعمال بھی امانت میں خیانت (corruption) کے مترادف ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ، فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ مِسْكِينٍ»¹
 ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ جسے لوگوں کے مابین فیصلہ کرنے کے لیے قاضی کا عہدہ دیا گیا تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے اسے بغیر چھری کے ذبح کیا گیا ہو۔“

اسی طرح وعدہ صرف وہی نہیں ہوتا کہ جس میں آپ باقاعدہ یہ الفاظ بولیں کہ میں آپ سے وعدہ کر رہا ہوں بلکہ اگر آپ نے کسی سے طے (commitment) کیا ہے کہ آپ اس کا قرض ایک ماہ تک واپس کر دیں گے تو یہ بھی وعدہ میں شامل ہے۔ اور مومن کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَلَّةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَلَّةٌ مِنْ نِفَاقٍ حَتَّى يَدْعَهَا: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ»²

”حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس میں یہ چار خصلتیں ہوں تو وہ توپکا منافق ہے۔ اور جس میں ان چار میں سے کوئی خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اُس کو چھوڑ دے۔ اور وہ خصلتیں یہ ہیں کہ جب بولے، جھوٹ بولے۔ اور جب معاہدہ (contract) کرے تو غداری کرے۔ اور جب وعدہ (promise) کرے تو توڑ دے۔ اور جب جھگڑا کرے تو پھٹ پڑے۔“

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الأحکام، باب ذِکْرِ الْفُضَاةِ، 774/2

² صحیح مسلم، کتابُ الْإِيمَانِ، بابُ بَيَانِ خِصَالِ الْمُنَافِقِ، 78/1

اور کامیاب ہونے والے مومنوں کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی نماز کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ نماز جماعت سے ادا کرتے ہیں اور وقت پر ادا کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ دو دو نمازیں جمع کر رہے ہوں، یا دن میں چار نمازیں پڑھ لی اور ایک ضائع کر دی، یا ہفتے میں چار دن پڑھ لی اور تین دن چھٹی کر لی۔ نماز کی حفاظت سے مراد نماز کو اپنے وقت میں ادا کرنا ہے۔ اور اس میں بھی کوشش کرے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے اور اگر کسی مجبوری سے جماعت نہ مل سکے تو نماز کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر نہ کرے۔

ان چھ صفات میں سے پہلی اور آخری صفت کا تعلق نماز سے ہے۔ پہلی صفت نماز کی باطنی کیفیت کے بارے ہے کہ اُس کو خشوع کی کیفیت سے ادا کرے۔ اور دوسری صفت نماز کی ظاہری صورت کے بارے ہے کہ نماز اپنے وقت پر ادا کرے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اگر مومن اپنی نماز کے ظاہر اور باطن کی اصلاح کر لے گا تو اللہ عزوجل نماز کی اصلاح کی برکت سے درمیان کی چار صفات از خود اس میں پیدا فرمادیں گے۔ پس اصلاح نفس کے اس قرآنی پروگرام میں نماز کی ظاہری اور باطنی اصلاح کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَتَانِي اللَّيْلَةُ رَبِّي تَبَارَكَ وَتَعَالَى فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ، - قَالَ أَحْسَبُهُ فِي الْمَنَامِ - فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ هَلْ تَدْرِي فِيمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلَى؟ قَالَ: قُلْتُ: لَا، قَالَ: «فَوَضَعَ يَدَهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتَّى وَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ» أَوْ قَالَ: فِي نَحْرِي، فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ، قَالَ: يَا مُحَمَّدُ، هَلْ تَدْرِي فِيمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلَى؟ قُلْتُ: نَعَمْ، فِي الْكَفَّارَاتِ، وَالْكَفَّارَاتِ الْمُكْتَبَةِ فِي الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، وَالْمُشْيِ عَلَى الْأَقْدَامِ إِلَى الْجَمَاعَاتِ، وَإِسْبَاحُ الْوُضُوءِ فِي الْمَكَارِهِ، وَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ عَاشَ بِخَيْرٍ وَمَاتَ بِخَيْرٍ، وَكَانَ مِنْ خَطِيئَتِهِ كِبُومٌ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ، وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، إِذَا صَلَّيْتَ فَقُلْ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ، وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ، وَحُبَّ الْمَسَاكِينِ، وَإِذَا أَرَدْتَ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَافْضِنِي إِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُونٍ،

قَالَ: وَالذَّرَجَاتُ إِفْشَاءُ السَّلَامِ، وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ، وَالصَّلَاةُ بِاللَّيْلِ
وَالنَّاسُ نِيَامٌ»¹

”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ رات اللہ عزوجل میرے خواب میں بہترین صورت میں میرے پاس آئے اور مجھ سے سوال کیا: اے محمد ﷺ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ مجلس کے فرشتے کن باتوں میں اختلاف کرتے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا یہاں تک میں نے اُس کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، وہ سب میرے سامنے روشن ہو گیا۔ اب اللہ عزوجل نے پھر سوال کیا: اے محمد ﷺ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ مجلس کے فرشتے کن باتوں میں اختلاف کرتے ہیں؟ تو میں نے کہا جی ہاں، مجھے معلوم ہے کہ وہ اس میں اختلاف کر رہے ہیں کہ کون سے نیک اعمال ایسے ہیں کہ جو گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ اور وہ نیک اعمال کہ جو انسان کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں، ان میں سے ایک نماز باجماعت کے لیے مسجد کی طرف پیدل چل کر جانا ہے۔ اور دوسرا نماز باجماعت کے بعد مسجد میں کچھ دیر تک بیٹھے رہنا ہے۔ اور تیسرا مشکلات [یعنی گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں ٹھنڈے پانی] میں اہتمام سے وضو کرنا ہے۔ اور جس نے یہ تین کام کر لیے تو اس کی زندگی خیر پر گزری اور اس کا خاتمہ بھی خیر پر ہو گا۔ اور وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جائے جیسا کہ پیدا ہونے والا بچہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اور اللہ عزوجل نے یہ بھی کہا کہ اے محمد ﷺ! جب آپ نماز پڑھیں تو یہ دعا کریں: اے اللہ! مجھے نیک کام کرنے، برائی سے بچنے اور غریبوں سے محبت کرنے کی توفیق

¹ سنن الترمذی، أَوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، بَابُ وَمِنْ سُورَةِ ص، 366/5-367۔ اس روایت کو امام ترمذی، امام بخاری، امام ابن عبد البر، امام بغوی، امام ابن تیمیہ، امام منذری، امام ابن حجر، علامہ ابن العربی، علامہ ابن جوزی، شیخ احمد شاکر اور علامہ البانی رحمہم اللہ نے ”حسن“ قرار دیا ہے۔

عطا فرما۔ اے پروردگار! اور جب آپ اپنے بندوں کو کسی آزمائش میں ڈالنے کا ارادہ کریں تو مجھے اس آزمائش سے پہلے ہی اس دنیا سے اٹھالیں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ درجات کو بلند کرنے والے اعمال یہ ہیں: سلام کو عام کرنا، غریبوں کو کھانا کھلانا اور رات کو اس وقت نماز پڑھنا جبکہ لوگ سو رہے ہوں۔“

جن مومنین میں یہ چھ صفات پیدا ہو جائیں تو انہیں قرآن مجید نے جنت الفردوس کا وارث کہا ہے۔ جنت کے ایک سو درجات ہیں اور ان میں سب سے بلند درجہ جنت الفردوس کا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کو تلقین کی ہے کہ جب بھی اللہ سے دعا مانگو تو جنت الفردوس مانگو۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا:

«الْجَنَّةُ مِائَةُ دَرَجَةٍ، كُلُّ دَرَجَةٍ مِنْهَا مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَإِنَّ أَعْلَاهَا الْفِرْدَوْسُ، وَإِنَّ أَوْسَطَهَا الْفِرْدَوْسُ، وَإِنَّ الْعَرْشَ عَلَى الْفِرْدَوْسِ، مِنْهَا تُفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ، فَإِذَا مَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَسَلُّوهُ الْفِرْدَوْسَ»¹

”جنت کے سو درجات ہیں۔ ایک درجہ سے دوسرے درجے کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے کہ جتنا زمین اور آسمان کے مابین ہے۔ اور سب سے اعلیٰ اور سب سے بہترین جنت، جنت الفردوس ہے۔ اور اللہ کا عرش جنت الفردوس کے اوپر ہے۔ جنت الفردوس ہی سے جنت کی تمام نہریں جاری ہوتی ہیں لہذا جب بھی تم اللہ سے دعا مانگو تو جنت الفردوس کا سوال ضرور کرو۔“

جنت کا سب سے آخری درجہ بھی اتنا بڑا ہوگا کہ اس دنیا سے دس گنا بڑی جنت اس شخص کو ملے گی کہ جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہوگا۔ اور نہ صرف دنیا سے دس گنا بڑی جنت بلکہ اس دنیا سے دس گنا نعمتیں بھی اس جنت میں ہوں گی یعنی وہ ایک مزین (furnished) جنت ہوگی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد باب صِفَةِ الْجَنَّةِ، 2/1448

«إِنِّي لَأَعْلَمُ آخِرَ أَهْلِ النَّارِ خُرُوجًا مِنْهَا، وَآخِرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُولًا الْجَنَّةَ، رَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ حَبَوًّا، فَيَقُولُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَهُ: اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ، فَيَأْتِيهَا فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهَا مَلَأَى، فَيَرْجِعُ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ، وَجَدْتُهَا مَلَأَى، فَيَقُولُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَهُ: اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ، قَالَ: فَيَأْتِيهَا، فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهَا مَلَأَى، فَيَرْجِعُ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ، وَجَدْتُهَا مَلَأَى، فَيَقُولُ اللَّهُ لَهُ: اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ، فَإِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشْرَةَ أَمْثَالِهَا - أَوْ إِنَّ لَكَ عَشْرَةَ أَمْثَالِ الدُّنْيَا -، قَالَ: فَيَقُولُ: أَتَسْحَرُ بِي - أَوْ أَتَضْحَكُ بِي - وَأَنْتَ الْمَلِكُ؟، قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَحِكَ حَتَّى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ»¹

”میں اس شخص کو جانتا ہوں کہ جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا اور سب سے آخر میں جنت میں داخل ہو گا۔ یہ شخص گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا جہنم سے نکلے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے کہیں گے کہ جا، جنت میں داخل ہو جا۔ وہ شخص جنت کے دروازے پر آئے گا تو اسے محسوس ہو گا کہ شاید جنت بھر چکی ہے [اور اس کے لیے اس میں جگہ نہیں ہے]۔ وہ واپس اپنے پروردگار کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ اے میرے رب! جنت تو بھری ہوئی ہے۔ اللہ عز و جل اسے دوبارہ کہیں گے کہ جا، اور جنت میں داخل ہو جا۔ پس وہ جنت کے دروازے پر آئے گا تو اسے دوبارہ محسوس ہو گا کہ شاید جنت بھر چکی ہے [اور اس کے لیے اس میں جگہ نہیں ہے]۔ پس وہ دوبارہ واپس اپنے پروردگار کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ اے میرے رب! جنت تو بھری ہوئی ہے۔ تو اللہ عز و جل اس سے کہیں گے جا، اور جنت میں داخل ہو جا۔ ہم نے تجھے دنیا جتنی بڑی جنت دی بلکہ دنیا سے دس گنا بڑی جنت دی۔ تو وہ شخص کہے گا کہ اے میرے رب! آپ تو بادشاہ ہیں لیکن اپنے بندے کا مذاق تو نہ اڑائیں [یعنی اس شخص کو یہ یقین ہی نہیں آئے گا کہ اسے اتنی بڑی جنت مل سکتی ہے اور وہ اپنے رب کی اس بات کو مذاق سمجھ لے گا]۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ

¹ صحیح مسلم، کتابُ الْإِيمَانِ، بَابُ آخِرِ أَهْلِ النَّارِ خُرُوجًا، 173/1

یہ بات بیان کرتے ہوئے آپ اس قدر ہنسے کہ آپ کی داڑھیں نظر آنا شروع ہو گئیں۔“

آج ہم اس غلط فہمی میں ہیں کہ جب مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جنت ملے گی تو یہ خیال آتا ہے کہ شاید ڈیفنس یا بحریہ ٹاؤن میں کوئی دس مرلے کا پلاٹ نکل آئے گا یعنی جنت کو ہم نے اتنی حقیر نعمت سمجھ رکھا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ احادیث کی کتابوں سے جنت کے ابواب کا خاص طور مطالعہ کریں تاکہ اس کی خواہش اور طلب میں اضافہ ہو۔ اور پھر یہی خواہش اور طلب ہماری اصلاح کا ذریعہ بن جائے۔



باب دوم اصلاح احوال

اس باب میں اصلاح احوال کے ضمن میں انسانی مزاج، کیفیات، نفسیات، جذبات اور قرآن مجید کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

تلون مزاجی

عصر حاضر کے انسان کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز میں تیزی سے حاصل ہونے والی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ یکسانیت سے اکتاہٹ محسوس کرتی ہے اور تبدیلی کی طرف مائل رہتی ہے۔ انسانی مزاج کا یہ وصف اس کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اگر یہ مزاج نہ ہو تو زندگی سے حرکت ہی ختم ہو جائے اور انسان جمود (inertia) کا شکار ہو جائے اور دوسری صورت میں اگر یہ مزاج حد سے بڑھ جائے تو اسے ”تلون مزاجی“ کہتے ہیں۔ پس تبدیلی کی طرف مائل رہنے والا مزاج نہ رکھنا جمود پیدا کرتا ہے اور ہر قدم پر تبدیلی کی طرف مائل مزاج تلون مزاجی پیدا کرتا ہے اور یہ دونوں مطلوب نہیں ہیں۔

متلون مزاج (temperamental) سے مراد ایسا مزاج ہے جس میں ٹھہراؤ نہ ہو اور جلد تبدیل ہو جانے والا ہو۔ تبدیلی انسانی زندگی بلکہ اس کے مزاج کا حصہ ہے اور انسان تبدیلی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تبدیلی نہ ہونے کا مطلب دنیا کا خاتمہ ہے لیکن آئے روز تبدیلی کی خواہش ایک کمزوری ہے کیونکہ زندگی حرکت اور سکون دونوں کے توازن کا نام ہے۔ ہم میں سے ہر شخص تبدیلی چاہتا ہے، اپنے لباس میں، رہن سہن میں، عادات و اطوار میں حتیٰ کہ زندگی کی ہر اس چیز میں جو اس سے متعلق ہو۔ لوگ اپنے موبائل، لیپ ٹاپ، گاڑی، گھر، ملازمت، کاروبار، پیشہ، مدرسہ، یونیورسٹی، تنظیم، جماعت حتیٰ کہ شریک حیات تک سے اکتا جاتے ہیں۔

مدرسہ اور یونیورسٹی کے طالب علم ہی کی مثال لے لیں۔ کسی مدرسہ اور یونیورسٹی میں دو سال لگانے کے بعد اکثر و بیشتر طلباء میں دوسرے مدرسہ اور یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک گاڑی لینے کے بعد ہمیں بہتر گاڑی کی خواہش محسوس ہوتی ہے حالانکہ پہلی گاڑی ہماری ضرورت پوری کر رہی ہوتی ہے۔ شوہر اپنی بیوی سے اکتا جاتے ہیں حالانکہ وہ یہ تبصرہ بھی کر رہے ہوتے ہیں کہ اگر دوسری بھی لے آئیں گے تو وہ ہر گز پہلی سے بہتر نہ ہوگی کیونکہ نوع تو ایک ہی ہے۔ اور بیوی کو اپنی سہیلی

اور پڑوسن کا شوہر آئیڈیل معلوم ہوتا ہے حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی شادی اس آئیڈیل شوہر کے ساتھ بھی ہو جاتی، تو وہاں بھی اس کے کچھ نہ کچھ مسائل باقی رہنے تھے۔ لوگ ایک جگہ ملازمت چھوڑ کر دوسری جگہ جوائن کرنے کو انجوائے کرتے ہیں حالانکہ دوسری جگہ میں بعض اوقات انہیں کوئی زیادہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ اعلیٰ دنیاوی تعلیم کے بعد دین کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنی زندگیاں دین کے لیے وقف کرنے کی بات کرتے ہیں حالانکہ ان میں بھی اکثر کے ہاں اصل محرک (motive) ان کے مزاج کا تلون ہوتا ہے نہ کہ کوئی عزم و استقلال۔ ایسے لوگ دنیا سے دین کی طرف آکر دوبارہ دنیا کی طرف جلد چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ آئے روز کاروبار تبدیل کرتے رہتے ہیں کہ انہیں ایک ہی قسم کے کاروبار میں سکون نہیں ملتا۔

جو لوگ متلون مزاج ہوتے ہیں، ان میں یہ کمزوری بھی ہوتی ہے کہ وہ جو اچھا لگے، اسے کر گزرنے کی سوچتے ہیں حالانکہ ان میں وہ کچھ کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی ہے۔ تلون مزاجی انسان کے اوقات اور صلاحیتوں دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ جو بھی کام کرے، چاہے دنیا کا ہو یا دین کا، اس میں ٹھہراؤ پیدا کرے۔ کم از کم پانچ سال سے پہلے اپنی زندگی کے بارے کوئی بڑا فیصلہ نہ کرے الا یہ کہ کوئی بہت ہی مجبوری ہو۔

کہیں ملازمت اختیار کی ہے تو پانچ سال وہاں رہے۔ کوئی کاروبار شروع کیا ہے تو پانچ سال تک جیسے تیے چلائے۔ گاڑی لی ہے تو کم از کم پانچ سال بعد اسے تبدیل کرے۔ کسی مدرسہ یا یونیورسٹی میں طالب علم ہے تو چار پانچ سال سے پہلے وہاں سے نکلے کا نہ سوچے۔ ایک استاذ کو چاہیے کہ وہ ایک کورس کم از کم پانچ سال تک پڑھائے اور ہر سال یا سیمسٹر میں نیا کورس نہ لے۔ ان شاء اللہ! اس تدبیر سے انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ اور کام میں پختگی آجائے گی۔

بعض اوقات تبدیلی کی خواہش زیادہ زور اس وقت پکڑتی ہے جبکہ انسان یہ سمجھتا ہو کہ یہ تبدیلی اسے آگے لے کر جانے والی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ذاتی ارتقا اور نمو (personal grooming) چاہتا ہے۔ اور بعض دیندار لوگ اپنی ذات کا تعارف اس لیے چاہتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری ذات دین کے تعارف کا ایک ذریعہ ہے لہذا اگر ہم اپنی ذات کے تعارف پر توجہ دیتے ہیں تو یہ دین ہی کی ایک خدمت ہے۔ اس سوچ میں اخلاص بھی ہو سکتا ہے اور اپنے آپ سے دھوکا بھی لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

ہمارا مقصود اس وقت صرف یہ ہے کہ دین کے نام پر بعض اوقات ہم اپنی شخصیت کے نمو اور ارتقا میں بہت زیادہ گم ہوتے چلے جاتے ہیں اور کم وقت میں بہت کچھ بننے کے لیے تلون مزاجی کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے باعتبار نتیجہ کچھ حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ دنیا دار شخص کو راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواب میں سوائے ڈپریشن کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تلون مزاجی کا ایک اور بہترین حل قناعت بھی ہے جس پر ہم ان شاء اللہ علیحدہ سے گفتگو کریں گے۔

تلون مزاجی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے مزاج میں ٹھہراؤ ہو اور ٹھہراؤ یا تو پیدا لاشی ہوتا ہے کہ انسان کی مٹی اور خمیر میں داخل ہو یا پھر بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ اور جو ٹھہراؤ بعد میں پیدا ہو تو وہ عقل اور وقت سے آتا ہے۔ انسان جس قدر سمجھدار ہو گا، اس کی بات چیت، اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے میں اسی قدر ٹھہراؤ ہو گا۔ اور انسان جس قدر بے وقوف ہو گا اسی قدر عجلت پسند ہو گا۔ سمجھداری کے علاوہ ٹھہراؤ وقت کے ساتھ بھی آتا ہے کہ بڑی عمر میں انسان جلد باز نہیں رہ جاتا۔ عموماً وہ نوجوان کی جوانی میں ان میں جلد بازی ہوتی ہے، تو بڑی عمر میں جا کر ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وجہ شاید یہ بھی ہے کہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کا تجربہ بڑھنے سے اس کی عقل بھی بڑھتی جاتی ہے اور عقل بڑھنے سے اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس صفت کے لیے چالیس سال کی عمر کا انتظار کریں بلکہ

ہمیں اس سے پہلے بھی اپنے مزاج میں ٹھہراؤ پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ قبیلہ عبد القیس کے لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ملاقات کے لیے تشریف لائے تو آپ ان کے استقبال کے لیے گئے۔ تمام لوگ آپ ﷺ کو دیکھتے ہیں اپنی سواریوں سے اترے اور آپ ﷺ کی طرف لپکے جبکہ ان کے سردار اشج عبد القیس رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی سواری کو باندھا اور اس کے بعد اپنے سفر والے کپڑوں کی جگہ دوسرا لباس پہنا اور پھر آپ ﷺ کی طرف بڑھے تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّ فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ، قَالَ: مَا هُمَا؟ قَالَ: الْأَنَاءَةُ وَالْحِلْمُ، قَالَ: مَنِيَّةٌ جَبِلْتُ عَلَيْهِ أَوْ مَنِيَّةٌ أَتَخَلَّفُهُ؟ قَالَ: لَا بَلْ جَبِلْتُ عَلَيْهِ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ»¹

”تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ کون سی خصلتیں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ سمجھداری اور ٹھہراؤ۔ انہوں نے کہا کہ کیا یہ خصلتیں مجھ میں پیدا نشی ہیں یا میں نے بعد میں اختیار کی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ خصلتیں تم میں پیدا نشی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس پر اللہ کا شکر ہے۔“

خشیت کے آنسو

آنسو دو قسم کے ہیں: ایک مجلس کے دوسرے تنہائی کے۔ اہم بات یہ ہے کہ عموماً دونوں ہوتے کچھ ہیں اور نظر کچھ آتے ہیں، مجلس والے اہل مجلس کی نظر میں اور تنہائی والے اپنی نظر میں۔ ایک دوست کو نماز باجماعت میں بہت رونا آیا۔ ساتھ کھڑے نمازیوں کو یہ تاثر ملا کہ شاید خشیت الہی سے رو رہے ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ رونے کا سبب کوئی دنیاوی آزمائش تھی جس میں انہیں صبر نہیں آ رہا تھا۔ اس آزمائش کے سبب دل بھر آیا ہوا تھا، اور آنکھیں نم ناک تھیں لہذا جیسے ہی نماز میں داخل ہوئے تو زار و قطار

¹ محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُسْتِي (المتوفى: 354ھ)، صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية، 1414ھ - 1993ء، 178/16

رونا شروع کر دیا۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ نماز میں کوئی ایسا خیال آیا کہ آنسو جاری ہو گئے۔ مثلاً بچہ بیمار تھا، نماز میں اس کے پچھڑ جانے کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی آنسو جاری ہو گئے۔ یہ آنسو اگرچہ خشیت الہی کے نہیں ہوتے لیکن انسان کا بعض اوقات ایسے آنسوؤں پر اختیار بھی نہیں ہوتا۔ البتہ رونے والے کو یہ سوچ کر ذہنی کوفت ہو سکتی ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اس کے بارے متقی، پرہیزگار معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہے ہوں گے؟ اب سوال یہ ہے کہ مجلس کے ایسے آنسو ریاکاری تو نہیں ہیں لیکن کیا نیکی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ آنسو دل کی نرمی کے بعد جاری ہوتے ہیں۔ اور اگر محض دل کی نرمی نیکی ہے تو شاید یہ نیکی کے آنسو کہلائے جاسکیں؟ یہ آنسو انسان کے اپنے لیے تو واضح ہوتے ہیں لیکن لوگوں کے لیے دھوکہ ہیں۔

دوسری قسم کے آنسو تنہائی کے ہیں۔ بعض اوقات انسان کو ان آنسوؤں کے بارے بھی شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں اور ان کی آمد شیطان کی طرف سے ہوئی ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ تنہائی کے احوال و کیفیات بھی جھوٹی ہو سکتی ہیں۔ اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اگر تنہائی کے رونے کے نتیجے میں اپنے نفس میں عاجزی محسوس ہو تو یہ رونار حمان کی طرف سے ہے اور اگر اس رونے کے بعد اپنی بڑائی کا کسی بھی قسم کا احساس پیدا ہو تو یہ آنسو شیطان کی طرف سے ہیں۔

یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ تنہائی میں جبکہ ہمارے ساتھ کوئی بھی نہیں ہوتا تو اس وقت ریاکاری تو ممکن نہیں ہے لیکن تکبر ممکن ہے۔ ہم تنہائی میں اگر کچھ دیر رونے کے بعد اپنے آپ کو تقویٰ کے کسی درجے پر فائز سمجھیں اور پھر تنہائی سے مجلس میں آکر لوگوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیں تو محسوس یہی ہوتا ہے کہ تنہائی کا یہ رونا شیطان کی طرف سے ہی تھا۔ واللہ اعلم

بعض دوستوں نے تبصرہ کیا کہ تنہائی کے آنسوؤں میں شک نہیں کرنا چاہیے اور یہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ہمیں اس تبصرے سے اتفاق نہیں ہے۔ جس طرح

مجلس میں کسی شخص کے رونے کے اسباب خشیت الہی کے علاوہ ہو سکتے ہیں تو تنہائی میں بھی رونے کے اسباب خشیت الہی کے علاوہ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کے رونے میں ریاکاری نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اخلاص ضرور موجود ہے۔ آنسوؤں میں بعض اوقات ریاکاری نہیں ہوتی لیکن اخلاص بھی نہیں ہوتا بلکہ کوئی اور سبب ہوتا ہے اور یہی بات ہم واضح کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جو شخص تنہائی میں اللہ کی خشیت کی وجہ سے رو پڑے تو اسے قیامت والے دن اللہ کے عرش کا سایہ نصیب ہو گا۔¹ اور تنہائی کے رونے میں کبھی ریاکاری نہیں ہو سکتی البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص تنہائی میں کسی دنیاوی آزمائش یا عارضی ناکامی یا عشق مجازی میں رو رہا ہو۔ لہذا تنہائی کے رونے میں بھی وجہ خشیت الہی ہونی چاہیے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَالْبُكَاءُ أَنْوَاعٌ. أَحَدُهَا: بُكَاءُ الرَّحْمَةِ وَالرِّقَّةِ. وَالثَّانِي: بُكَاءُ الْخَوْفِ وَالْخَشْيَةِ. وَالثَّلَاثُ: بُكَاءُ الْمُحَبَّةِ وَالشَّوْقِ. وَالرَّابِعُ: بُكَاءُ الْفَرَحِ وَالسُّرُورِ. وَالْخَامِسُ: بُكَاءُ الْجَزَعِ مِنْ وُرُودِ الْمُؤْلِمِ وَعَدَمِ احْتِمَالِهِ. وَالسَّادِسُ: بُكَاءُ الْحُزْنِ. وَالْفَرْقُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ بُكَاءِ الْخَوْفِ، أَنَّ بُكَاءَ الْحُزْنِ يَكُونُ عَلَى مَا مَضَى مِنْ حُصُولِ مَكْرُوهٍ أَوْ قَوَاتِ مَحْبُوبٍ، وَبُكَاءُ الْخَوْفِ يَكُونُ لِمَا يَتَوَقَّعُ فِي الْمُسْتَقْبَلِ مِنْ ذَلِكَ، وَالْفَرْقُ بَيْنَ بُكَاءِ السُّرُورِ وَالْفَرَحِ وَبُكَاءِ الْحُزْنِ، أَنَّ دَمْعَةَ السُّرُورِ بَارِدَةٌ وَالْقَلْبُ فَرَحَانٌ، وَدَمْعَةُ الْحُزْنِ حَارَّةٌ وَالْقَلْبُ حَزِينٌ... وَالسَّابِعُ: بُكَاءُ الْخَوْفِ وَالضَّعْفِ. وَالثَّامِنُ: بُكَاءُ التَّفَاقِ، وَهُوَ أَنْ تَدْمَعَ الْعَيْنُ وَالْقَلْبُ قَاسٍ، فَيُظْهِرُ صَاحِبُهُ الْخُشُوعَ وَهُوَ مِنْ أَقْسَى النَّاسِ قَلْبًا. وَالتَّاسِعُ: الْبُكَاءُ الْمُسْتَعَارُ وَالْمُسْتَأْجَرُ عَلَيْهِ، كِبُكَاءِ النَّائِحَةِ بِالْأُجْرَةِ، فَإِنَّهَا كَمَا قَالَ عَمْرُ بْنُ الْخَطَّابِ: (تَبِعَ عَابَرَتَهَا وَتَبَكَّى شَجْوَ غَيْرِهَا) وَالْعَاشِرُ: بُكَاءُ الْمُوَافَقَةِ، وَهُوَ أَنْ يَرَى الرَّجُلُ النَّاسَ يَبْكُونَ لِأَمْرٍ وَرَدَ عَلَيْهِمْ فَيَبْكِي مَعَهُمْ، وَلَا يَدْرِي لِأَيِّ شَيْءٍ يَبْكُونَ، وَلَكِنْ يَرَاهُمْ يَبْكُونَ فَيَبْكِي... التَّبَاكِي، وَهُوَ نَوْعَانِ: مَحْمُودٌ وَمَذْمُومٌ، فَلِلمَحْمُودِ أَنْ

¹ صحيح البخاري، كتاب الآذان، باب مَنْ جَلَسَ فِي الْمَسْجِدِ يَتَمَطَّرُ الصَّلَاةَ وَفَضَّلَ الْمَسَاجِدَ، 133/1

يُسْتَجَلَبُ لِرِقَّةِ الْقَلْبِ وَلِخَشْيَةِ اللَّهِ لَا لِلرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ. وَالْمَذْمُومُ أَنْ يُجْتَلَبَ لِأَجْلِ الْخَلْقِ، وَقَدْ «قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ رَأَهُ يَبْكِي هُوَ وَأَبُو بَكْرٍ فِي شَأْنِ أُسَارَى بَدْرٍ: أَخْبِرْنِي مَا يُبْكِيكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَإِنْ وَجَدْتُ بُكَاءً بَكَيْتُ، وَإِنْ لَمْ أَجِدْ تَبَاكَيْتُ لِبُكَائِكُمَا، وَلَمْ يُبْكِرْ عَلَيْهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» وَقَدْ قَالَ بَعْضُ السَّلَفِ: ابْكُوا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ، فَإِنْ لَمْ تَبْكُوا فَتَبَاكُوا¹

”رونے کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ پہلی قسم دل کی نرمی یا کسی پر رحم کی وجہ سے رونہ۔ دوسری قسم خوف اور ڈر کی وجہ سے رونہ ہے۔ تیسری قسم کسی کی محبت یا شوق میں رونہ ہے۔ چوتھی قسم خوشی میں رونہ ہے۔ پانچویں قسم کسی مصیبت کے نازل ہونے اور اس کے برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے بے چین ہو کر رونہ ہے۔ اور چھٹی قسم غم کا رونہ ہے۔ خوف اور غم کے رونے میں فرق یہ ہے کہ غم کا رونہ ماضی میں کسی محبوب چیز کے نہ ملنے یا کسی ناپسندیدہ شے کے ملنے پر ہوتا ہے جبکہ خوف کے رونے کا تعلق مستقبل کے متوقع اندیشوں سے ہوتا ہے۔ خوشی اور غم کے رونے میں فرق یہ ہے کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور دل خوش ہوتا ہے جبکہ غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں اور دل غمگین ہوتا ہے... اور ساتویں قسم کمزوری کا رونہ ہے۔ آٹھویں قسم نفاق کا رونہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آنکھیں آنسو بہائیں اور دل سخت ہو۔ رونے والا اپنے خشوع کو ظاہر کرے حالانکہ اس کا دل لوگوں میں سخت تر ہو۔ نویں قسم کرائے کا رونہ ہے جیسا کہ نوحہ کرنے والیاں اجرت پر لی جاتی ہیں۔ اور اسی بارے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ وہ اپنے آنسو بیچتی ہیں اور دوسرے کے دکھ پر روتی ہیں۔ اور دسویں قسم موافقت کا رونہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کچھ لوگوں کو کسی وجہ سے روتا دیکھے اور ان کے رونے پر خود بھی رونا شروع کر دے۔ اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں لیکن ان کے رونے کی

¹ ابن قیم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب (المتوفى: 751هـ)، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة

الرسالة، بيروت، 1994ء، 1/177

وجہ سے اسے رونا آجاتا ہے... اور رونانہ آئے لیکن رونے کی کوشش کرے تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محمود ہے اور دوسری مذموم ہے۔ محمود قسم وہ ہے کہ جس میں دل کی نرمی اور خشیت الہی کی وجہ سے رونے کی کوشش کرے نہ کہ ریاکاری اور دکھاوے کے لیے۔ اور مذموم یہ ہے کہ لوگوں کے لیے رونے کی کوشش کرے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے نازل شدہ آیات کی وجہ سے روتے دیکھا تو کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتائیں کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ پس اگر میں آپ کو روتے دیکھوں گا تو خود بھی روؤں گا۔ اور اگر مجھے رونانہ بھی آیا تو رونے کی کوشش کروں گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا انکار نہیں کیا۔ بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ اللہ کی خشیت کی وجہ سے روؤ۔ پس اگر تم رونہ سکو تو رونے کی کوشش کرو۔“

طربیہ (comedy) اور المیہ (tragedy) انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں یا ایسی دو حالتیں ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے ہر لمحے میں ان دو میں سے کسی ایک حالت میں ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ جو روتا اور ہنستا نہ ہو۔ پس رنج و غم، دکھ درد، تکلیف و آزمائش اور ان کی وجہ سے رونادھونا ہر انسان کا مقدر ہے لیکن بہترین رونا وہ ہے کہ جو اپنے رب کی خشیت یا محبت میں ہو۔ یعنی اپنے مالک کی ناراضگی کے ڈر سے روئے یا اپنے خالق کی محبت میں روئے۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

البكاء عشرة أجزاء: جزء لله، وتسعة لغير الله، فإذا جاء الذي لله في العام مرة فهو كثير.¹

”رونے کی دس قسمیں ہیں، ان دس میں سے ایک اللہ کے لیے ہے اور نو مخلوق کے لیے۔ پس اگر سال میں ایک مرتبہ بھی اللہ کے لیے رونے والی صورت حاصل ہو جائے تو بہت کافی ہے۔“

¹ الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قايماز (المتوفى: 748هـ)، سير أعلام النبلاء، مؤسسة الرسالة، 1985ء، 258/7

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول میں انسان کے رونے کے اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر انسان کو دس مرتبہ رونا آئے تو عام طور ان دس میں سے ایک مرتبہ اللہ کے لیے ہوتا ہے اور نو مرتبہ کے اسباب اللہ کی خشیت کے علاوہ ہوتے ہیں۔ دوسری بات جو انہوں نے کہی ہے، وہ یہ ہے کہ خالصتاً اللہ کے لیے رونا اگرچہ یہ نادر ہے لیکن اتنا قیمتی ہے کہ اگر سال میں ایک بار بھی حاصل ہو جائے تو انسان کو اطمینان حاصل ہو جانا چاہیے کہ اسے بہت بڑی نعمت حاصل ہو گئی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے۔¹ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سلف صرف اس بات سے مطمئن نہیں ہو جاتے تھے کہ ہمیں رونا زیادہ آتا ہے بلکہ وہ اپنے رونے کا بھی نفسیاتی تجزیہ کرتے تھے اور گہرائی میں اس کے اسباب تلاش کرتے تھے تاکہ محض آنسو بہا لینا شیطان کی طرف سے اس نفسیاتی تسکین کا موجب نہ بن جائے کہ میں گناہوں سے پاک ہو گیا ہوں۔

ڈر کی نفسیات

عموماً مذہبی طبقہ دین میں کسی گنجائش کا ذکر کرنے میں ڈر کی نفسیات کا شکار رہتا ہے۔ مذہبی لوگوں کی اکثریت شرعی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں یہ خوف رکھتی ہے کہ اگر اس کام کی اجازت دین سے نکل آئی تو یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے، لوگ یہ رخصت نکال لیں گے، وہ کرنا شروع کر دیں گے، یہ بھی کر لیں گے، وہ بھی کر لیں گے وغیرہ وغیرہ۔ لہذا اس کی اجازت نہ ہونا ہی بہتر ہے اور ممانعت ہی کی دلیل تلاش کرو۔

اس ڈر کی نفسیات کو اگر ہم ایک دنیاوی مثال سے سمجھنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ اگر سڑک پر نکلیں گے تو ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ اور یہ تو ہے کہ ایکسیڈنٹ تو سڑک پر ہی ہوتا ہے، گھر بیٹھے تو نہیں ہو گا۔ لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ کاروبار دنیا چھوڑ دیں،

¹ أحمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن أسد الشیبانی (المتوفى: 241ھ)، الزهد، دار الكتب العلمية،

بیروت، لبنان، 1999م، 185/1

گھر سے باہر نکلنا ختم کر دیں یا کم کر دیں۔ ہم میں سے بعض لوگ کوئی حادثہ دیکھ کر گاڑی چلانا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ انجانے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کسی شاہراہ پر چلنے والی گاڑیوں میں سے کتنی گاڑیوں کے حادثے ہوتے ہیں؟ ہزار میں سے ایک؟ یا کوئی بھی نسبت و تناسب ہو؟ پس یہ خوف اس قابل نہیں ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے۔

بعض خوف ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا اعتبار کیا جانا چاہیے، اور یہ وہ ہوتے ہیں جو غالب گمان کے درجے میں ہوں۔ اور بعض خوف ایسے ہوتے ہیں جو وہم کے درجے میں ہوتے ہیں، جن کا اعتبار کرنا زندگی کو مصیبت بنادیتا ہے۔ اگر مزاج اور رویہ ایسا ہو کہ رات کے کسی وقت میں کھڑا سن کر ساری رات انسان چور کے انتظار میں گزار دے تو ایسا محتاط مزاج اور رویہ ہماری زندگی کو عذاب بنادے گا۔ دنیا میں ایسے زندگی گزاریں کہ لگے کہ آپ زندگی گزار رہے ہیں، نہ کہ اس طرح کہ زندگی آپ کو گزار رہی ہے۔

دیندار طبقہ پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جیسے اس طبقے میں زندگی اور حیات نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ زندگی میں کوئی تفریح (entertainment) نہیں ہے، ہلا گلا (enjoyment) نہیں ہے۔ بس ہر طرف ایک پشیمردگی (sadness) سی چھائی ہوئی ہے۔ عام آدمی کو یہی شکوہ ہے کہ مذہبی طبقے کے پاس جو دین ہمیں بتلانے کے لیے رہ گیا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ بھی نہ کرو، وہ بھی نہ کرو۔ مدرس کے درس، واعظ کے وعظ اور خطیب کے خطبہ میں یہ کبھی سننے کو نہیں ملتا کہ یہ بھی کر سکتے ہو، وہ بھی کرنا جائز ہے وغیرہ۔ دین کی جو تعبیر یا تصور پیش کیا جاتا ہے، اس میں رخصتوں اور سہولتوں کا تو نام نہیں لیکن بیڑیاں اور زنجیریں خوب بتلائی جاتی ہیں۔ محرمات، گناہ کبیرہ، حرام امور کے نام سے تو میسویوں کتابیں مل جائیں گی لیکن شاید کوئی ایک بھی ایسی کتاب ڈھونڈے سے بھی نہ ملے کہ جس کا موضوع یہ ہو کہ اسلام میں مباحات، جائز اور حلال امور، رخصتیں اور سہولتیں کون کون سی ہیں۔

ٹھیک ہے شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی نہ ہو، ڈانس پارٹی نہ ہو، مخلوط

معاشرت سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن کیا ہمارا دین شادی کے لیے صرف اس قدر خوشی کی اجازت فراہم کرتا ہے کہ جس سے دلہا اور دلہن کے گھر میں ماتم ہونے کا شبہ نہ ہو؟ ہم نے اسکول کے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بھائی جانے والی تالیوں اور عید کے موقع پر گلے ملنے تک کو بدعت قرار دے دیا ہے۔

پس دین میں اگر آپ ایک چیز کے جائز ہونے پر بحث کریں گے تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ اسے غلط رخ پر لے جائیں۔ کسی گنجائش کو غلط رخ پر لے جانے والے اس غلطی کے خود ذمہ دار ہیں لیکن اس کا ہر گز مطلب یہ نہیں ہے کہ جس کی اجازت ٹکلتی ہو، اس پر بھی قدغن لگا دو۔ علما کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو خود تو دین کی رخصتوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن عوام کو اس لیے نہیں بتلاتے ہیں کہ عوام میں چونکہ اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہے لہذا وہ اس رخصت کو معلوم نہیں کیا سے کیا بنادیں گے؟ دین میں رخصت اور سہولت کا پہلو لوگوں کو بتلانا کتنا ضروری ہے یہ اسے ہی سمجھ آ سکتا ہے کہ جس نے معاشرے میں نکل کر عام لوگوں میں دعوت کا کام کیا ہو۔

سنن ترمذی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ کسی غزوہ سے واپسی پر ایک کالی کلوٹی لونڈی نے آپ ﷺ سے آکر کہا کہ میں نے یہ نذرمانی تھی کہ اگر اللہ نے آپ کو فتح دی تو آپ کے سامنے کھڑے ہو کر گیت بھی گاؤں گی اور دف بھی بجاؤں گی۔ آپ نے کہا:

«إِنْ كُنْتُ نَذَرْتُ فَأَضْرِبِي وَإِلَّا فَلَا»¹

”اگر تم نے نذرمانی ہے تو ایسا کر لو۔ اور اگر نذر نہیں مانی تھی تو رہنے دو۔“

کیا آج کوئی شیخ الحدیث یا مفتی یا اسلامی تحریک کے لیڈر اپنے شاگردوں یا کارکنوں سے بھری مجلس میں لونڈی جیسی سماجی حیثیت اور ذہنی سطح رکھنے والی کسی عورت کو اپنے سر پر کھڑے ہو کر دف بجانے اور گیت گانے کی اجازت دے سکتے تھے؟ سچ ہے کہ ایک فقیہ اور نبی کے ظرف میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہمارے مذہبی طبقے کو عوام کے لیے گنجائش پیدا کرنے میں نبوی ظرف کی ضرورت ہے۔

¹ سنن الترمذی، أَبَوَابُ الْمُتَأَقِبِ، بَابُ فِي مَنَاقِبِ أَبِي حَفْصِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، 620/5

ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ سوچیں یا کہیں کہ ابھی دف اور گیت سے شروع ہوئے ہیں تو میوزک کے جواز تک بھی پہنچیں گے۔ اس پر ہم وہی تبصرہ کریں گے کہ جو اس تحریر کا عنوان ہے کہ ہم دراصل ڈر کی نفسیات کا شکار ہیں۔ باقی میوزک اگرچہ جائز نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہمیں ڈر کی نفسیات سے نکل کر دین اسلام کی وسعتوں اہل اسلام کے لیے جو گنجائشیں موجود ہیں، وہ انہیں ضرور دینی چاہئیں۔ اور یہ ان کا دینی حق ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہم ڈر کی نفسیات کی بنا پر لوگوں کا دینی حق انہیں نہ دے رہے ہوں اور اس وجہ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد دینی زندگی کو اختیار کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو۔ واللہ اعلم۔

ایک دوست یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکثر بچے نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ جب بچوں سے نماز نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی جائے تو ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ظہر کی بارہ رکعات ہیں، عشاء کی سترہ رکعات ہیں، اتنی رکعتیں پڑھنا مشکل لگتا ہے۔ نماز نہ پڑھنے والے بچوں کو جب یہ کہا گیا کہ تم پانچ وقت کی نمازوں میں صرف فرض رکعتیں ادا کر لیا کرو تو بہت سے بچوں نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اور درست بات بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نمازوں میں فرائض کو فرض قرار دیا ہے، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ اور نوافل فرائض میں شامل نہیں ہیں۔ اگر سنتیں اور نوافل پڑھنا بھی لازم ہوتے تو انہیں بھی فرض قرار دیا جاتا۔

پس ایک شخص اگر صرف فرض رکعات ادا کر لیتا ہے تو اس کی نماز کا فرض ادا ہو جاتا ہے لیکن جو سنتیں اور نوافل پڑھتا ہے تو وہ افضل ہے۔ سنتیں اور نوافل پڑھنے کا نفع یہ ہے کہ قیامت والے اگر کسی کے فرائض میں کمی ہوئی تو وہ نوافل سے پوری کر دی جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«فَإِنْ انْتَقَصَ مِنْ فَرِيضَتِهِ شَيْءٌ، قَالَ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: انْظُرُوا هَلْ لِعِبْدِي مِنْ تَطَوُّعٍ فَيُكَمَّلَ بِهَا مَا انْتَقَصَ مِنَ الْفَرِيضَةِ، ثُمَّ يَكُونُ سَائِرُ عَمَلِهِ عَلَى ذَلِكَ»¹

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الصَّلَاةُ 69/2

”پس اگر اس کی فرض نماز کم نکلی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہیں گے کہ اس کی سنتوں اور نوافل کو تلاش کرو اور ان کے ذریعے اس کے فرض مکمل کر دو۔ اسی طرح کی بات نماز کے علاوہ فرائض میں بھی ہوگی۔“

نماز کے علاوہ فرائض میں جیسا کہ زکوٰۃ ہے۔ اگر قیامت والے دن کسی کی زکوٰۃ کم نکلی تو اس کے نفی صدقہ سے پوری کر دی جائے گی۔ اور اگر کسی کے فرض روزے کم نکلیں تو نفل روزوں سے پورے کر دیے جائیں گے۔ لہذا اس پہلو سے نوافل کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

اب یہاں پھر ڈر کی نفسیات کا شکار مذہبی طبقہ یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ آپ لوگوں کو سنتوں سے روک رہے ہیں حالانکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ جو سنتیں اور نوافل پڑھ رہے ہیں، انہیں پڑھتے رہنا چاہیے کہ بچوں کو بھی ہم یہ سمجھاتے ہیں کہ ایک امتحان میں پاس ہونا ہے اور ایک اچھا گریڈ لینا ہے تو دونوں میں فرق ہے۔ تو جس نے اچھا گریڈ لینا ہے تو وہ سنتوں اور نوافل کا بھی اہتمام کرے۔ اسی طرح جو نماز نہیں پڑھ رہے تو اب اگر وہ صرف فرض پڑھ لیں تو کیا آپ کے نزدیک صرف فرض پڑھ لینے والا اور بالکل ہی نماز نہ پڑھنے والا دونوں برابر ہیں؟ تو ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ پس ایسے لوگوں کو جو نماز پڑھنے کی طرف نہیں آتے تو انہیں یہ بتانا چاہیے کہ صرف فرض پڑھ لیں تو آپ کا نماز کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اور اس سے ہمارے معاشرے میں نمازیوں کی تعداد دو گنا ہو جائے گی۔

ایک دوست نے تبصرہ کیا کہ ”میرے ناقص خیال کے مطابق جس چیز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اس کے لیے ’ڈر کی نفسیات‘ لفظ مناسب معلوم نہیں ہوا، کیونکہ بندہ مومن سے یہ مطلوب ہے کہ اس کا دل ’تقویٰ اللہ‘ سے معمور ہو۔ لوگ اس طرح کے کاموں سے ڈرتے ہیں تو اچھا ہی کرتے ہیں، اس میں کیا خرابی ہے، تقویٰ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مباح چیزوں کو بھی ادنیٰ شبہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے۔“

اس پر ہم نے یہ تبصرہ کیا کہ آپ کا نکتہ اچھا ہے اور ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ

صریح حرام سے بچنے کے علاوہ شبہات میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ لیکن اختلاف صرف اتنا ہے کہ تقویٰ اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے نہ کہ دوسروں کے لیے۔ میں اگر خود سے مباح چیزوں کو ادنیٰ شبہ کی وجہ سے چھوڑ دوں تو یہ میرے تقویٰ میں شامل ہوگا لیکن میرا تقویٰ یہ نہیں ہے کہ میں ادنیٰ شبہ کی وجہ سے دوسروں کو مباح امور سے روکوں۔ ایک خدا کا ڈر وہ ہے جو ہمیں اپنے بارے میں محسوس ہو اور ایک وہ جو دوسروں کے بارے میں ہو تو دونوں میں فرق ہے۔ تقویٰ اور شیء ہے اور نہی عن المنکر اور باب ہے اور دونوں کے احکام مختلف ہیں۔

بحیثیت قوم ہماری یہ نفسیات بن چکی ہے کہ ہم آئیڈیل تقویٰ اپنی ذات کی بجائے دوسرے میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ جب کسی صحابی کو کسی علاقے کا گورنر بنا کر بھیجتے تھے تو یہ ہدایت فرماتے:

«بَشِّرُوا وَلَا تُنْفِرُوا، وَدَبِّرُوا وَلَا تُعَبِّرُوا»¹

”لوگوں کو خوش خبری والی باتیں بتلانا اور ان میں دین سے وحشت پیدا نہ کرنا۔

اور دین میں آسانی پیدا کرنا اور دین کے معاملے میں تنگی نہ کرنا۔“

جذبات کا اظہار

جذبات، انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے اور ان کے بغیر تو انسان کے انسان ہونے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ انسان کوئی روبرو ٹھوڑے ہیں کہ جذبات کا اظہار نہ کریں۔ اور دنیا کا عالمی معاشی نظام کمپیوٹرز اس وقت چاہتا یہی ہے کہ انسان کو روبرو بنا دے۔ سماجی اور انسانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں جس قدر ریسرچ ہو رہی ہے، اس کا ایک بڑا حصہ اسی مقصد کے لیے وقف ہے کہ انسان کے اخلاق اور رویوں کو بھی مشینی بنا دیا جائے۔ مثلاً فلاں موقع پر آپ نے یوں جواب (response) دینا ہے اور اس موقع پر یوں رد عمل کا اظہار (react) کرنا ہے یہ سب کچھ انسان کو اس طرح سکھایا جاتا ہے جیسے کہ سرکس کے گھوڑے کو کرتب کرنا

¹ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، والتبیر، باب فی الأمر بالتبیر وتترك التفتیر، 1358/3

(perform) سکھایا جاتا ہے۔

جدید دور میں آئیڈیل یا سپر ہیرو انسان کیسا ہو گا؟ پہلے سے نصب شدہ ہدایات (installed instructions) کا پابند کہ جس کا کوئی رد عمل (response) فطری نہ ہو بلکہ پہلے سے طے شدہ (programmed) ہو جیسا کہ کمپیوٹر پروگرامنگ کے ذریعے لمبی چوڑی ہدایات جاری کر دی جاتی ہے، اسی طرح سے اب جدید انسان کے ساتھ بھی کمپیوٹر کی طرح ایک روبوٹ کا سا معاملہ اختیار کیا جا رہا ہے کیونکہ جس قدر انسان روبوٹ بنے گا اسی قدر اس کو چلانا یا دوسرے الفاظ میں کنٹرول کرنا ان کے لیے آسان ہو گا۔ انہیں بس مشینی سوسائٹی (robotic society) چاہیے۔ اور سماجی اور انسانی علوم (Humanities and Social Sciences) روبوٹ ہی تو تیار کر رہے ہیں؟ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان بھیڑیں بن جائیں۔ دی میٹرکس (The Matrix) کا آئیڈیا کس نے دیا؟ ان کی اپنی سوسائٹی کے لوگوں نے۔ انہیں بھیڑیں بھی نہیں بلکہ روبوٹ چاہئیں کیونکہ بھیڑوں میں بھی جذبات ہوتے ہیں۔

ہمیں اس آئیڈیے سے اتفاق نہیں ہے جو کہ اسٹیون ہاکنگ (Stephen Hawking) نے پیش کیا ہے کہ ایک دور میں انسان کی تخلیق کردہ مشینیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ اس دنیا پر قبضہ کر لیں گی اور انسان کو غلام بنالیں گی۔ آپ مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) میں بھلے جتنی ترقی کر لیں اور دنیا کے ذہین ترین کمپیوٹر اور روبوٹ بنالیں لیکن اللہ کی بنائی ہوئی ذہانت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں یعنی انسان کا۔ البتہ یہ ممکن ہے بلکہ یہ انہوں نے کر کے دکھا دیا ہے کہ انسانوں کو مشین بنا دیں اور یہ روبوٹ کی طرح آپ کی بات مانیں۔

فلاں جذباتی انسان ہے؟ یہ جملہ ایک طعن بن چکا ہے اور ہر شخص یہ کہتا پھرتا ہے کہ جذباتی بات نہ کریں، جذباتی بات نہ کریں۔ اس جملے کا ایک پہلو درست ہے کہ جذبات ہی ہر وقت انسان پر غالب نہ رہیں۔ لیکن جذبات بالکل ہی ختم ہو جائیں اور ہر انسانی عمل اور رد عمل میں عقل شریف کا ہی عمل دخل رہ جائے تو پھر اس قسم کے

کیریکٹر کے لیے مشرقی روایت میں بے غیرت کی اصطلاح موجود ہے جو کہ خوش قسمتی سے دنیا کے ہر کچھر اور زبان میں بھی موجود ہے۔ کیا جذبات کے بغیر بھی انسان ہو سکتا ہے؟ غم و غصہ اور محبت و پیار وغیرہ یہ سب جذبات ہی تو ہیں۔ اور تو اور ایمان بھی ایک جذبہ ہی ہے۔

آپ مذہبی معاشرے پر ان کے جذباتی ہونے کی بنا پر طعن کرتے ہیں، آپ اپنی زبان کے سارے نامور شعر اٹھا کر دیکھ لیں، اور کسی ایک کے بارے ہی بتلادیں کہ اس کا کلام جذباتی نہیں ہے۔ آپ اپنا قومی ادب اور لٹریچر دریا برد کر دیں کہ یہ جذبات کی دنیا ہے۔ آپ اپنی فلم انڈسٹری پر پابندی لگا دیں کہ سب جذباتی اور رومانوی باتیں ہیں۔ کیا کوئی ایسی فلم آپ آج تک بنا سکے ہیں کہ جس میں جذبات نہ ہوں۔ جسے دیکھ کر آنکھیں نم نہ ہوں یا چہروں پر مسکراہٹ رقص نہ کرے۔

اگر محض جذباتیت کوئی خوبی نہیں ہے تو عقل محض بھی کوئی خیر نہیں ہے۔ حسن ان دونوں کے توازن میں ہے۔ اللہ نے انسان کو جذبات اور عقل دونوں عطا کیے ہیں اور اسی لیے دیے ہیں کہ کہیں جذبات کا اظہار کرے اور کہیں عقل سے کام لے۔ بہترین انسان وہی ہے کہ جس میں عقل اور جذبات دونوں کا اظہار اپنے اپنے محل اور مقام پر نظر آئے۔ اور یہی اعتدال ہے۔

روایات میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنو ہشام کی بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ ابو جہل کا تعلق بنو ہشام خاندان سے تھا اور فتح مکہ کے موقع پر ابو جہل کے دو بھائی اور ایک بیٹے اور اس کے علاوہ اس خاندان کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بنو ہشام نے اپنی بیٹی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینے سے پہلے اس بارے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی جبکہ اس سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلا چکی تھیں کہ علی رضی اللہ عنہ دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّ بَنِي هِشَامِ بْنِ الْمُغِيرَةِ اسْتَأْذَنُوا فِي أَنْ يُنْكَحُوا ابْنَتَهُمْ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ، فَلَا أَدْنُ، ثُمَّ لَا أَدْنُ، ثُمَّ لَا أَدْنُ، إِلَّا أَنْ يُرِيدَ ابْنُ أَبِي طَالِبٍ

أَنْ يُطَلِّقَ ابْنَتِي وَيَنْكِحَ ابْنَتَهُمْ، فَإِنَّمَا هِيَ بَضْعَةٌ مَيِّ، يُرِيئِي مَا أَرَايَهَا، وَيُؤْذِيَنِي مَا آذَاهَا»¹

”ہشام بن مغیرہ کے بیٹوں نے مجھ سے اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ پس میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ البتہ علی رضی اللہ عنہ چاہیں تو میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دیں اور اس کے بعد بنو ہشام کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جس چیز سے اس کو قلق پہنچتا ہے، اس سے مجھے قلق پہنچتا ہے۔ اور جس چیز سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے، اس سے مجھے بھی تکلیف پہنچتی ہے۔“

چونکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی والدہ اور ان کی بہنیں بھی فوت ہو چکی تھیں لہذا ان کی دل جوئی کرنے والا اللہ کے رسول ﷺ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ پس آپ ان کے ان حالات کے پیش نظر ان کے جذبات کا خصوصی دھیان رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی اور ان کی وفات کے بعد پھر آٹھ شادیاں کی ہیں اور ان کی ازواج میں ام بنین بنت حزام، لیلیٰ بنت مسعود، اسماء بنت عمیس، ام حبیب بنت ربیعہ، امامہ بنت ابی العاص، خولہ بنت جعفر، ام سعید بنت عروہ اور محیابہ بنت امری القیس رحمہم اللہ شامل ہیں۔² حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جو نسل آگے چلی ہے تو وہ سید کلماتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دیگر بیویوں سے جو نسل آگے چلی ہے تو وہ اعوان اور علوی کہلاتے ہیں۔

قرآنی احوال

احوال، حال کی جمع ہے اور حال وہ کیفیت ہے کہ جو انسان کے پورے وجود پر طاری ہو جیسا کہ جسم پر لرزہ طاری ہونا۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد

¹ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ذب الرجل عن ابنته في الغيرة والانصاف، 37/7

² الطبري، حمد بن جرير بن يزيد الأملي، أبو جعفر، (المتوفى: 310ھ)، تاريخ الطبري = تاريخ الرسل

والمملوك، وصلة تاريخ الطبري، دار التراث، بيروت، الطبعة الثانية، 1387ھ، 154/5

ﷲ کے نزدیک دور نبوی ﷺ میں قرآن مجید ہی تزکیہ کی واحد اور اکیلی بنیاد تھا۔ ان کے نزدیک قرآن مجید سے تزکیے کا اعلیٰ اور فوری طریقہ تہجد میں لمبے قیام میں قرآن مجید کو ترتیل کے ساتھ سمجھ کر پڑھنا ہے جیسا کہ سورۃ المزمل میں اس کا بیان ہے۔ قیام بالقرآن کی وہ بہت زیادہ ترغیب دیتے تھے۔ شروع کی قرآنی تربیت گاہوں کے جو احوال ان کی تحریروں میں ملتے ہیں، ان میں یہ بات بھی ہے کہ ستر کی دہائی میں ہونے والی قرآنی تربیت گاہ میں شریک ہونے والے رفقاء نے اجتماعی قیام الیل میں آٹھ دنوں میں قرآن مجید مکمل کیا۔¹

ڈاکٹر صاحب کے اکثر رفقاء قرآن مجید سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسا کہ کسی مجسم چیز سے محبت کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کا ادب، احترام، اس کو سینے سے لگانا، اس کو چومنا، سفر و حضر میں اس کا پاکٹ سائز نسخہ اپنے ساتھ رکھنا، اس کی تلاوت سے سکینت حاصل کرنا وغیرہ۔ یہ سب باتیں ان کی جماعت کے رفقاء میں عام ہے اور ان کے خواص کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ زندہ رہنے والے لوگوں میں سے ہیں، ان کا جینا، مرنا، نماز اور قربانی، قرآن مجید بن چکا ہے۔

ان کے ایک شاگرد کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگوں کو تو قرآن مجید سناتا ہوں، صاحب کلام کو بھی سنا دوں۔ تو انہوں نے اس غرض سے مسجد میں روزانہ ایک پارہ تہجد کی نماز میں پڑھنا شروع کیا۔ اور ستر ہویں دن کے بعد ان کی کیفیت یہ تھی کہ تہجد کے اشتیاق میں نینداڑی جاتی تھی اور تہجد کے قیام میں کیفیت وہی ہوتی تھی جو سورۃ النور میں بیان ہوئی:

﴿مَثَلُ نُورِهِ كَمِثْقَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحُ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُّورٌ عَلَى نُورٍ﴾ [النور: 35]

”اللہ کے نور کی مثال [مومن کے دل میں] ایسی ہی ہے جیسا کہ ایک طاقتی

¹ اسرار احمد، ڈاکٹر، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر، مرکزی انجمن خدام القرآن،

لاہور، 1990ء، ص 226

میں ایک چراغ ہو۔ اور وہ چراغ کسی قندیل میں ہو اور قندیل ایسے ہو جیسے کوئی بہت ہی روشن ستارہ۔ اور یہ چراغ زیتون کے ایک ایسے بابرکت درخت کے تیل سے روشن ہو کہ جو درخت نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اور زیتون کا وہ تیل از خود بھرنے کو تیار ہو، چاہے اسے کسی آگ نے نہ بھی چھوا ہو۔ اور یہ نور پر نور ہے۔“

قرآن مجید ہی سے تزکیہ کا حصول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا خاصہ معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ تصوف کے ابتدائی مصادر دیکھ لیے جائیں جیسا کہ الرسالة القشیریۃ، عوارف المعارف، التعرف، کشف المحجوب وغیرہ یا متاخرین مثلاً مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت اشرف علی تھانوی، مولانا عبد القادر رائے پوری رحمہم وغیرہ کی کتب اور سوانح کا مطالعہ کر لیا جائے یا معاصرین مثلاً ڈاکٹر عبد الحی، مولانا اللہ یار خان، خواجہ شمس الدین عظیمی، مولانا ذوالفقار نقشبندی وغیرہ کے ملفوظات کا مطالعہ کر لیں تو احساس ہو گا کہ کسی بھی زمانے یا سلسلے میں اصلاح نفس میں قرآن مجید سے احوال پیدا کرنے کو وہ مقام حاصل نہیں رہا ہے جو سماع، مثنوی یا مراقبہ وغیرہ جیسے ذرائع کو حاصل رہا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو اس بات کا نہ صرف یقین کامل حاصل تھا بلکہ اصرار بھی تھا کہ اللہ عز و جل سے اس نوعیت کا قرب کہ جیسا انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا، اس کے کلام کے علاوہ کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا اور یہی یقین انہوں نے اپنے شاگردوں میں بھی پیدا کر دکھایا۔ اس یقین میں ڈاکٹر اسرار رحمہ اللہ اور ان کے قریبی رفقاء واقعتاً منفرد ہیں۔

ان کے بعض رفقاء کا کہنا ہے کہ ہم قرآن ہی سے اپنا تزکیہ کریں گے اور اصلاح نفس میں اسی کو اپنا شیخ بنائیں گے۔ اسی سے مجمع احوال پیدا کریں گے۔ اگر نہ بھی ہوں تو ہم مجاہدہ کریں گے کہ ہم اسی کے مکلف ہیں۔ اور اگر قرآن مجید سے احوال نصیب نہ ہوں تو

ہم اپنے پروردگار کے سامنے روئیں گے کہ ہمیں اس سے وہ احوال نصیب فرمائے جو انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ملے تھے۔ اور ایسے ہی رونے والے پیدا کریں گے جو اس بات پر ہی مصر ہوں گے کہ ان کے جمیع احوال قرآن مجید ہی سے پیدا ہوں یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار سے اسی حال میں جا لیں اور کسی اور ذریعہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کے رفقاء میں بہت ہیں کہ جو قرآن مجید ہی کو اپنے تزکیہ کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور انہیں اگرچہ وہ احوال نصیب نہ بھی ہوں جو صوفیاء کو ہوتے ہیں، لیکن امید کی جاسکتی ہے کہ یہ قیامت والے دن اپنے مجاہدے اور اتباع سنت کے بدلے پروردگار سے زیادہ قریب ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنَّمَا أَجَلُكُمْ فِي أَجَلٍ مِّنْ خَلَا مِ الْأُمَمِ، كَمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصْرِ، وَمَغْرِبِ الشَّمْسِ، وَمَثَلُكُمْ وَمَثَلُ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى، كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَعْمَلَ عَمَّالًا، فَقَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي إِلَى نِصْفِ النَّهَارِ عَلَى قِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ الْيَهُودُ، فَقَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ إِلَى الْعَصْرِ عَلَى قِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ النَّصَارَى، ثُمَّ أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ مِنَ الْعَصْرِ إِلَى الْمَغْرِبِ بِقِيرَاطَيْنِ قِيرَاطَيْنِ، قَالُوا: نَحْنُ أَكْثَرُ عَمَلًا وَأَقَلَّ عَطَاءً، قَالَ: «هَلْ ظَلَمْتُكُمْ مِنْ حَقِّكُمْ؟» قَالُوا: لَا، قَالَ: «فَذَلِكَ فَضْلِي أُوتِيهِ مَنْ شِئْتُ»¹

”اللہ کے نبی ﷺ سے مروی ہے کہ میری امت کی عمر پچھلی امتوں کے مقابلے میں اتنی ہی ہے جتنا کہ عصر سے مغرب کے درمیان کا وقت ہے۔ اور میری امت اور یہود و نصاریٰ کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ ایک شخص نے کچھ لوگوں کو مزدوری پر رکھا۔ تو اس نے کہا کہ کون ہے کہ جو صبح سے زوال کے وقت تک ایک قیراط پر مزدوری کرے گا تو یہود نے کہا کہ ہم کریں گے۔ پس یہود نے صبح سے زوال تک ایک قیراط کے عوض مزدوری کی۔ پھر اس شخص نے کہا کہ کون ہے کہ جو زوال سے عصر کے وقت تک ایک قیراط پر مزدوری کرے تو نصاریٰ نے ظہر سے عصر تک ایک قیراط پر مزدوری کی۔ پھر اس شخص

¹ صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القرآن علی سائر الکلام، 191/6

نے کہا کہ کون ہے جو عصر سے مغرب تک دو قیراط پر مزدوری کرے۔ تو مسلمانوں نے عصر سے مغرب تک دو قیراط پر مزدوری کی۔ اس پر یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم نے کام زیادہ کیا ہے لیکن ہماری مزدوری کم ہے۔ تو اس شخص نے کہا کہ کیا میں نے جو مزدوری تم سے طے کی تھی، اس میں کوئی کمی کی ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔ تو اس شخص نے کہا کہ پھر یہ اضافہ میری طرف سے ہدیہ ہے کہ جس کو چاہوں میں دوں۔“

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آخرت میں جو مقام اور مرتبہ ملے گا اس کی بنیاد یہ نہیں ہوگی کہ کس نے کتنی محنت یا عبادت کی ہے بلکہ یہ کہ کس کی محنت کو اللہ نے کس قدر شرف بخشا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ دنیا میں جنہوں نے نیکی کا کام زیادہ کیا ہو، آخرت میں وہ لوگ ان سے آگے ہوں کہ جنہوں نے ان کے جتنا نیک عمل نہ کیا ہو لیکن اللہ عز و جل کو ان کا تھوڑا کام پسند بہت آیا ہو۔

اور احوال کا کیا ہے، وہ تو قوالی اور میوزک سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور سماع اور رقص و سرود سے بھی انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ میر وغالب کی شاعری بھی احوال پیدا کر دیتی ہے اور المیہ و طربیہ سے بھی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض ڈرامے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھتے ہوئے آہ و بکا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دامن آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے حالانکہ انسان جانتا ہے کہ یہ ڈرامہ ہے، حقیقت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس پر گریہ کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔

احوال تو شیطان کی طرف سے بھی ہوتے ہیں اور خود نفس کی طرف سے بھی اور سچے بھی ہوتے ہیں اور جھوٹے بھی لیکن قرآن سے جو بھی حال پیدا ہوگا، وہ سچا ہوگا۔ اور بقیہ ذرائع سے جو احوال پیدا ہوتے ہیں، ان پر زیادہ سے زیادہ مباح احوال کا حکم لگ سکتا ہے، اور نیکی تو اس مباح حال کے نتیجے میں کیے جانے والے عمل پر ملے گی جبکہ قرآنی احوال میں قرآن کا حال بذاتہ خود ہی ایک نیکی ہے، چاہے اس کے نتیجے میں کوئی نیکی عمل میں نہ بھی آئے۔ یہ اس بارے ایک اہم نکتہ ہے۔

سماع، میوزک، مراقبہ، شاعری اور المیہ سے کیفیات حاصل ہونے کے نتیجے میں وجد میں آنا یا آنسوؤں کا جاری ہونا کوئی نیکی نہیں ہے لیکن قرآن مجید کی تلاوت کے نتیجے میں آنسو جاری ہونا نیکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے رمضان کے مہینے میں کئی مرتبہ قرآن مجید براہ راست سننے کا اتفاق ہوا اور میں ان کے قریب ہی بیٹھتا تھا۔ اور عام طور محسوس کیا کہ قرآن مجید کے بیان میں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہوتی تھی۔ اسی طرح نماز میں کئی مرتبہ ان کے ساتھ یا پیچھے کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ میں نے انہیں قرآن مجید کی تلاوت کے سماع کے نتیجے میں وجد میں آکر دائیں بائیں جھومتے نہ دیکھا ہو۔ وہ آگے پیچھے نہیں جھومتے تھے جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور حفظ کے طلباء دوران حفظ آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں اور اس کی ایک وجہ وہ یہود کی مخالفت بتلاتے تھے کہ یہودی تورات کی تلاوت کرتے ہوئے آگے پیچھے جھومتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کرامت یہی تھی کہ وہ فرائض اور مستحبات کا اہتمام اور محرمات اور شبہات سے اجتناب کرنے والے تھے۔ اور اس میں خوب مجاہدے سے کام لینے والے تھے۔ قرآن اکیڈمی میں قیام کے دوران ان کے گھر سے مسجد کے درمیان میں میرا ہائٹی کمرہ تھا، اگر کبھی صبح کی جماعت سے سوتا رہتا تو نماز باجماعت کے لیے جاتے ہوئے کھڑکی سے نظر ڈالتے اور ڈانٹ کر اٹھا دیتے۔

قرآن اکیڈمی میں قیام کے دوران جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ان کے آفس وغیرہ میں ملاقات ہوئی تو اس میں ایک خاص کیفیت حاصل ہوئی یا صوفیائی اصطلاح میں ایک حال حاصل ہوا کہ جسے ”سکینت“ کا عنوان دیا جاسکتا ہے اور یہ بہت غالب اور نمایاں حال ہوتا تھا کہ جسے ان کا ہر رفیق محسوس کرتا تھا اور اس کی وجہ ان کا ”صاحب قرآن“ ہونا تھا۔ بلاشبہ جو بھی ”صاحب قرآن“ ہوگا، اس کی ذات سکینت کے نزول کا مرکز ہوگی اور اس کا ہر ساتھی اس کی صحبت میں اس سکینت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے قلبی سکون، اطمینان اور ایمان میں اضافے کو اسی طرح محسوس کر سکتا تھا جیسا کہ برف کی سل کے پاس ٹھنڈک اور آگ کے الاؤ کے پاس حرارت کا احساس۔

ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے جتنے بھی احوال پیدا ہوتے تھے، وہ قرآنی احوال تھے اور ایک لفظ میں ان جمیع احوال کا خلاصہ سکینت ہے۔ الحمد للہ! یہ احوال ایسے تھے کہ ان کے اللہ ہی کی طرف سے ہونے کی دلیل قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ دونوں میں موجود ہے۔ ایمان پر استقامت اختیار کرنے کی صورت میں فرشتوں کے نزول کا بیان قرآن مجید میں ﴿تَنْزِيلٌ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی صورت میں سکینت کے نازل ہونے کا بیان سنت میں «نزلت عليهم السكينة» کے الفاظ میں موجود ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ متصوفانہ مزاج رکھنے والے صلحا کی صحبت سے جو کیفیات دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان کی نوعیت میں گہرائی ہوتی ہے جبکہ قرآنی مزاج رکھنے والے اصحاب قرآن کی صحبت سے جو احوال دل میں پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنی نوعیت میں گیرائی اور وسعت رکھتے ہیں۔ صلحا اور زہاد کی صحبت سے قلب میں خشوع کی کیفیت عام طور پر پیدا ہوتی ہے جیسے ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ کی کیفیت جبکہ اصحاب قرآن کی صحبت سے ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت میں ذکر سے مراد ذکر الہی اور دوسری میں ذکر سے مراد قرآن مجید ہو جیسا کہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ میں ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بعض رفقاء کا کہنا ہے کہ آج اگر کوئی ہم میں اس بات کا اہتمام کر لے کہ اپنے گھر میں کسی کمرہ میں کسی وقت مثلاً مغرب تا عشاء کے درمیانی وقت کو قرآن مجید کی تلاوت کے لیے مختص کر لیا جائے کہ سب گھر والے جمع ہو کر تلاوت کریں اور اس میں نافرمانہ نہ کریں اور اس کمرے میں کوئی لغو کام بھی نہ ہو مثلاً بچوں کا کارٹون وغیرہ دیکھنا تو ایک ہی ہفتے کے بعد جو احوال اس مخصوص جگہ میں مخصوص اوقات میں تلاوت کرنے سے حاصل ہوں گے، وہی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی مجلس میں حاصل ہوتے تھے اور یہی سکینت کے احوال ہیں۔

ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب قرآنی اور روحانی احوال کا تقابل فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

”گھر سے آفس تک کے سفر میں مجھے اتنا وقت میسر ہوتا ہے کہ میں کسی نہ کسی علمی سرگرمی کو اپنا سکون۔ پھر چاہے وہ کتاب پڑھنا ہو، کوئی لیکچر سننا ہو یا پھر کسی بات پر غور و فکر کرنا، دوران سفر میں وقت نکال پاتا ہوں۔ ایسی ہی ایک شب آفس سے گھر واپسی پر پیدل جا رہا تھا اور ذہن کسی خاص آیت قرآنی پر غور میں مشغول تھا۔ ایسی حالت میں جب مگن ہوتا ہوں تو کوئی بار ایسا ہوا ہے کہ مجھ سے میرے جانے والوں نے شکوہ کیا کہ ہم آپ کو آوازیں دیتے رہے اور آپ نے سراٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ میں کسی آیت پر غور کرتا ہوا خرماں خرماں گھر جا رہا تھا جب کسی نے بالکل سر پر آکر مجھے تحکمانہ انداز میں مخاطب کیا: فکر نہ کرو، جلد تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔ میں نے چونک کر اپنی داہنی جانب دیکھا تو کم و بیش میرا ہی ہم عمر ایک انسان مجھ سے مخاطب تھا۔ شیو بڑھی ہوئی، بال الجھے ہوئے، کپڑے بے ہنگم اور صحت خستہ، میں نے اس سے مسکرا کر پوچھا: آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟ اس شخص نے اسی شاہانہ شان سے اثبات میں سر ہلایا اور دہرایا: فکر نہ کرو، جلد تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔ میں نے مسکراتے ہوئے تعجب سے پوچھا: کیسی مشکل؟ اس نے کہا: وہی زندگی کی مشکل جس کے بارے میں تم ابھی ابھی سوچ رہے تھے۔ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا: میں تو زندگی کی کسی مشکل کے بارے میں سوچ نہیں رہا تھا، بلکہ ایک آیت قرآنی پر تدبر کر رہا تھا۔ اب میرا یہ عزیز ٹیٹیا اور پھر سنبھل کے اسی تحکمانہ بھاری آواز میں کہا: فکر نہ کرو میں جانتا ہوں کہ تم بہت پریشان ہو، تمہاری ساری پریشانیوں کا علاج ہے میرے پاس۔ میں دھیمے سے ہنسا اور بولا: بہت شکریہ بھائی، مگر میں تو الحمد للہ! ذرا سا بھی پریشان نہیں بلکہ پوری طرح پرسکون ہوں۔ اب اس بھائی کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار تھے، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کہے؟ شاید یہ بات اس کے

تصور میں بھی نہ تھی کہ اس کا مخاطب کسی بھی پریشانی اور تکلیف کا شکوہ نہیں رکھتا۔ وہ کچھ دیر سوچ کر بولا: مجھے روحانیت عطا کی گئی ہے اور میں تمہارے مسائل حل کر سکتا ہوں۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے وہی جواب دہر ا دیا: میں تو پہلے ہی اللہ کی رحمتوں سے سرشار ہوں، البتہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کس نے بتایا کہ تمہیں روحانیت عطا ہوئی ہے؟ اب اس نے تفصیل بتائی جس کے مطابق ان کے گاؤں میں کوئی پیر صاحب تھے جنہوں نے اس کے سینے میں روحانیت منتقل کر دی ہے اور اب وہ اپنا ہاتھ کسی کے بھی سینے پر رکھ کر اسے خوشی سے سرشار کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے پوری شد مد سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دبا یا اور پھر اعتماد سے فخر یہ پوچھا: کیسا محسوس ہوا؟ میں نے مسکرا کر جواب دیا: بالکل ویسا ہی جیسا آپ کے ہاتھ رکھنے سے پہلے محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اس بھائی کے چہرے پر شدید بیچارگی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ روحانیت کوئی ایسی جادوئی شے نہیں جو عبادات و معاملات میں درستی کے بغیر کسی پیر یا مولوی سے عطا ہو جائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی اللہ کی کتاب کو سمجھ کر پڑھا ہے تو اس نے تذبذب سے نفی میں سر ہلادیا۔ میں نے سمجھایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم دین اسلام میں روحانیت کا حصول کرنا چاہو اور اس کلام کو کبھی سمجھو ہی نہیں جو تمہارے رب نے نازل کیا ہے؟ میں اسے کافی دیر سمجھاتا رہا، اسے بھی میری باتیں کسی حد تک سمجھ آنے لگی تھیں مگر شاید ابھی بھی اس کا ذہن اپنے روحانی ماہر نہ ہونے کا اقرار نہ کر پارہا تھا لہذا بولا کہ میں تمہیں آیات قرآنی کا ایک ایسا طاقتور وظیفہ دیتا ہوں کہ جس سے تمہاری ہر مراد پوری ہو سکے گی۔ یہ کہہ کر اس نے اللہ کے دو متفرق صفاتی نام بیان کر کے مجھ سے صبح شام اسے مخصوص تعداد میں پڑھنے کا تقاضا کیا۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ ٹھیک ہے میں انہیں پڑھ لوں گا مگر کیا تم مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ کتاب الہی سمجھ کر پڑھو گے؟ اس نے ارادہ کیا اور شاید چاہا کہ میں اسے مزید کچھ قرآن حکیم کے بارے میں بیان کروں۔ میں دیر تک

اسے قرآن کا پیغام سمجھاتا رہا، جب بات مکمل ہو گئی تو ساتھ ہی اس نے خود پر چڑھی روحانیت کی نقاب بھی اتار پھینکی۔ میں نے اس کے حالات پوچھے تو قریب قریب روتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کی اذیتیں بتانا شروع کیں۔ اس نے بتایا کہ کیسے کیسے اسے اس کے سگوں نے دھوکہ دیا اور ذلیل کیا۔ یہ بیان کرتے ہوئے کبھی وہ نم دیدہ اور کبھی غصہ سے آگ بگولہ ہو جاتا۔ اسی دوران جذبات میں اس نے پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں بھرپور تلفظ کے ساتھ ماں بہن کی گالیاں بھی دیں۔ وہ شخص جو کچھ دیر پہلے میری ہر اذیت دور کرنے کا روحانی علاج بتانا چاہتا تھا اور جسے خود کے بارے ایک کامل صوفی ہونے کا گمان تھا، اس وقت مجھے شدید کرب میں مبتلا ایک ہارا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے میرا نمبر لیا اور رخصت ہو گیا۔ دوسرے دن اس کی کال آئی اور اس نے پھر ملنے کی درخواست کی، جس پر ہم ایک بار پھر ملے۔ اس بار وہ بولنے سے زیادہ سنا چاہتا تھا۔ یہ اس سے آخری ملاقات تھی اور مجھے امید ہے کہ وہ کم از کم روحانی ہونے کے اس دھوکے سے باہر آ گیا تھا جس نے اس کے طرز متخاطب کو متکبرانہ بنا رکھا تھا۔ افسوس ہے کہ آج میرے ملک میں ہر دوسرا شخص روحانیت کی دکان کھولے بیٹھا ہے اور سادہ مزاج لوگوں کو بے سر پیر کے جادوئی علاج، وظیفے وغیرہ تجویز کر رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کی عبادات، اخلاق اور معاملات میں درستگی لائی جائے۔ انہیں تفرقہ کی آگ سے نکالا جائے اور انہیں قرآن حکیم سمجھنے پر راغب کیا جائے۔¹

مفتدین صوفیاء ہر گز ایسے نہیں تھے جیسا کہ آج کل کے صوفی ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف کا اصل عبادت میں احسان پیدا کرنا، اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا اور اخلاق حسنہ سے متصف کرنا تھا۔ اور آج کل کا تصوف مراقبہ، تصور شیخ، کشف قبور، پاس انفاس، قوالی، رقص، وجد طاری کرنے، مرغ بسمل کی طرح تڑپنے، قلب جاری کرنے بلکہ اب تو بعض گھنٹنا بھی جاری کرتے ہیں وغیرہ جیسی بدعات کا نام بن چکا ہے کہ جن کا

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

دین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کے رسول ﷺ نے ان ذرائع سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصلاح فرمائی اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان میں سے کسی چیز کو بطور ذریعہ اختیار کرتے ہوئے تابعین کی تربیت فرمائی اور نہ ہی تابعین نے ان میں سے کسی شے کو ذریعہ کا درجہ دیتے ہوئے تبع تابعین کی اصلاح کی کوشش کی۔ مذکورہ بالا ذرائع سے جو کچھ احوال حاصل ہوتے ہیں، وہ ہر گز دینی احوال نہیں بلکہ انسانی ذہن کے احوال ہیں اور ان کا خالق بھی انسان کا ذہن ہی ہوتا ہے، چاہے ان کا احساس قلب میں جاری ہو جیسا کہ مختلف مذاہب کی روایتوں میں ان موضوعات کا گہرا اور سنجیدہ مطالعہ بھی ہمیں اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔ دین اسلام میں تربیت اور اصلاح کے ذرائع بالکل اور ہیں جو کہ نماز، تلاوت، روزہ، صدقہ، دعا اور ذکر وغیرہ ہیں۔

دین میں اعتدال

حسن اور خوبصورتی اعتدال ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسلام ہمیں دین کے معاملے میں افراط و تفریط (extremes) سے اجتناب اور اعتدال کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے زیادہ عمل نہیں بلکہ خوبصورت عمل مطلوب ہے۔ اور خوبصورت عمل وہ ہے کہ جس میں اعتدال اور میانہ روی ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ
الْغَفُورُ﴾ [المَلِك: 2]

”اللہ نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ تمہاری اس بارے آزمائش کرے کہ تم میں سے کون ہے جو بہترین عمل کرنے والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے، بخشنے والا ہے۔“

بعض اوقات مذہبی ذہن کی نفسیات یہ بن جاتی ہے کہ وہ نیکی کو گننا شروع کر دیتے ہیں اور کثرت اعمال کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اتنی نفلیں پڑھ لی ہیں یا اتنی بار درود شریف پڑھ لیا ہے یا اتنا صدقہ کر دیا ہے وغیرہ جبکہ دین میں کیفیت (quality) مطلوب ہے نہ کہ گنتی (quantity)۔ اذکار میں زیادہ سے زیادہ گنتی کا جو ذکر ہے وہ سو

کے عدد کا ہے۔ اور اس میں بھی اصل مقصود ایک خاص تعداد میں ذکر کے ذریعے یاد الہی کی کیفیت میں بہتری لانا ہے۔

اور مزاج میں اعتدال ہو گا تو نیک اعمال میں کیفیت کو گنتی پر ترجیح حاصل ہوگی۔ پس جس مزاج میں اعتدال نہیں ہو گا تو وہ گنتی کو کیفیت پر ترجیح دے گا اور معتدل مزاج کیفیت کو گنتی پر اہمیت دے گا۔ اور مزاج میں اعتدال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ انسان طرفین اور جانین سے واقف ہو۔ اگر انسان کا مطالعہ صرف خیر کا ہو تو امکان ہے کہ وہ خیر کے معاملے میں غلو کا شکار ہو جائے اور اگر اسے خیر کے ساتھ شر کا بھی علم ہو گا تو خیر کے معاملے میں معتدل رویہ اختیار کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

دین میں سختی، غلو کی ایک قسم ہے اور غلو، اعتدال کے منافی ہے۔ جہاں غلو ہو گا، وہاں اعتدال نہیں ہو سکتا اور جہاں اعتدال ہو گا، وہاں غلو نہیں ہو سکتا۔ پس نیکی اور دین کے معاملے میں غلو اور انتہا پسندی سے بچنا چاہیے اور میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ»¹

”دین آسان ہے۔ اور جو بھی دین کے معاملے میں سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا۔ پس تم میانہ روی اختیار کرو اور کمال کو نہ بھی پاسکو تو اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرو۔ اور خوش خبری حاصل کرو۔ اور صبح، شام اور رات کے ایک حصے میں عبادت پر اکتفا کر لیا کرو۔“

ہمدردی اور احترام

فیملی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے آیا تھا کہ پارکنگ میں گاڑی لگاتے ہوئے احساس ہوا کہ دائیں طرف ایک بائیک کھڑی ہے اور درمیان میں فاصلہ بہت کم ہے لہذا بہت احتیاط سے گاڑی پارک کرنی ہوگی۔ اچانک نظر پڑی کہ پارکنگ میں کھڑی

¹ صحیح البخاری، کتاب الإيمان، باب: الدِّينُ يُسْرٌ، 16/1

بانیک پر کوئی لگ بھگ تیس سال کی عمر کا ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا اور پریشان دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بانیک اس کی اپنی نہیں ہے۔ ایک طرف تو یہ دل کیا کہ ہارن دے کر اسے متنبہ کروں کہ بانیک تھوڑی اُدھر کر لے۔ پھر یہ سوچا کہ میں خود ہی کچھ ہمت کر کے گاڑی جیسے تیسے کھڑی کر لوں، اس بچارے کو تکلیف نہ ہی دوں تو اچھا ہے کہ معلوم نہیں کس پریشانی میں ہے۔

گاڑی کھڑی کر کے ریستورنٹ میں داخل ہوئے۔ کھانے کا آرڈر دیا اور کھانا لگائے جانے سے پہلے اس شخص کو میں نے دوبارہ ریستورنٹ کے ایک کونے میں ایک میز پر کسی گہری سوچ میں نظریں جھکائے بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ اس کی گود میں تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ کپڑے بس مناسب سے تھے جیسے کسی درمیانے درجے کے ریستورنٹ میں کام کرنے والے ملازمین کے ہوتے ہیں اور چہرے پر پریشانی بلکہ کرب کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ اپنی پوزیشن میں ساکت تھا جیسے کہ اس کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے حلیے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کی طرف بار بار دیکھوں۔ اسی دوران میں نے غور کیا کہ ریستورنٹ میں کام کرنے والے ملازمین میں سے ایک دو نے ایک دو بار اسے مخاطب کر کے کچھ کہا بھی۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ شاید وہ یہاں ملازم ہو لیکن وہ گاہکوں کے سامنے کھانا نہیں لگا رہا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران اس نے ایک آدھ بار نظریں اٹھا کر ہماری طرف یا شاید کھانے کی طرف دیکھا۔ اس سے احساس پیدا ہوا کہ شاید اسے بھوک لگ رہی ہے۔ چونکہ اس ریستورنٹ میں پردے کے کچھ بہتر انتظامات ہونے کی وجہ سے فیملی کے ساتھ اکثر آنا جانا رہتا تھا لہذا اس کے عملے سے میں بخوبی واقف تھا۔ اس لیے اگر اس شخص کا تعلق ریستورنٹ کے عملے سے بھی تھا تو یہ ایک نیا اضافہ تھا۔ اب دل میں یہ خیال آیا کہ اس کا تعلق ریستورنٹ کے عملے سے معلوم ہوتا ہے لہذا کھانا تو اسے یہاں سے مل ہی جاتا ہوگا، چاہے گاہکوں کا بچا کچھا ہو جبکہ اس کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ وہ مسئلہ کیا ہو سکتا ہے؟

دھیان کھانے سے زیادہ اس کے بارے غور کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک ذہن میں یہ بات آئی، ہم میں ہر دوسرے شخص کا مسئلہ پیسہ ہے یا اگر پیسہ نہیں بھی ہے تو پیسہ ایک ایسی چیز ہے جو اس کا مسئلہ حل کر سکتی ہے۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی خوشی ہوئی کہ میں نے اس کے غم کا علاج معلوم کر لیا ہے۔ اب اس پر غور کرنے لگا کہ اسے پیسے کیسے دوں؟ ایک دفعہ ذہن میں آیا کہ کھانا کھا کر واپس جاتے چپکے سے اس کے ہاتھ میں کچھ رقم پکڑا دوں گا۔ پھر معافیہ خیال ذہن میں آیا کہ اگر اس کا مسئلہ پیسہ نہ ہو تو اس طرح اسے رقم دینے سے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچے گی۔ اب تو نفس میں گویا ایک کشمکش سی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ اسے کچھ رقم دینے کے لیے آمادہ کرتا تھا اور اس کے احترام کا جذبہ اس میں رکاوٹ بن جاتا تھا کیونکہ وہ سوالی بہر حال نہیں تھا۔ بہر حال فیملی نے کھانا کھایا اور میں اسی کشمکش کے ساتھ ریٹورنٹ سے گھر کی طرف روانہ ہوا اور کافی دیر یہی سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مہینے بعد پھر اسی ریٹورنٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پھر اسی شخص کو اسی کیفیت میں اسی میز پر اسی انداز میں بیٹھے دیکھا تو ہمدردی کا جذبہ ایک دفعہ پھر شدت سے بیدار ہو گیا۔ لیکن احترام کے جذبے نے کوشش کے باوجود ہمت نہیں پڑنے دی کہ میں اسے کچھ رقم دے سکتا۔ ریٹورنٹ سے کھانے کھا کر باہر نکلے، گاڑی میں بیٹھے تو گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے اپنے بیٹے، جو کہ آٹھ سال کا ہے، کے ہاتھ میں کچھ رقم رکھی اور کہا کہ چپکے سے اندر جا کر اس شخص کے ہاتھ میں رکھ کر واپس آ جاؤ۔ میں ابھی اپنے بیٹے کو اس کام سے بھیج ہی رہا تھا کہ اہلیہ نے یہ بات سن لی جو گاڑی میں ابھی بیٹھ ہی رہی تھیں۔ وہ کہنے لگیں: کیا کرتے ہیں، اسی طرح کسی کو کیوں تکلیف (hurt) دیتے ہیں؟ معلوم نہیں کس پریشانی میں ہے؟ اس طرح پیسے دینا اسے اچھا بھی لگے یا نہیں؟ اہلیہ کی یہ بات سن کر میں ایک دفعہ پھر سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس کی ہمدردی کا جذبہ جو غالب آچکا تھا، وہ اس بات پر پھر مغلوب ہو گیا اور اس کے احترام کا جذبہ غالب آ گیا۔

مقصد یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی مدد کرتے ہوئے اس کے احترام اور وقار کو پیش نظر رکھنا چاہیے مثلاً اگر کسی عزیز رشتہ دار کو زکوٰۃ کی رقم دینی ہے تو اسے یہ بتلانا نہیں چاہیے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے کہ اس سے اس کے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں۔ بس جب آپ نے اس کے حالات سے یہ اندازہ لگالیا کہ وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے تو آپ اسے یہ بتلائے بغیر کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے، زکوٰۃ ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کی مدد کرنی ہو تو کوشش کرے کہ اس طرح غیر محسوس انداز میں ہو کہ اگلا اس کا احسان مند نہ رہے۔ ہمارے ایک استاذ صاحب نے کلاس میں اگر کسی غریب طالب علم کی مدد کرنی ہوتی تھی تو اس سے سبق سنتے تھے اور سبق سنانے پر تعریف کرتے ہوئے جیب سے پیسے نکالتے اور بطور انعام کے شاباش کے طور پر طالب علم کو پکڑا دیتے تھے۔

اسی طرح یہ بھی کہنا ہے کہ کسی کا احترام اس قدر غالب نہ آجائے کہ آپ اس کے احترام کے نتیجے میں اس سے نیکی کرنے سے ہی رہ جائیں۔ یہ توازن نہیں ہے جیسا کہ اس واقعے میں میرے ساتھ ہوا ہے۔ احترام ضروری ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری نیکی کرنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے فلاں رشتہ دار ضرورت مند ہیں لیکن ساتھ میں یہ خیال بھی ہے کہ اگر براہ راست ان کے ہاتھ میں کچھ رقم پکڑا دی تو محسوس کریں گے تو ایسی صورت میں غیر محسوس انداز میں رقم دینے کا کوئی طریقہ سوچیں اور اگر نہیں بن پڑتا تو رقم دے کر نیکی ضرور کریں اور بعد میں اس پر استغفار کر لیں کہ اگر ان کی کوئی دل آزاری ہوئی ہے تو اللہ معاف فرمائے۔ اللہ عزوجل قرآن مجید میں اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ﴾

[المؤمنون: 60]

”اور یہ وہ لوگ ہیں جو وہ اللہ کی راہ میں دے سکتے ہیں، دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے دل اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنی رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

تو اللہ کے بندے تو وہی ہیں کہ جو صدقہ کرتے ہوئے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ نہ

معلوم اللہ اس نیک عمل میں کسی کمی کو تاہی پر ہی نہ پکڑ لے۔ ایک ہی شخص کے بارے بعض اوقات ہم ایک سے زائد قسم کی سوچ اور جذبات رکھتے ہیں یا ان میں مبتلا ہوتے ہیں جس کا اثر ان کے بارے ہماری ذات سے جنم لینے والے رویوں پر پڑتا ہے۔ اور یہ جذبات ہی ہیں کہ جو ہمیں کچھ کام کرنے پر آمادہ کرتے ہیں اور یہی جذبات ہیں کہ جو کسی کام کے کرنے میں رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں۔ لہذا ان جذبات کی اصلاح اور ان میں اعتدال پیدا کرنا بہت ضروری ہے اور دل میں پیدا ہونے والے مختلف جذبات کو ہم نے اس کتاب کے دسویں باب میں موضوع بحث بنایا ہے۔

نیکی میں کمال

درجہ احسان نیکی کر لینے کا نام نہیں ہے بلکہ نیکی میں کمال پیدا کرنے کو احسان کہتے ہیں۔ اللہ عزوجل کے مقرب ترین بندے وہی شمار ہوتے ہیں کہ جو اپنی نیکی میں کمال پیدا کر لیں۔ نیکی کر لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور نیکی میں کمال پیدا کرنا تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمْ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ، يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: الْإِمَامُ الْعَادِلُ، وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ طَلَبَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ، أَخْفَى حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ»¹

”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ سات شخص ایسے ہیں کہ جنہیں قیامت والے اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایے میں جگہ دے گا کہ اس دن اس سایے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا۔ ان میں پہلا شخص وہ حکمران ہے جو کہ عدل و انصاف کرنے والا ہو۔ اور دوسرا وہ نوجوان ہے کہ جس کی جوانی اپنے رب کی عبادت میں گزری ہو۔ اور تیسرا وہ شخص ہے

¹ صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب مَنْ جَلَسَ فِي الْمَسْجِدِ يُتَعَفَّرُ الصَّلَاةَ وَفُضِّلَ الْمَسَاجِدُ، 1/133

کہ جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔ اور چوتھا وہ دو شخص ہیں جو صرف اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں اور اللہ ہی کے لیے ملتے ہیں اور اللہ ہی کی خاطر جدا ہوتے ہیں۔ اور پانچواں وہ شخص کہ جسے کسی حسب نسب والی حسین و جمیل عورت نے برائی کی دعوت دی ہو اور اس نے جواب میں یہ کہا ہو کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اور چھٹا وہ شخص کہ جس نے اس طرح چھپا کر صدقہ کیا ہو کہ اگر دائیں ہاتھ سے کیا تو بائیں کو بھی علم نہ ہوا۔ اور ساتواں وہ شخص کہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔“

اگر اس روایت میں غور کیا جائے تو یہ ساتوں وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی نیکی میں کمال پیدا کیا ہے۔ عام آدمی تو عدل کرتا ہی ہے لیکن حکمران کا عادل ہونا تو یہ ”اختیار میں کمال“ کا درجہ ہے۔ اسی طرح عبادت تو بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن جوانی کی عبادت میں ”عبادت کا کمال“ ہے۔ اور مسجد میں جانے والے بھی بہت ہوتے ہیں لیکن مسجد میں اس قدر دل لگنا کہ ایک نماز کے بعد دوسری کے انتظار میں رہے تو یہ ”بندگی میں کمال“ ہے۔ اور محبت تو بہت سے لوگ آپس میں کرتے ہیں لیکن اللہ کے لیے محبت کرنا کہ اللہ ہی کے لیے ملاقات کرے اور اللہ ہی کے لیے جدا ہو تو یہ ”معاشرت میں کمال“ ہے۔

اور برائی کی دعوت تو کسی طوائف کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے لیکن کسی خاندانی اور حسین و جمیل عورت کی طرف سے برائی کی دعوت کو رد کرنا تو یہ ”تقویٰ میں کمال“ ہے۔ اور صدقہ تو بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن ایسے کرنا کہ بائیں ہاتھ کے علم میں بھی نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا صدقہ کیا ہے تو یہ ”صدقہ میں کمال“ ہے۔ اور اللہ کے سامنے رونے والے تو بہت ہیں لیکن تنہائی میں رونادراصل ”اخلاص میں کمال“ ہے۔ تو بہت سی نیکیاں کرنے سے بہتر ہے کہ ایک نیکی کریں اور اس میں کمال پیدا کریں۔ پس اللہ نے چاہا تو یہی نیکی قیامت والے دن نہ صرف ہماری نجات بلکہ مقررین میں سے ہونے کا ذریعہ بن جائے گی۔ اور نیکی میں کمال کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس میں دوام اور پیدائش ہو۔

توبہ کا حال

توبہ یہ نہیں ہے کہ استغفار کی تسبیح کے ہزار دانے صبح گرا دیے اور ہزار شام کو بلکہ توبہ تو ایک ایسا حال ہے جو پہلے انسان کے دل پر طاری ہوتا ہے، پھر اس کی آنکھوں سے جھانکتا ہے اور پھر اس کے پورے وجود کو سمیٹ لیتا ہے۔ توبہ یہ ہے کہ پہلے دل میں اپنی کوتاہی اور نافرمانی پر شرمندگی اور ندامت کا احساس پیدا ہو، پھر اسی احساس سے آنکھیں نم ہو جائیں، اور بالآخر انسان اپنے وجود کو اس احساس کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدے میں ڈال دے کہ پروردگار! جب اسے آپ کے سامنے جھکا دیا تو اب جھکائے ہی رکھوں گا۔

ہمارے ہاں توبہ استغفار رسم بن چکی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم توبہ استغفار کرتے ہوئے اس کے معانی پر کما حقہ غور و فکر نہیں کرتے۔ توبہ محض گناہوں کی معافی طلب کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ تو اللہ سے اس کی رحمت کا مطالبہ بھی ہے۔ استغفار کا لفظ مغفرت سے نکلا ہے اور مغفرت عربی زبان میں ڈھانپ لینے کو کہتے ہیں۔ پس استغفار کرنے والا شخص اپنے پروردگار سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیں کہ جس طرح ایک مرغی چیل کو دیکھ کر اپنے بچوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے بھی شیطان مردود اور نفس کی شرارتوں سے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے روایات میں ملتا ہے کہ آپ ایک مجلس میں سو مرتبہ استغفار کر لیتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: إِنْ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَجْلِسِ الْوَاحِدِ مِائَةَ مَرَّةٍ: «رَبِّ اغْفِرْ لِي، وَتُبْ عَلَيَّ، إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ»¹

”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم اللہ کے رسول ﷺ کی مجلس میں بیٹھ کر باقاعدہ شمار کیا کرتے تھے کہ آپ ایک مجلس میں سو مرتبہ یہ

¹ سنن أبي داود، باب تَقْرِيعِ أَبْوَابِ الْوُثْرِ، بَابُ فِي الْإِسْتِغْفَارِ، 85/2

کلمات پڑھ لیتے تھے کہ اے میرے رب! مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے، اور اپنی رحمت کے ساتھ مجھ پر رجوع فرما، اور بے شک آپ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رجوع کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔“

توبہ کا معنی بھی لوٹنے اور رجوع کرنے کا ہے۔ بندے کی توبہ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹ جائے کہ جیسے کوئی بچہ اپنے والدین سے لڑ جھگڑ کر یا روٹھ کر گھر چھوڑ گیا تھا لیکن بعد میں والدین کے احسانات یاد آنے پر واپس گھر لوٹ آیا۔ پس بندے نے غفلت، لاعلمی، یا خواہش کی وجہ سے اپنے مالک سے جو منہ موڑ لیا تھا تو واپس اسی کی طرف اپنا منہ کر لے۔ سچی توبہ ایک ایسا حال ہے جو سلوک کی منازل طے کرتے ہوئے کبھی نیچے گر جانے پر فوراً وہاں ہی پہنچا دیتا ہے کہ جہاں سے انسان گرا ہو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ، كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ»¹

”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔“

دنیا میں کوئی گاڑی ایسی نہیں ہے کہ جسے زیرو میٹر کنڈیشن میں واپس لایا جاسکے لیکن توبہ انسان کو واپس اسی حالت میں لے جاتی ہے کہ جبکہ وہ گناہوں سے بالکل پاک تھا، ایک معصوم بچہ تھا۔ اگر انسان کی پرانی گاڑی اپنی زیرو میٹر کنڈیشن میں واپس ہو جائے تو اس کے لیے کس قدر خوشی کا باعث ہوگی، اسی طرح توبہ بھی بندہ مومن کے لیے ایسی ہی دلی خوشی کا باعث بن جاتی ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ ہر انسان کے دل میں اللہ نے ایک پودا لگایا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو توبہ کرنے سے یہ پودا کھل اٹھتا ہے اور انسان خوش ہو جاتا ہے۔ اور توبہ نہ کرنے سے یہ پودا مر جھا جاتا ہے اور انسان مایوسی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اندر کی خوشی اور باطنی سکون نہ تو آپ کو دنیا کی آسائشوں سے مل سکتا ہے اور نہ ہی سائیکالوجسٹ دے سکتے ہیں۔ یہ خوشی نہ تو یوگا سے حاصل ہونے والی ہے، نہ ہی

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّہد، باب ذِکْرِ النَّوْثَةِ، 1419/2

میڈیٹیشن سے اور نہ ہی ترک دنیا سے۔ اور ان راستوں سے جو خوشیاں حاصل بھی ہوتی ہیں، وہ جھوٹی، بناوٹی اور عارضی خوشیاں ہیں۔ اصل خوشی تو اپنے رب کے سامنے اپنے گناہوں پر شرمندگی کے اظہار، اپنی آنکھوں کو غم کرنے اور اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دینے سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ توبہ ایک ایسا عمل ہے کہ پروردگار کو بھی اس سے خوشی ہوتی ہے۔ اور جب رب اپنے بندے سے خوش ہوتا ہے تو وہ اسے خوشی عطا بھی کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«لَللّٰهِ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ حِينَ يَتُوبُ إِلَيْهِ، مِنْ أَحَدِكُمْ كَانَ عَلَى رَاحِلَتِهِ بِأَرْضٍ فَلَاةٍ، فَأَنْفَلَتْ مِنْهُ وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشِرَابُهُ، فَأَيْسَ مِنْهَا، فَأَتَى شَجَرَةً، فَاضْطَجَعَ فِي ظِلِّهَا، قَدْ أَيْسَ مِنْ رَاحِلَتِهِ، فَبَيْنَا هُوَ كَذَلِكَ إِذَا هُوَ بِهَا، فَأَيْمَمَةً عِنْدَهُ، فَأَخَذَ بِخَطْمِهَا، ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ: اللَّهُمَّ أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّكَ، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ»¹

”جب بندہ اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے تو اللہ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ جتنی ایک ایسے شخص کو جو اپنی سواری پر کسی صحرا میں سفر کر رہا تھا کہ وہ [کہیں سستانے کے لیے رکا اور وہ] سواری اس سے گم ہو گئی جبکہ اس کا کھانا پینا اسی سواری پر تھا۔ پس جب وہ اس کی تلاش سے مایوس ہو گیا تو ایک درخت کے سایے میں لیٹ گیا۔ پس اسی مایوسی کی حالت میں تھا کہ اچانک اس کی سواری اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس نے اس کی لگام پکڑی اور اس قدر خوش ہوا کہ کہنے لگا: اے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب۔ پس خوشی کی شدت کی اس قدر تھی کہ اس نے غلط جملہ بول دیا۔“

سواری کے اچانک مل جانے پر اس کی خوشی کی شدت اس قدر تھی کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پس توبہ اگر دل میں خوشی کی کیفیت پیدا نہ کرے تو اس توبہ سے بھی توبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ سچی توبہ ہمیشہ دل میں خوشی پیدا کرتی ہے۔ بعض اوقات انسان کسی گناہ کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ عادت بد اس سے چھوٹی نہیں

¹ صحیح مسلم، کتاب التَّوْبَةِ، بَابُ فِي الْحَقِيقِ عَلَى التَّوْبَةِ وَالْفَرَحِ، 2104/4

ہے۔ پس ایک دفعہ اس پر توبہ کرتا ہے اور گناہ نہ کرنے کا عزم کرتا ہے۔ پھر اپنا عزم توڑتا ہے اور اسی گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر توبہ کر لیتا ہے اور دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم کر لیتا ہے۔ پھر اپنا عزم توڑتا ہے اور اسی گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شیطان انسان کو دوسرے ڈالتا ہے کہ یہ گناہ تو تجھ سے چھوٹنے والا نہیں لہذا ایسی توبہ کا کیا فائدہ کہ کل پھر گناہ کرنا ہو۔ اس طرح انسان سے گناہ تو چھوٹتا نہیں لیکن شیطان توبہ بھی چھڑوا دیتا ہے۔ بھلے گناہ نہ چھوٹے لیکن کسی صورت توبہ کرنا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ عقلمندی نہیں ہے کہ گناہ نہ چھوٹ رہا ہو تو میں نیکی کرنا بھی چھوڑ دوں اور توبہ کرنے سے بڑھ کر نیکی کا عمل کیا ہو گا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بتلایا ہے کہ گناہ نہ کرنے کے بعد کوئی نیکی کر لیا کرو تو وہ گناہ کے اثرات کو کم کر دے گی۔ اور توبہ بھی ایک نیکی ہے، صدقہ بھی نیکی ہے، دو نفل پڑھنا بھی نیکی ہے، قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی نیکی ہے، عمرہ کرنا بھی نیکی ہے، ان میں سے کچھ بھی کر لینا چاہیے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«وَأَتَّبِعِ السَّنِيَّةَ الْحَسَنَةَ تَمَحُّهَا»¹

”اور گناہ کے پیچھے نیکی کو لگا دو تو وہ اس گناہ کو مٹا دے گی۔“

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ کو ہلکا سمجھ لے کہ گناہ کر لیا، اب بعد میں نیکی کر لوں گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ گناہ کر کے اتنے پریشان ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے بھی مایوس ہو جاتے ہیں تو انہیں کہا گیا کہ یہ ایک دوسری انتہا ہے لہذا اس سے بھی بچو۔ تمہارے گناہ کتنے ہی بڑے اور زیادہ کیوں نہ ہوں لیکن اللہ کی رحمت سے بڑے اور زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اور رہی متوازن بات تو وہ یہی ہے کہ مومن کبھی بھی اپنے گناہ کو ہلکا نہیں سمجھتا اور کبھی بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ يَرَى ذُنُوبَهُ كَأَنَّهُ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ يَخَافُ أَنْ يَقَعَ عَلَيْهِ،

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الْإِيْرِ وَالصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي مُعَاشَرَةِ النَّاسِ، 355/4

وَأَنَّ الْفَاجِرَ يَرَىٰ ذُنُوبَهُ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلَىٰ أَنْفِهِ»¹

”مومن اپنے گناہوں کو یوں دیکھتا ہے کہ جیسے وہ پہلا کے نیچے ہے کہ جو اس پر گرنے والا ہے۔ اور فاسق و فاجر اپنے گناہوں کو یوں دیکھتا ہے جیسے کوئی مکھی تھی جو اس کی ناک پر سے گزر گئی۔“

اب ناک پر سے مکھی گزرنے پر بھی الجھن تو ہوتی ہے اور فاسق و فاجر کو گناہ کر کے بس اتنی ہی پریشانی ہوتی ہے اور مومن کی پریشانی گناہ کے بعد بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن جتنی پریشانی ہوتی ہے، توبہ سے اتنی ہی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ پس توبہ ہر حال میں کرنی چاہیے کہ انسان گناہ گار ہے۔ اور گناہ صرف یہ نہیں ہے کہ زنا کر لیا، قتل کر دیا، شراب پی لی، شرک کر لیا بلکہ جھوٹ بولنا بھی گناہ ہے، غیبت کرنا بھی گناہ ہے، حسد کرنا بھی گناہ ہے، گالی دینا بھی گناہ ہے، غیر محرم عورت کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا بھی گناہ ہے، اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا نہ کرنا بھی گناہ ہے، کسی کو حقیر سمجھنا بھی گناہ ہے، لوگوں کا رستہ روک لینا بھی گناہ ہے وغیرہ۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ»²

”تمام کے تمام انسان بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہیں لیکن بہترین گناہ کرنے والے وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے بھی ہیں۔“

اللہ عز و جل نے اپنی کتاب قرآن مجید میں متقی ان لوگوں کو نہیں کہا کہ جن سے گناہ نہ ہوتے ہیں کیونکہ جن سے گناہ نہ ہوں تو وہ تو انبیاء اور رسولوں کی جماعت ہے۔ پس قرآن کی نظر میں وہ لوگ متقی ہیں کہ جن سے گناہ ہوں تو انہیں فوراً اثر مندگی کا احساس ہو اور توبہ کر لیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (133) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (134) وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ

¹ صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب التَّوْبَةِ، 67/8

² سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّهْد، باب ذِکْرِ التَّوْبَةِ، 1420/2

ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ اللَّهُ ذُنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿135﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿آل عمران: 136﴾

”اور تم توبہ استغفار کی طرف دوڑ لگاؤ اور اس جنت کی طرف بھی دوڑ لگاؤ کہ جس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں کے برابر ہے۔ اور یہ جنت متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور متقی وہ ہیں جو تنگی میں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خوشحالی میں بھی، اور وہ غصے کو پی جانے والے ہیں، اور وہ لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ عز و جل ایسے محسنین سے محبت رکھتے ہیں، اور متقی وہ ہیں کہ جب وہ کوئی بے حیائی کا کام یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کو یاد کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، اور اللہ کے سوا کون ہے کہ جو گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ اور متقی وہ ہیں کہ جو اپنے گناہوں پر اڑ نہیں جاتے جبکہ وہ علم بھی رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ یہ ہے کہ اللہ عز و جل ان کو معاف فرمائے گا اور انہیں ایسے باغات عطا فرمائے گا کہ جن کے بیچ میں نہریں جاری ہوں گی، اور کیا ہی خوب اجر ہے عمل کرنے والوں کا۔“

پس تقویٰ کی علامت یہ ہے کہ گناہ ہوا نہیں اور ندامت اور شرمندگی شروع ہو گئی۔ پس توبہ کی نیکی چھوڑ دینے کے معاملے میں شیطان کے وسوسہ میں ہر گز نہ آئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ عَبْدًا أَصَابَ ذَنْبًا - وَرَبَّمَا قَالَ أَذْنَبَ ذَنْبًا - فَقَالَ: رَبِّ أَذْنَبْتُ - وَرَبَّمَا قَالَ: أَصَبْتُ - فَاغْفِرْ لِي، فَقَالَ رَبُّهُ: أَعْلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ؟ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ أَصَابَ ذَنْبًا، أَوْ أَذْنَبَ ذَنْبًا، فَقَالَ: رَبِّ أَذْنَبْتُ - أَوْ أَصَبْتُ - آخَرَ، فَاغْفِرْهُ؟ فَقَالَ: أَعْلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ؟ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللَّهُ، ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا، وَرَبَّمَا قَالَ: أَصَابَ ذَنْبًا، قَالَ: رَبِّ أَصَبْتُ - أَوْ قَالَ أَذْنَبْتُ - آخَرَ، فَاغْفِرْهُ لِي، فَقَالَ: أَعْلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ؟ غَفَرْتُ لِعَبْدِي ثَلَاثًا،

فَلْيَعْمَلْ مَا شَاءَ»¹

”ایک بندے نے ایک گناہ کیا اور کہا: اے میرے رب! میں نے گناہ کیا ہے، آپ مجھے معاف فرمادیں۔ تو اللہ عز و جل نے کہا: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے۔ پس میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا، وہ شخص گناہ سے رکا رہا اور پھر ایک گناہ کر لیا۔ اور اس شخص نے پھر کہا: اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کر لیا، آپ یہ بھی معاف فرمادیں۔ تو اللہ عز و جل نے کہا: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا، وہ شخص گناہ سے رکا رہا اور پھر ایک اور گناہ کر لیا۔ اور اس شخص نے پھر کہا: اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کر لیا، آپ یہ بھی معاف فرمادیں۔ تو اللہ عز و جل نے کہا: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے۔ پس میں نے اپنے بندے کو تیسری بار بھی معاف کر دیا اور اب وہ جو چاہے عمل کر لے۔“

اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک میرا بندہ گناہوں سے توبہ کرتا رہے گا تو اس وقت تک وہ جو چاہے کر لے، اس کا نقصان نہیں ہوگا۔ یہ توبہ کی برکت ہے، اس کی عظمت ہے، اس کا مقام ہے۔ سچی توبہ کے ساتھ گناہ کا ضرر ختم ہو جاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ سچی توبہ انسان کو اللہ کے مزید قریب کر دیتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کا درجہ پہلے سے بڑھ جاتا ہے۔

سچ کا حال

سچ بندہ مومن کی پہچان ہے کہ ایمان اور جھوٹ کا جمع ہونا محال ہے۔ بندہ مومن ہمیشہ سچ کے حال میں ہوتا ہے، وہ سچ کے احوال میں زندگی گزارتا ہے۔ سچا انسان وہ ہے

¹ صحیح بخاری، کتاب التَّوْحِيدِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: يُرِيدُونَ أَنْ يُضِلُّوا كَلَامَ اللَّهِ، 145/9

کہ جس کے دشمن بھی اس کے بارے گواہی دیں کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اور یہی وہ شخص ہے کہ سچ اس کا حال اور پہچان بن جاتا ہے، اور یہی وہ شخص ہے کہ جو اللہ کے ہاں صدیق کے مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ صَدِيقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذَّابًا»¹

”حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: سچ کو لازم پکڑو کیونکہ سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اور ایک شخص سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کی کوشش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اسے صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو کہ جھوٹ فسق و فجور کی طرف لے کر جاتا ہے اور فسق و فجور جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کی کوشش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔“

انسان کو اپنے رب کے ساتھ بھی سچا ہونا چاہیے، مخلوق کے ساتھ بھی سچا ہو اور اپنے آپ سے بھی سچ بولے۔ رب کے ساتھ سچا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ سے جو وعدے کیے ہیں، وہ پورے کرے۔ مخلوق کے ساتھ سچا ہونے سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی حال میں ان سے جھوٹ نہ بولے۔ اور اپنے آپ سے سچا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے بارے جانتے بوجھتے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کرے۔ اسی طرح انسان اپنی سوچ میں سچا ہو، اپنے قول میں سچا ہو اور اپنے عمل میں سچا ہو تو یہ ایسا شخص ہے کہ سچ اس کا حال بن چکا ہے۔ سوچ میں سچائی یہ ہے کہ جھوٹ کے بارے سوچنا بھی اسے ناگوار

¹ صحیح مسلم، کتاب البرِّ والصَّلةِ وَالْأَدَابِ، بَابُ فَتْحِ الْكَذِبِ وَخُسْنِ الصِّدْقِ وَفَضْلِهِ، 4/2013

گزرے۔ اور قول میں سچائی یہ ہے کہ جب بات کرے تو اس کا مخالف اور دشمن بھی اس کی بات کو سچ سمجھے۔ اور عمل کی سچائی یہ ہے کہ جب کوئی اسے دیکھے تو اس کے بارے سچا انسان ہونے کا تصور ذہن میں آئے۔

جھوٹ صرف یہی نہیں ہے کہ آپ واقعہ کے خلاف بیان کریں بلکہ جھوٹ یہ بھی ہے کہ آپ حق کو چھپالیں اور کافر کا جھوٹ یہی ہے کہ اس نے حق کو چھپالیا کہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت خدا کا موجود ہونا اور وحدہ لا شریک ہونا ہے۔ اور جھوٹ صرف بدی کے احوال میں نہیں ہوتا بلکہ جھوٹ نیکی کے احوال میں بھی ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کے دل میں اتنی عاجزی نہیں ہے کہ جتنی عاجزی کا اظہار وہ اپنے قول اور فعل سے کر رہا ہے، تو یہ بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک شخص اتنا نیک نہیں ہے کہ جتنا اس کے لباس سے اس کے نیک ہونے کا تاثر مل رہا ہے، تو یہ شخص بھی جھوٹ بول رہا ہے۔

اگر آپ بیمار ہیں اور کسی نے حال احوال پوچھا ہے تو آپ کہہ دیتے ہیں کہ الحمد للہ! خیریت سے ہوں تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ اگر آپ کو بھوک لگ رہی ہے اور کوئی شخص آپ سے کھانے پینے کے بارے تکلفاً پوچھتا ہے تو اسے یہ کہنا کہ مجھے بھوک نہیں ہے، یہ بھی جھوٹ ہی ہے۔ آپ ہنسی مزاح میں ہی کوئی خلاف حق بات بیان کرتے ہیں، تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَيْصِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا، وَبَيْتٍ فِي وَسْطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَإِنْ كَانَ مَارِحًا وَبَيْتٍ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ»¹

”میں اس شخص کو جنت کے کنارے گھر کی ضمانت دیتا ہوں کہ جو جھگڑا چھوڑ دے، چاہے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو۔ اور اس شخص کو جنت کے وسط میں گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو جھوٹ چھوڑ دے، چاہے مزاح میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس شخص کو جنت کے اعلیٰ درجات میں گھر کی ضمانت دیتا ہوں کہ جو اپنے اخلاق کو بہترین بنالے۔“

¹ سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، 253/4

اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ اس شخص کو قیامت کے دن اللہ عزوجل سے جنت کے وسط میں گھر لے کر دینے کی ضمانت دے رہے ہیں کہ جو ہنسی مزاح میں بھی جھوٹ نہ بولے اور یہ بہت بڑی ضمانت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ضمانت ہے۔ پس سچ کے حال کا معنی یہ ہے کہ ہر بات میں سچا ہو۔ اور صرف بات میں نہیں بلکہ اپنے ہر حال میں سچا ہو۔ اس کا ظاہر اس کے باطن کے مطابق ہو۔ اس کا قال اس کے حال کی تصدیق کرے اور اس کا حال اس کے قال کی تائید کرے۔ اگر کسی شخص نے اپنے نام کے ساتھ علامہ لگایا ہے اور اس کے پاس اتنا علم نہیں ہے کہ جتنا علامہ بننے کے لیے چاہیے تو یہ بھی جھوٹا ہے۔

اور آپ ﷺ اس شخص کو جنت کے کنارے اللہ عزوجل سے گھر لے کر دینے کی بشارت دے رہے ہیں کہ جو جھگڑا چھوڑ دے، چاہے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو کہ جھگڑے کے طول پکڑنے کی اکثر وجہ یہی ہوتی ہے کہ فریقین میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو حق پر سمجھ رہا ہوتا ہے۔ پس اپنے آپ کو حق پر سمجھنے کے باوجود اگر جھگڑا چھوڑ دے اور صلح کر لے تو اس حدیث کو اپنے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے جنت کی رسید سمجھے کہ قیامت والے دن نبی کریم ﷺ کو اس حدیث کا حوالہ دے کر انہیں اپنی جنت کے حصول کے لیے اللہ کے حضور ضامن بنالے۔

سچائی نہ صرف آخرت میں اجر لائے گی بلکہ دنیا میں بھی اپنا پھل ضرور لاتی ہے۔ جناب عظیم الرحمن عثمانی صاحب اس بارے فرماتے ہیں:

”کچھ عرصہ سے میری کمپنی ایک کمپیوٹر ایکسپٹ کو تلاش کر رہی ہے مگر سخت معیار ہونے کی وجہ سے انٹرویو پر انٹرویو ہوتے رہے لیکن کوئی امیدوار کامیاب نہیں ہو سکا۔ کچھ دن پہلے میں نے امیدواروں کے بائیو ڈیٹا کا تفصیلی جائزہ لیا اور ان میں سے زیادہ تجربہ یافتہ افراد کو انٹرویو کے لئے بلا لیا۔ ان ہی بائیو ڈیٹا کی چھان بین میں ایک ایسا امیدوار بھی نظر میں آیا جس کا تعلق پر تگال سے تھا۔ اس شخص کے پاس تجربہ اور تعلیم نسبتاً کم تھی۔ بظاہر ایسی کوئی خاص وجہ نہ تھی کہ اسے انٹرویو پر بلا یا جائے مگر ایک بات جو حیرت انگیز تھی وہ یہ کہ اس بائیو

ڈیٹا میں بلا کی سچائی سے کام لیا گیا تھا۔ وہ باتیں جن کا اعتراف کرنا یو قونی سمجھا جاتا ہے، اس شخص نے اسے کھل کر بیان کر دیا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص سچا ہے یا یو قوف؟ میں نے اپنے بیٹے اور ایک سینئر کو یہ بائیو ڈیٹا دکھایا تو ان کا بھی یہی حال ہوا۔ خیر اسی لمحے میں ہم نے اسے بھی بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ آج انٹرویو کا دن تھا، جب اس شخص کی باری آئی تو یہ دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ ایک مسلم تھا، گو کہ اس کے نام سے یہ ظاہر نہ ہوا تھا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ماتھے پر نماز کا نشان۔ پہلی نظر پڑی تو اس کے لبوں کو ہلتا دیکھا، ایک لمحہ میں سمجھ گیا کہ یہ تسبیحات پڑھ رہا ہے۔ خیر جناب مجھ سمیت تین افراد نے اس کا انٹرویو شروع کیا (بقیہ دونوں انگریز تھے)، وہی سچائی جو اس کے بائیو ڈیٹا پر نمایاں تھی آج سامنے مجسم ہو گئی تھی۔ وہ باتیں جن میں وہ با آسانی جھوٹ بول کر یا بات گھما کر متاثر کر سکتا تھا، اس نے خالص سچ کو مسکرا کر کہہ دیا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس انسان کے لئے سچ بولنا، نوکری حاصل کرنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ ایک گھنٹے کے انٹرویو کے بعد ہم تینوں نے بیک وقت ایک آواز ہو کر یہ تبصرہ کیا کہ یہ کتنا سچا آدمی ہے! اس کی سچائی کا ایسا اثر دل پر ہوا کہ ہم سب کا فیصلہ اس کے حق میں نکلا اور وہ نوکری جس میں اس سے کہیں زیادہ چالاک و تجربہ کار لوگ کامیاب نہ ہو سکے تھے، وہ اسے حاصل ہو گئی۔ آج لاجک فیل ہوتے آنکھوں سے دیکھی، جھوٹ کو پھانسی پر چڑھتا دیکھا اور حق کا رستہ غیب سے بننا نظر آیا۔ بس اب انتظار ہے کہ اس اللہ کے بندے کے ساتھ مل کر میں کام کر سکوں اور انشاء اللہ! اس سے سیکھ سکوں۔ سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم۔“¹

تنہائی کا حال

احمد جاوید صاحب کی اصلاحی مجلس میں دو سال شرکت کا موقع ملا اور ان دو سالوں میں ان سے شاید دو لفظ ہی سیکھے ہیں۔ شروع میں تو سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ یہ کیا ہیں؟

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

لیکن جب لفظ معنی سے حال میں بدلنا شروع ہو تو الفاظ کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک لفظ ”تہائی“ اور دوسرا ”سچائی“ ہے۔ جب سے یہ دو لفظ سیکھے ہیں تو سیکھنے کا مفہوم بھی تبدیل ہو گیا ہے کہ سیکھنا کسے کہتے ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ نہیں سیکھتے یا بہت کم سیکھتے ہیں۔¹

ان الفاظ کو وہ جملے میں عام طور یوں استعمال کرتے تھے کہ ”اپنی تہائی کو بہتر بنالو“ اور ”سچے بن جاؤ“۔ اب کہنے کو تو یہ عام سے جملے ہیں، آپ ان جملوں پر لمبا چوڑا وعظ سن لیں یا کہہ لیں، یہ سب سیکھنے میں شامل نہیں ہے۔ ”تہائی“ کے لفظ کو سیکھ لینا یہ ہے، چاہے آپ ایک دن میں سیکھیں یا سال میں، کہ جب جب آپ کو تہائی میسر ہو تو دل نماز کی طرف لپک لپک کر جائے۔

جس طرح تہائی میں فلم دیکھنے کی رغبت محسوس ہوتی تھی، اب نماز پڑھنے کی رغبت ایسے ہی محسوس ہونے لگے۔ پہلے تہائی میں گناہ سے روکنے کے لیے نفس سے مجاہدہ کرنا پڑتا تھا تو اب تہائی کی نیکی چھوڑنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت محسوس ہو۔ اور پھر تہائی، صرف بیڈروم کی تہائی نہیں ہے بلکہ اگر کہیں گاڑی میں اکیلے سفر میں ہے تو بھی تہائی میں ہے حتیٰ کہ جب جب خاموش ہے تو حالت تہائی میں ہی ہے۔

جس طرح بیڈروم کی خلوت میں انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی تہائی کی حفاظت کرنی ہے، اسی طرح بازار کی مجلس میں نظروں کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی تہائی کو بہتر بنانا ہے کہ چاہے کوئی اور تونہ دیکھ رہا ہو لیکن وہ تو دیکھ رہا ہے کہ جو نظروں کی خیانت کا بھی حساب رکھتا ہے۔

اور سچا بننا صرف اپنے قول میں نہیں بلکہ حال میں بھی ہے۔ سچ صرف یہ نہیں ہے

1 اور سیکھنے میں ایک اور اہم بات کہ بعض اوقات سیکھنے والے کو وہ الفاظ بھا جاتے ہیں جو کہ سکھانے والے کے نزدیک زیادہ اہم نہیں ہوتے کہ وہ الفاظ سیکھنے والے کے احوال اور ضرورت کے زیادہ مناسب ہوتے ہیں۔ اور الفاظ کے جس طرح معانی ہوتے ہیں، اسی طرح احوال بھی ہوتے ہیں۔ معانی ذہن میں مرتسم ہوتے ہیں تو احوال دل میں منتقل ہوتے ہیں۔ اس پر ہم کسی اور مقام پر مفصل گفتگو کریں گے۔

کہ جھوٹ نہ بولو بلکہ سچ یہ بھی ہے کہ سچ کو چھپاؤ نہ۔ سچا بننا یہ بھی ہے کہ جتنے نیک ہو، اتنے ہی نظر آؤ۔ آپ کی بات چیت، گفتگو، حلے اور وضع قطع سے کوئی آپ کو اتنا عالم فاضل اور متقی پرہیز گار نہ سمجھ لے کہ جتنا کہ آپ نہیں ہو۔ اور آپ کیا ہو، آپ صرف وہی ہو جو آپ اپنی تنہائی میں ہوتے ہو نہ کہ مجلس میں۔

بھئی، یہ بھی سچا بننا نہیں ہے کہ اپنے آپ کے لیے ”عاجز“، ”فقیر“، ”حقیر“ پر تقصیر اور ”طویل“ جیسے القابات استعمال کرنا شروع کر دیں۔ سچا بننا یہ ہے کہ جو ہیں، بس اس کا اظہار کریں اور وہی اپنے قال اور حال سے نظر آئیں۔ ایک عالم دوست سے کسی نے سوال کیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ”احقر“ کی اس بارے یہ رائے ہے۔ تو سائل نے پوچھا کہ یہ ”احقر“ کون ہے؟ بس اگر کسی نے سوال پوچھا ہے تو سیدھی طرح جواب دے دیں کہ میری رائے یہ ہے، خواہ مخواہ کے مصنوعی عاجزی اور انکساری کے احوال اختیار کرنے سے اجتناب کریں۔ اگر تو عالم دین ہیں تو اپنے آپ کو طویل کہنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی علامہ کہے جانے پر خوشی محسوس کریں، بس یہی کہیں کہ عالم دین ہوں۔

تکلیف اور بیماری میں ہیں، تو کوئی حال احوال پوچھے تو بتلا دیں کہ تکلیف میں ہیں۔ اور کچھ کھانے کو دل کر رہا ہے اور میزبان نے تکلفاً پوچھ لیا ہے تو بتلا دیں کہ کھانے کو دل کر رہا ہے۔ تاجر ہیں تو اپنے مال کا عیب بھی بتلائیں، چاہے گاہک نہ بھی پوچھے، پھر بھی بتلائیں کہ اسی کا مطلب ہے کہ سچ نہ چھپائیں۔ اللہ عز و جل مجھے بھی اور آپ کو بھی ان دو جملوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین! ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ ثَوْبَانَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ قَالَ: «لَا عَلَمَ أَقْوَامًا مِنْ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِحَسَنَاتٍ أَمْثَالِ جِبَالِ تِهَامَةَ بِيضًا، فَيَجْعَلُهَا اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ هَبَاءً مَنْثُورًا»، قَالَ ثَوْبَانُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ صِفْهُمْ لَنَا، جَلِّهِمْ لَنَا أَنْ لَا نَكُونَ مِنْهُمْ، وَنَحْنُ لَا نَعْلَمُ، قَالَ: «أَمَّا إِيَّاهُمْ إِخْوَانُكُمْ، وَمِنْ جِلْدَتِكُمْ، وَيَأْخُذُونَ مِنَ اللَّيْلِ كَمَا تَأْخُذُونَ،

وَلَكِنَّهُمْ أَقْوَامٌ إِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللَّهِ انْتَهَكُوهَا¹

”حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی امت کے ان افراد کو ضرور پہچان لوں گا جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں جیسی سفید (روشن) نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے تو اللہ عز و جل ان (نیکیوں کو) بکھرے ہوئے غبار میں تبدیل کر دے گا۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ ان کی صفات بیان فرما دیجیے کہ یہ کون لوگ ہوں گے؟ ان (کی خرابیوں) کو ہمارے لئے واضح کر دیجیے کہ ایسا نہ ہو کہ ہم ان میں شامل ہو جائیں اور ہمیں پتہ بھی نہ چلے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تمہارے ہی بھائی ہوں گے اور تمہاری طرح کے ہی ہوں گے اور اسی طرح تجھ گزار ہوں گے جیسے تم ہو، لیکن وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر انہیں تنہائی میں اللہ کے حرام کردہ گناہوں کے ارتکاب کا موقع ملتا ہے تو وہ ان کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔“

زبان کی حفاظت

زبان کی حفاظت ایک ایسا حال ہے کہ جس کی طرف بندہ مومن کو ہر لمحہ متوجہ رہنا چاہیے کہ زبان ہی وہ چیز ہے کہ جس کے سبب سے لوگ سب سے زیادہ جہنم میں داخل ہوں گے۔ کامیابی صرف جنت میں جانے کا نام نہیں ہے کہ جنت میں تو وہ بھی جائیں گے جو کہ پہلے جہنم کی سیر کریں گے بلکہ کامیابی تو جہنم سے بچ کر جنت میں جانے کا نام ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ زُحْجَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ [آل عمران: 185]

”پس جسے جہنم کی آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب ہو گیا۔“

پس جہنم سے نجات پالینا ہی اصل کامیابی ہے اور جہنم سے نجات اسی صورت ممکن ہے جبکہ یہ معلوم ہو کہ جہنم میں جانے کے اسباب کیا ہیں؟ تو جہنم کے داخل ہونے کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب زبان ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر الذنوب، 1418/2

سُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ، فَقَالَ: «تَقْوَى اللَّهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ»، وَسُئِلَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ، فَقَالَ: «الْقَمُ وَالْقَرْجُ»¹

”آپ سے یہ سوال ہوا کہ جنت میں لوگوں کو داخل کرنے کے اسباب میں سے بڑا سبب کون سا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کا تقویٰ اور عمدہ اخلاق۔ پھر آپ سے سوال ہوا کہ لوگ جہنم میں سب سے زیادہ کس وجہ سے داخل ہوں گے تو آپ نے جواب دیا کہ شرم گاہ اور زبان کی وجہ سے۔“

زبان کا غلط استعمال بہت سے گناہوں کو شامل ہے کہ جن میں گالم گلوچ، لعن طعن، بہتان، جھوٹ، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، غیبت، چغلی، افشائے راز، فحش گوئی، تحقیر و تذلیل، ناشکری وغیرہ ہیں۔ زبان کی حفاظت کی صورت میں ان تمام گناہوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایک طویل روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دین کی بہت سی باتیں بتلانے کے بعد کہا:

«أَلَا أُخْبِرُكَ بِمَا لَكَ ذَلِكَ كُلُّهُ؟» قُلْتُ: بَلَى، فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ، فَقَالَ: «تَكْفُفْ عَلَيْكَ هَذَا» قُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللَّهِ وَإِنَّا لَمُؤَاخِدُونَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهِ؟ قَالَ: «تَكَلَّمْتُكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ وَهَلْ يَكْبُ النَّاسُ عَلَى وُجُوهِهِمْ فِي النَّارِ، إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟»²

”کیا میں اب آپ کو ایک ایسی بات نہ بتلا دوں جو کہ ان سب باتوں کی کنجی ہے۔ تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیوں نہیں! آپ ﷺ نے اپنی زبان کو پکڑ کر کہا کہ اسے قابو میں رکھو۔ تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے نبی ﷺ! کیا ہم سے اس کی بھی پوچھ گچھ ہوگی جو کہ ہم عام باتیں کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے معاذ! لوگوں کو جہنم میں اونڈھے منہ گرانے والی اگر کوئی شے ہے تو وہ ان کی زبان ہی کی کھیتی ہے۔“

زبان سے جو گناہ ہوتے ہیں، وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے

¹ سنن الترمذی، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في حسن الخلق، 363/4

² سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب كيف اللسان في الفتنة، 1314/2

ہے جیسا کہ اپنے مالک کی ناشکری کرنا اور دوسرا وہ کہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے جیسا کہ کسی مسلمان بھائی کو زبان سے اذیت دینا۔ اور بعض اوقات انسان اپنے مالک کی ناشکری میں کوئی ایسا کلمہ کہہ دیتا ہے کہ مالک اس سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللَّهِ، مَا يَظُنُّ أَنَّ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ، فَيَكْتُتِبُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُ بِهَا رِضْوَانَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سُخْطِ اللَّهِ، مَا يَظُنُّ أَنَّ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ، فَيَكْتُتِبُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ بِهَا سُخْطَهُ إِلَى يَوْمِ يُلْقَاهُ»¹

”تم میں سے کوئی شخص بعض اوقات کوئی ایسی بات کر جاتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کی نظر میں اتنی قدر و قیمت والی بات ہے کہ اللہ کو وہ اس قدر پسند آ جاتی ہے کہ اللہ عز و جل یہ لکھ دیتے ہیں کہ میں اپنے بندے سے قیامت کے دن تک کے لیے راضی ہو گیا۔ اور تم میں سے کوئی شخص بعض اوقات کوئی ایسی بات کر جاتا ہے جو اللہ عز و جل کو ناراض کرنے والی ہوتی ہے اور اسے یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کی نظر میں کتنی بری بات ہے تو اللہ عز و جل اس کی بات سے اس قدر ناراض ہوتے ہیں کہ یہ لکھ دیتے ہیں کہ میں اس بندے سے قیامت تک کے دن تک کے لیے ناراض ہو گیا۔“

پس اللہ کا شکر ادا کرتا رہے کہ معلوم نہیں قیامت والے دن اس کے نامہ اعمال میں کوئی ایک کلمہ شکر ایسا نکل آئے کہ صرف اسی کے سبب سے جنت میں داخل ہو جائے۔ اور اللہ کی ناشکری کے کلمات سے اللہ کی پناہ مانگتا رہے کہ معلوم نہیں کہ قیامت والے دن نامہ اعمال میں ایک ہی کلمہ ایسا نکل آئے کہ جہنم میں جانے کا سبب بن جائے۔ اور جہاں تک حقوق العباد کی بات ہے تو اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمان ہی اس کو قرار دیا ہے کہ جس کی زبان کی اذیت سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنۃ، 1312/2

«الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ»¹

”مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

اور مہاجر وہ ہے کہ جو اس کو چھوڑ دے کہ جس سے اللہ نے منع کیا ہو۔“

پس مسلمان کی بنیادی تعریف میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو جیسا کہ مہاجر کی بنیادی تعریف میں یہ شامل ہے کہ وہ گناہ اور معصیت کو چھوڑنے والا ہو۔ اس شخص کا ولی ہونا تو بہت دور کی بات، مسلمان ہونا بھی شبہ میں ہے کہ جس کی زبان درازی سے دوسرے مسلمان تنگ ہوں۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کی یہ حدیث تو ایسی ہے کہ جب بھی اسے پڑھا جائے، انسان اندر تک ہل کر رہ جاتا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«إِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكْفِرُ اللِّسَانَ فَيَقُولُ: اتَّقِ اللَّهَ فَبِنَا فَإِنَّمَا نَحْنُ بِكَ، فَإِنْ اسْتَقَمَّتْ اسْتَقَمَّتْ وَإِنْ اَعْوَجَّتْ اَعْوَجَّتْنَا»²

”جب بھی انسان صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضا ہاتھ جوڑ کر اس کی زبان کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ دیکھ ہمارے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا کہ ہماری نجات تمہی سے ہے۔ اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہو گئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔“

ایک اور روایت میں اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کو جنت کی ضمانت دی ہے کہ جو اپنی شرم گاہ اور زبان کی حفاظت کی ذمہ داری لے لے۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی ضمانت اور گارنٹی ہے نہ کہ کسی پیر و مرشد کا دعویٰ۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ يَتَوَكَّلْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَتَوَكَّلْ لَهُ بِالْجَنَّةِ»³

”جو مجھے اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کی ذمہ داری دیتا ہے تو میں اس کی

¹ صحیح البخاری، کتابُ الإیمان، بابُ: الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، 11/1

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي جَفْظِ اللِّسَانِ، 605/4

³ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي جَفْظِ اللِّسَانِ، 605/4

جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔“

یہ تمام روایات اس مسئلے میں صریح ہیں کہ جو شخص اپنی زبان کی حفاظت نہیں کر سکتا تو ولی کے مقام پر تو کجا مسلمان کے مرتبے پر بھی پورا نہیں اترتا جبکہ ہمارے ہاں جبلا اسے بہت پہنچا ہوا پیر سمجھتے ہیں جو غلیظ گالیاں بکتا ہو بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ اس پر حال آیا ہوا ہے لہذا اگر تمہیں اس حال میں کوئی گالی دے تو سمجھو کہ تمہارا کام بن گیا۔ اور بعض پیر کہ جن کے ہزاروں میں مرید ہیں اور برسوں سے لوگوں سے بیعت لے کر ان کی اصلاح کا فرض سرانجام دے رہے ہیں، ان کی مجلسیں بھی دوسروں کی غیبتوں سے آباد ہوتی ہیں۔ یہ کیا تصوف ہے اور کیسا تزکیہ نفس ہے؟ جو احوال کتاب و سنت میں ہیں، ان کا نہ تو تذکرہ ہے اور نہ ہی ان پر عمل ہے۔ اور سارا زور تکلف کے ساتھ ایسے مصنوعی حال طاری کرنے پر ہے جو نہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں نظر آتے ہیں اور نہ ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاں ملتے ہیں۔

یہ کیا بات ہوئی کہ بس سارا زور اس پر ہے کہ قلب جاری ہو رہا ہے یا نہیں، دل میں حرکت ہوئی ہے یا نہیں، لطائف روشن ہوئے ہیں یا نہیں، تخلیہ روح ہوا یا نہیں، پاس انفاس کی مشق ہے یا نہیں، آسمانوں کی سیر ہوئی یا نہیں۔ یہ سب آپ کو حاصل ہو جائے تو اس کا کھ فائدہ نہیں ہے کہ اگر کہیں روڈ پر جاتے ہوئے کسی نے آپ پر کمشنس پاس کیے اور آپ نے اس کو صلواتیں سنا دیں۔ سلوک کی منازل حاصل ہوئی ہیں یا نہیں، یہ کوئی مصلے پر تھوڑی پتہ چلے گا۔ وہ تو روڈ پر معمولی سی غلطی سے جب اگلا گالی دے گا، ہاتھ سے اشارے کرے گا تو آپ کے ریسپانس سے معلوم ہو گا کہ حضرت سلوک کی منازل طے کرتے ہوئے کس آسمان پر پہنچے ہیں۔

جنت کی طلب

جنت کی طلب اور جہنم کا خوف دو ایسے حال ہیں کہ جن سے بندہ مومن کبھی خالی نہیں ہوتا۔ بعض جبلا نے رابعہ بصری رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ جھوٹا واقعہ معروف کر دیا کہ وہ ایک مرتبہ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں لوٹا لے کر جا رہی تھیں تو کسی نے

پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ تو کہنے لگیں کہ اس آگ سے جنت کو جلانا چاہتی ہوں اور اس لوٹے کے پانی سے جہنم کی آگ بجھانا چاہتی ہوں تاکہ لوگ جنت کی خواہش اور جہنم کے خوف سے عمل نہ کریں بلکہ صرف اللہ کی محبت میں عمل کریں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سلف صالحین کے بارے ایسے بہت سے جھوٹے واقعات اور قصے و معظوں نے گھڑ کر پھیلار کھے ہیں کہ جن کی کوئی سند موجود نہیں ہے اور تصوف کی بعض ردی کتابوں میں بھی ایسے جھوٹے واقعات نقل کر دیے گئے ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کوئی مسلمان ایسی بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا ہے کہ یہ تو صریح کفر ہے۔ اللہ عزوجل نے خود قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر جنت کا شوق دلایا ہے اور اس کی رغبت میں نیک عمل کرنے کے لیے ابھارا ہے۔ اور اسی طرح جہنم سے ڈرایا ہے اور اس کے خوف کی وجہ سے گناہ کے عمل سے روکا ہے۔

جس طرح اللہ کی محبت میں نیک عمل کرنا عین ایمان ہے، اسی طرح جنت کی طلب اور جہنم کے خوف سے نیکی کرنا اور برائی سے بچنا بھی عین ایمان ہے۔ قرآن مجید کی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے بھی جنت کی صفات اور نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے تاکہ ان کے ذکر سے نیک عمل کی رغبت پیدا ہو۔ اور جنت بھی کوئی ایک نہیں ہے بلکہ کئی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق جنت کے سو درجات ہیں کہ جن میں سے سب سے اعلیٰ درجہ جنت الفردوس کا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«الْجَنَّةُ مِائَةٌ دَرَجَةٍ، كُلُّ دَرَجَةٍ مِنْهَا مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَإِنَّ أَغْلَاهَا الْفِرْدَوْسُ، وَإِنَّ أَوْسَطَهَا الْفِرْدَوْسُ، وَإِنَّ الْعَرْشَ عَلَى الْفِرْدَوْسِ، مِنْهَا تُفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ، فَإِذَا مَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَسَلُّوهُ الْفِرْدَوْسَ»¹

”بے شک جنت میں سو درجات ہیں اور سب سے اعلیٰ اور بہترین درجے کی جنت، جنت الفردوس ہے۔ اور جنت الفردوس سے اوپر اللہ عزوجل کا عرش ہے۔ تو جب بھی تم اللہ سے جنت مانگو تو جنت الفردوس کا سوال کیا کرو۔“

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الرُّہد، باب صِفَةِ الْجَنَّةِ، 1448/2

قرآن مجید میں جنت کی وسعت کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ اس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں کے برابر ہے۔¹ اور ایک روایت میں سب سے ادنیٰ درجے کے جنتی کی جنت کی وسعت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ہماری اس زمین سے دس گنا بڑی جنت ہوگی² جبکہ اعلیٰ درجے کی جنت کے بارے کہا گیا ہے کہ وہ تمہاری سوچ اور فکر سے بہت بلند ہے کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ کیا ہے؟ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

«أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ، فَافْرُؤُوا إِنِّ شِئْتُمْ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ»³

”میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے کہ جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر اس کا خیال بھی نہیں ہو گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا پس تم یہ آیت مبارکہ تلاوت کر لو کہ کوئی جان بھی نہیں جانتی کہ اس کے لیے کس قسم کی آنکھوں کی ٹھنڈک تیار کی گئی ہے۔“

جنت کی ہر نعمت ایسی ہے کہ اسے زوال نہیں ہے بلکہ اس کی نعمتوں کے لیے عروج ہی عروج ہے۔ یہ تو دنیا کی نعمتیں ہیں جو یا تو ختم ہو جاتی ہیں یا پرانی ہو جاتی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«يُنَادِي مُنَادٍ: إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَصْحُوا فَلَا تَسْقُمُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَحْيُوا فَلَا تَمُوتُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَشْبُوا فَلَا تَهْرَمُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَتَعْمُوا فَلَا تَبْأَسُوا أَبَدًا»⁴

”جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ تم ہمیشہ صحت مند رہو گے اور کبھی بیمار نہ ہو گے۔ اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے کہ تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ اور تم ہمیشہ نعمتوں میں رہو گے کہ تمہیں

¹ آل عمران: 3، 133؛ الحديد: 57؛ 21

² سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّہد، بابُ صِفَةِ الْجَنَّةِ، 1452/2

³ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، بابُ مَا جَاءَ فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ وَأَنْبَاءِ مَخْلُوقَتِهَا، 118/4

کبھی سختی نہیں چھوئے گی۔“

جنت کی نعمتوں کی دوسری بات یہ ہے کہ وہ لازوال ہونے کے ساتھ باکمال بھی ہیں۔ جنت کی ہر نعمت اپنے معیار میں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہوگی جیسا کہ اہل جنت کے حسن کے بارے ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَوَّلُ زُمَرَةٍ تَلِجُ الْجَنَّةَ صُورَتُهُمْ عَلَى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، لَا يَبْصُقُونَ فِيهَا، وَلَا يَمْتَخِطُونَ، وَلَا يَتَغَوَّطُونَ، آيَنَتُهُمْ فِيهَا الذَّهَبُ، أَمْشَاطُهُمْ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَمَجَامِرُهُمُ الْاَلْوَدُ، وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ، وَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ زَوْجَتَانِ، يُرَى مَخْ سَوْفَهُمَا مِنْ وَرَاءِ اللَّحْمِ مِنَ الْحُسْنِ، لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَلَا تَبَاغُضَ، قُلُوبُهُمْ قَلْبٌ وَاحِدٌ، يُسَبِّحُونَ اللَّهَ بُكْرَةً وَعَشِيًّا»¹

”پہلی جماعت جو کہ جنت میں داخل ہوگی، ان کے چہرے چودہویں کے چاند کی طرح روشن ہوں گے۔ وہ نہ توجت میں تھوک پھینکیں گے، نہ ناک سکیں گے اور نہ ہی انہیں پیشاب پاخانے کی حاجت ہوگی۔ ان کے برتن سونے کے ہوں گے اور کنگھیاں سونے اور چاندی کی۔ ان کی انگلیٹھیاں عود کی ہوں گی اور پسینہ مشک کی خوشبو کی مانند ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک کو دو بیویاں ملیں گی کہ جو اس قدر شفاف (transparent) ہوں گی کہ ان کی ہڈیوں کا گودا تک ان کے گوشت میں سے نظر آ رہا ہوگا۔ جنتیوں کے مابین کوئی جھگڑانہ ہوگا اور نہ ہی کوئی بغض ہوگا۔ ان کے دل ایک ہوں گے اور وہ صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کریں گے۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«وَلَوْ أَنَّ امْرَأَةً مِنْ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ اطَّلَعَتْ إِلَى الْأَرْضِ لَأَضَاءَتْ مَا بَيْنَهُمَا، وَكَالَتْ مَا بَيْنَهُمَا رِيحًا، وَلَنَصِيفُهَا - يَغْنِي الْخِمَارَ - خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا»²

”اور اگر اہل جنت میں سے کوئی عورت زمین میں جھانک لے تو زمین اور

¹ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقه، 118/4

² صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، 117/8

آسمان کے مابین موجود خلا سب اس کے حسن سے روشن ہو جائے اور اس کی خوشبو سے بھر جائے۔ اور جنتی عورت کا صرف دوپٹہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے۔“

آج ہم ایک مناسب گھر بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں، کس قدر محنت کرتے ہیں، دو دو ملازمتیں کرتے ہیں، ملازمت کے ساتھ کاروبار بھی کرتے ہیں، اور ٹائم لگاتے ہیں وغیرہ لیکن اس کے باوجود اپنا گھر بنانا کسی کو نصیب ہوتا ہے اور وہ بھی عمر کے آخری حصے میں جبکہ اس سے بہتر گھر کی خواہش پھر بھی باقی رہتی ہے۔ یہ گھر بھی ایسے ہیں کہ دوسری نسل میں جا کر اپنی مدت پوری کر لیتے ہیں اور کھنڈر بن جاتے ہیں جبکہ اس کے برعکس جنت کے گھر ہمیشہ کے لیے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے اور ایسے ہیں کہ اس سے بہتر کی خواہش اور طلب نہ ہوگی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْخَيْمَةُ دُرَّةٌ، مُجَوَّفَةٌ طُولُهَا فِي السَّمَاءِ ثَلَاثُونَ مِیْلًا، فِي كُلِّ زَاوِيَةٍ مِنْهَا لِلْمُؤْمِنِ أَهْلٌ لَا يَرَاهُمُ الْآخَرُونَ»¹

”بندہ مومن کو جنت میں ایک موتی کا خیمہ نما گھر دیا جائے گا اور یہ موتی اندر سے خالی ہو گا اور اس کی اونچائی تیس میل ہوگی۔ اس موتی کے خیمہ نما گھر کے ہر کونے میں بندہ مومن کی بیویاں ہوں گی جو دوسروں کو نہ دیکھ سکیں گے۔“

ایک اور روایت میں اعلیٰ درجے کے جنتیوں کے گھروں کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

«إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ، كَمَا يَتَرَاءَوْنَ الْكُوكَبَ الدَّرِّيَّ الْغَائِبَ فِي الْأَفْقِ، مِنَ الْمَشْرِقِ أَوْ الْمَغْرِبِ، لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ» قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَاءِ لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُهُمْ، قَالَ: «بَلَى وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، رِجَالٌ آمَنُوا بِاللَّهِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِينَ»²

”اہل جنت اپنے اوپر جنتوں میں موجود جنتیوں کے گھریوں دیکھیں گے جیسے کہ دورانق میں کوئی روشن ستارہ مشرق یا مغرب میں غروب ہوتے دیکھتے ہیں۔“

¹ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقة، 117/4

² صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقة، 119/4

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو انبیاء کے مقام ہوں گے کہ جہاں دوسرے نہیں پہنچ پائیں گے۔ تو آپ نے فرمایا کہ کیوں نہیں، اللہ کی قسم! وہ لوگ بھی ان بلند و بالا جنتوں میں داخل ہوں گے کہ جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔“

جنت کے درختوں کے بارے ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ نے فرمایا:

«إِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَشَجَرَةً يَسِيرُ الرَّكَّابُ فِي ظِلِّهَا مِائَةَ سَنَةٍ، وَاقْرَأُوا إِنَّ شَيْئَكُمْ {وَوَظَلِّ مَمْدُودٌ} [الواقعة: 30]»¹

”جنت میں ایک درخت ایسا ہے کہ اگر گھڑ سوار اس کے سائے میں سو سال تک چلے تو اس کا سایہ ختم نہ ہو۔ پس تم قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ لو کہ جنت میں لمبے لمبے سائے ہیں۔“

جنت میں انسان کی ہر خواہش اور دعا پوری ہوگی جیسا کہ قرآن مجید میں سورۃ فصلت کی آیت 34 میں ہے۔ دعا سے مراد یہ ہے کہ جو مانگے گا وہ ملے گا اور خواہش سے مراد یہ ہے کہ جو جی چاہے گا، چاہے زبان سے مانگا نہ بھی ہو تو وہ بھی حاضر کر دیا جائے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ بندہ مومن جنت میں جب اولاد کی خواہش کرے گا تو ایک گھڑی جتنے وقت میں حمل ٹھہرے گا اور وضع حمل بھی ہو جائے اور اس کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔² ایک اور روایت میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم کی وفات ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ جنت میں ان کو ایک دودھ پلانے والی بھی ہے۔³

جہنم کا خوف

اللہ عز و جل نے قرآن مجید میں جہاں جنت کا ذکر کیا ہے، وہاں جہنم سے ڈرایا بھی ہے۔ انسان کی کامیابی کے لیے جنت کا شوق اور جہنم کا خوف دونوں احوال کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اللہ کے ڈر اور خوف کے مفاہیم میں سے ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اللہ کے

¹ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقه، 119/4

² سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب صفة الجنة، 1452/2

³ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقه، 119/4

عذاب اور پکڑ سے ڈرنا کہ جس کی ایک انتہائی صورت جہنم ہے۔ انسان دو ہی وجہ سے کسی عمل پر آمادہ ہوتا ہے یا تو کسی شے کی خواہش (desire) کی وجہ سے یا پھر اس کے ڈر کے سبب سے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان ڈر اور خوف کے اثر سے زیادہ عمل کرتا ہے بنسبت خواہش اور طلب کے۔

آپ اس ڈر سے کہ میری ملازمت چھوٹ جائے گی، زیادہ بہتر کارکردگی دکھاتے ہیں بنسبت اس کے کہ مجھے میرے کام کے عوض بونس ملے گا۔ امتحانات میں اے گریڈ لینے کے لیے بہت کم لڑکے محنت کرتے ہیں لیکن فیل ہونے سے بچنے کے لیے زیادہ لڑکے محنت کرتے ہیں۔ تو کامیابی کی امید سے زیادہ ناکامی کا خوف انسان کے عمل پر اثر انداز ہوتا ہے اور جہنم میں داخل ہونے کا مطلب ناکامی ہے۔

قرآن مجید میں بھی بہت سے مقامات پر تفصیل سے جہنم کی ہولناکی کو بیان کیا گیا اور سنت میں بھی آپ ﷺ نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ أَهْلَ النَّارِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَرَجُلٌ، تَوَضَّعُ فِي أَحْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَةً، يَغْلِي مِنْهَا دِمَاعُهُ»¹

”جہنم کا ہلکا ترین عذاب یوں ہو گا کہ ایک شخص کے قدموں کے نیچے آگ کا انگارہ کھاجائے گا کہ جس کی تپش سے اس کا دماغ کھولے گا۔“

اور کامیابی صرف جنت میں داخل ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ جہنم سے بچ جانے اور جنت میں داخل ہونے کا نام ہے۔ روایات میں ملتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوں گے جو بغیر حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔ ایک روایت کے مطابق اس امت کے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے اور یہ وہ ہوں گے جو کہ خوب متوکل ہوں گے۔² اور بعض ایسے ہوں گے کہ جن کا حساب ہو گا لیکن ان کے میزان میں ان کے نیکیوں کے پلڑے بھاری ہو جائیں گے اور گناہوں کے پلڑے ہلکے ہوں

¹ صحیح البخاری، کتاب الزَّكَاةِ، بَابُ صِفَةِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، 113/8

² صحیح مسلم، کتاب الْإِيمَانِ، بَابُ التَّائِيْلِ عَلَى دُخُولِ طَوَائِفِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ وَلَا

عَذَابٍ، 197/1

گے۔ پس یہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے جیسا کہ قرآن مجید میں سورۃ القارۃ میں موجود ہے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ جن کے گناہوں کے پلڑے بھاری ہوں گے تو یہ پہلے جہنم میں جائیں گے اور اگر مسلمان ہوئے تو بالآخر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ ان جہنم میں جانے والے مسلمانوں کے جنت میں داخل ہونے کا سبب شفاعت ہو گا۔ یہ شفاعت صالحین بھی کریں گے اور انبیاء و رسل بھی اور خود اللہ عز و جل بھی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«يَخْرُجُ قَوْمٌ مِنَ النَّارِ بِشَفَاعَةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَيَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ، يُسَمَّوْنَ الْجَهَنَّمِيِّينَ»¹

”نبی کریم ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے کچھ لوگوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا اور ان کا نام جنت میں جانے کے بعد بھی جہنمی معروف ہو جائے گا۔“

پس شفاعت کے بارے میں ایک بات ذہن میں رہے کہ شفاعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عذاب بالکل نہیں ہو گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شفاعت کی وجہ سے عذاب کم کر دیا جائے گا۔ اور یہ بات بہت لاجیکل بھی ہے کہ اگر عقیدہ یہ بنا دیا جائے کہ سب امتیوں نے آپ کی شفاعت کی وجہ سے سیدھا جنت میں ہی جانا ہے تو عمل کا کیا فائدہ؟ اور عمل کون کرے گا؟ ایک طرف ایک امتی اتنی محنت سے فرائض ادا کرتا ہے اور حرام سے بچ بچ کر زندگی گزارتا ہے اور دوسرے امتی کو نہ فرض کی پروا ہے اور نہ ہی حلال و حرام کی تو کیا دونوں نے شفاعت سے سیدھا جنت میں جانا ہے؟ نہیں ایسا ہر گز نہیں ہے۔ پس شفاعت کی اصل صورت یہ ہے کہ اس میں عذاب اور سزا کم کر دی جائے گی لیکن ملے گی ضرور۔ اور جو مرید اپنے پیروں اور مرشدوں سے ایسی شفاعت کی امید لگا کر بیٹھے ہیں کہ وہ جو بھی کر لیں، انہیں جہنم کی آگ چھوئے گی نہیں تو یہ بہت دھوکے میں پڑے ہیں۔ یہ ویسا ہی دھوکا ہے، جو یہودیوں کو ہوا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نبی کی اولاد ہیں لہذا اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ یہود حضرت

¹ صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، 116/8

یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں سید زادے ہیں لیکن قرآن مجید نے ان پر بار بار واضح کیا کہ تم نے اگر جنت میں جانا ہے تو اپنے اعمال کی بنیاد پر نہ کہ اپنے حسب نسب یا تعلق رشتہ داری کی بنیاد پر۔ اور جہنم میں چند دن تو کچھ چند لمحوں کے لیے جانا بھی کسی بہت بڑے عذاب سے کم نہیں ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

يُؤْتَى بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً، ثُمَّ يُقَالُ: يَا ابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ حَيْرًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيمٌ قَطُّ؟ فَيَقُولُ: لَا، وَاللَّهِ يَا رَبِّ وَيُؤْتَى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا، مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ، فَيُقَالُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ؟ فَيَقُولُ: لَا، وَاللَّهِ يَا رَبِّ مَا مَرَّ بِي بُؤْسٌ قَطُّ، وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ¹

”قیامت والے دن دنیا میں سب سے زیادہ آسانی اور آسائش میں رہنے والے شخص کو لایا جائے گا اور جہنم میں ایک غوطہ دیا جائے گا اور پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تم نے کبھی آسانی اور آسائش دیکھی ہے؟ تو وہ کہے گا نہیں، اللہ کی قسم! میں نے کبھی آسانی اور آسائش دیکھی ہی نہیں۔“

اور دوسری بات یہ ہے کہ اصل کامیابی یہ ہے کہ آپ کو آخرت میں سفارش کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ سفارش تو نالائق بچوں کی ہوتی ہے اور ہم سے مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ ہمارے اعمال اس قابل ہوں کہ ہمارے جنت میں داخلے کا سبب بن جائیں۔ پس ایک بچہ وہ ہے جو اپنی محنت سے پاس ہوتا ہے اور ایک بچہ وہ ہے کہ سفارش سے پاس ہوتا ہے تو استاذ اور والدین کے لیے قابل فخر بچہ تو وہی ہوتا ہے جو محنت سے پاس ہو نہ کہ سفارش سے۔ باقی یہ کہنا کہ ہمارے اعمال تو اس قابل نہیں ہیں کہ ہم جنت میں جاسکیں تو یہ ایک احساس ہے اور اس احساس کا ہونا اچھی بات ہے لیکن ہم اس وقت احساس کی نہیں مطالبے کی بات کر رہے ہیں کہ اللہ عز و جل کا ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ یہ کہ ہم بغیر سفارش جنت میں جائیں یا یہ کہ سفارش کے ساتھ؟ اگر اللہ عز و جل کا یہ مطالبہ ہے کہ

¹ صحیح مسلم، کتاب صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ بَابُ صَنْعِ أَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا فِي النَّارِ وَصَنْعِ أَشَدِّهِمْ بُؤْسًا فِي الْجَنَّةِ، 2162/4

بغیر سفارش جنت میں جائیں تو ہمیں اس کے لیے محنت کرنی ہے اور اگر اس کے باوجود کوئی کمی کوتاہی رہ گئی تو خود اللہ عزوجل شفاعت فرمائیں گے، اللہ کے رسول ﷺ شفاعت فرمائیں گے، انبیاء و رسل شفاعت کریں گے، شہداء اور صالحین بھی شفاعت کریں گے وغیرہ۔ یہ صحیح تصور ہے۔

تو ایک تو یہ ہے کہ جس کے دل میں بھی رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان موجود ہے یا جس نے بھی کلمہ پڑھ لیا ہے تو وہ بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ تو صرف کلمے کا پڑھ لینا اور دل میں اس کا یقین رکھنا بھی اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں پڑے رہنے سے بچ جائے گا۔ پس محض ایمان کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، چاہے وہ ایمان رائی کے دانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو اور اگر ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو تو پھر تو کیا ہی کہنے! لیکن ہماری کامیابی اس میں ہے کہ ہم جہنم میں جائیں ہی نہ۔ اور یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔

عمل صالح جہاں نیکیوں کے کرنے کا نام ہے، وہاں گناہوں سے بچنے کا بھی نام ہے۔ ہمیں اگر جہنم سے بچنا ہے تو ان گناہوں سے بچنا ہو گا کہ جو جہنم میں جانے کا سبب ہیں۔ اور کچھ گناہ تو ایسے ہیں کہ جن کی وجہ سے انسان ہمیشہ جہنم میں پڑا رہے گا اور وہ شرک اور کفر ہیں۔ اور ان کے علاوہ جو گناہ ہیں تو اللہ عزوجل انہیں کبھی نہ کبھی معاف کر دیں گے لیکن ہمیں ان گناہوں سے بھی بچنا ہے جو عارضی طور پر جہنم میں لے کر جانے والے ہیں۔ اور ان گناہوں میں سے ایک گناہ تو وہ ہے جو مصلحین میں پایا جاتا ہے کہ دوسروں کی اصلاح پر خوب زور ہے اور خود کا عمل کچھ نہیں ہے۔ دوسروں پر تنقید ہی تنقید اور خود انہی کوتاہیوں میں مبتلا کہ جن کو بنیاد بنا کر دوسروں کو کوسا جا رہا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

يُجَاءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقَى فِي النَّارِ، فَتَنْدَلِقُ أَفْتَانُهُ فِي النَّارِ، فَيَدُورُ كَمَا يَدُورُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ، فَيَجْتَمِعُ أَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُولُونَ: أَيُّ فُلَانٍ مَا شَأْنُكَ؟ أَلَيْسَ كُنْتَ تَأْمُرُنَا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ؟

قَالَ: كُنْتُ أُمَرُّكُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا آتِيهِ، وَأَنْتُمْ عَنْ الْمُنْكَرِ وَآتِيهِ»¹
 ”ایک شخص کو قیامت والے دن لایا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ تو اس کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر آجائیں گے اور وہ ان کے گردیوں گھومے گا جیسے گدھاجکی کے گرد گھومتا ہے۔ پس جہنمی اس کے پاس جمع ہو کر اس سے پوچھیں گے کہ تو نے کیا گناہ کیا ہے؟ تو وہی نہیں ہے جو ہمیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور برائی سے منع کرتا تھا۔ تو وہ کہے گا کہ ہاں میں وہی ہوں لیکن میں تمہیں تو نیکی کا حکم دیتا تھا لیکن خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ اور تمہیں تو برائی سے منع کرتا تھا لیکن خود برائی کرتا تھا۔“

اور کچھ گناہ ایسے ہیں کہ جن کا تعلق انسان کی عبادت سے ہے مثلاً فرائض جیسا کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ اگر انسان ان فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا تو یہ بھی عذاب کا ایک بڑا سبب ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا مِنْ صَاحِبٍ ذَهَبٍ وَلَا فِضَّةٍ، لَا يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، إِلَّا إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، صُفِّحَتْ لَهُ صَفَائِحُ مِنَ نَارٍ، فَأُخِيَّتْ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ، فَيَكْوَى بِهَا جَنْبُهُ وَجَبِينُهُ وَظَهْرُهُ، كُلَّمَا بَرَدَتْ أُعِيدَتْ لَهُ، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتَّى يُفْضَى بَيْنَ الْعِبَادِ، فَيَرَى مَسْبِلَهُ، إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِمَّا إِلَى النَّارِ»²

”جس شخص کے پاس سونا اور چاندی ہو اور وہ ان کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت والے دن اس کے لیے اس کے سونے چاندی سے آگ کے تختے تیار کیے جائیں گے، انہیں آگ میں گرم کیا جائے گا اور ان کے ذریعے سے اس کے پہلو، پیشانی اور پشت کو داغا جائے گا۔ اور جب وہ تختے ٹھنڈے ہو جائیں گے، تو انہیں دوبارہ گرم کر لیا جائے گا۔“

اسی طرح وہ کبیرہ گناہ جو کہ جہنم میں جانے کا سبب بنتے ہیں، ان سے بچنے کا بھی خاص اہتمام کرنا چاہیے کہ جن میں اللہ کے ساتھ شرک کرنا، کفر کرنا، نفاق رکھنا، زنا کرنا،

¹ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقه، 121/4

² صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب إثم مانع الزکاة، 680/2

والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹی گواہی دینا، چوری کرنا، شراب پینا، سود کھانا، جوا کھیلنا، رشوت لینا، کسی کی زمین کو دبا لینا، یتیم کا مال کھا جانا، قطع رحمی کرنا، پڑوسی کو اذیت دینا، ظلم کرنا، جادو ٹونا اور تعویذ گنڈا کرنا، تکبر کرنا، ریاکاری کرنا، حسد رکھنا، نجاست اور گندگی سے نہ بچنا، چغلی کھانا وغیرہ شامل ہیں۔

دنیا سے بے رغبتی

ایک بندہ مومن کو جس حال میں دنیا میں رہنا چاہیے، وہ دنیا سے بے رغبتی کا حال ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس حال کو اختیار کرنے کی نہ صرف ترغیب دلائی ہے بلکہ اس کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا:

«كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ» وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ، يَقُولُ: «إِذَا أَهْمَسَيْتَ فَلَا تَلْتَظِرِ الصَّبَّاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَلْتَظِرِ الْمَسَاءَ»¹
 ”دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ کوئی اجنبی ہو یا مسافر۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ ایسے رہو کہ جیسے صبح کی ہے تو شام کی امید نہ رکھو اور شام کی ہے تو صبح کی امید نہ رکھو۔“

تو دنیا سے بے رغبتی صرف دل کا فعل نہیں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میرے دل میں دنیا کی محبت نہیں، چاہے دنیا میں سرتاپاؤں ڈوبا ہوا ہو۔ نہیں، یہ بے رغبتی نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا سے بے رغبتی پہلے عمل میں آتی ہے، پھر دل میں پیدا ہوتی ہے۔

دنیا سے بے رغبتی کو زہد بھی کہا جاتا ہے تو زہد کا تعلق عمل سے بھی ہے اور قلب سے بھی۔ صرف قلب کا زہد ایک قسم کا دھوکا ہے اور کچھ نہیں۔ لیکن زہد یہ بھی نہیں ہے کہ دل میں تو دنیا کی محبت خوب ہو اور ظاہر میں فقیروں جیسا حلیہ بنا رکھا ہو۔ زہد وہی ہے کہ جس کا دل بھی دنیا سے بے رغبتی محسوس کرے اور اس کے پاس موجود دنیا بھی یہ

¹ صحیح البخاری، کتاب الزَّوْاقِي، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»، 89/8

ظاہر کر رہی ہو کہ یہ دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا شخص ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک صحابی نے اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیں کہ اگر میں وہ کر لوں تو اللہ عز و جل بھی مجھ سے محبت رکھیں اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں تو آپ نے فرمایا:

«اَزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللَّهُ، وَازْهَدْ فِيمَا فِي أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ»¹

”دنیا سے بے رغبتی اختیار کر لے تو اللہ تجھ کو اپنا محبوب بنالے گا۔ اور جو لوگوں کے پاس ہے، اس سے بے رغبتی اختیار کر لے تو لوگ تجھ سے محبت کریں گے۔“

بہت سادہ سی بات ہے کہ اگر لوگوں کے پاس جو دنیا اور مال ہے، آپ اس کی خواہش کریں گے کہ وہ اپنی دنیا اور مال آپ کو بھی دیں تو لوگ آپ سے دور بھاگیں گے کہ یہ کہیں مجھے پیسے ہی نہ مانگ لے۔ اور جب آپ لوگوں کی دنیا سے بے رغبت ہو جائیں گے کہ اگر وہ اپنی دنیا آپ کو دینا بھی چاہیں گے تو آپ کو اس کو لینے کی خواہش نہ ہوگی تو لوگوں کے دلوں میں آپ کی حقیقی محبت پیدا ہوگی۔ اس مثال کو اپنے رشتہ داروں کے حوالے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دنیا کا پجاری اللہ کا محبوب نہیں بن سکتا کہ اس کے اللہ عز و جل سے تعلق کی وجہ صرف اتنی ہے کہ اسے وہاں سے کچھ دنیا مل جائے، بس۔ باقی اسے نہ اللہ کی پرواہ ہے، نہ اس کے رسول ﷺ کی، نہ اس کے دین کی اور نہ ہی اس کی آخرت کی۔ یہ بھی بہت سادہ بات ہے کہ اگر کسی رشتہ دار، پڑوسی اور دوست سے آپ کی تعلق کی بنیاد صرف یہ ہے کہ آپ کو اس سے کوئی فائدہ مل جائے تو یہ محسوس ہوتے ہی وہ آپ سے دور چلا جائے گا۔ اور اللہ عز و جل تو دلوں کے بھید اور سینوں کے راز جانتے ہیں تو انہیں کیسے معلوم نہیں ہوگا کہ میرا بندہ مجھ سے صرف اس دنیا کی وجہ سے قریب ہوتا ہے کہ جو میرے ہاتھ میں ہے یا اس کا اس کے علاوہ بھی مجھ سے کوئی تعلق ہے۔

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّہد، باب الزُّہد فی الدُّنْیَا، 1373/2

تو کیا دنیا سے بے رغبتی اور زہد اختیار کرنے کا مطلب فقیر بن جانا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ امیر شخص بھی زہد ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا ہو جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بھی تھے اور زہد بھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امیر بھی تھے اور زہد بھی۔ زہد سے مراد ہے کہ دنیا کو اپنے دل اور عمل سے حقیر اور گھٹیا سمجھتا ہو۔ مثلاً اگر دنیا کسی کو دینی پڑ جائے تو یوں ہی سمجھے جیسے کسی کو ٹشو پیپر دے دیا ہو۔ اب ٹشو پیپر کو ہم اتنا حقیر اور گھٹیا سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی راہ گزر بھی چلتے چلتے مانگ لے تو انسان اسے بھی دو چار پکڑا ہی دیتا ہے اور اس پر افسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس نے مانگا ہی کیوں ہے یا اسے دیا ہی کیوں۔

پس جب کل دنیا جو کہ آپ کے پاس موجود ہے، اس کی حیثیت آپ کی نظر میں ٹشو پیپر جتنی ہو جائے تو آپ زہد ہیں۔ اب اس دنیا کا ہونا آپ کے لیے نقصان دہ نہیں رہا کہ آپ اپنی اس دنیا میں دوسروں کو بھی خوشی خوشی شریک کر لیں گے۔ تو زہد اور دنیا سے بے رغبتی کی سب سے بڑی علامت سخاوت ہے۔ جس میں جس قدر سخاوت ہے، اس میں اس قدر زہد کا حال موجود ہے ورنہ تو ایک فقیر بھی دنیا کا پجاری ہو سکتا ہے۔ اور زہد کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ جس میں زہد پیدا ہو جائے گا، اسے دنیا کے جانے پر زیادہ غم نہیں ہوگا مثلاً اُس سے کوئی ملازمت جاتی رہی، کاروباری نقصان ہو گیا، رشتہ دار چھڑ گیا تو اب اس کا یہ حال نہیں ہوگا کہ جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو اور انسان مایوس ہو کر بستر پر پڑ گیا ہو بلکہ ایسے ہی جیسا کہ کچھ تھوڑا بہت نقصان ہو گیا اور پھر سے اپنے کام میں جت لگے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا گزر بازار سے ہوا اور آپ ﷺ نے بکری کے ایک مرے ہوئے بچے کو دیکھا کہ جس کے کان بھی نہیں تھے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

«أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ هَذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟» فَقَالُوا: مَا نُحِبُّ أَنَّهُ لَنَا بِسَيِّءٍ، وَمَا نَصْنَعُ بِهِ؟ قَالَ: «أَتُحِبُّونَ أَنَّهُ لَكُمْ؟» قَالُوا: وَاللَّهِ لَوْ كَانَ حَيًّا، كَانَ عَيْبًا فِيهِ، لِأَنَّهُ أَسْلَكَ، فَكَيْفَ وَهُوَ مَيِّتٌ؟ فَقَالَ: «فَوَاللَّهِ لِدُنْيَا أَهْوَنُ

عَلَى اللَّهِ، مِنْ هَذَا عَلَيْكُمْ»¹

”تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ یہ بکری کا بچہ ایک درہم میں خرید لے؟ تو صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں تو یہ پسند نہیں ہے کہ یہ ہمیں تھوڑی سی قیمت میں مل جائے اور ہم اسے لے کر کریں گے کیا؟ تو آپ نے فرمایا: کیا تمہیں پسند ہے کہ تم اس کے مالک بن جاؤ؟ تو صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ کی قسم! اگر یہ زندہ ہوتا تو بھی ہمیں اس میں رغبت نہ ہوتی کہ اس کے کان کٹے ہوئے ہیں اور یہ عیب دار ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! دنیا اللہ کی نظر میں اس سے بھی زیادہ حقیر اور ذلیل ہے جتنا کہ یہ بکری کا بچہ تمہاری نظر میں۔“

پس زہد اس کا نام نہیں ہے کہ آپ نے پھٹے پرانے کپڑے پہن لیے بلکہ زہد تو یہ ہے کہ اگر آپ محل میں بھی بیٹھے ہوں یا مر سیڈیز میں سوار ہوں تو آپ کے نزدیک اس محل اور مر سیڈیز کی حیثیت بکری کے مرے ہوئے بچے جتنی ہو۔ اور یہ کیسے معلوم ہوگا؟ یہ اس وقت معلوم ہوگا جبکہ آپ کو وہ محل اور مر سیڈیز یعنی اپنی دنیا دوسروں سے شیر کرنی پڑ جائے۔ اگر تو آپ کی دنیا میں دوسروں کا حق بھی اتنا ہی ہو جتنا کہ آپ کا اپنا تو آپ حقیقی معنوں میں زاہد ہیں ورنہ تو ابھی زہد کا دعویٰ ہے یا اس کے رستے پر قدم رکھا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَوْ كَانَتْ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً مَاءً»²

”اگر دنیا کی حیثیت اللہ کی نظر میں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ عز و جل کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتے۔“

تو اللہ کی نظر میں دنیا کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے اور دنیا کی یہی حیثیت جب بندہ مومن کے دل میں قرار پکڑ جائے تو اس کو زہد کہتے ہیں۔ جب دنیا سے

¹ صحیح مسلم، کتاب الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، 2272/4

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، 560/4

بے رغبتی اختیار کرنی ہے تو رغبت کس میں کرنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین میں اور آخرت میں کہ جس میں دین کو اختیار کرنے کا بدلہ ملے گا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَاذَا يَرْجِعُ»¹

”دنیا کی حیثیت آخرت کے مقابلے میں اتنی ہی ہے کہ جتنا کہ تم میں سے کوئی شخص سمندر میں اپنی انگلی ڈالے تو اس کے ہاتھ پر جو پانی لگ جاتا ہے۔“

پس دنیا جب آخرت کے مقابلے میں اتنی حقیر ہے تو اس کی طرف توجہ دینا بے وقوفی ہوگی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ، قَالَ: مَرَّ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا تَقُولُونَ فِي هَذَا الرَّجُلِ؟» قَالُوا: رَأَيْنَاكَ فِي هَذَا، نَقُولُ: هَذَا مِنْ أَشْرَافِ النَّاسِ، هَذَا حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ، أَنْ يُخَطَّبَ، وَإِنْ شَفَعَ، أَنْ يُشَفَّعَ، وَإِنْ قَالَ، أَنْ يُسْمَعَ لِقَوْلِهِ، فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَمَرَّ رَجُلٌ آخَرُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا تَقُولُونَ فِي هَذَا؟» قَالُوا: نَقُولُ، وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَذَا مِنْ فُقَرَاءِ الْمُسْلِمِينَ، هَذَا حَرِيٌّ إِنْ خَطَبَ، لَمْ يُنْكَحْ، وَإِنْ شَفَعَ، لَا يُشَفَّعَ، وَإِنْ قَالَ، لَا يُسْمَعَ لِقَوْلِهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَهَذَا خَيْرٌ مِنْ مِلْءِ الْأَرْضِ مِثْلَ هَذَا»²

”سہل بن سعد سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کے سامنے سے ایک شخص کا گزر ہوا تو آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ تمہاری اس شخص کے بارے کیا رائے ہے؟ تو صحابہ کرام نے جواب دیا کہ جو آپ کی رائے ہے، وہی ہماری ہے کہ یہ شخص سرداروں میں سے ہے، اگر کہیں نکاح کا پیغام بھیجے تو فوراً قبول کر لیا جائے اور کسی کی سفارش کرے تو فوراً قبول کر لی جائے اور اگر بات کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو مجمع لگ جائے۔ اللہ کے نبی ﷺ یہ باتیں سن کر خاموش

¹ سنن الترمذی، أبواب الزُّهْد، 561/4

² سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّهْد، باب فَضْلِ الْفُقَرَاءِ، 1379/2

ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اسی مجلس کے سامنے سے ایک اور شخص کا گزر ہوا تو آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ تمہاری اس شخص کے بارے کیا رائے ہے؟ تو صحابہ کرام نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ اگر کہیں نکاح کا پیغام بھیجے تو کوئی رشتہ نہ دے، سفارش کرے تو قبول نہ کی جائے اور اگر بات کرے تو کوئی بات ہی نہ سنے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ پہلے جیسوں سے دنیا بھر جائے تو یہ اکیلا ان سب سے بہتر ہے۔“

تو یہی ہماری دنیا ہے ناں۔ مال، دولت، عہدہ، اختیار، طاقت، چوہدر اہٹ، سفارش وغیرہ وغیرہ لیکن اس سب کی اللہ اور رسول ﷺ کی نظر میں کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس دنیا کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان کیا ہی خوب ہے! وہ فرماتے ہیں:

«الدُّنْيَا جِيفَةٌ وَطَلَّابُهَا كِلَابٌ، فَمَنْ أَرَادَ الْجِيفَةَ فَلْيَصْبِرْ عَلَى مُخَالَطَةِ الْكِلَابِ»¹

”دنیا مردار ہے اور اس کے طلب گار کتے ہیں۔ پس جسے مردار چاہیے تو اسے کتوں کا سامنا کرنے پر صبر کرنا ہو گا۔“

اس دنیا میں آپ کو قوت اور اختیار کیا ایسے ہی مل جائے گا؟ چاہے وہ قومی اسمبلی کی سیٹ ہو یا کسی سرکاری تعلیمی ادارے کے پرنسپل کی۔ بس کسی بھی سرکاری محکمے میں کوئی سیٹ ایسی ہو کہ جس میں اختیارات موجود ہو تو کیا اس کے حصول کے لیے آپ کو پہلے کتا نہیں بننا پڑے گا اور پھر دوسرے کتوں سے لڑائی کر کے یہ سیٹ چھین کر حاصل نہیں کرنا پڑے گی؟ پس متعلمند شخص وہی ہے جو دنیا سے ضرورت کا تعلق رکھے اور دنیا لینے اور سمیٹنے سے زیادہ دینے اور بانٹنے میں رغبت محسوس کرے۔ پریشانی تو انسان کا مقدر ہے لیکن دانا شخص وہی ہے کہ جو آخرت کے لیے پریشان رہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ جَعَلَ الْهُمُومَ هَمًّا وَاحِدًا، هَمَّ الْمَعَادِ، كَفَاهُ اللَّهُ هَمَّ دُنْيَاهُ، وَمَنْ

¹ بحی بن الحسین بن إسماعیل بن زید الحسینی الشجرى الجرجانی (المتوفى 499 هـ)، ترتيب الأملی الحمیسية للشجرى، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولى، 1422 هـ - 2001 م، 267/2

تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُومُ فِي أَحْوَالِ الدُّنْيَا، لَمْ يُبَالِ اللَّهُ فِي أَيِّ أَوْدِيَّتِهِ هَلَكَ»¹

”جس نے اپنے تمام غموں کو ایک غم بنا لیا یعنی آخرت کا غم تو اللہ عز و جل اس کے دنیا کے غموں میں اس کو کفایت کر جائیں گے۔ اور جو دنیا کی پریشانیوں میں گم ہو گیا تو اللہ عز و جل کو کوئی پروا نہیں کہ وہ کسی وادی میں ہلاک ہوتا ہے۔“

اس روایت سے مراد یہ ہے کہ جس نے دنیا کو اپنا غم بنا لیا، مال، دولت، اقتدار، عہدہ، اختیار، کرسی وغیرہ اور اس کے حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت پریشان رہتا ہے تو اللہ کو اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ اسے وہ دنیا حاصل ہوتی ہے یا نہیں۔ لیکن جس نے آخرت کو اپنی اصل پریشانی بنا لیا اور اس کے لیے محنت کر رہا ہے تو اللہ عز و جل اس کی دنیا کی ضرورت کو پورا کر دیں گے۔

پس جسے تو دنیا سے بے رغبتی کی دولت حاصل ہے، وہ تو بہت خوب ہے لیکن جسے زہد کی کمی محسوس ہو تو وہ مساکین کی مجالس میں بیٹھا کرے کہ مساکین کے ساتھ محبت رکھنا اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ایک ایسا عمل ہے جو انسان میں دنیا سے بے رغبتی اور زہد کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی:

«اللَّهُمَّ أَحْيِيْنِي مِسْكِيْنًا وَأَمِتْنِي مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِي فِي زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» فَقَالَتْ عَائِشَةُ: لِمَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «إِنَّهُمْ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ قَبْلَ أَغْنِيَائِهِمْ بِأَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا، يَا عَائِشَةُ لَا تَرُدِّي الْمَسْكِيْنَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، يَا عَائِشَةُ أَحْيِي الْمَسَاكِيْنَ وَفَرِّبِيْهِمْ فَإِنَّ اللَّهَ يَقْرِيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»²

”اے اللہ! مجھے مسکینی میں زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرما، اور مسکینی میں ہی مجھے وفات دے، اور قیامت والے دن مسکینوں میں ہی میرا حشر فرما۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ یہ کیوں اے اللہ کے رسول ﷺ! تو آپ نے جواب دیا کہ میری امت کے غریب لوگ جنت میں میری امت کے امرا

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّہد، باب الھَمُّ بِالدُّنْيَا، 1375/2

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ الزُّہد، بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ قُرَّاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ قَبْلَ أَغْنِيَائِهِمْ، 577/4

سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے۔ اے عائشہ رضی اللہ عنہا! کسی غریب کو واپس نہ کرنا، چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی اسے دے دو۔ اے عائشہ رضی اللہ عنہا! غریبوں سے محبت رکھو اور انہیں اپنے قریب رکھو کہ اس کے بدلے اللہ عزوجل قیامت والے دن تمہیں اپنے قریب رکھے گا۔“

عباد الرحمن کے احوال

قرآن مجید میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اللہ نے اپنے نیک بندوں کی دس صفات بیان فرمائی ہیں۔ اور جن بندوں میں یہ دس صفات ہوں تو انہیں ”عباد الرحمن“ کا لقب دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ ﴿63﴾ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ﴿64﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿65﴾ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿66﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا ﴿67﴾ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ﴿68﴾ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا ﴿69﴾ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿70﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿71﴾ وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿72﴾ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخْرُؤْا عَلَيْهِمْ صُمًّا وَعُمِّيَانًا ﴿73﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا ذُرِّيَّتَيْنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿74﴾ أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿75﴾ خَالِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا﴾ [الفرقان: 63-76]

”رحمن کے (سچے) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) باتیں کرتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر چلے جاتے

ہیں۔ اور وہ اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام کرتے ہوئے راتیں گزار دیتے ہیں۔ اور وہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے دوزخ کا عذاب دور رکھ، کیونکہ اس کا عذاب تو ہلاک کر دینے والا ہے۔ بے شک جہنم ٹھہرنے اور رہنے کے لحاظ سے بدترین جگہ ہے۔ اور وہ لوگ خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی بخیلی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود سے دعائیں نہیں کرتے اور کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے کہ جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا ہو سوائے حق کے، اور نہ وہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور جو کوئی یہ گناہ کرے گا تو وہ اپنے اوپر سخت وبال لائے گا۔ اسے قیامت کے دن دوہرا عذاب دیا جائے گا اور وہ ذلت و خواری کے ساتھ ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں، ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان کرنے والا ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسا رجوع کیا جیسا کہ رجوع کا حق تھا۔ اور وہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہوتا ہے تو وقار سے گزر جاتے ہیں۔ اور جب انہیں ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان سے اندھے بہرے ہو کر نہیں رہ جاتے۔ اور وہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے بلند وبالا محلات دی جائیں گے جہاں ان کا دعا اور سلام کے ساتھ استقبال ہو گا۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی خوب وہ جگہ ہے، ٹھہرنے کے لیے اور رہائشی کے لیے۔“

اللہ عزوجل نے اپنے نیک بندوں کے لیے قرآن مجید میں جو اصطلاحات استعمال کی ہیں، وہ صدیقین، شہداء، مسلمین، مومنین، محسنین، صالحین، مصلحین، متقین، صادقین،

خاشعین، قانتین، مقربین، ربانین، مہتدین، عابدین، مفلحین، اولیاء اللہ، عباد الرحمن وغیرہ جیسی اصطلاحات ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان اصطلاحات میں ”اہل اللہ“ اور ”أصحاب القرآن“ جیسی اصطلاحات کا اضافہ کیا ہے۔ اور صوفیاء کے ہاں معروف اصطلاحات غوث، قطب، ابدال، اوتاد اور قلندر وغیرہ نہ تو قرآن مجید میں موجود ہیں اور نہ ہی ان کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نقل ہوا ہے اور نہ ہی ان کے مقام اور مرتبے کے بارے کوئی مستند شیعہ روایت کی گئی ہے لہذا ان اصطلاحات کی حیثیت چند ناموں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

تزکیہ نفس کے سلفی منہج میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا اصطلاحات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا اہل بننے کے لیے مجاہدہ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ان اصطلاحات کے ضمن میں ان کے حاملین کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں جیسا کہ عباد الرحمن ان بندوں کو کہا گیا ہے کہ جن میں درج ذیل دس صفات پائی جاتی ہوں۔ اور ان کا مرتبہ بھی قرآن مجید ہی میں بیان کر دیا گیا ہے اور جنت میں بلند و بالا محلات ہیں۔

درج بالا آیات میں رحمان کے بندوں کی پہلی صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ عاجزی صرف ان کے دل میں نہیں ہوتی بلکہ ان کی گفتگو، ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ان کا چلنا پھرنا بھی عاجزی کے احوال کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں اس قدر عاجزی ہوتی ہے کہ اس کا اظہار ان کے اعضا سے بھی ہو رہا تھا۔ اور عاجزی سے چلنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ مریضوں کی طرح چلے بلکہ یہ کہ چال میں تکبر نہ ہو۔ عاجزی پر مزید گفتگو ہم نے کتاب کے آخری باب میں ”عاجزی کے احوال“ کے عنوان کے تحت کی ہے۔

ایسی چال کہ جس میں تکبر ہو، بہت ناپسندیدہ ہے جیسا کہ سینہ تان کر چلنا، گردن اکڑا کر چلنا، زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلنا، ایک کندھا گرا کر چلنا۔ قرآن مجید میں سورۃ بنی اسرائیل میں ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ اگر تم خدا کی زمین میں اکڑ کر چل بھی لو گے تو کیا کر لو گے؟ نہ تو تم زمین پر زور سے پاؤں مار کر اسے پھاڑ سکتے ہو، اور نہ ہی تم اپنی

گردن اڑا کر اتنی لمبی کر سکتے ہو کہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکو، تو پھر کسی چیز کی اکڑ؟
 رحمان کے بندوں کی دوسری صفت یہ بیان ہوئی کہ جب جاہل اور جذباتی لوگوں
 سے ان کا واسطہ پڑتا ہے تو وہ ان کے ساتھ الجھتے نہیں ہیں بلکہ سلام کہہ کر رخصت ہو
 جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ بات چیت میں جذباتی (emotional) ہو
 جائے اور گالم گلوچ پر اتر آئے تو ان کا رویہ یہ نہیں ہوتا کہ دو کے جواب میں چار سنادیں
 بلکہ وہ لعن طعن کا جواب سلام سے دیتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ رحمان کے
 بندوں کے رویوں اور اخلاق میں پختگی (maturity) ہوتی ہے کہ وہ جاہلوں کے ساتھ
 جاہل نہیں بن جاتے۔ اس بارے ہم نے مزید گفتگو پانچویں باب میں ”رستے کی
 اخلاقیات“ کے عنوان کے تحت کی ہے، وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

رحمان کے بندوں کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ تہجد کی نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ
 فرض نماز تو ادا کرتے ہی ہیں جبکہ تہجد بھی ان کے معمولات میں شامل ہوتا ہے۔ اور تہجد
 میں بھی رات کا اچھا خاصہ حصہ اللہ کے سامنے سجدے اور قیام کی حالت میں گزرتا ہے
 کہ قرآن مجید نے تو کہا ہے کہ ان کی راتیں سجدے اور قیام کی حالت میں ہی گزرتی ہیں۔
 سلوک کی منازل تہجد کی نماز میں طے ہوتی ہیں نہ کہ مراقبہ میں۔ اور یہی سلف صالحین
 اور صوفیاء کے منہج تربیت کا بنیادی فرق ہے۔ تزکیہ نفس کے سلف صالحین کے منہج کے
 ذرائع نماز، قرآن مجید، دعا، تہجد، سجدہ، ذکر و فکر اور صدقہ وغیرہ ہیں جبکہ اصلاح نفس
 کے صوفی منہج میں مراقبہ، تصور شیخ، لطائف، ذکر جہری، پاس انفاس، سماع، رقص اور
 وجد وغیرہ کو بنیادی ذرائع کی حیثیت حاصل ہے۔

آج کل شہروں میں جو لائف اسٹائل بن چکا ہے کہ ہمارے نوجوان راتوں کو جاگتے
 ہیں اور دن میں سوتے ہیں تو تہجد پڑھنا مشکل نہیں رہا۔ اور تہجد کی کم از کم نماز دو رکعت
 ہے اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعت ہے۔ جو دو رکعت پڑھ لے تو یہ بھی تہجد گزار ہے اور
 جو روزانہ ایک سیپارہ تہجد میں تلاوت کرے تو کیا ہی کہنے۔ اور اگر روزانہ ایک تہائی
 رات تہجد پڑھے تو یہ وہ تہجد کی نماز ہے جو اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پڑھا

کرتے تھے۔

رحمان کے بندوں کی چوتھی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ جہنم سے اللہ کی پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ ان کی دن رات کی عبادت ان میں یہ زعم نہیں پیدا کر دیتی کہ وہ جنتی ہیں بلکہ وہ اس قدر عبادت کے باوجود جہنم کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ایمان تو ہوتا ہی امید اور خوف مابین ہے۔ اگر کوئی شخص صرف پر امید ہو کہ میں جنت میں جاؤں ہی جاؤں تو یہ بھی ایمان کے منافی ہے۔ اور اگر کوئی شخص صرف خوف میں مبتلا رہتا ہو کہ میرا رب تو مجھے جہنم میں ڈالے ہی ڈالے تو یہ بھی ایمان کے منافی ہے۔ ایمان یہ ہے کہ کبھی دل کی کیفیت یہ ہو کہ امید غالب ہو کہ میرا رب مجھے معاف کر دے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔ اور کبھی دل پر خوف غالب ہو کہ میرا رب مجھے جہنم میں نہ ڈال دے۔ جنت کی آیات سن کر دل خوش ہو جائے اور جہنم کی آیات سن کر دل غمگین ہو جائے تو انہی دو کیفیات کا آنا جاننا ہی ایمان ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، وَالنَّارُ مِثْلُ ذَلِكَ»¹

”تمہاری جنت تمہارے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔ اور تمہاری جہنم بھی تمہارے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔“

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ آخر وقت میں جبکہ سانسیں اکھڑ رہی ہوں اور انسان اس دنیا سے دوسری دنیا میں جا رہا ہو تو اس وقت امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے کہ اللہ مجھے معاف کرے گا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا دَعَانِي»²

”میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ میرے بندے کا میرے بارے گمان ہے۔ اور جب بھی میرا بندہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔“

رحمان کے بندوں کی پانچویں صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ مال خرچ کرنے میں نہ تو فضول خرچ ہیں کہ اللوں تلوں میں مال خرچ کریں اور نہ ہی کنجوس ہیں کہ جہاں

¹ صحیح البخاری، کتاب الزَّكَاةِ، بَابُ الْجَنَّةِ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، 102/8

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ الزُّهْدِ بَابُ مَا جَاءَ فِي حُسْنِ الظَّنِّ بِاللَّهِ، 596/4

ضرورت ہو، وہاں بھی خرچ نہ کریں۔ نیکی ہمیشہ دو انتہاؤں کے مابین ہوتی ہے۔ اور مال خرچ کرنے میں بھی دو انتہائیں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں ضرورت نہیں ہے، وہاں بھی خرچ کرے یا جہاں جتنی ضرورت ہے، اس سے زائد خرچ کرے۔ اور دوسری انتہا یہ ہے کہ جہاں ضرورت ہو، وہاں بھی خرچ نہ کرے اور جمع کر کے خوش ہوتا رہے۔ اگر شادی بیاہ کے موقع پر چھ لاکھ کا عروسی جوڑا تیار ہو گا اور دو لاکھ میں دلہن کا میک اپ ہو گا تو یہ فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور وہ جوڑا اور میک اپ ایک دن بھی نہیں بلکہ چند گھنٹوں کے لیے ہوتا ہے۔ اور کنجوس آدمی نہ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے اور نہ اپنے گھر والوں پر، نہ اپنے رشتہ داروں پر اور نہ ہی اپنے دوستوں پر۔ فضول خرچ کو سب لوگ باتیں بناتے ہیں، چاہے باتیں بنانے کی وجہ یہی ہو کہ وہ خود اتنی فضول خرچی کی استطاعت نہیں رکھتے اور کنجوس آدمی سے بھی سب ناراض رہتے ہیں۔ لہذا رحمان کے بندے اپنے خرچ کرنے میں معتدل رویہ اختیار کرتے ہیں کہ جہاں خرچ کرنا ہے، وہاں خرچ کرتے ہیں اور جہاں نہیں کرنا، وہاں نہیں کرتے ہیں۔ رحمان کے بندوں کا دنیا کے معاملات میں خرچ کرنا بھی احسان کی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے کہ قیامت والے دن اس کا بھی حساب ہونا ہے کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ مال اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور اللہ کی نعمتوں کے بارے سوال ہو گا کہ ان کا شکر کتنا ادا کیا اور ان کا استعمال کیسے کیا۔

رحمان کے بندوں کی چھٹی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ تین بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ہمارے دین میں گناہوں کو چھوڑے اور بڑے گناہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور جو کبیرہ اور بڑے گناہ ہیں، ان میں سے بھی بڑے گناہ تین ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، کسی جان کو قتل کرنا اور زنا کرنا۔ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ عز و جل نے قرآن مجید میں بیان فرمایا کہ میں شرک معاف نہیں کروں گا اور سارے گناہ معاف کر دوں گا۔ اور کسی انسان کو قتل کرنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک انسان کے قتل کو پوری نوع انسانی کے قتل کے برابر کا گناہ قرار دیا ہے۔ اور زنا اور بدکاری کرنا

بھی کبیرہ گناہوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔ ان تین گناہوں کے بارے بیان فرمایا کہ جو ان میں سے کسی ایک گناہ کا بھی ارتکاب کرے گا، وہ دنیا اور آخرت میں اس کا وبال چکھ لے گا۔ آخرت میں تو جو سزا ہے سو ہے لیکن دنیا میں ان گناہوں کی سزا یہ ہے کہ مشرک کو کبھی بھی دل کا اطمینان نصیب نہیں ہوتا، قاتل ہمیشہ اپنے ضمیر کے بوجھ تلے پریشان رہتا ہے اور زانی ہر وقت بے سکونی کی کیفیت میں رہتا ہے۔ ان لوگوں کے گرد نعمتوں اور آسائشوں کا ڈھیر ہوگا لیکن زندگی میں سکون اور اطمینان نام کی چیز نہ ہوگی۔

ساتھ ہی یہ بھی بیان فرمادیا کہ اگر کسی سے یہ گناہ ہو گئے اور اس نے سچی توبہ کر لی تو اللہ عز و جل نہ صرف اس کے گناہوں کو معاف کر دیں گے بلکہ اس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُؤْتَى بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيَقَالُ: اغْرِضُوا عَلَيْهِ صِغَارُ ذُنُوبِهِ. قَالَ: فَتُغْرِضُ عَلَيْهِ وَيُخَبَّأُ عَنْهُ كِبَارُهَا، فَيَقَالُ: عَمِلْتَ يَوْمَ كَذَا وَكَذَا كَذَا وَكَذَا، وَهُوَ مُقَرَّرٌ لَا يُنْكِرُ، وَهُوَ مُشْفِقٌ مِنَ الْكِبَارِ. فَيَقَالُ: أُعْطِيَهُ مَكَانَ كُلِّ سَيِّئَةٍ عَمَلَهَا حَسَنَةً قَالَ: فَيَقُولُ: إِنَّ لِي ذُنُوبًا مَا أَرَاهَا. قَالَ: قَالَ أَبُو ذَرٍّ: فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَحِكَ حَتَّى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ»¹

”حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ قیامت والے ایک شخص کو لایا جائے گا کہ جس نے دنیا میں اپنے گناہوں سے سچی توبہ کر لی ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہیں گے کہ اسے پہلے اس کے صغیرہ گناہ دکھاؤ تو اس شخص کو اس کے چھوٹے گناہ دکھائیں جائیں گے اور بڑے چھپالیے جائیں گے۔ اور اس سے کہا جائے گا کہ دنیا میں فلاں دن یہ کیا اور فلاں دن وہ کیا، فلاں وقت میں یہ کیا اور فلاں وقت میں وہ کیا۔ وہ شخص اپنے گناہوں کو تسلیم کرے گا اور ان کا انکار نہیں کرے گا۔ اور دل ہی دل میں ڈر رہا ہوگا کہ ابھی تو بڑے گناہ سامنے ہی نہیں آئے۔ تو اس حال میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 313/35

میرے بندے کو ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی عطا کرو۔ تو وہ شخص فوراً بول پڑے گا کہ اے میرے رب! میرے کچھ گناہ ایسے ہیں جو مجھے یہاں اعمال نامے میں نظر نہیں آرہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ یہ بات بیان کرتے ہوئے اس قدر ہنسے کہ آپ کی داڑھیں نظر آنے لگیں۔“

رحمان کے بندوں کی ساتویں صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے کہ جھوٹی گواہی کو بہت بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ سچی گواہی ضروری نہیں کہ عدالت میں ہی دی جائے، عدالت کے علاوہ بھی اگر میاں بیوی، دو افراد اور دو خاندانوں میں جھگڑا ہو اور ان کے باہمی اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے خاندان کے کچھ بڑے جمع ہوں اور کچھ لوگوں سے گواہی طلب کی جائے تو وہ سچی گواہی دیں، چاہے وہ ان کے اپنے خلاف جاتی ہو۔ جو شخص دنیا کے معاملات میں سچی گواہی نہیں دیتا تو اللہ کے بارے اس کی گواہی بھی خالص نہ ہوگی بلکہ نفاق کی ملاوٹ کے ساتھ ہوگی۔ اللہ کے بارے گواہی ہم ہر نماز میں دیتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ پڑھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور صرف آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

رحمان کے بندوں کی آٹھویں صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ لغو کاموں میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ اور اگر کسی لغو بات اور کام سے ان کا گزر ہو جائے تو بڑے وقار اور سنجیدگی سے گزر جاتے ہیں کہ مداری کا تماشا دیکھنے کھڑے نہیں ہو جاتے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بہترین اسلام، اس کو قرار دیا ہے کہ انسان لایعنی باتیں اور کام چھوڑ دے۔ لایعنی باتیں اور کام وہ ہیں کہ جن میں نہ آخرت کا بھلا ہو اور نہ دنیا کا فائدہ ہو کہ گھنٹوں بیٹھے بے مقصد براؤنگ کر رہے ہیں، یا اسمارٹ فون میں سارا دن گیمز میں مشغول ہیں، یا تھروں پر بیٹھے تاش کے پتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»¹

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، 558/4

”آدمی کے اسلام کا حسن اس میں ہے کہ ہر لایعنی شیء کو چھوڑ دے۔“

رحمان کے بندوں کی نویں صفت یہ بیان ہوئی کہ جب انہیں قرآن مجید کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ غور سے سنتے ہیں اور پھر اس پر عمل کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ اللہ کی آیات سن کر اندھے بہرے بن جائیں کہ سنا ہی نہیں، یا سنی ان سنی کر دی، یا ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا، یا سن کر بھلا دیا، یا سن کر

اہمیت نہ دی۔

رحمان کے بندوں کی دسویں صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اللہ سے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ پروردگار! ہمارے بیوی بچوں کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور متقی بنا۔ انسان کے لیے اس بڑھ کر کیا آزمائش ہو گی کہ اس کی اولاد اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جائے۔ اس لیے فرمانبردار بیوی اور صالح اولاد اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ جس کے لیے ہمیشہ دعا گو رہنا چاہیے۔ جس شخص کو گھر سے سکون نہ ملا تو اسے دنیا کی کسی جگہ سکون نہیں مل سکتا لہذا اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے پروردگار! کہ جن لوگوں کا آپ نے مجھے ذمہ دار بنایا ہے، ان کو فرمانبردار اور صالح بنانا۔



باب سوم اصلاح عبادات

اس باب میں اصلاح احوال کے ضمن میں توحید، نماز، تلاوت، ذکر و فکر، تہجد، دعا اور صدقہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

توحید اور عبادت

عبادت دو چیزوں کا نام ہے، محبت اور عاجزی۔ دل میں پہلے اپنے معبود کے لیے محبت پیدا ہوتی ہیں اور پھر وجود اس کی عظمت کے سامنے جھک جاتا ہے۔ پس عبادت کا معنی اللہ عزوجل سے انتہائی درجے میں محبت رکھنا اور اس کے سامنے انتہائی درجے عاجزی اختیار کرنا ہے۔ عبادت مارے باندھے کی اطاعت کا نام نہیں ہے بلکہ عبادت تو وہ فرمانبرداری ہے کہ جودل سے ہو۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَالْعِبَادَةُ: اسْمٌ يَجْمَعُ غَايَةَ الْحُبِّ لَهُ وَغَايَةَ الدُّلِّ لَهُ فَمَنْ ذَلَّ لِغَيْرِهِ مَعَ بُغْضِهِ لَمْ يَكُنْ عَابِدًا وَمَنْ أَحَبَّهُ مِنْ غَيْرِ ذُلٍّ لَهُ لَمْ يَكُنْ عَابِدًا وَاللَّهُ مُبْخَاثَةٌ يَسْتَحِقُّ أَنْ يُحَبَّ غَايَةَ الْمَحَبَّةِ؛ بَلْ يَكُونُ هُوَ الْمُحْبُوبَ الْمُطْلَقَ الَّذِي لَا يُحَبُّ شَيْءٌ إِلَّا لَهُ وَأَنْ يُعْظَمَ وَيُذَلَّ لَهُ غَايَةُ الدُّلِّ؛ بَلْ لَا يُذَلُّ لِشَيْءٍ إِلَّا مِنْ أَجْلِهِ.¹

”اور عبادت انتہائی درجے میں محبت رکھنے اور انتہائی درجے میں عاجزی اختیار کرنے کا نام ہے۔ پس جس نے کسی کے سامنے عاجزی اختیار کی لیکن دل میں اس سے بغض رکھا تو یہ عبادت نہیں ہے۔ اور جس نے کسی سے محبت رکھی لیکن اس کے سامنے عاجزی اختیار نہ کی تو یہ بھی عبادت نہیں ہے۔ اور اللہ عزوجل اس کے مستحق ہیں کہ ہم ان سے انتہائی درجے میں محبت رکھیں بلکہ وہی ہمارے محبوب مطلق ہوں اور ہر شے کی محبت ان کی محبت کی وجہ سے ہو۔ اور یہ کہ ہم اللہ عزوجل کی تعظیم کریں اور ان کے سامنے انتہائی درجے میں عاجزی اختیار کریں اور اگر کسی اور کے سامنے عاجزی کا اظہار ہو بھی تو وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہو۔“

قرآن مجید کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں نکالنا چاہیں تو وہ لفظ توحید ہے۔ جتنے انبیاء دعوت کا ذکر قرآن مجید میں ہے، تو وہ ایک ہی نقطے کے گرد گھومتی ہے اور وہ نقطہ یہ ہے

¹ ابن تیمیہ، نقی الدین أبو العباس أحمد بن عبد الحلیم الحارانی (المتوفی: 728ھ)، مجموع الفتاوی، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416ھ/1995م، 162/15

کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ عبادت میں توحید نہ ہو تو وہ عبادت، عبادت نہیں شرک ہے۔ عبادت اُسی وقت مقبول قرار پائے گی جبکہ اس میں توحید ہوگی ورنہ تو عبادت یہودی اور عیسائی بھی کرتے ہیں اور اُسی خدا کی کرتے ہیں کہ جس کی ہم کرتے ہیں۔

توحید دو قسم پر ہے۔ ایک دل کی اور دوسری عمل کی، توحید ارادی اور توحید عملی۔ دل کی توحید یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت کو غالب رکھے اور عمل کی توحید یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے اُس طرح عاجزی کا اظہار نہ کرے کہ جیسے اللہ کے سامنے ہونا چاہیے۔ دل کے شرک کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے اور عمل کے شرک کا تعلق اس کے افعال سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَمَن كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ
أَحَدًا﴾ [الكهف: 110]

”اے نبی ﷺ! کہہ دیں کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ تو جو اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔“

عبادت کی ابتدا اللہ کی محبت سے ہوتی ہے اور انتہا اس کے سامنے اپنے وجود کو زمین پر ڈال دینے سے۔ عبادت کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دل کی اصلاح ہو۔ دل کسی اور کامرید ہو اور عبادت اللہ کی ہو، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ توحید ارادی کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی اصل مراد، اللہ کی ذات بن جائے۔ پس انسان کا دل نہ مال کا مرید ہو، نہ دنیا کا، نہ خواہش کا، نہ شیخ کا، صرف اور صرف اللہ ہی کا مرید ہو۔

توحید میں اصل دل کی توحید ہے اور دل کی توحید یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت ہر شے پر غالب رہے۔ جب تک دل میں اللہ کی محبت غالب نہ ہوگی، اس وقت تک عبادت کی اصلاح کی بنیاد نہ پڑے گی۔ اگر دل میں دنیا، مال، مقام، خواہش، عورت اور شیخ وغیرہ

کی محبت اللہ کی محبت پر غالب آگئی تو یہی شرک ہے۔ اللہ عزوجل نے دنیا اور مخلوق کی محبت سے منع نہیں فرمایا لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ ان سے ویسی محبت نہ رکھو جیسی کہ اللہ سے رکھنی چاہیے یعنی کسی شے کی محبت بھی اللہ کی محبت کے برابر ہو جائے تو یہ شرک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ [البقرة: 165]

”کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مد مقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسے محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔“

اسی طرح اگر انسان کے دل پر اس کی خواہش کی محبت اس طرح مسلط ہو جائے کہ وہ اللہ کی چاہت پر غالب آجائے تو قرآن مجید نے اسے خواہش کی پوجا کا نام دیا ہے۔ شرک صرف بتوں کے سامنے سر جھکانے اور قبروں پر سجدہ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ انسان، بتوں اور قبروں کے علاوہ خواہش نفس کو بھی اللہ کا شریک بنالیتا ہے۔ ہمارے ہاں کتنے ہی لوگ ہیں کہ جو یورپ کا ویزہ لگوانے کی خاطر کفر کر گزرتے ہیں، محبوب کی خاطر خدا تک کو قربان کرنے کی قسمیں کھاتے ہیں، ملازمت کی خاطر دین اسلام چھوڑ جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا﴾ [الفرقان: 43]

”کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے کہ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا ہے؟ تو کیا آپ ﷺ ایسے شخص کی سفارش کریں گے؟“

اور عمل کا شرک یہ ہے کہ کسی اور کے سامنے ویسی ہی عاجزی کا اظہار کرے جیسا کہ اللہ کے سامنے کیا جاتا ہے۔ کسی بت، قبر، پیر، شیخ، گدی نشین، مذہبی پیشوا، محبوب اور حکمران کے سامنے ایسے جھکانا جیسے اللہ کے سامنے جھکا جاتا ہے تو یہ عمل کا شرک ہے۔ مزاروں پر جا کر قبروں کا طواف کرنا، ان کے سامنے سجدے میں پڑ جانا یا ان کے سامنے

رکوع کے بل جھک جانا شرک ہے کہ یہ تینوں عبادت ہی کی قسمیں ہیں۔ ہمارے ہاں مزاروں پر جو خرافات ہوتی ہیں تو وہ تمام مسالک اور مکاتب فکر کے جید علما کی نظر میں ممنوع ہیں لیکن جو کچھ ہو رہا ہے تو وہ جاہل مولویوں کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ بریلوی مکتبہ فکر کے بانی مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”روضہ انور کا طواف نہ کرو، نہ سجدہ کرو، نہ اتنا جھکنا کہ رکوع کے برابر ہو۔

حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اُن کی اطاعت میں ہے۔“¹

اب اس فتویٰ کو پڑھیں اور سوچیں کہ اعلیٰ حضرت تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر طواف، سجدہ اور رکوع سے منع فرمائیں اور یہاں امتیوں کے مزاروں پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اور طواف، سجدہ اور رکوع کی طرح دعا کرنا بھی عبادت ہی ہے لہذا اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارنا بھی شرک میں داخل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادًا أُمَّاتُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الأعراف: 194]

”یقیناً اللہ کے علاوہ جن سے تم دعائیں کرتے ہو تو وہ تمہاری طرح ہی کے بندے ہیں۔ پس تم ان سے دعائیں کرو تو انہیں چاہیے کہ وہ تمہاری دعائیں قبول بھی کریں، اگر تم سچے ہو۔“

پس جب دعا، عبادت ہی ہے۔ اور عبادت، اللہ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے تو پھر مشکل میں کسی ولی، امام، پیر، فقیر، شیخ اور بزرگ کو پکارنا اس کی عبادت کرنا ہی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

﴿إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ﴾²

”یقیناً دعا، عبادت ہی ہے۔“

تمام مسالک اور مکاتب فکر کے جید علما کا اتفاق ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی سے دعا نہیں

¹ احمد رضا خان بریلوی، فتاویٰ رضویہ شریف، مطبوعہ جامعہ نظامیہ، لاہور، 769/10

² سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب فضل الدعاء، 1258/2

کی جاسکتی ہے۔ البتہ کچھ علما کا کہنا ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہوئے اس کی جناب میں اس کے نیک بزرگوں کو وسیلہ بنا سکتے ہیں جبکہ اللہ کے علاوہ کسی نبی، ولی اور امام سے براہ راست مانگنے کا کوئی بھی جید عالم دین قائل نہیں رہا ہے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیا کرام سے استغاثہ اور استعانت مشروط طور پر جائز ہے جبکہ انہیں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کی بارگاہ میں وسیلہ جانے... اور اعتماد کر لے کہ بے حکم خدا تعالیٰ ذرہ نہیں ہل سکتا اور اللہ تعالیٰ کے دیے بغیر کوئی ایک حصہ نہیں دے سکتا۔ ایک حرف نہیں سن سکتا۔ پلک نہیں ہلا سکتا اور بے شک سب مسلمانوں کا یہی اعتقاد ہے۔“¹

وسیلے کے بارے صحیح رائے یہی ہے کہ اللہ سے دعا مانگتے ہوئے وسیلہ جائز تو ہے لیکن صرف ان چیزوں کا وسیلہ جائز ہے کہ جن کا ذکر کتاب و سنت میں مذکور ہے۔ مثلاً ایک تو اللہ کے ناموں کا وسیلہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ سے اس کے ناموں کے ذریعے دعا کیا کرو۔ پس دعا کرتے ہوئے یہ کہنا کہ اے اللہ! آپ کو ”حی قیوم“ ہونے کا واسطہ، مجھے صحت عطا فرمائیں اور میرے حالات سنواریں، تو یہ بالکل جائز ہے۔ اور دوسرا اپنے نیک اعمال کا وسیلہ جائز ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ایک غار میں تین اشخاص کے زندہ قید ہونے کا قصہ نقل ہوا ہے۔ اس روایت کے مطابق ان تینوں افراد نے اللہ کی جناب میں اپنے نیک اعمال پیش کر کے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی دعا کو قبول فرما کر ان کی آزمائش کو ٹال دیا۔² پس اگر یہ کہے کہ اے اللہ! فلاں وقت میں، میں نے یہ نیک کام کیا تھا۔ آپ کو اس کا واسطہ، آپ میری آزمائش ٹال دیں۔ تو یہ جائز ہے۔

اسی طرح کسی آزمائش کے وقت اللہ کے کسی نیک بندے کو جو کہ حیات ہوں، اللہ کی جناب میں وسیلہ بنایا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں بارش نہ ہونے

¹ احمد رضا خان بریلوی، احکام شریعت، مطبوعہ آگرہ، ہندوستان، 4/1

² صحیح البخاری، کتاب الإجازۃ باب من استأجر أجیراً ففترک الأجر أجزء، 91/3

پر اللہ کے رسول ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اللہ سے دعا مانگتے تھے جو قبول ہوتی تھی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ ہم اپنے کسی جانے والے نیک شخص سے کہتے ہیں کہ بھائی! میرے لیے دعا کرنا۔ اور ان لوگوں کا وسیلہ کہ جو فوت ہو چکے ہوں، تو وہ جائز نہیں ہے۔ اگر فوت شدگان سے وسیلہ جائز ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور نبی کریم ﷺ کو وفات کے بعد بھی وسیلہ بناتے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، كَانَ إِذَا قَحَطُوا اسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، فَقَالَ: «اللَّهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِينَا، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا»، قَالَ: «فَيَسْقُونَ»¹

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب بھی قحط پڑتا تو حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو نماز استسقاء کے لیے بلواتے اور یہ کہتے: اے اللہ! جب تک اللہ کے نبی ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے تو ہم انہیں آپ کی جناب میں وسیلہ بناتے تھے اور آپ بارش برسا دیتے تھے۔ اور اب ہم اللہ کے نبی ﷺ کے چچا کو آپ کی جناب میں وسیلہ بناتے ہیں، پس آپ ہمیں بارش دے دیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس طرح لوگوں کو بارش دے دی جاتی تھی۔“

دنیا میں وہ لوگ تقرب الی اللہ کے درجات جلد طے کر لیتے ہیں اور سلوک کی منازل میں بہت اوپر تک جاتے ہیں کہ جن کا عقیدہ صحیح اور فکر صالح ہو۔ انسان کا عمل اسے اللہ کے اتنا قریب نہیں کرتا جتنا اللہ کے بارے اس کا عقیدہ اسے اللہ کے قریب کر دیتا ہے۔ اور آخرت میں انسان کا عمل اسے جنت میں اتنے بلند درجات عطا نہیں کرے گا جتنا کہ اس کا اللہ کے بارے عقیدہ اسے بلند درجات تک لے جائے گا۔ اور سلوک کی منازل یہ نہیں ہیں کہ کوئی پہلے آسمان پر ہے اور کوئی ساتویں پر جیسا کہ تصوف میں ہو رہا ہے۔ سلف صالحین کے نزدیک سلوک کی جمیع منازل عبودیت اور استعانت کے مابین

¹ صحیح البخاری، أبواب الاستسقاء، باب سؤال التائب الإمام الاستسقاء إذا قحطوا، 27/2

ہیں جیسا کہ امام ابن القیمؒ کی کتاب "مدارج السالکین بین منازل إياك نعبد وإياك نستعين" کا موضوع یہی ہے یعنی سلوک کی ان منازل کا بیان جو کہ ایک نعبہ اور ایک نستعین کے مابین ہیں۔ عبادت کی توحید سے سلوک کے راستے کا سفر شروع ہوتا ہے اور دعا کی توحید پر اس کا اختتام ہوتا ہے اور بقیہ منازل اس کے مابین ہیں۔

پس عقیدے کی اصلاح بہت ضروری ہے کہ اللہ کی معرفت ہی تو اصلاح احوال کی بنیاد ہے۔ جیسی اللہ کی معرفت ہوگی، ویسے ہی احوال نصیب ہوں گے۔ اور درست بات یہی ہے کہ احوال سب کو نصیب ہو جاتے ہیں لیکن کچھ شیطانی ہوتے ہیں اور کچھ رحمانی۔ بت اور قبر کو سجدہ کرنے والے کے لیے بھی شیطان اس کے عمل میں لذت اور کیفیت ڈال دیتا ہے۔ جو اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں بھی یہ کہنے میں کچھ نہ کچھ کیفیات حاصل ہو رہی ہوتی ہیں جو کہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ رحمانی اور شیطانی احوال میں فرق کرنے والی شئی شریعت ہے۔

توحید اسماء و صفات کے باب میں جیسے احوال سلفیت میں حاصل ہو سکتے ہیں، ویسے کسی بھی دوسری فکر میں حاصل نہیں ہو سکتے کہ یہ سلفیت ہی تو ہے کہ جو اسماء و صفات میں جس طرح لغوی معنی جاری کرتی ہے، وہ غیب میں موجود جمال کو ان کے لیے حاضر بنا دیتا ہے۔ وہ دیکھے نہ جاسکنے والے محبوب کو دیکھ لینے کی خواہش پوری کرنے کے راستے نکال دیتا ہے۔ وہ انسانی کے جمالیاتی شعور (aesthetic consciousness) کے بنیادی تقاضے "حضور حقیقت" (presence of reality) کو ممکن بنا دیتا ہے۔

اس کو یوں سمجھیں کہ علما نے توحید کی تین قسمیں بنائی ہیں۔ پہلی قسم توحید ربوبیت کہلاتی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کو اس کے افعال میں اکیلا اور وحدہ لا شریک ماننا۔ وہ اکیلا اس دنیا کا خالق ہے، وہ اکیلا اس دنیا کا نظام چلا رہا ہے، وہ اکیلا اس دنیا کا رازق ہے، وہ اکیلا ہے جو سب کو زندگی اور موت عطا کرتا ہے، وہ اکیلا ہے جو ساری دنیا کا مالک ہے وغیرہ۔ اور چند ایک جہلا کے علاوہ مسلمانوں میں سب فرقے اس کے قائل ہیں۔

دوسری قسم توحید الوہیت کہلاتی ہے۔ اس کا معنی ہے کہ بندوں کا اپنے افعال میں

اللہ کو اکیلا اور وحدہ لا شریک ماننا۔ آسان الفاظ میں اللہ کو اس کی عبادت میں اکیلا اور وحدہ لا شریک ماننا اور اس کو توحید عبادت بھی کہتے ہیں۔ وہ اکیلا ہے جو رکوع اور سجدے کے لائق ہے، وہ اکیلا ہے جو طواف اور سعی کے لائق ہے، وہ اکیلا ہے جو دعا اور مناجات کے لائق ہے، وہ اکیلا ہے جو نذر و نیاز اور قربانی کے لائق ہے وغیرہ۔ اور جہلا کے علاوہ سب مکاتب فکر اس کے قائل ہیں۔

اور تیسری قسم توحید اسما و صفات ہے۔ کتاب و سنت میں اللہ کے جو نام اور اسما نقل ہوئے ہیں، ان پر اسی طرح ایمان رکھنا کہ جیسے یہ نقل ہوئے ہیں۔ ان کے لغوی معنی پر ایمان رکھنا جبکہ ان کی کیفیت کو بیان نہ کرنا۔ اللہ کی ذات کا تعارف حاصل کرنے کا ہمارے پاس ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ اس کی اسما و صفات ہیں۔ تمام مکاتب فکر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ کے ناموں میں اس کے ظاہری لغوی معنی کو جاری کیا جائے گا۔ اسی طرح تمام مکاتب فکر میں سات صفات کے بارے بھی اتفاق ہے کہ ان میں ظاہری لغوی معنی کو جاری کیا جائے گا اور وہ حیات، علم، قدرت، ارادہ، کلام، سماعت اور بصارت کی صفات ہیں۔

اس کے علاوہ صفات میں اختلاف ہے جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ کے چہرے، ہاتھ، عرش پر مستوی ہونے وغیرہ کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے اللہ عز و جل نے ارشاد فرمایا کہ میں نے آدم علیہ السلام کو اپنے دو ہاتھوں سے پیدا کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِإِيدِي﴾ [ص: 75]

”اللہ عز و جل نے کہا: اے ابلیس! جس شخص کو میں نے اپنے دو ہاتھوں سے

بنایا، اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا۔“

اب اللہ کے ہاتھ تو ہیں لیکن کیسے ہیں، یہ معلوم نہیں ہے۔ اور اس بارے غور و فکر کرنا کہ اللہ کے ہاتھ کیسے ہیں، بدعت ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ کے ہاتھوں سے مراد، قدرت ہے۔ اور اسے تاویل کرنا کہتے ہیں، اور یہ بھی بدعت ہے کہ صحابہ، تابعین،

تبع تابعین اور ائمہ دین تاویل نہیں کرتے تھے۔ دو ہاتھوں کا لفظ عربی زبان میں قدرت کے لیے استعمال نہیں ہوتا اگرچہ ہاتھ کا لفظ قدرت کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ عزوجل نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اپنی قدرت سے بنایا اور بقیہ مخلوق کو بھی اپنی قدرت ہی سے پیدا کیا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی؟ پس اللہ کے ہاتھوں سے مراد اس کے ہاتھ ہی ہیں، قدرت نہیں۔ البتہ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اللہ کے ہاتھ انسانوں جیسے ہیں کہ یہ تشبیہ ہے اور یہ بھی بدعت ہے۔ ہمیں جتنا بتلایا گیا، ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ اور جو نہیں بتلایا گیا، اس کی کھود کرید نہیں کریں گے۔ صفات باری تعالیٰ کے بارے یہ سلف کا موقف تھا۔

اس آیت مبارکہ میں شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولانا شرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، مولانا مودودی، مولانا پیر کرم شاہ رحمہ اللہ سب نے آیت کا ترجمہ ہاتھ ہی سے کیا ہے اور قدرت کسی نے بیان نہیں کیا کیونکہ ”یدی“ کا قدرت کے لفظ سے ترجمہ کرنے سے دو قدر تیں بن جاتیں کہ اللہ عزوجل نے آدم علیہ السلام کو دو قدرتوں سے پیدا فرمایا اور یہ غیر منطقی ترجمہ ہوتا۔ اور اگر اللہ عزوجل کے دو ہاتھوں سے مراد دو قدرتیں لی جائیں تو اس آیت کا کیا معنی بنے گا کہ جس میں ارشاد ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ [المائدة: 64]

”اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں اور ایسا کہنے کے سبب ان پر لعنت کی گئی۔ اور اللہ عزوجل کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔“

پس ایسی صفات کے بارے معروف موقف تین ہیں۔ بعض لوگ ان صفات باری تعالیٰ میں بھی ظاہری لغوی معنی جاری کرتے ہیں اور اس کی کیفیت بیان نہیں کرتے اور یہ اسلاف کا موقف ہے۔ اسلاف سے مراد صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین رحمہم اللہ ہیں۔ بعض ایسی صفات میں تاویل کے قائل ہیں کہ ان میں مجازی معنی مراد لیا جائے گا

اور یہ متاخرین کا موقف ہے۔ مولانا پیر کرم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ﴿خَلَقْتُ بَيْدَيَّ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”اس کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ جس کو میں نے اپنے دو ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ ہیں؟ اسلاف کا مسلک یہ ہے کہ وہ ان کلمات کی تاویل نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہاں اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں جس طرح آیت میں مذکور ہے۔ لیکن وہ کیسے ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے ہمیں اس کی خبر نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی ان کی حقیقت کو جانتا ہے۔ اور متاخرین علما کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوسرے انسانوں کو میں نے ماں باپ کے واسطے سے پیدا کیا، لیکن آدم کو بلا واسطہ محض اپنی قدرت سے پیدا فرمایا۔ تو یہاں یہاں کا معنی قدرت ہے اور یہ استعمال لغت عرب میں عام ہے۔“¹

برصغیر کے جید حنفی عالم دین مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس باب میں علما کے چند مسلک ہیں: ایک مسلک تاویل کہ استواء بمعنی استیلا اور یہ بمعنی قدرت اور وجہ بمعنی ذات، و علیٰ ہذا القیاس اور یہی مختار اکثر متاخرین متکلمین کا ہے۔ دوسرا مذہب: تشابہ فی المعنی وفي کیفیة۔ تیسرا مسلک: معلوم المعنی، تشابہ الکیفیہ۔ اور حق ان میں مسلک ثالث ہے اور یہی مذہب صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین و محدثین و فقہاء و اصولیین محققین ہے۔“²

بعض تفویض کے قائل ہیں کہ ہم نہ تو ان صفات کی تاویل کریں گے اور نہ ہی ان کا لغوی معنی بیان کریں گے³ لیکن یہ موقف بھی درست نہیں ہے۔ اس بارے درست موقف وہی ہے، جو سلف صالحین کا ہے۔ مثال کے طور قرآن مجید میں سات مقامات پر اس صفت کا ذکر ہے کہ اللہ عزوجل اپنے عرش پر مستوی ہوئے۔ اب بعض لوگ اس کی

¹ پیر کرم شاہ، مولانا، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، 252/4

² سلیم اللہ خان، مولانا، ماہنامہ وفاق المدارس، نومبر 2010ء، ص 9

³ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے تفسیر عثمانی میں اور مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے ماہنامہ وفاق المدارس کے ایک مجلہ میں شائع شدہ مضمون میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔

تاویل کرتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ مان لیا کہ اللہ عزوجل عرش پر ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا، وہ آئے گا، جبکہ سلف اس کو ایسے ہی مانتے تھے جیسا کہ یہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ حضرت یحییٰ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ ہم امام مالک رحمہ اللہ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے تو امام مالک رحمہ اللہ کو یہ سوال سن کر پسینے چھوٹ گئے اور انہوں نے اپنا سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر بعد فرمایا:

الْإِسْتِوَاءُ غَيْرُ مَجْهُولٍ، وَالْكَثِيفُ غَيْرُ مَعْقُولٍ، وَالْإِيمَانُ بِهِ وَاجِبٌ، وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بَدْعَةٌ، وَمَا أَوَّلَكَ إِلَّا مُبْتَدِعًا، فَأَمَرَ بِهِ أَنْ يُخْرَجَ¹

”اللہ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے۔ اور اس کی کیفیت کیا ہے، یہ عقل میں نہیں آسکتی۔ اور اس کے عرش پر مستوی ہونے پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تو بھی بدعتی ہے۔ پس امام مالک رحمہ اللہ نے اس شخص کے بارے حکم دیا کہ اسے ان کی مجلس سے اٹھا دیا جائے تو اسے ان کی مجلس سے اٹھا دیا گیا۔“

پس ایک خدا وہ ہے کہ جس کا تعارف قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ اور ایک خدا وہ ہے کہ جو انسانوں نے قرآن مجید اور احادیث سے اپنے ذہن کے مطابق نکالا ہے۔ اور جو انسانوں نے نکالا ہے تو ان میں آپس میں بھی اختلاف ہے کہ اسما و صفات میں جہیمہ کچھ کہتے ہیں، معتزلہ کا کچھ موقف ہے، اشاعرہ کا اور موقف ہے اور ماترید یہ کا اور۔ کچھ فلسفی جب خدا کو ماننے ہیں تو خدا کی حقیقت ان کے نزدیک علیہ العلیل (The Prime Mover) سے زائد کچھ نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب کچھ سائنسدان خدا کو مانتے ہیں تو خدا کی حقیقت ان کے نزدیک ایک ریاضیاتی دماغ (mathematical mind) کی سی ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی بعض گروہوں نے خدا کو مان تولیا لیکن ان کے نزدیک خدا نہ بول سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے، نہ

¹ البیہقی، أحمد بن الحسین بن علی الخراسانی، (المتوفی: 458ھ)، الاعتقاد والهدایة إلى سبیل الرشاد علی مذهب السلف وأصحاب الحديث، دار الآفاق، بیروت، الطبعة الأولى، 1401ھ، ص 116

بلند ہو سکتا ہے، نہ اتر سکتا ہے، نہ جاسکتا ہے، نہ آسکتا ہے۔¹ یہ جمیع تصورات خدا کے ناقص تصورات ہے اور انسانوں کے بنائے ہوئے تصورات ہیں۔ خدا کا صحیح تصور وہی ہے جو کتاب و سنت میں بیان ہو گیا ہے۔

پس کتاب و سنت میں اللہ عز و جل کی صفات کی جب تاویل کی جاتی ہے تو انسان ایک ایسے خدا پر ایمان لا رہا ہوتا ہے کہ جو خود اس کے ذہن کی تخلیق ہو۔ بعض لوگ کتاب و سنت سے خدا کا تصور بناتے ہیں کہ جہاں وہ لے جائے، بس ہمارا خدا وہی ہے۔ اور بعض لوگ پہلے سے اپنے ذہن میں خدا کا ایک تصور رکھتے ہیں اور پھر اگر کتاب و سنت کا خدا اس کے خلاف ہو تو نصوص کی تاویل کر اسے اپنے ذہن کے خدا کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ ہمیں حکم اس خدا پر ایمان لانے کا ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کا خدا ہے نہ کہ اپنے ذہن کے خدا پر۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ کا خدا وہی ہے کہ جو کتاب و سنت میں بیان ہو چکا ہے، اور جس پر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین رضی اللہ عنہم کا ایمان تھا کہ وہ خیر القرون میں سے تھے۔

پس قرآن مجید اور احادیث میں اللہ کا جو تعارف کروایا گیا ہے، اس کی تاویل نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے اللہ کی حقیقی معرفت کبھی حاصل نہ ہوگی۔ اس کی تفصیل ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب ”وجود باری تعالیٰ“ میں بیان کر دی ہے۔ اگر غور کریں تو توحید ربوبیت انسان کے عقلی شعور، توحید عبودیت نفسیاتی شعور اور توحید اسما و صفات جمالیاتی شعور کی تسکین ہے اور اسما و صفات کی تاویل اور تفویض کے ذریعے اس شعور کی تسکین اور سیرابی کے جمیع رستے بند کر دیے گئے ہیں۔² صفات میں تاویل کرنے سے خدا کوئی

¹ قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ قیامت والے دن آپ کا رب اور فرشتے آسمانوں سے ہماری زمین پر نازل ہوں گے اور یہ زمین اللہ عز و جل کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ [الفجر: 22؛ الزمر: 69] اب اس کا معنی واضح ہے لیکن بہت سے لوگ ایسی آیات کی تاویل کرتے ہیں۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ تاویل کرنے سے وہ احوال پیدا نہیں ہوتے کہ جو ان صفات کو جیسا کہ وہ ہیں، مان لینے سے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہ بات کہی تھی کہ توحید کے باب میں سلفیت میں جو احوال نصیب ہوتے ہیں، وہ کبھی دوسری فکر میں نصیب نہیں ہوتے۔

² توحید اُلسماء و صفات کے بارے ائمہ اربعہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور صاحبین یعنی قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا عقیدہ یہی ہے کہ وہ اس میں

ذات محسوس نہیں ہوتا بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی روشنی اور لہر ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ اور جہاں تک سوال کی بات ہے تو سوال تو خدا کو ایک ذات مان لینے ہی سے پیدا ہو جاتا ہے کہ کوئی ذات جسم کے بغیر نہیں ہوتی ہے لہذا سوال پیدا ہو جانے کے خوف سے اللہ کی ذات کے اس تعارف کا ہی انکار نہیں کر دینا چاہیے جو اس نے خود اپنی کتاب میں اپنے بارے میں کروایا ہے اور اسی مقصد سے کروایا ہے کہ اس کی مخلوق کو اس کا تعارف حاصل ہو۔

نماز اور تزکیہ

قرآن مجید کے مطابق نماز انسان کو برائی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔ اب بہت سے نمازی ایسے ہیں کہ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور برائی سے بھی نہیں رکتے۔ نمازی بھی ہیں اور بے حیائی سے بھی باز نہیں آتے۔ پس واضح رہے کہ وہی نماز انسان کو برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے کہ جو خشوع والی نماز ہو۔ خشوع سے مراد دل کی وہ نرمی، رقت، عاجزی اور انکساری ہے کہ جس کا اظہار انسان کے اعضا سے بھی ہو رہا ہو۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو نماز میں ڈاڑھی سے کھیتے دیکھا تو کہا کہ اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضا سے بھی اس کا اظہار ضرور ہوتا۔¹ نماز میں خیالات یا وسوس کا آنا ایک عام بیماری ہے کہ اس امت میں سب سے پہلا خیر جو اٹھا لیا جائے گا، وہ خشوع ہی ہے۔ حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنْ شِئْتُ لَأَحْدِثَنَّكَ بِأَوَّلِ عِلْمٍ يُرْفَعُ مِنَ النَّاسِ؟ الْخُشُوعُ، يُوشِكُ أَنْ تَدْخُلَ مَسْجِدَ جَمَاعَةٍ فَلَا تَرَى فِيهِ رَجُلًا خَاشِعًا»²

”اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس علم کے بارے میں بھی بتلا دوں کہ جو لوگوں میں

ظاہری لغوی معنی کو جاری کرتے ہیں اور کیفیت بیان نہیں کرتے۔ اس بارے میں نے مابینامہ محدث مارچ 2011ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون ”کیا صفات الہیہ میں ائمہ اربعہ مفوض ہیں؟“ میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

¹ ابن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان العسبی، الکتاب المصنف فی الأحادیث والآثار، مکتبۃ الرشید، الرياض، 1409ھ، 86/2

² سنن الترمذی، أبواب العلم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی ذهاب العلم، 31/5

سب سے پہلے اٹھایا جائے گا۔ اور وہ خشوع ہے۔ تم کسی ایسی مسجد میں جاؤ گے کہ جہاں جماعت سے نماز ہو رہی ہو اور تمہیں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آئے گا کہ جس میں خشوع ہو۔“

خشوع دو قسم کا ہے، ایک اخلاص کا اور دوسرا ریاکاری کا۔ اخلاص کا خشوع وہ ہے کہ جس کا اظہار مجلس اور تنہائی دونوں میں ایک جیسا ہو۔ پس خشیت کی جو کیفیت مجلس میں پیدا ہو، تنہائی میں اس سے بہتر یا کم از کم اس جیسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ اس کے برعکس ریاکاری کا خشوع وہ ہے کہ جس کا اظہار صرف مجلس میں ہوتا ہے۔ پس اگر مجلس میں تو خشیت طاری ہوتی ہو لیکن تنہائی میں نہ ہوتی ہو تو یہ ریاکاری کا خشوع ہے۔

بعض اوقات انسان نماز میں کسی ایسے شخص کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے کہ جو اس کا جان پہچان والا ہو۔ پس اس کی موجودگی کی وجہ سے انسان کا دھیان اور اعضا کا سکون نماز میں بڑھ جاتا ہے لہذا یہ ریاکاری کا خشوع ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس کا مصدر شیطان ہے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ بعض اوقات گھر میں مہمان آئے ہوں تو انسان غیر ارادی طور پر تجھ پڑھنے یا رکعتیں لمبی کرنے لگ جاتا ہے تو یہ بھی ریاکاری کا خشوع ہے۔ ریاکاری کا خشوع یہ بھی ہے کہ جماعت کرواتے ہوئے امام صاحب کو رونا آئے یا رقت طاری ہو جبکہ تنہائی کی نماز میں نہ آنسو جاری ہوں اور نہ ہی دل کی نرمی حاصل ہوتی ہو۔ بہر حال ہمارا موضوع اس وقت اخلاص کا خشوع ہے جو نماز میں اصل مقصود ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيَنْصَرِفُ وَمَا كُتِبَ لَهُ إِلَّا عَشْرُ صَلَاتِهِ تَسْعُهَا ثُمْنُهَا مُنْعُهَا سُدُسُهَا خُمُسُهَا زُنْعُهَا ثُلُثُهَا نَصْفُهَا»¹

”لوگ نماز پڑھ کر جب واپس ہوتے ہیں تو ان میں سے بعض کے لیے نماز کے ثواب میں سے دسواں حصہ، بعض کے لیے نواں، بعض کے لیے آٹھواں، بعض کے لیے ساتواں، بعض کے لیے چھٹا، بعض کے لیے پانچواں، بعض کے لیے چوتھا، بعض کے لیے تیسرا اور بعض کے لیے آدھا لکھا جاتا ہے۔“

¹ سنن أبي داود، أبواب تفریع اشتیقات الصلوة، باب ما جاء في نقصان الصلوة، 211/1

اس روایت میں خطاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہے لہذا معلوم ہوا کہ ایک ہی جیسی ظاہری صورت، وقت اور مقام میں نماز پڑھنے کے باوجود ثواب میں فرق رہ جاتا ہے اور ثواب کا یہ فرق نماز میں انسان کی قلبی توجہ اور ذہنی یکسوئی میں اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس خشوع کی کمی سے ثواب کم اور خشوع کی زیادتی سے ثواب بڑھ ہو جاتا ہے۔

نماز میں خشوع کیسے حاصل ہو؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ بعض اہل علم نے اس سوال کے جواب میں نماز میں خشوع و خضوع کے حصول کے طریقے بیان کر دیے ہیں۔ یہ ایک مفید بحث ہے لیکن ہماری رائے میں خشوع و خضوع کی تدابیر اختیار کرنے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ غور کیا جائے کہ نماز میں خشوع و خضوع کے حصول میں رکاوٹیں (hindrances) کیا ہیں، اور پہلے انہیں دور کیا جائے اور پھر تدبیر پر عمل کیا جائے جیسا کہ ہم تخلیہ اور تحلیہ کے عنوان کے تحت اس بارے گفتگو کر چکے ہیں۔

نماز میں خشوع و خضوع کے موانع (hindrances) دو قسم کے معلوم ہوتے ہیں: ایک خارجی اور دوسرے داخلی۔ خارجی رکاوٹوں کی مثالوں میں جیسا کہ شیطان ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ سے ایک صحابی نے نماز میں وساوس زیادہ آنے کی شکایت کی تو آپ نے کہا کہ یہ ”خنزب“ شیطان ہے۔ بس نماز سے پہلے اس سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ تو اس کا علاج تو اللہ کے رسول ﷺ نے بتلادیا اور ان صحابی کو اس کے بعد کوئی وسوسہ محسوس بھی نہ ہوا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ خَالَ بَيْنِي وَبَيْنَ صَلَاتِي وَقِرَاءَتِي يَلْبِسُهَا عَلَيَّ» فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «ذَلِكَ شَيْطَانٌ يُقَالُ لَهُ خَنْزَبٌ، فَإِذَا أَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذْ بِاللَّهِ مِنْهُ، وَانْفِلْ عَلَى يَسَارِكَ ثَلَاثًا» قَالَ: «فَفَعَلْتُ ذَلِكَ فَأَذْهَبَهُ اللَّهُ عَنِّي»¹

”اے اللہ کے رسول ﷺ! شیطان میرے اور میری نماز اور میری قراءت کے مابین حائل ہو جاتا ہے اور اس کو مجھ پر خلط ملط کر دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

¹ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التَّعَوُّذِ مِنَ الشَّيْطَانِ الْوَسْوَسةِ فِي الصَّلَاةِ، 1728/4

اس شیطان کا نام ”خنزب“ ہے۔ پس جب تجھے ایسا محسوس ہو تو اس سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو اور اپنے بائیں طرف تین مرتبہ ہلکا سا تھوک دیا کرو۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا تو وہ شیطان مجھ سے جاتا رہا۔“

ہم میں سے اکثر کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ خنزب شیطان سے پناہ بھی مانگ لیتے ہیں اور دل پر پھونک بھی مار لیتے ہیں لیکن پھر بھی وسوسہ جاری رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خشوع و خضوع کی رکاوٹیں ایک سے زائد یاد گیر نوعیتوں کی بھی ہیں۔ خارجی رکاوٹ کی مثال کوئی دنیاوی ضرورت یا حاجت ہو سکتی ہے۔ اس کا علاج بھی یہ ہے کہ انسان کو اگر کوئی دنیاوی ضرورت یا حاجت پریشان کر رہی ہو تو پہلے اسے پورا کرے اور پھر نماز پڑھے تو نماز میں توجہ بہت بڑھ جائے گی، ان شاء اللہ۔ جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بول و برازی کی ضرورت یا نیند کے غلبے کی حالت میں پہلے حاجت پوری کرنے اور پھر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدُكُمْ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ، وَلَا وَهُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ»¹
 ”تم میں کوئی اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ کھانا اس کے سامنے موجود ہو یا وہ بول و براز کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّي فَلْيَرْقُدْ، حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ، فَإِنْ أَحَدُكُمْ إِذَا صَلَّى وَهُوَ نَاعِسٌ، لَا يَدْرِي لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسْبُ نَفْسُهُ»²

”جب تم میں سے کوئی نماز میں اونگھے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے سو جائے، یہاں تک کہ اس کی نیند پوری ہو جائے۔ پس جب کوئی تم میں سے اونگھ کی حالت میں نماز پڑھے گا تو اسے یہ معلوم نہ ہو گا کہ وہ استغفار کر رہا ہے یا اپنے کو آپ لعن طعن کر رہا ہے۔“

سنن اور نوافل میں تو ہم یہ اہتمام کر لیں کہ دنیاوی حاجت سے فراغت کے بعد ہی

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 507/40

² صحيح بخاري، كتاب الوضوء، باب الوضوء من النوم، 53/1

نماز پڑھنے کی کوشش کریں جیسا کہ اگر ہم نے عشا کے وقت گھر والوں کے ساتھ کہیں آؤٹنگ یا کھانا کھانے کے لیے جانا ہے تو فرض مسجد میں پڑھ کر نکل آئیں۔ پھر واپس گھر آ کر سونے سے پہلے فراغت کی حالت میں عشا کی سنتیں اور وتر ادا کریں۔

فرائض میں البتہ جماعت کی پابندی لازم ہے۔ اگر جماعت نکل گئی تو پھر اگر کام ایسا ہے کہ نماز میں وہی ذہن پر غالب رہے گا تو پہلے کام کر لے اور نماز کو دیر سے ادا کر لے لیکن منتهی اوقات (the end of the time) سے باہر نہ جائے کہ نماز قضا ہو جائے کیونکہ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور اگر کوئی پریشانی ذہن پر چھائی ہوئی ہو تو اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ نماز میں اذان کے فوراً بعد مسجد میں حاضر ہو جائے کہ اسے فرض نماز سے پہلے دس منٹ مل جائیں۔ پانچ منٹ میں دو رکعت نفل نماز پڑھے اور بقیہ پانچ منٹ میں اذکار میں دل لگانے کی کوشش کرے تو فرض نماز میں اسے توجہ حاصل ہو جائے، ان شاء اللہ۔ اور اگر فرض نماز کے لیے پہنچا ہی تاخیر سے ہے کہ جماعت کی نماز کھڑی ہے تو اب یہی کرے کہ ذہن کو حاضر رکھنے کے لیے اپنے نفس سے ممکن مجاہدہ کرے۔ اس سے اگرچہ غالب توجہ نہ بھی حاصل ہو لیکن کسی قدر ضرور حاصل ہو جائے گی اور مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ میں اتنی توجہ نہ بھی ہو کہ جس سے نصف ثواب حاصل ہوتا ہو لیکن اس مجاہدے کی بدولت کم از کم دسویں حصے سے کسی بڑے درجے میں ثواب لینے کا حقدار تو ضرور بن جائے گا۔

پس خارجی رکاوٹیں تو یہی دو معلوم ہوتی ہیں: ایک شیطان اور دوسرا انسانی حاجات و ضروریات اور دونوں کے علاج کے بارے گفتگو کسی قدر ہو چکی ہے۔ پہلے رکاوٹ کا تعین کریں کہ شیطانی و سوسے ہیں یا دنیاوی پریشانیاں اور پھر اس کا علاج کریں تو فائدہ ضرور ہوگا، تو ان شاء اللہ۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هَذَا، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»¹

¹ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب صفۃ الوضوء وکمالہ، 205/1

”جس نے میرے طریقے کے مطابق وضو کیا اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اس طرح کے ان دو رکعتوں میں اس نے اپنے نفس کے ساتھ کوئی گفتگو نہ کی ہو [یعنی مکمل توجہ اللہ ہی کی طرف رہی ہو] تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کے سابقہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں۔“

نماز میں احسان

نماز میں ایسے خیال کا آنا جو انسان کو اللہ کے حضور اور اس کے سامنے کھڑے ہونے کے تصور سے نکال دے، احسان کے منافی ہے۔ حدیث جبریل علیہ السلام میں ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسے عبادت کرو جیسے تم اللہ کو دیکھ رہے ہو یا ایسے جیسے اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہوں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ: مَا الْإِحْسَانُ؟ قَالَ: «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»¹

”حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کہ تم اللہ کی ایسے عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اسے دیکھ نہ سکو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔“

احسان کا لفظ حسن سے نکلا ہے، پس احسان دراصل عبادت میں حسن پیدا کرنے کا نام ہے۔ اللہ کو دیکھنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کے بارے کوئی تصویر (image) اپنے ذہن میں قائم کر لے اور اسے اپنا رب سمجھ لے۔ ایسا خدا جو انسان کی سوچ میں آجائے، انسانی ذہن کی تخلیق (creation) ہوگا۔

اس حدیث سے مراد صرف اتنی ہے کہ اگر وہ شخص اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ کو دیکھ رہا ہو تو اس میں اللہ کی خشیت کی کیفیات اور اللہ کی محبت کے احوال کیسے ہوتے؟ تو ایسی ہی خشیت کی کیفیات اور محبت کے احوال کے ساتھ نماز ادا کرے تو یہ احسان کا افضل درجہ ہے۔ اور احسان کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے، تو اس تصور کے ساتھ

¹ صحیح بخاری، کتاب الإيمان، باب سُؤَالِ جِبْرِيلَ الثَّوْبِيِّ عَنِ الْإِيمَانِ، وَالْإِحْسَانِ، 19/1

اللہ کی خشیت کی جو کیفیات اور اللہ کی محبت کے جو احوال پیدا ہوں تو ان کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اور یہی احسان والی نماز ہے۔

اور اللہ کی خشیت کی کیفیات اور محبت کے احوال اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ دوران نماز انسان کا دل اور دماغ دونوں اللہ کی طرف یکسو (focused) ہوں۔ اور اگر یہ دونوں اللہ کی طرف یکسو نہ ہو رہے ہوں تو انہیں یکسو کرنے کے لیے جو محنت اور کوشش کرے گا تو اسے مجاہدہ کہتے ہیں کہ جو خود ایک نیکی ہے۔

نماز میں انسان کو اللہ کے سوا کی جو سوچ آتی ہے، وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے دو قسم کی ہے: ایک دینی اور دوسری دنیاوی۔ احسان کی اعلیٰ ترین صورت تو یہی ہے کہ انسان نماز میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی سوچ سے دور رہے اور اس کی سوچ، اللہ کی خشیت اور اللہ کی محبت کے ساتھ، صرف اُسی کی طرف یکسو ہو۔ منافقین کے بارے قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَى يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: 142]

”اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے دکھلاوا کرتے ہیں۔ اور [نماز میں] اللہ عز و جل کو بہت تھوڑا یاد رکھتے ہیں۔“

پس اس آیت مبارکہ میں یہ اشارہ ہے کہ نماز میں صرف اللہ ہی کی ذات کو یاد رکھنا چاہیے، دل سے بھی اور دماغ سے بھی۔ ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ نماز میں بعض اوقات اللہ کے غیر کی سوچ کا آجانا احسان اور خشوع کے منافی نہیں ہوتا مثلاً نماز میں قرآن مجید کے معانی پر غور کرنا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے کئی ایک احادیث میں مروی ہے کہ آپ کو حالت نماز میں جنت یا جہنم کا مشاہدہ کروایا گیا۔ جب یہ مشاہدہ خود حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے کروایا گیا تھا تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ نماز میں سوچ اگر دینی ہو یا ایسی ہو کہ وہ اللہ کی ذات کی توثیق ہو لیکن اللہ کی ذات کی طرف متوجہ کرنے والی ہو تو ایسی سوچ احسان اور خشوع کے منافی نہیں ہوتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَصَلَّى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ... قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، رَأَيْتَاكَ تَنَاقَلْتَ شَيْئًا فِي مَقَامِكَ ثُمَّ رَأَيْتَاكَ كَعَجْكَعْتَ؟ قَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنِّي رَأَيْتُ الْجَنَّةَ، فَتَنَاقَلْتُ عَنْقُودًا، وَلَوْ أَصْبَهُتُ لَأَكَلْتُمُ مِنْهُ مَا بَقِيَتْ الدُّنْيَا، وَارَيْتُ النَّارَ، فَلَمْ أَرْ مَنْظَرًا كَالْيَوْمِ قَطُّ أَفْظَعَ»¹

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں سورج گرہن لگا تو آپ نے نماز پڑھائی... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہم نے آپ کو دیکھا ہے کہ آپ [نماز میں] اپنی جگہ پر کوئی چیز پکڑ رہے تھے اور پھر ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ الٹے قدموں واپس پلٹ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بیشک میں نے جنت دیکھی تو میں نے اس سے ایک خوشہ پکڑنا چاہا اور اگر میں اسے لے لیتا تو آپ لوگ اسے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے۔ اور مجھے جہنم دکھائی گئی اور میں نے آج تک اس جیسا خوفناک منظر نہیں دیکھا۔“

اسی طرح امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قول عمر: إِنِّي لَأَجْهَرُ جَيْشِي وَأَنَا فِي الصَّلَاةِ. فَهَذَا جَمْعُ بَيْنِ الْجِهَادِ وَالصَّلَاةِ. وَتَضَاهِيَةُ التَّفَكُّرِ فِي مَعَانِي الْقُرْآنِ وَاسْتِخْرَاجُ كُنُوزِ الْعِلْمِ مِنْهُ فِي الصَّلَاةِ. فَهَذَا جَمْعُ بَيْنِ الصَّلَاةِ وَالْعِلْمِ، فَهَذَا لَوْ، وَالتَّفَاتُ الْغَافِلِينَ اللَّاهِبِينَ وَأَفْكَارُهُمْ لَوْ أَنَّ أَحَدًا²

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں مجاہدین کے لشکر نماز کے دوران تیار کرتا ہوں۔ پس اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہاد اور نماز دونوں کو جمع کر لیتے تھے۔ اور اس کی مثال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان نماز کی حالت میں قرآن مجید کی آیات کے معانی پر غور کرے اور اس میں سے علم کے خزانے برآمد کرے۔ پس یہ ایک رنگ ہے۔ اور نماز کی حالت میں اللہ کی یاد سے غافل اور بے پرواہ لوگوں کا رنگ ایک دوسرا رنگ ہے۔“

¹ صحیح بخاری، أبواب الكُشُوفِ، بَابُ صَلَاةِ الْكُشُوفِ جَمَاعَةً، 37/2

² زاد المعاد في هدي خير العباد: 243/1

حضرت عمرؓ نماز اور جہاد کو جمع کر لیتے تھے کہ جو لشکر انہوں نے جہاد کی غرض سے بھیجے ہوتے تھے، ان کی ترتیب نماز میں قائم کر لیتے تھے۔ شاید اس سے مقصود یہ بھی ہو کہ جہاد جیسے بابرکت کام کے فیصلے مقام قرب میں یعنی حالت نماز میں ہوں تاکہ اللہ کی رہنمائی موجود رہے اور استخارے کا جو مقصود ہے، وہ بھی حاصل رہے۔

تبلیغی جماعت کے امیر حضرت مولانا الیاسؒ نے کہا ہے کہ وہ ایک مرتبہ نماز میں تبلیغی جماعتوں کی تشکیل کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنے لیے اس چیز کو اولیٰ نہ سمجھا اور اس کا حل یہ نکالا کہ نماز سے پہلے کچھ دیر کا مراقبہ ہو جائے تاکہ نماز میں کامل یکسوئی حاصل رہے۔ شیخ بن بازؒ سے اس بارے سوال ہوا کہ اگر کوئی شخص جنت، جہنم، اپنی قبر یا موت کے بارے نماز میں سوچے تو کیا اس کا جواز ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ نماز کے واجبات اور سنن میں کوتاہی نہ ہو۔¹

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسی دینی سوچ جو اللہ کے حضور میں رہنے میں رکاوٹ نہ بنے تو اس کا نماز میں آنا جائز ہے اور ایسی سوچ احسان اور خشوع کے منافی بھی نہیں ہے۔ نماز میں جنت اور جہنم، موت اور قبر، حالت قیام میں قرآن مجید کی آیات میں تذکر و تدبر یا سجدے اور رکوع کی تسبیح و مناجات میں غور و فکر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو اللہ ہی کے حضور میں رکھتی ہیں۔

البتہ اگر کوئی ایسی دینی سوچ ہو جو انسان کو اللہ کے حضور سے نکال کر نفس کی طرف متوجہ کر دے تو یہ احسان اور خشوع کے منافی ہوگی اور اس کا ازالہ بھی ضروری ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی مناظر کسی جگہ مناظرہ کے لیے گئے ہیں اور نماز کے بعد مناظرہ متوقع ہے یا کوئی دوست فیس بک پر جاری کسی مذہبی بحث سے اٹھ کر نماز کے لیے گئے ہیں۔ اب اگر نماز میں انہیں فریق مخالف کو زیر کرنے کی دلیلیں ہی سوچتی رہیں تو یہ ایسی سوچ ہے جو اگرچہ دینی تو ہے لیکن انسان کو اللہ کے حضور میں رہنے نہیں دیتی بلکہ فریق مخالف کے تصور میں ہی الجھائے رکھتی ہے لہذا نماز میں ایسی سوچ کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ بظاہر دینی

¹ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز، فتاویٰ نور علی الدرب، المكتبة الشاملة، المكة المكرمة، 41/8

لیکن اپنی حقیقت میں دنیاوی سوچ ہی ہے کیونکہ انسان جس دینی عمل (activity) کو درمیان میں چھوڑ کر نماز کی طرف متوجہ ہوا ہے، اس کا محرک (motive) اکثر و بیشتر فریق مخالف کی خیر خواہی (well-wishing) سے زیادہ اپنی ذات کے غلبے کی خواہش (urge to dominate) ہوتی ہے۔

جہاں تک دنیاوی سوچ کا معاملہ ہے تو دنیا اور دنیا کے مال و اسباب کے بارے نماز میں سوچنا احسان اور خشوع کے منافی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«فَإِنْ هُوَ قَامَ فَصَلَّى، فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَمَجَّدهَ بِالَّذِي هُوَ لَهُ أَهْلٌ، وَفَرَّغَ قَلْبَهُ لِلَّهِ إِلَّا أَنْصَرَفَ مِنْ خَطِئَتِهِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»¹

”پس جو شخص [اچھی طرح وضو کر کے] نماز کے لیے کھڑا ہوا۔ اللہ کی حمد و ثنا اور بڑائی ایسے بیان کرے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ اور نماز میں اپنا دل اللہ ہی کے لیے فارغ کر لے تو نماز کے بعد اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو گا جیسا کہ اس کی ماں نے اسے گناہوں سے پاک جنا تھا۔“

انسان اپنی سوچ کے اعتبار سے یا تو منتشر خیال ہوتے ہیں یا یکسو۔ منتشر خیال وہ ہے کہ ایک خیال ذہن میں آئے اور دوسرا جائے۔ کبھی ادھر کی بات یاد آئی کبھی اُدھر کی۔ کبھی خیالوں میں یہاں اور کبھی وہاں۔ اور یکسو اسے کہتے ہیں کہ جس کے ذہن پر ایک وقت میں ایک ہی خیال حاوی اور غالب رہتا ہو۔ منتشر خیال کے کرنے کے تود و کام ہیں کہ ایک تو مجاہدے کے ساتھ اپنی سوچ کو یکسو کرے یعنی ایک نقطہ پر مرکوز کرے اور دوسرا یہ کہ اللہ کی طرف یکسو کرے۔ اور یکسو شخص کے کرنے کا ایک ہی کام ہے کہ اپنی یکسوئی کو مجاہدے کے ساتھ اللہ کی طرف منتقل کر دے۔

اس بارے اہم تر بات یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والی سوچ کا اس کے دل سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انسانی ذہن میں اسی چیز کی سوچ پیدا ہوتی ہے کہ جس شے کا اس کا دل طلب گار ہوتا ہے۔ اگر دل دنیا کا طالب ہے تو دنیا کی سوچ پیدا ہوگی، علم کا

¹ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرہا، باب إسلام عمرو بن عبسۃ، 569/1

طالب ہے تو علم کی سوچ آئے گی۔ اسی طرح مال، مقام، عزت، جاہ میں جس چیز کا طلب گار ہوگا، وہ اس کے ذہن پر چھائی رہے گی۔ اگر اللہ کا طالب ہے تو اللہ کی سوچ غالب رہے گی۔ خارجی رکاوٹیں کہ جن کا ذکر اوپر گزر چکا، کو دور کرنے کے باوجود اگر نماز میں توجہ اور یکسوئی حاصل نہ ہو تو پھر مسئلہ طلب اور ارادے کا ہے کہ دل کس کا طلب گار ہے اور کس مرید ہے۔ انسان اپنی طلب اور ارادے کو درست کرے کیونکہ پروردگار کا ارشاد ہے:

﴿فَأَتَيْنَا تُولُوًّا فَتَمَّ وَجْهُهُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرة: 115]

”پس تم جس طرف بھی رخ کر لو، اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔ بلاشبہ اللہ عزوجل وسعت والا، علم والا ہے۔“

پس مالک تو یہ کہے کہ جس طرف بھی چلے جاؤ، خالق کو پا لو گے اور ہم قبلہ رخ ہو کر بھی رب کو نہ پاسکیں تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے رب کو پالینے میں سچے طلب گار نہیں ہیں۔ جس میں سچی طلب ہے، اسے دکان، کاروبار اور بازار میں بھی رب کا دھیان حاصل رہے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَجَالٌ لَا تُلْهِيمُهُمْ تِجَارَةً وَلَا بَيْعٌ عَنِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ

الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ﴾ [النور: 37]

”یہ ایسے لوگ ہیں کہ انہیں اللہ کی یاد اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے نہ تو تجارت اور نہ ہی خرید و فروخت غافل کر سکتی ہے۔ یہ لوگ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں کہ جس دن میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی۔“

اب اگر انسان کو مسجد میں بھی رب نہ ملے یا وہ حالت نماز میں بھی اللہ کی یاد سے غافل رہے تو اس کا لازماً مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا سچا طالب نہیں ہے۔ اور کسی چیز کے لیے سچی طلب جب دل میں ہوتی ہے تو انسان اسے اپنے سینے میں محسوس کر سکتا ہے۔ اگر انسان کو نئے موبائل یا گاڑی کی طلب (desire) ہو اور وہ اس طلب یا خواہش کی موجودگی یا شدت کو محسوس کر سکتا ہے تو کیا رکاوٹ ہے کہ پروردگار کی سچی طلب ہو اور وہ اپنی موجودگی کا احساس نہ دلائے؟

پس نماز میں کامل توجہ اور یکسوئی اس وقت تک حاصل نہ ہوگی جب تک کہ اپنے رب سے ملاقات، مناجات اور گفتگو کی سچی طلب دل میں نہ ہوگی۔ دل میں طلب دنیا کی ہو اور نماز میں رب یاد آجائے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ دنیا کی خواہش ممنوع نہیں ہے لیکن جب یہ حد سے بڑھ جائے تو بہت ہی نقصان دہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَجْمِلُوا فِي طَلَبِ الدُّنْيَا، فَإِنَّ كُلًّا مُبَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ»¹
 ”دنیا کی خواہش میں اعتدال اور وقار پیدا کرو کیونکہ ہر شخص کو وہی مل کر رہنا ہے جو اس کی تقدیر میں ہے۔“

ہم بعض اوقات اپنے ظاہری دینی حلیے یا اعمال سے دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ ہم اللہ کے طلب گار ہیں۔ یہ دھوکہ ایک عالم دین، خطیب، واعظ، مدرس قرآن، مجاہد، صوفی، مرشد، مذہبی رہنما، مفتی، شیخ الحدیث، مدرسہ کے ناظم اور انقلابی تحریک کے کارکن کو بھی لگ جاتا ہے۔ انسان میں حقیقی دینداری اتنی ہی ہے جتنی کہ نماز میں اسے اللہ کے حضور میں حاضری نصیب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اپنے وجود یا درگد میں کچھ دینداری نظر آئے تو اس دینداری کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

مفتی، عالم، مجاہد، صوفی، واعظ، خطیب، مرشد، لیڈر اور مدرس بننے سے پہلے کہیں یہ ضروری ہے کہ اللہ کا ایک عاجز بندہ بنا جائے اور یہی مقصود زندگی ہے۔ اور اگر بندگی کے ساتھ اضافی طور اللہ تعالیٰ کسی کو اچھا عالم، مجاہد، مدرس یا مرشد بنا دیں تو یہ اللہ کی ایک نعمت ہے جس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن یہ ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہے کہ اس کے حصے کا کام عالم، مجاہد، مدرس اور مرشد بننے سے زیادہ بندہ بننے کا ہے۔ اور اس نے اصل محنت اسی مقصد کے حصول کے لیے کرنی ہے۔

ایک سالک اپنے دل میں اللہ کی سچی طلب کیسے بیدار کرے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اب یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے کہ ہمیں یہ طلب پیدا نہیں کرنی۔ اللہ نے یہ ہمارے دل میں پیدا کی ہوئی ہے، ہم نے اسے صرف بیدار کرنا ہے کیونکہ دنیا کی طلب میں ہم مالک

¹ سنن ابن ماجہ، أبواب التجارات، باب الإقتضاد في طلب العيشة، 274/3

کی طلب کو سلا دیتے ہیں اور چھپا دیتے ہیں۔ اس طلب کو بیدار کرنے کی کئی تدابیر ہو سکتی ہیں۔ ایک تدبیر تو یہ ہے کہ صبح کی نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کریں اور کبھی کبھار نماز فجر کے بعد اشراق تک دعا و مناجات میں وقت گزاریں اور اشراق کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لائیں۔ صبح کی بیداری کے بغیر اپنے دل میں سوئی ہوئی طلب کو بیدار کرنا بہت مشکل کام ہے۔

اور اگر اشراق تک دعا و مناجات میں مشغول رہنا مشکل محسوس ہو تو شام کے اوقات میں مثلاً عصر کے بعد کبھی کبھار قبرستان کی زیارت کر لی جائے اور وہاں کم از کم دس منٹ کسی عزیز کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر قبرستان والوں کے حق میں دعائے مغفرت کر لیا کریں۔ ان دو تدابیر میں سے کسی ایک تدبیر پر بھی عمل کرنے سے اللہ کی طلب نہ صرف قلب میں بیدار ہو جائے گی بلکہ سینے میں روشن بھی ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔ اور ذہن میں رہے کہ بندگی کی منازل طے کرنے کے لیے مجاہدہ تو شرط ہے ہی لہذا فجر کی بیداری یا شام کی زیارت میں جو مجاہدہ ہے، اس سے نہ گھبرائے۔

نماز میں ذہنی اور قلبی یکسوئی

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ انسانی ذہن کی تخلیق ایسے ہوئی ہے کہ وہ ہریل سوچتا رہے لہذا سوچ اس کا جوہر اور مادہ ہے۔ اور سوچنا اس کا ایسا عمل ہے جو جبری ہے، پس انسان اس کا مکلف نہیں ہے کہ اس کے فطری خاصے کو تبدیل کرے۔ لہذا انسان سے ذہنی یکسوئی کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ قلبی یکسوئی کا مطالبہ ہے۔ پس انسان نماز کی حالت میں اپنے ارادے، احساسات اور جذبات میں اللہ کے علاوہ کسی کو شریک نہ کرے جبکہ تصور میں تو شرکت ہو ہی جاتی ہے۔ نماز میں اللہ کے غیر کا خیال احسان کے منافی نہیں ہے لیکن غیر کا ارادہ یا اس کے بارے احساسات اور جذبات یہ احسان کے منافی ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ذہن میں اچھے ہیں یعنی فلسفیانہ ذہن کے ہیں اور دوسرے وہ جو جذبات میں اچھے ہیں یعنی شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ دونوں نماز میں الفاظ پر غور کریں۔ ذہین آدمی الفاظ سے وہ معانی ذہن میں پیدا

کرے جو اسے اللہ کے حضور میں رکھیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ تہجد میں عذاب کی آیات پر پناہ مانگتے اور بشارت کی آیات پر دعا مانگتے تھے۔ اور جو لوگ مزاج میں اچھے ہیں وہ الفاظ سے وہ نئے نئے احوال پیدا کریں جو انہیں اللہ کے حضور میں رکھیں جیسا کہ حدیث جبریل میں احسان کے احوال کا تذکرہ ہے۔ پہلی صورت نماز میں اللہ کو دیکھنے اور دوسری اللہ کے اسے دیکھنے کی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

حضرت شیخ اکل فی اکل علامہ نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ نماز پنجگانہ ”لطائف خمسہ“ اور تلاوت قرآن مجید ”سلطان الاذکار“ ہے۔¹ اس میں اگر ایک اور اضافہ کر دیا جائے کہ تنہائی کی دعا و مناجات ہی ”مراقبہ“ ہے تو یہ سلفی سلوک کا جامع منہج ہے۔ پس جس نے اپنے لطائف روشن کرنے ہیں تو وہ اپنی ہر نماز کو روشن کرنے کے لیے مجاہدہ کرے۔ جسے مراقبہ کا شوق ہے، وہ خلوت میں دعا و مناجات میں کثرت کرے۔ اور جسے اپنی اصلاح کے لیے ذکر کا رستہ اختیار کرنا ہے، وہ قرآن مجید کو سلطان الاذکار کی جگہ رکھے۔

عبادت کا ذوق پیدا کر دینے والے پانچ اعمال

پانچ اعمال ایسے ہیں کہ اگر آپ انہیں کچھ عرصہ معمول بنالیں، چاہے چالیس دن ہی بنالیں تو وہ آپ میں عبادت کا ذوق پیدا کر دیں گے۔ ہم اکثر عبادت کی خواہش کرتے ہیں لیکن عبادت میں دل نہیں لگتا تو یہ اعمال ایسے ہیں کہ اگر معمول میں آجائیں تو عبادت بوجھ اور زحمت نہیں رہتی بلکہ خوشی اور رحمت بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ پانچ اعمال ایسے ہیں کہ لوگ انہیں حقیر سمجھتے ہیں لیکن اجر و ثواب میں ان جیسے اعمال نہیں ہیں۔ تزکیہ نفس کے دو ہی میدان ہیں؛ عبادت اور اخلاق۔ پس یہ پانچ اعمال آپ کا نصف تزکیہ کر دیں گے کہ آپ میں عبادت کے ذوق کی بنیاد رکھ دیں گے۔

¹ سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مشعر باصلاح صوفیہ ومعارج ومدارج اہل سلوک، ترجمہ: مولانا عبد العزیز صمدن فرخ آبادی، جریدہ الواقعة کراچی، شمارہ (5 / 6) شوال، ذیقعد 1433ھ / ستمبر، اکتوبر 2012ء

پہلا عمل نماز کے لیے آذان کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَسْمَعُ مَدَى صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ، جَنَّ وَلَا إِنْسٌ وَلَا شَيْءٌ، إِلَّا شَهِدَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»¹

”جو شخص نماز کے لیے آذان کہے گا تو جنت، انسان اور اللہ کی ہر مخلوق جو اس کی آذان کی آواز سنے گی، قیامت والے دن اس کے حق میں گواہی دے گی۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ مؤذن کی آذان پر جتنے لوگ جماعت میں شامل ہوں گے، ان سب نمازیوں کی نماز کا اجر مؤذن کو بھی ملے گا۔² اور رمضان کے مہینے اور جمعہ کی نماز میں تو نمازیوں کی تعداد کافی ہوتی ہے لہذا ان دنوں میں آذان کہنے کا اہتمام شوق سے کرنا چاہیے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص کسی پہاڑ کی جڑ میں اپنی بکریاں چراتا ہیں، نماز کے لیے آذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے۔ اللہ عز و جل اس کے اس عمل کو دیکھ کر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو! میرا یہ بندہ میرے خوف سے آذان کہہ رہا ہے اور نماز ادا کر رہا ہے، میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔³ اس روایت میں سفر میں آذان کہنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور خاص طور ایسے مقام پر آذان کہنا کہ جہاں مسجد اور آبادی نہ ہو۔

دوسرا عمل باجماعت نماز کے لیے پیدل چل کر جانا اور باجماعت نماز کا انتظار کرنا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَلَا أَذْلَكُكُمْ عَلَى مَا يَمْحُو اللَّهُ بِهِ الْخَطَايَا، وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟» قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ: «إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، وَكَثْرَةُ الْخُطَا إِلَى الْمَسَاجِدِ، وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، فَذَلِكَ الرِّبَاطُ»⁴

”کیا میں تمہاری رہنمائی ان اعمال کی طرف نہ کروں کہ جن سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور درجات بلند ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے

¹ صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب رَفَعَ الصَّوْتُ بِاللَّيْءِ، 125/1

² سنن النسائي، کتاب الأذان، رَفَعَ الصَّوْتُ بِاللَّيْءِ، 13/2

³ سنن أبي داود، تَفْصِيلُ صَلَاةِ الشُّفْرِ، باب الأذان في الشُّفْرِ، 4/2

⁴ صحیح مسلم، کتاب الطَّهَارَةِ، باب فَضْلِ إِسْبَاغِ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، 219/1

رسول ﷺ! ضرور کریں۔ آپ نے فرمایا: مشقت کے باوجود اچھی طرح وضو کرنا، مسجد کی طرف زیادہ سے زیادہ قدم اٹھانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ اور ان اعمال کا ثواب ایسا ہی ہے جیسا کہ اسلامی ریاست کی حفاظت کے لیے سرحدوں پر پہرہ دینے کا اجر و ثواب۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ جو باجماعت نماز کے لیے چل کر جاتا ہے تو اس کے ہر قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور جو باجماعت نماز کے انتظار میں رہتا ہے تو اُس کے اس انتظار کے وقت میں بھی اُس کے لیے نماز پڑھنے جتنا ہی اجر و ثواب لکھا جا رہا ہوتا ہے۔¹ اور ہم تو دس منٹ مسجد میں پہلے پہنچ جائیں تو پریشان ہو جاتے ہیں کہ بہت جلدی آگئے ہیں۔ اس روایت میں مسجد میں بیٹھنے کی فضیلت کا بیان بھی ہے جبکہ آج ہمارے ہاں مساجد میں بیٹھنے کا رواج بالکل ہی ختم ہو گیا ہے۔

تیسرا عمل تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز میں شامل ہونا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ صَلَّى لِلَّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا فِي جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيرَةَ الْأُولَى كُتِبَ لَهُ بَرَاءَتَانِ: بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ، وَبَرَاءَةٌ مِنَ الْبَقَا»²

”جو شخص چالیس دن تک تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کو اللہ عزوجل دو سرٹیفکیٹ عطا فرماتے ہیں: ایک یہ کہ وہ کبھی منافق نہیں ہو گا اور دوسرا یہ کہ وہ جہنم میں داخل نہیں ہو گا۔“

اور تکبیر تحریمہ سے مراد یہ ہے کہ امام صاحب کی پہلی اللہ اکبر کے ساتھ جماعت میں شامل ہو۔ چالیس دن تک تکبیر اولیٰ کا اہتمام ایک ایسا عمل ہے جو باجماعت نماز کی عادت ڈال دیتا ہے۔

چوتھا عمل جو آپ میں عبادت کے ذوق کی بنیاد رکھ دے گا، پہلی صف میں نماز پڑھنا ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى الصَّفِّ الْأَوَّلِ»³

¹ صحیح البخاری، کتاب النہج، باب مَا ذُكِرَ فِي الْأَسْوَاقِ، 66/3

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ فِي فَضْلِ التَّكْبِيرَةِ الْأُولَى، 7/2

³ سنن ابن ماجہ، أَبْوَابُ إِقَامَةِ الصَّلَوَاتِ وَالشُّعْنَةِ فِيهَا، بَابُ فَضْلِ الصَّفِّ الْمَقْدَمِ، 132/2

”پہلی صف میں نماز پڑھنے والوں کے لیے اللہ عز و جل اور فرشتے رحمت کی دعا فرماتے ہیں۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ آذان کہنے اور پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا کیا اجر ہے تو تم اس کے لیے قرعہ اندازی کرنے لگو گے۔¹ معنی یہ ہے کہ اس کے لیے ایک دوسرے سے اتنی لڑائی کرو گے کہ بالآخر قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنے پر راضی ہو گے کہ آذان کون کہے گا اور پہلی صف میں کون کھڑا ہوگا۔

پانچواں عمل نماز کے بعد نماز کی جگہ میں بیٹھ کر ذکر اذکار کرنا ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص نماز کے بعد اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے تو فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! اس کو معاف فرمادے۔ اے اللہ! اس پر رحم فرمادے۔² تو فرشتے جس کے لیے دعا کریں تو اس کی کیا فضیلت ہوگی؟ ایک اور روایت میں ہے کہ اگر فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے تک مسجد میں بیٹھا رہے اور دو رکعت نماز اشراق پڑھ کر اٹھے تو اسے ایک مقبول حج اور عمرے کا ثواب ملتا ہے۔ اور یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی کہ ایک مکمل حج اور مکمل عمرے کا ثواب ملتا ہے۔³

آخری اور اہم تر بات یہ ہے کہ یہ پانچوں اعمال نماز سے متعلق ہیں کہ جس کی نماز درست ہو جائے گی، اس کی تمام عبادت درست ہو جائے گی۔ اور نماز کی درستگی کا آغاز اسے مسجد میں اہتمام سے ادا کرنے سے شروع ہوتا ہے۔

نماز فجر کی باجماعت ادائیگی

ایک دوست سے اصلاح نفس پر بات چیت ہو رہی تھی تو میں نے کہا کہ اصلاح نفس دو چیزوں کا نام ہے؛ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب۔ اس نے کہا کہ کوئی ایسا نسخہ ہے کہ تمام فرائض کو ادا کرنا اور تمام حرام کاموں سے اجتناب کرنا آسان ہو جائے۔

¹ سنن الترمذی، أبواب الصلاة، باب ما جاء في فضل الصَّيِّفِ الأوَّل، 437/1

² صحيح البخاري، كتاب البُيُوع، باب ما ذكر في الأسواق، 66/3

³ سنن الترمذی، أبواب الشُّفَر، باب ذكر ما يُستَحَبُّ مِنَ الْجُلُوسِ فِي الْمَسْجِدِ بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، 481/2

میں نے کہا کہ میری نظر میں ایک نسخہ ہے کہ اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو فرائض کی ادائیگی آسان ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ فجر کی نماز تکبیر تحریمہ کے ساتھ ادا کرنے کو اپنی عادت بنالیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دس فرائض پر عمل کر لیں بلکہ ایک فرض کو پکڑ لیں اور اسے احسن طریقے سے ادا کرنے کی قسم کھالیں۔ پس اس ایک فرض کی بہترین طریقے سے ادائیگی آپ کے لیے بیسیوں فرائض کی ادائیگی کو آسان بنا دے گا۔

دوست نے کہا کہ یہ تو بہت مشکل کام ہے، خاص طور شادی اور بچوں کے ہو جانے کے بعد۔ میں نے کہا کہ کوئی شک نہیں لیکن یہی ایک مشکل کام کر لینے سے آپ کے لیے بقیہ فرائض کی ادائیگی آسان ہو جائے گی ورنہ تو وہ آپ کے لیے بوجھ رہیں گے اور ان کی ادائیگی کے لیے بہت مجاہدہ کرنا پڑے گا۔ فجر کی نماز کی باجماعت ادائیگی آپ میں مجاہدے کا ایسا بیج رکھ دے گی کہ جس کے بعد کسی بھی نیکی کو کرنا آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔ خوش ہونے (pleasure) کے لیے درد (pain) تو لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مجاہدہ کرنا ایک ایسا درد ہے کہ جو دن بھر کے لیے آپ کی طبیعت کو خوش کر دیتا ہے۔ اور فجر کی نماز کے وقت سوئے رہنا دن بھر کو آپ کے لیے بھاری کر دے گا اور سارا دن ایک عجیب قسم کی خوشحالی طاری رہے گی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«يَعْقِدُ الشَّيْطَانُ عَلَى قَافِيَةِ رَأْسِ أَحَدِكُمْ إِذَا هُوَ نَامَ ثَلَاثَ عَقَدٍ، يَضْرِبُ كُلَّ عَقْدَةٍ مَكَانَهَا: عَلَيْكَ لَيْلٌ طَوِيلٌ فَارْقُدْ، فَإِنْ اسْتَيْقَظَ فَذَكَرَ اللَّهَ انْحَلَّتْ عَقْدَةٌ، فَإِنْ تَوَضَّأَ انْحَلَّتْ عَقْدَةٌ، فَإِنْ صَلَّى انْحَلَّتْ عَقْدُهُ كُلُّهَا، فَأَصْبَحَ نَشِيطًا طَيِّبَ النَّفْسِ، وَإِلَّا أَصْبَحَ خَبِيثَ النَّفْسِ كَسَلَانَ»¹

”شیطان تم میں سے ہر شخص کی گدی پر سونے کے بعد تین گریں لگاتا ہے۔ اور ہر گرہ لگاتے ہوئے پھونک مارتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ابھی رات بہت پڑی

¹ صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، 122/4

ہے، سوئے رہو۔ پس اگر وہ شخص ہمت کر کے بیدار ہو جائے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ اور بیدار ہونے کے بعد اگر وضو کر لے تو دوسری گرہ بھی کھل جاتی ہے۔ اور اگر وضو کرنے کے بعد نماز پڑھ لے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے۔ اور اس کی صبح ایسے ہوتی ہے جیسے وہ بہت چست اور دل سے خوش ہو۔ اور اگر وہ سویا رہے تو اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے اور وہ وجود دست پڑ جاتا ہے۔“

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے ایک ایسے شخص کا تذکرہ ہوا جو کہ فجر کے وقت سویا رہا تھا تو آپ نے فرمایا:

«ذَلِكَ رَجُلٌ بَالَ الشَّيْطَانُ فِي أُذُنَيْهِ»¹

”اس شخص کے کانوں میں شیطان نے پیشاب کر دیا تھا۔“

ایک اور روایت کے تو الفاظ ہیں کہ جس نے عشا کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو اسے آدھی رات قیام کرنے کا ثواب ملے گا اور جس نے فجر کی نماز بھی باجماعت ادا کی تو اسے پوری رات قیام کا ثواب ملے گا۔²

اب بات حرام سے اجتناب کی طرف آئی۔ میں نے کہا کہ یہاں بھی ایک نسخہ ہے کہ اگر آپ اس پر عمل کر لیں تو حرام سے اجتناب کرنا آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ وہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ مووی اور فلم نہ دیکھنے کے بارے میں قسم کھا لیں۔ اس نے کہا کہ یہ تو مشکل کام ہے۔ میں نے کہا کہ مشکل ہے لیکن یہ تمام حرام کاموں سے بچنے کی بنیاد آپ میں رکھ دے گا۔ آپ اس ایک کام سے اجتناب کر لیں، آپ میں جملہ حرام کاموں سے بچنے کے بیج کی بنیاد پڑ جائے گی۔

اس نے کہا کہ آپ کا خیال ہے کہ جو مووی اور فلم دیکھتے ہیں، وہ حرام سے نہیں بچ پاتے۔ میں نے کہا کہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہر گز نہیں ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ میں آپ سے ابھی مووی کی شرعی حیثیت پر بحث نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ ایسے فضول، عبت اور لغو کام سے اجتناب کر لیں گے تو آپ کے لیے

¹ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرين، وَصَرَّهَا، بَابُ مَا رُوِيَ فِيهِ نَامُ اللَّيْلِ أَجْمَعُ حَتَّى أَصْبَحَ، 537/1

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الْعِشَاءِ وَالْفَجْرِ فِي الْجَمَاعَةِ، 433/1

دیگر حرام کاموں سے اجتناب بہت ہی آسان ہو جائے گا۔ یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

ہم ہر شیء کو قانونی اور فقہی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں حالانکہ کسی شیء کو دیکھنے کے اور بھی زاویے ہوتے ہیں۔ میں اگر کہتا ہوں کہ عشا کے فوراً بعد سو جائیں اور فیس بک، واٹس ایپ استعمال نہ کریں تو اب آپ اس پر بحث لگالیں کہ یہ عشا کے بعد فوراً سونا کیا فرض ہے اور فیس بک، واٹس ایپ کا استعمال حرام ہے کیا؟ بھی! عشا کے بعد سونا، فرض نہ سہی، مستحب اور پسندیدہ تو ہے۔

اور رہا عشا کے بعد سوشل میڈیا کا استعمال تو بات یہ ہے کہ ہم دن بھر کے تھکے ہارے گھر واپس آتے ہیں اور ریلیکس ہونے کے لیے فیس بک اور واٹس ایپ کھول لیتے ہیں حالانکہ اس طرح ہم ریلیکس نہیں ہوتے بلکہ ذہن کو دوبارہ کام میں مصروف کر لیتے ہیں اور آرام کے نام پر جسم کو مزید تھکا لیتے ہیں اور فجر کی نماز قضا کر لیتے ہیں۔ بھی! قابل مرشد وہی ہے جو آپ کی مووی چھڑا دے اور فجر کی باجماعت نماز کی عادت ڈلوادے۔ باقی، نری صحبت کا اچار ڈالنا ہے کیا؟ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک منقش پردہ تھا کہ جس میں تصاویر تھیں اور انہوں نے اپنی گھر کی ایک جانب اسے دیوار پر لٹکایا ہوا تھا تو آپ نے ان سے فرمایا:

«أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكَ هَذَا، فَإِنَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِيرُهُ تَعْرِضُ فِي صَلَاتِي»¹

”میرے سامنے سے اپنا یہ پردہ ہٹالو کہ اس کی تصاویر نماز میں میری سامنے آتی رہتی ہیں۔“

مصلے کی کشش

جب مصلی آپ کو ایسے کھینچنے لگے جیسے مقناطیس لوہے کو تو اب مطلوب سلوک کی منازل طے ہو چکیں، اب تقرب الی اللہ کے لیے مزید کسی شوشاں یا ہوا یا پیری

¹ صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ بابُ إِنْ صَلَّى فِي ثَوْبٍ مُّصَلَّبٍ أَوْ تَصَاوِيرٍ، هَلْ تُفْسِدُ صَلَاتَهُ؟ وَمَا يُهَيِّئُ عَنْ ذَلِكَ؟، 84/1

مریدی کی ضرورت نہیں۔ ہاں! اب اگر ضرورت ہے تو اس بات کی کہ مخلوق خدا کا قرب حاصل کیا جائے، ان سے تعلق بنایا جائے، ان کی خدمت کی جائے، ان کے کام آیا جائے اور ان کو فائدہ پہنچایا جائے۔

خالق کا مقصد بھی اپنے بندوں کے تزکیہ نفس سے یہ نہیں ہے کہ سالک مصلیٰ پر ہی بیٹھ جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کا دل مصلیٰ کی طرف مائل ہو اور ہاتھ مخلوق خدا کی خدمت میں مصروف ہو۔ یہی تزکیہ کا نبوی منہج اور سلوک کا قرآنی طریق کار ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، أَنَّهُ قَالَ: «أُقِيمَتُ صَلَاةُ الْعِشَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ: لِي حَاجَةٌ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَاجِيهِ حَتَّى نَامَ الْقَوْمُ - أَوْ بَعْضُ الْقَوْمِ - ثُمَّ صَلَّوْا»¹

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عشا کی نماز کے لیے اقامت کہی گئی کہ ایک شخص نے کہا: اے نبی ﷺ! مجھے آپ سے کام ہے۔ آپ ﷺ اس کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہو کر سرگوشی میں باتیں کرنے لگے یہاں تک بعض نمازی اوٹ گئے اور پھر آپ نے نماز پڑھائی۔“

اگر سالک کسی خاص ایمانی کیفیت میں خالق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دو رکعت نفل کی نیت بندھے یا مصحف کھولے یا تسبیح ہاتھ میں لے اور ادھر سے کوئی دنیاوی تقاضا اور ذمہ داری اسے مخلوق خدا کی متوجہ کرے تو ایسی صورت حال میں تنہائی کے سجدے کی گریہ وزاری سے بہت بہتر بلکہ لازم ہے کہ اپنے بکلتے بچے کو مطمئن کرنے میں اپنی بیوی کا ہاتھ بٹائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنِّي لَأَذْخُلُ فِي الصَّلَاةِ، فَأُرِيدُ إِطَالَتَهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَاتَجَوَّزُ مِمَّا أَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهِ مِنْ بُكَائِهِ»²

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا

¹ صحیح البخاری، کتاب الخیض، باب التلیل علی أن یوم الخالیس لا ینقض الوضوء، 284/1

² صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي، 143/1

کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں نماز لمبی کروں لیکن اسی دوران پیچھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ اس بچے کی وجہ سے اس کی ماں بے چین ہوگی۔“

آپ ﷺ کے زمانے میں اندھیرے کے وقت کی نمازوں میں عورتیں بھی مسجد نبوی میں جماعت کی نماز میں شامل ہو جاتی تھیں جیسا کہ آج بھی حرمین میں عورتوں کے لیے علیحدہ سے نماز کی جگہ مخصوص ہے۔ بعض عورتیں اپنے شیر خوار بچے بھی ساتھ لے آتی تھیں اور نماز میں ان بچوں میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی تو آپ جماعت کی نماز مختصر فرما دیتے تھے۔

مخلوق خدا کی طرف متوجہ ہونے سے اگرچہ مصلے کے احوال اور کیفیات جاتی رہیں گی کہ ظاہر ہے کہ بچے کو چپ کروانے میں اب سجدے کی لذت کہاں؟ لیکن قرآنی سلوک یہی ہے کہ کیفیات اصل نہیں ہیں بلکہ فرائض اور ذمہ داریاں اصل ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے جب مرید یہ کہتے کہ حضرت ذکر میں لذت نہیں مل رہی تو وہ جواب میں کہتے کہ میاں لذت یہاں کہاں؟

تنہائی میں قرآن مجید پڑھنے کے جو احوال ہیں، وہ اپنے بچے کو نورانی قاعدہ پڑھانے میں نہیں ہیں لیکن شریعت کا حکم یہی ہے کہ اپنی تلاوت پر اپنے بچے کی تعلیم کو ترجیح دو، چاہے اپنی تلاوت میں تمہیں سکینت نازل ہوتی محسوس ہو اور بچے کو نورانی قاعدہ پڑھاتے ہوئے ذہنی کو فٹ جبکہ اسے سبق یاد نہ ہو رہا ہو۔ جس نے عبادت کی لذت اور کیفیات کے حصول کو مقصد بنالیا، وہ سخت غلطی پر ہے، چاہے کسی سلسلے کا مرشد ہی کیوں نہ ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ یہ تو کبھی کبھی حاصل ہوتی ہیں۔ اس کا ایک معنی یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ شریعت پر عمل اور جملہ فرائض اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ان کیفیات کا دوام ممکن نہیں ہے کہ شریعت پر عمل سالک کو خالق سے زیادہ مخلوق کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

نیکی کی مار کیٹنگ

مشاہدے میں آیا ہے کہ خوش الحان واعظین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آچکی ہے کہ جو نعت خواں حضرات کی طرح مسجد انتظامیہ سے ایڈوانس رقم طے کرتی ہے اور رقم کم ہونے کی صورت میں وقت دینے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ واعظین رمضان کی ایک رات میں کئی کئی مساجد بھگتاتے ہیں۔ وعظ کے دوران بار بار گھڑی کو دیکھتے ہیں اور جیسے ہی گھنٹہ پورا ہوا تو وعظ ختم کیونکہ مسجد والوں نے واعظ صاحب کو صرف ایک گھنٹے کا کرایہ دیا تھا۔ مزید گھنٹوں کے لیے نئے معاہدے کی ضرورت پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایسے واعظین عموماً مدرسے سے چوتھی یا پانچویں کلاس کے بھگوڑے ہوتے ہیں یا مدرسہ کی تاریخ میں ان کا علمی ریکارڈ کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہوتا لیکن آواز میں ترنم یا اسٹائل ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ انہیں پسند کرتے ہیں۔ رٹے رٹائے قصے کہانیاں سناتے ہیں، ہیکس لگاتے ہیں، لطائف اور چٹکلے چھوڑتے ہیں اور شعر و شاعری میں وقت پاس کرتے ہیں۔ اپنی چاچلوسی کو پسند کرتے ہیں اور دوچار طالب علم ان کے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کی جوتیاں سیدھا کرے تو عجیب خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وعظ کے لیے آتے اور جاتے وقت مسجد کے حجرہ میں ان کی خوب خاطر مدارت ہوتی ہے۔ بعض کا تو کھا کھا کر پیٹ اس قدر باہر آیا ہوتا ہے کہ کرتہ پھٹنے کو آئے۔ یہ واعظین رمضان کی طاق راتوں میں ٹائم پاس کرنے یا تفریح کا ایک بہترین ذریعہ بن چکے ہیں۔ ان کے وعظ میں اصلاح اور تربیت نام کی چیز نہیں ہوتی۔ ان کا بیان کیا ہوتا ہے بس قصے کہانیوں، شعر و شاعری، ہیکلوں، مخالف مکتبہ فکر پر چھبتیاں کسنے کا معجون مرکب ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہی حال رمضان المبارک میں قراء کا بھی بن چکا ہے۔ دوچار طالب علموں کے جلو میں تشریف لاتے ہیں۔ ان کی آدھی نماز سر پر رکھے سعودی رومال کو سنبھالنے میں ہی گزر جاتی ہے۔ بعضے تو خوب گلا پھاڑتے ہیں اور بعض بتکلف رونے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود بھی خوب خشوع و خضوع سے روتے ہیں اور لوگوں کو بھی

رلانے میں پورا زور لگاتے ہیں۔ پورا سال خلوت میں جنہیں اپنے رب کے سامنے دو آنسو بہانے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی وہ رمضان کی طاق راتوں میں ہزاروں کے مجھے کو رلاتے ہیں۔ تنہائی میں اگر رونے میں تکلف کرے تو ایسا تکلف جائز ہے لیکن مجھے میں تکلف سے رو کر دکھلاؤ اگر ناکون سی نیکی ہے؟

اور نعت خواں تو ان کے تو کیا کہنے! رمضان ہو یا غیر رمضان، ان کی حرکتیں برابر رہتی ہیں۔ کرائے کے اعتبار سے ان میں کئی درجے ہیں۔ نعت پڑھنے کے معقول معاوضہ کے علاوہ ایئر ٹکٹ، فائو اسٹار ہوٹل میں قیام اور سامعین کی طرف سے پھینکی جانے والی دلیوں کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔ اور ان کی نعت کیا ہے؟ دو چیزوں کا مرکب ہے، اپنے عاشق رسول ہونے کے دعوے اور دوسرے مسلک کے گستاخ رسول ہونے کے الزامات کا مجموعہ ہے۔ نعت کو مسلکی عصبیت اور مذہبی منافرت بھڑکانے کے لیے خوب استعمال کرتے ہیں اور نعت میں اللہ کے رسول ﷺ کا ذکر کم ہی کرتے ہیں۔

نعت میں خوب راگ الاپتے ہیں اور گانوں کی دھن پر نعت کہتے ہیں۔ بعض تو میوزک کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں۔ بعض سٹیج پر تشریف لانے سے قبل گلہ صاف کرنے کے لیے سگریٹ نوشی اور تمباکو پان کھانے کا بھی اہتمام فرماتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے نام کو خوب بچ رہے ہیں اور آپ ﷺ کا نام بچ کر خوب دنیا بنا رہے ہیں۔ ساری رات نعت پڑھیں کریں گے اور صبح کی نماز قضا کر دیں گے اور اپنی نعت میں اللہ کے رسول ﷺ کے ذکر میں اتنا مبالغہ کریں گے کہ نعت کو شرک تک پہنچا دیں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

«لَا تُطَرُّوْنِي، كَمَا أَطَرْتُ النَّصَارَى ابْنَ مَرْثَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ، فَقُولُوا عَبْدُ اللَّهِ، وَرَسُولُهُ»²

”میری تعریف میں ایسا مبالغہ نہ کرنا جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

¹ اس موضوع پر پروفیسر۔ عبد اللہ شاہین صاحب کی کتاب ”نعت گوئی اور اس کے آداب“ ایک بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔

² صحیح بخاری، کتابُ أَخَادِيثِ الْأَنْبِيَاءِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ وَادُّرُّكَ فِي الْكِتَابِ، 167/4

تعریف میں کیا ہے۔ میں تو صرف اللہ کی بندہ ہوں اور مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو۔“

لیکن آپ ﷺ کی اس ہدایت کو پس پشت ڈالتے ہوئے بعض شعرانے آپ ﷺ کی تعریف میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ جتنا عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں نہیں کیا۔ انہوں نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا تھا لیکن انہوں نے تو براہ راست ہی اللہ قرار دے دیا۔¹ اگر آپ کو نعت سننے کا شوق ہے تو اپنے گھر کے کسی بچے کو کوئی اچھی سی لکھی ہوئی نعت دیں اور اکیلے میں اس سے سن لیں۔ اس طرح نعت سننے سے آپ ﷺ کی ذات سے جو تعلق پیدا ہوگا، وہ کرائے کے نعت خوانوں کے گلا پھاڑ کر پیچنے چلانے اور گانوں کے راگ اور سُر لگانے سے کبھی پیدا نہ ہوگا۔

ہمیں اپنی طاق راتوں کو طویل قیام، لمبے رکوع و سجود، ذکر و اذکار، تلاوت قرآن، ترجمہ و تفسیر قرآن کے مطالعہ، محاسبہ نفس اور کائنات میں غور و فکر کے ساتھ مزین کرنا چاہیے اور دین کے نام پر وقت پاس کرنے والوں سے حتی الامکان دور رہنا چاہیے۔ یہ واضح رہے کہ ہماری اس تحریر کا مقصد طاق راتوں میں کسی وعظ و بیان، نعت و نظم یا قیام لیل کی نفی نہیں ہے بلکہ انفرادی عبادت کی ترغیب و تشویق دلانا ہے اور اجتماعی عبادت کے حوالے سے جو کوتاہیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«فَمَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ عَمَلَ الْآخِرَةِ لِلدُّنْيَا، لَمْ يَكُنْ لَهُ فِي الْآخِرَةِ نَصِيبٌ»²
 ”اس امت میں سے جس نے آخرت کا عمل دنیا کے لیے کیا تو اس کو آخرت میں کچھ حصہ نہ ملے گا۔“

¹ مثلاً شعراء کے ان نعتیہ اشعار میں غور کریں تو کھلم کھلا شرک نظر آئے گا کہ پہلے شعر میں اللہ کے رسول کو رب، دوسرے میں خدا اور تیسرے میں اُحد کہا گیا ہے۔
 مدینے کی مسجد کے منبر کے اوپر بغیر عین کے میں نے ایک عرب دیکھا وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر ذات احمد تھی یا خدا تھا سایہ کیا میم تک جدا تھا

² مسند الإمام أحمد بن حنبل: 145/35

ہمارے علم میں ہے کہ سب واعظ، قاری اور نعت خواں ایسے نہیں ہیں۔ ان میں ایک جماعت ان کی بھی ہے جو اپنے وعظ، تلاوت اور نعت میں اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ اسی طرح اس تنقید سے ہمارا مقصود ہر گز یہ نہیں ہے کہ دین کے نام پر ایسی اجتماعی سرگرمیاں ترک کر دی جائیں۔ ہمارے علم میں ہے کہ اس قسم کی اجتماعی سرگرمیوں بہت سے فوائد بھی ہیں کہ جنہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم طاق راتوں میں واعظین کا وعظ اور قراء کے اجتماعی قیام الیل میں شامل نہ ہوں گے تو انفرادی طور پر عبادت نہ کر سکیں گے کہ انفرادی عبادت کا ذوق ہی معاشرے سے ختم ہو گیا ہے لہذا گھر جا کر سونے سے بہتر ہے کہ کسی اجتماعی سرگرمی میں شامل ہوا جائے۔ یہ بات اس اعتبار سے بالکل درست ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انفرادی عبادت تو ہم سے ہوتی نہیں ہے لہذا اگر اجتماعی سے بھی روک دیا جائے گا تو ہم وہی وقت کسی لغو کام میں صرف کر کے اسے بے کار بنا سکتے ہیں تو اس اعتبار سے بھی یہ بات درست ہے۔ پس ایسے لوگوں کو اجتماعی سرگرمیوں میں ضرور شریک ہونا چاہیے کہ جن کا انفرادی عبادت میں دل نہ لگتا ہو۔

نیک کے کسی بھی کام پر نقد کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہوتا کہ لوگ نیک کے اس کام کو ترک کر دیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو جھنجھوڑتے رہیں کہ یہی نبیوں کا کام ہے کہ وہ انذار کرتے تھے۔ انذار کا معنی یہ ہے کہ لوگوں کو ڈرانا اور اس ڈرانے کا ایک مقصد تو نیک کے عمل پر لانا ہوتا تھا اور دوسرا کہ یہ کہ اگر نیک کے کسی عمل میں غلو یا کوتاہی ہو رہی ہے تو لوگ اعتدال کی طرف آجائیں۔ پس ہر حال میں سوچ بچار کرتے رہیں کہ کس طرح ہم اپنے نیک عمل کی کوالٹی کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں اور بہتری کی گنجائش تو ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ اور یہ بات درست ہے کہ بعض اوقات نقد میں مبالغہ جان بوجھ کر کیا جاتا ہے جبکہ کسی عمل کی خرابی اور کوتاہی حد سے بڑھ جائے۔

نماز وتر میں اجتماعی دعا

جیسے ہی رمضان کا آخری عشرہ داخل ہوتا ہے تو بعض دینی حلقوں اور سوشل میڈیا پر

یہ بحث تقریباً ہر سال سامنے آتی ہے کہ رمضان میں وتر کی نماز میں لمبی لمبی اجتماعی دعاؤں کا کیا جواز ہے؟ خاص طور ان لوگوں کے ہاں کہ جو فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کو بدعت قرار دیتے ہیں؟

ایک عالم دین دوست سے اس بات پر گفتگو ہوئی کہ اہل حدیث مساجد میں یہ جو وتر میں اجتماعی دعا کی رسم چل پڑی ہے اور اس کا اکثر مساجد میں اہتمام ہوتا ہے تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اور قراء حضرات ائمہ حریم کی رٹنی رٹائی دعائیں خشوع و خضوع بھرے لمحات میں دہراتے ہیں اور لوگ اس مقصد کے لیے اہل حدیث مساجد کا شدہ حال یعنی اہتمام سے سفر کرتے ہیں کہ وتر کی اجتماعی دعا میں شریک ہوا جائے تو اس سب کچھ کی کوئی شرعی بنیاد موجود ہے؟

میں نے یہ عرض کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے اتنا تو ثابت ہے کہ آپ نے رمضان میں وتر جماعت کے ساتھ پڑھائے لہذا وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ وتر میں جو لمبی دعائیں کی جاتی ہیں، ان کے جواز کی کیا دلیل ہے؟ میں نے کہا کہ اس بارے قنوت نازلہ کی روایات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ قنوت نازلہ کے علاوہ جو وتر میں دعائیں کی جاتی ہیں اور وہ دعائیں بھی غیر مسنون اس معنی میں ہیں کہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے نہیں ہیں بلکہ ائمہ حریم یا بلاد عرب کی مساجد کے ائمہ کے ہیں تو اس کا کیا جواز ہے؟ میں نے کہا کہ یہ بات درست ہے کہ قنوت نازلہ کے الفاظ متعین ہیں اور آپ ﷺ نے نماز وتر میں ویسی یا اتنی لمبی دعائیں نہیں کی جیسا کہ اہل حدیث مساجد میں کیا جاتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ کیا آپ اسے ایک نیارجمان (trend) کہہ سکتے ہیں اور اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ میں نے کہا کہ اسے بالکل ایک نیارجمان کہا جاسکتا ہے اور اس کی ابتدا حریمین سے ہوئی۔ ہمارے ہاں اہل حدیث اس بارے ائمہ حریم کی اتباع کرتے ہیں۔ اور اب بلاد عرب میں بھی بعض علما نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وتر کی نماز میں

گھنٹہ بھر لمبی دعا کی صورت میں اکتیسویں پارے کی تلاوت بند کی جائے کہ امام کو حکم یہ ہے کہ وہ جماعت کی نماز ہلکی کروائے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کی حالت میں لمبی دعا کا مقام سجدہ بتلایا ہے نہ کہ قیام۔ اور قیام میں کرنے کا اصل کام قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَلَا وَإِنِّي نَهَيْتُ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعًا أَوْ سَاجِدًا، فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظَّمُوا فِيهِ الرَّبَّ عَزَّ وَجَلَّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَقَمِينٌ أَنْ يُسْتَجَابَ لَكُمْ»¹

”آگاہ رہو! مجھے رکوع اور سجدے کی حالت میں قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا گیا۔ پس رکوع کی حالت میں تو اللہ عزوجل کی خوب عظمت بیان کرو۔ اور سجدے کی حالت میں خوب دعائیں کرو کہ امید ہے کہ اس حالت میں دعائیں قبول ہوں گی۔“

انہوں نے کہا کہ یہ وتر میں اتنی لمبی اجتماعی دعا کروانا کیا اخلاص کے منافی نہیں ہے؟ میں نے کہا کہ اس خدشے کا اظہار اب خود اہل حدیث میں سے بھی بہت سے لوگ کرنا شروع ہو گئے ہیں کہ اس طرح کی اجتماعی دعاؤں میں رونے اور رلانے کے مناظر میں بعض اوقات واضح تکلف اور تصنع نظر آتا ہے۔ اس گفتگو کے بعد میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم کسی کی نیت یا اخلاص پر شک تو نہیں کر سکتے ہیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ہمیں اللہ عزوجل نے دعائیں تضرع کے ساتھ اسے چھپانے کا بھی حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [الأعراف: 55]

”تم اپنے رب سے گڑ گڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے دعائیں کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

پس دعا کا تنہائی میں تو خوب اہتمام ہونا چاہیے اور اگر مجلس میں بھی کبھی بکھار لمبی دعا ہو جائے اور اس میں رونا آجائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن صحابہ کرام

¹ صحیح مسلم، کتاب الصلوة، باب التَّهْنِي عَنْ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، 348/1

رضی اللہ عنہ مجلس میں رونے کو ممکن حد تک چھپانے اور دبانے کی کوشش کرتے تھے۔
ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: خَطَبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُطْبَةً مَا سَمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ، قَالَ: «لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا، وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا، قَالَ: فَعَطَى أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجُوهَهُمْ لَهْمَ حَنِينٍ»¹

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک مرتبہ ایسا خطبہ دیا کہ اس جیسا خطبہ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ آپ نے کہا کہ اگر تمہیں وہ معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے تو تمہارا ہنسنا کم ہو جائے اور رونابڑھ جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے اور ان کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔“

یہ بات مناسب نہیں ہے کہ کوئی قاری قرآن رمضان کے آخری عشرے میں ہر رات میں نپے تلے ردیف اور قافیوں میں دعا کا اہتمام کرتے ہوئے اپنا خشوع و خضوع لوگوں کو دکھائیں اور آواز کے زیر و بم سے لوگوں کو رلانے کی حتی الامکان کوشش کریں اور پھر ایسے مواقع کی آڈیو یا ویڈیو ریکارڈنگ کا بھی اہتمام ہو۔

پس اگر قاری قرآن ایک ہی طاق رات میں مختلف مساجد میں وتر پڑھا کر یا وعظ ایک ہی طاق رات میں مختلف مساجد میں وعظ کے ذریعے اپنی خشیت کا اظہار کریں کہ لوگ ان کی درد بھری دعا یا وعظ سننے کے لیے شہر حال کریں اور انتظامیہ ان کے نام پر اپنے مدرسے کی اشتہار بازی (advertisement) کرے تو اس سب کچھ پر شاید قرآن مجید کی اس آیت کا اطلاق کیا جاسکتا ہے:

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُتَّالًا يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: 142]

”اور جب وہ نماز کے لیے قیام کرتے ہیں تو سستی کی حالت میں لوگوں کو

¹ صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قوله لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبَدِّلَ لَكُمْ سُبُكُمُ، 54/6

دکھانے کے لیے قیام کرتے ہیں اور اس قیام میں اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔“
ایک دوست کہ جنہوں نے وتر کی اجتماعی دعاؤں میں لوگوں کو رلایا ہوا ہے، کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جسے شیطان انسان کے لیے خوبصورت بنا دیتا ہے:
﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ﴾ [النمل: 24]

”اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ پس اس نے انہیں سیدھے رستے سے روک دیا اور وہ ہدایت پانے والے نہیں ہیں۔“
پس یہ عمل ہے تو ریاکاری اور دکھلاوا لیکن انسان اسے نیکی اور تقویٰ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں نے اتنے لوگوں کو اللہ کے حضور رلا دیا اور انہیں توبہ کروادی۔ شاید یہ تو بہت بڑا نیکی کا کام ہے کہ مالک کے گم شدہ غلاموں کو اس سے ملوایا جائے لیکن ریاکاری کی یہ نیکی انسان اپنے اخلاص کے خون کا نذرانہ دیتے ہوئے کر رہا ہوتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح کا کام اگر ذاتی اصلاح کی قربانی کی قیمت پر ہو تو پھر اس صورت میں اپنی ذات کی اصلاح کو ترجیح دینی چاہیے۔ اس بارے میں مزید تفصیل ہم نے اس کتاب کے پہلے باب میں ”صالح اور مصلح“ کے عنوان کے تحت بیان کی ہے۔

ہم پہلے بھی توجہ دلا چکے ہیں لیکن دوبارہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نیکی کے کسی عمل پر تنقید سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ لوگ اس نیک عمل کو ہی ترک کر دیں بلکہ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نیک عمل میں بعض اوقات کوتاہی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کوتاہی اتنی بڑی بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نیک عمل نیکی نہ رہے بلکہ گناہ بن جائے لہذا ہمیں صرف نیکی کر کے مطمئن نہیں ہو جانا بلکہ اپنی نیکی کی اصلاح کرتے رہنا ہے تاکہ وہ گناہ کی صورت نہ بن جائے۔ اگر ایک نیکی میں ریاکاری شامل ہو جائے گی تو وہ لازمی طور گناہ بن جائے گی اور جنت کی بجائے جہنم کا سبب بن جائے گی۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجاہد کے جہاد، قاری قرآن کی تلاوت اور سخی کی صدقہ کرنے کے نیک اعمال میں ریاکاری شامل ہو جاتی ہے۔ اور بظاہر بڑی بڑی نیکیاں کرنے والے یہ تینوں قسم کے لوگ یعنی مجاہد، قاری اور سخی جہنم میں جائیں گے بلکہ ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ آپ

ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«يَا أَبَا هُرَيْرَةَ، أَوَّلُكَ الثَّلَاثَةُ أَوَّلُ خَلْقِ اللَّهِ تُسَعَّرُ بِهِمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»¹

”اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! [اپنی شہرت کے لیے جہاد، تلاوت، اور صدقہ کرنے والے مجاہد، قاری اور سخی] وہ تین قسم کے لوگ ہیں کہ جن کے وجود سے قیامت کے دن سب سے پہلے جہنم کی آگ کو بھڑکایا جائے گا۔“

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہمیں نیکی نہیں کرنی۔ ہمیں نیکی کرنی ہے لیکن ایک تو اس میں کوتاہی کو دور کرنا ہے اور دوسرا اس کو اعلیٰ صورت میں کرنا ہے یعنی اس کے معیار کو مزید بہتر بنانا ہے۔ پس اجتماعی دعائیں ریاکاری کی صورتوں کو دور کریں اور دعا کی نیکی کی اعلیٰ صورت یعنی تنہائی کی دعا کو اہمیت دیں۔ لیکن جن کا تنہائی کی دعائیں دل نہ لگتا ہو تو وہ اجتماعی دعائیں شرکت کر لیں لیکن یہ اطمینان کر لیں کہ اس اجتماعی دعائیں ایسا تکلف، تصنع اور بناوٹ نہ ہو کہ وہ اجتماعی دعا، نیکی کی بجائے گناہ دکھ رہی ہو۔

مان لیا کہ ریاکاری دل کا فعل ہے لیکن بعض اوقات انسان کا کوئی جذبہ اس پر اتنا غالب آجاتا ہے کہ اس کا اظہار اس کے رویوں سے ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب کسی سے آپ کی نفرت بڑھ جاتی ہے تو اگرچہ اس نفرت کا محل تو دل ہی ہے لیکن اس کا اظہار آپ کے اعضا سے ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پس اسی طرح اگر اپنی شہرت کا جذبہ دل پر غالب آجائے تو آپ کی ہڈی لینگو تنج یہ بتلا دیتی ہے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ اس لیے خدا راہ! اپنے آپ کو اس وقت جھوٹی تسلیاں مت دیں جبکہ آپ کے ریا کا اظہار آپ کے عمل سے ہو رہا ہو۔

سلف صالحین کا طرز عمل تو بالکل مختلف تھا کہ وہ مجلس میں اپنے رونے کا اظہار کرنے کی بجائے اسے چھپاتے تھے۔ حضرت عمرو بن قیس رضی اللہ عنہ کو رونا آتا تو دیوار کی طرف منہ کر کے کہتے کہ زکام لگ گیا ہے۔ عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ پر مجلس میں رقت طاری ہو جاتی تو گھبرا کر کھڑے ہو جاتے کہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے۔ حسان بن ابی

¹ سنن الترمذی، أَبَوَاتُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الرِّيَاءِ وَالشُّمْعَةِ، 591/4

سنان رُحْمُ اللہ کو مجلس میں رونا آتا اور بعض اوقات اتنا روتے کہ دامن تر ہو جاتا لیکن آواز بالکل بھی نہ نکلتی تھی۔ محمد بن واسع رُحْمُ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسے لوگوں کا زمانہ پایا ہے کہ ان میں کوئی ایک اگر اپنی بیوی کے ساتھ ایک تکیے پر سر رکھے سویا ہو اور اللہ کی خشیت سے روئے تو اس کی بیوی کو بھی اس کا علم نہ ہو۔ اور میں نے ایسے لوگوں کا زمانہ پایا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی نماز میں روئے تو ساتھ کھڑے نمازی کو بھی اس کا علم نہ ہو۔ اگر کسی قاری قرآن کے دل میں اس روایت کا اثر ہو گا تو اجتماعی دعایا تلاوت میں اگر اسے رونا آ بھی رہا ہو گا تو وہ اس کو اس طرح چھپالے گا کہ کسی کو احساس بھی نہ ہو گا کہ اس پر کوئی کیفیت طاری ہوئی تھی۔

اسی طرح قرآن مجید کو روتے ہوئے پڑھنا یا خشیت کی کیفیت کے ساتھ پڑھنا تو دونوں میں فرق ہے۔ قرآن مجید کو خشیت کے لہجے میں پڑھنا مسنون ہے، چاہے تنہائی میں پڑھے یا مجلس میں، لیکن روتے ہوئے تلاوت کرنا تو اس عمل کے لیے زیادہ بہتر تنہائی ہے اور یہی حکم اجتماعی دعا کا بھی ہے۔ شیخ بن باز رُحْمُ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

س: ما رأي سماحتكم في ظاهرة ارتفاع الأصوات بالبكاء؟ ج: لقد نصحت كثيرا ممن اتصل بي بالحد من هذا الشيء، وأنه لا ينبغي لأن هذا يؤدي الناس ويشق عليهم ويشوش على المصلين وعلى القارئ، فالذي ينبغي للمؤمن أن يحرص على أن لا يسمع صوته بالبكاء، وليحذر من الرياء، فإن الشيطان قد يجره إلى الرياء، فينبغي له أن لا يؤدي أحدا بصوته ولا يشوش عليهم، ومعلوم أن بعض الناس ليس ذلك باختياره بل يغلب عليه من غير قصد وهذا معفو عنه إذا كان بغير اختياره.²

”سوال: اس شخص کے بارے آپ کی کیا رائے ہے جو روتے میں آواز بلند

¹ أحمد بن ناصر الطيار، حياة السلف بين القول والعمل، دار ابن الجوزي، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى، 1433 هـ، 252-253

² عبد العزيز بن عبد الله بن باز (المتوفى: 1420 هـ)، مجموع فتاوى العلامة عبد العزيز بن باز، دار القاسم للنشر، الرياض، 342-343/11

کرتے ہیں؟ جواب: جن لوگوں نے مجھ سے اس بارے رابطہ کیا ہے تو میں نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے ڈرایا ہے۔ ایسا کرنا بالکل بھی جائز نہیں ہے کہ اس سے نمازیوں کو تکلیف پہنچتی ہے، قاری اور نمازیوں کی نماز متاثر ہوتی ہے۔ مسلمان کے لائق یہی ہے کہ روتے وقت اس کی آواز سنائی نہ دے اور ریاکاری سے بچتا رہے۔ بعض اوقات شیطان اسے ریاکاری کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ پس لازم ہے کہ کسی نمازی کی نماز کو اپنے رونے کی آواز سے خراب نہ کرے۔ البتہ یہ واضح ہے کہ کچھ لوگوں کا رونا اختیاری نہیں ہوتا بلکہ بغیر ارادے کے انہیں رونا آ جاتا ہے تو ایسے لوگوں سے اللہ عزوجل درگزر فرمائیں گے جبکہ ان کا آواز سے رونا اختیاری نہ ہو۔“

اصلاح نفس میں روزے کا کردار

تزکیہ نفس دو چیزوں کا نام ہے؛ عبادت کی اصلاح اور اخلاق کی تربیت۔ اپنے اخلاق اگر درست کرنے ہوں تو اس میں کرنے کے دو کام ہیں؛ اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا اور اچھے اخلاق سے متصف کرنا۔ پہلے نفس کو رذائل سے پاک کریں اور پھر اچھے اخلاق سے متصف کریں کہ لباس اچھا کرنے کے لیے پہلے میل کچیل کو دور کیا جاتا ہے اور پھر خوشبو لگائی جاتی ہے۔ اگر کپڑوں پر نجاست اور گندگی لگی ہو تو خوشبو چھڑکنے کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا۔

اسی طرح عبادت کی اگر اصلاح کرنی ہو تو اس میں بھی کرنے کے کام دو ہی ہیں؛ خواہشات کو کنٹرول کرنا اور عبادت کا ذوق بیدار کرنا کہ انہی دو راستوں سے عبادت میں احسان کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ عبادت میں احسان کی کیفیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ عبادت کا ذوق بیدار ہو جائے اور عبادت کے ذوق کے بیدار ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ انسانی شہوات ہیں۔ جب تک انسان ان شہوات کو کنٹرول نہیں کر لیتا، اس وقت تک اس میں صحیح معنوں میں عبادت کا ذوق اور شوق پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص اپنی شہوات کو پورا کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے یا ان کو مکمل کرنے کے لیے بے چین

رہتا ہے یا ان کی تکمیل کے لیے سوچ بچار میں مشغول رہتا ہے تو اسے مجلس اور تنہائی کی عبادت کی کیفیات حاصل ہونا مشکل ہیں۔

اللہ عزوجل نے انسان میں اس کی آزمائش کے لیے کئی قسم کی شہوات رکھ چھوڑی ہیں اور اس سے مطالبہ یہ کیا ہے کہ وہ ان کو کنٹرول کر کے دکھا دے اور اسی کا نام تزکیہ ہے۔ ان شہوات میں سے بڑی شہوتیں، شرم گاہ کی شہوت، پیٹ کی شہوت اور دماغ کی شہوت ہیں۔ شرم گاہ کی شہوت میں زنا اور اس کی قسمیں شامل ہیں جبکہ پیٹ کی شہوت سے مراد کھانے پینے سے متعلق شہوات ہیں۔

اور دماغ کی شہوت یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر دوسروں پر غلبہ پالینے (urge to dominate) کی شہوت بھی موجود ہے کہ جس کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ میری موت کے بعد بھی دنیا میں میرا نام زندہ رہے اور انتہا اس پر کہ ساری دنیا میری غلام بن جائے، چاہے میں کوئی ایسا فلسفی یا آرٹسٹ بن جاؤں کہ ساری دنیا کے ذہن میرے ذہن کے غلام ہوں یا چاہے میں کوئی ایسا سرمایہ دار یا حکمران ہوں کہ ساری دنیا پر میری عملداری اور حکمرانی ہو۔ صوفیا جسے حب جاہ کہتے ہیں، وہ یہی ہے۔ ہر شخص اپنی مشہوری چاہتا ہے، چاہے دنیا دار ہو یا دیندار۔

روزہ دراصل ہماری شہوات کو کنٹرول کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ [البقرة: 183]

”اے اہل ایمان! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

اس آیت مبارکہ میں روزے کا مقصد تقویٰ بتلایا گیا ہے یا یہ کہا گیا ہے کہ روزے کی غایت اور نتیجہ یہ ہے کہ انسان متقی بن جاتا ہے۔ اور متقی وہی ہے جو اپنے آپ کو اپنے خالق کی نافرمانی سے بچا کر رکھتا ہو اور یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ اس نے اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھ لینا سیکھ لیا ہو۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

«الصَّوْمُ جُنَّةٌ، الصَّوْمُ جُنَّةٌ»¹

”روزہ ڈھال ہے، روزہ ڈھال ہے۔“

ڈھال کا مقصد دشمن کے حملے سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ روزہ کے ڈھال ہونے کا معنی یہ بھی ہے کہ روزہ شیطان کے حملوں سے بندہ مومن کو محفوظ رکھتا ہے کہ شیطان انسان کی خواہشات اور شہوات کو ہوا دینے اور پھونکیں مارنے کا کام کرتا ہے تاکہ انہیں بھڑکا کر انسان کو اللہ کی نافرمانی اور معصیت کی طرف راغب کر سکے۔ اور وہ ہر وقت اسی کام میں لگا ہوا ہے اور ہمیں اس کی یہ حیثیت اپنے ذہن میں ہر وقت تازہ رکھنی چاہیے۔

بھوک، جنس اور غلبہ پانے کی خواہشات میں سے کون سی انسانی خواہش سب سے زیادہ قوی ہے؟ اس بارے میں ماہرین انسانیات کا اختلاف ہے۔ اگرچہ بعض روایات کے اسلوب سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسانی خواہشات میں سے شہوت کی خواہش سب سے زیادہ قوی ہے اور انسان کی گمراہی میں سب سے زیادہ کردار اسی خواہش کا ہوتا ہے۔ تو روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو نہ صرف شہوت کی خواہش کو کنٹرول میں رکھتا ہے بلکہ بھوک اور غلبہ پانے کی خواہشات میں بھی ضبط پیدا کر دیتا ہے۔ اور شہوت میں صرف جنس شامل نہیں ہے بلکہ لالچ اور حرص بھی شہوت ہی کی صورتیں ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنِ اسْتِطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغْضُ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وَجَاءٌ»²

”جو تم میں سے نکاح کی طاقت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ شادی کر لے کیونکہ شادی کرنا نظروں اور شرم گاہ کی حفاظت کے لیے بہت مفید ہے۔ اور جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ روزے رکھے کیونکہ روزہ رکھنا شہوت کو توڑ دیتا ہے۔“

اور جنس کی خواہش صرف یہ نہیں ہے کہ زنا کر لے بلکہ جنس کی خواہش یہ بھی ہے

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 446/15

² صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف على نفسه العزبة، 26/3

کہ فحش قسم کی موویز اور ویب سائٹس دیکھے۔ جنس کی خواہش یہ بھی ہے کہ فحش لٹریچر کا مطالعہ کرے۔ جنس کی خواہش یہ بھی ہے کہ غیر محرم سے تنہائی میں موبائل، واٹس ایپ اور فیس بک پر باتیں کر کے لذت حاصل کرے۔ جنس کی خواہش یہ بھی ہے کہ غیر محرم کے بارے سوچ سوچ کر لذت حاصل کرے۔ جنس کی خواہش یہ بھی ہے کہ غیر محرم کو شہوت کی نظر سے گھورے وغیرہ۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«كُتِبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ نَصِيْبُهُ مِنَ الزَّيْنَةِ، مُدْرِكُ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَالْعَيْنَانِ زَيْنَاهُمَا النَّظَرُ، وَالْأُذُنَانِ زَيْنَاهُمَا الْإِسْتِمَاعُ، وَاللِّسَانُ زَيْنَاهُ الْكَلَامُ، وَالْيَدَا زَيْنَاهُمَا الْبَطْشُ، وَالرِّجْلُ زَيْنَاهُمَا الْخُطَا، وَالْقَلْبُ يَهْوَى وَيَتَمَتَّى، وَيُصَدِّقُ ذَلِكَ الْفَرْجُ وَيَكْذِبُهُ»¹

”انسان کے لیے اس کے زنا کا حصہ اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے اور وہ اسے لازمًا کر رہے گا۔ پس آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں کہ ان کا زنا دیکھنا ہے۔ اور کان بھی زنا کرتے ہیں کہ ان کا زنا سننا ہے۔ اور زبان بھی زنا کرتی ہے کہ اس کا زنا گفتگو کرنا ہے۔ اور ہاتھ بھی زنا کرتا ہے کہ اس کا زنا پکڑنا ہے۔ اور پاؤں بھی زنا کرتے ہیں کہ ان کا زنا چلنا ہے۔ اور دل تو خواہش کرتا ہے لیکن شرم گاہ یا تو اس کی خواہش کو پورا کر دیتی ہے یا پھر اس سے انکار کر دیتی ہے۔“

ہر مہینے میں ایام بیض کے دنوں میں تین نفل روزے رکھنا مسنون ہے۔ اور ایام بیض سے مراد چاند کی تیر ہوئی، چودھویں اور پندرہویں تاریخیں ہیں۔ اور اگر اس سے زیادہ کرنا چاہے تو ہر ہفتے میں دو دن یعنی سوموار اور جمعرات کے دن روزہ رکھنا بھی مسنون ہے کہ ان دونوں دنوں میں فرشتوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہے تو ایک دن روزہ رکھ لے اور ایک دن افطار کر لے اور یہ نفل روزے میں سے افضل ترین روزہ ہے کہ جسے صوم داؤد عَلَيْهِ السَّلَام کہا گیا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ روزہ رکھنا تو اس سے منع کر دیا گیا ہے جیسا کہ آپ صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

«فَقَامَ عُمَرُ أَوْ رَجُلٌ آخَرُ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، رَجُلٌ صَامَ الْأَجَدَ قَالَ:

¹ صحیح مسلم، کتاب القدر، باب فُتِرَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حُطْلُهُ مِنَ الزَّيْنَةِ وَغَيْرِهِ، 2047/4

لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ أَوْ مَا صَامَ وَمَا أَفْطَرَ. قَالَ: صَوْمُ يَوْمَيْنِ وَإِفْطَارُ يَوْمٍ. قَالَ: وَمَنْ يُطِيقُ ذَاكَ؟ قَالَ: إِفْطَارُ يَوْمَيْنِ وَصَوْمُ يَوْمٍ. قَالَ: لَيْتَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ قَوَّانًا لِدَلِّكَ. قَالَ: صَوْمُ يَوْمٍ وَإِفْطَارُ يَوْمٍ. قَالَ: ذَاكَ صَوْمُ أَحْيٍ دَاوُدَ. قَالَ: صَوْمُ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيسِ؟ قَالَ: ذَاكَ يَوْمٌ وُلِدْتُ فِيهِ، وَأُنْزِلَ عَلَيَّ فِيهِ. قَالَ: صَوْمُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ، وَرَمَضَانَ إِلَى رَمَضَانَ صَوْمُ الدَّهْرِ وَإِفْطَارُهُ. قَالَ: صَوْمُ يَوْمٍ عَرَفَةَ؟ قَالَ: يُكْفَرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالْبَاقِيَةَ. قَالَ: صَوْمُ يَوْمٍ عَاشُورَاءَ؟ قَالَ: "يُكْفَرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ"¹

”حضرت عمرؓ نے فرمایا کسی اور صحابی نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اس شخص کے بارے آپ کی کیا رائے ہے کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص ایسا ہے کہ اس نے کبھی روزہ رکھا ہی نہیں۔ صحابی نے عرض کیا کہ اس کے بارے کیا رائے ہے کہ جو دو دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی کون طاقت رکھ سکتا ہے؟ صحابی نے عرض کیا کہ اس کے بارے کیا رائے ہے کہ جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن افطار کرے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم اللہ عز و جل سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کی طاقت عطا فرمائے گا۔ صحابی نے عرض کیا کہ اس کے بارے کیا رائے ہے کہ جو ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے۔ صحابی نے عرض کیا کہ سو موار اور جمعرات کے روزے کے بارے کیا کہتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس دن میں، میں پیدا ہوا اور اس دن میں مجھ پر وحی نازل کی گئی۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان کے روزے رکھنا اور ہر مہینے میں تین روزے رکھ لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمیشہ روزہ رکھا ہو۔ صحابی نے عرض کیا کہ یوم عرفہ یعنی حج کے دن کے روزے کے بارے کیا کہتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے ایک سال اگلے اور ایک سال پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ صحابی نے

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 225-224/37

عرض کیا کہ دس محرم کے روزے کے بارے کیا کہتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے ایک سال پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔“

رمضان اور قرآن

رمضان کے مہینے کو قرآن مجید سے خاص نسبت یہ ہے جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت 185 میں ہے کہ رمضان کے مہینے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ رمضان کے مہینے میں قرآن مجید کی تلاوت کا نسبتاً زیادہ اہتمام فرماتے تھے یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے مہینے میں حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرماتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی، اس سال آپ نے دو مرتبہ دور فرمایا۔¹

رمضان میں جہاں اور بہت سے کرنے کے کام ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم قرآن مجید کے ساتھ اپنے تعلق کو زندہ کریں۔ قرآن مجید کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں، چاہے یہ وقت قرآن مجید کی تلاوت کی صورت میں گزرے یا اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی صورت میں کہ آپ ﷺ کا فرمان یہ بھی ہے کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں کہ جو قرآن مجید سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔²

رمضان میں ہماری تربیت اور اصلاح کا جو پروگرام دیا گیا ہے، وہ دوہرا ہے کہ دن میں بھوکے پیاسے رہ کر اپنے نفس کو کمزور کرو کہ جو مٹی ہی سے بنا ہے اور اس کی ساری خوراک بھی مٹی ہی سے آتی ہے اور اس کی ساری خواہشات بھی ایسی ہیں جو انسان کو مٹی ہی کی طرف لے کر جاتی ہیں۔ اور رات کو قیام الیل میں قرآن مجید سننا، سمجھنا سمجھا کر اپنی روح کو تقویت دو کہ جو آسمانوں سے آئی ہے اور اس کی غذا بھی آسمانوں سے آئی ہے اور وہ کلام الہی ہے۔ رمضان سلوک کی منازل طے کرنے کا مہینہ ہے۔ رمضان تقرب الی اللہ میں آگے بڑھ جانے کا مہینہ ہے۔ رمضان نفس کی اصلاح کا مہینہ ہے۔ رمضان

¹ صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کان جبریل یغرض القرآن علی النبی، 186/6

² صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ، 192/6

تربیت کا مہینہ ہے۔ رمضان کا مہینہ تزکیہ نفس کا سالانہ پروگرام ہے۔
 اور تزکیہ نفس کا کل خلاصہ دو لفظوں میں یہی ہے کہ ضبط نفس (self-control) ہو کہ جو روزے سے پیدا ہو گا۔ اور شخصیت کی تعمیر (personality development) ہو جو قرآن مجید سے زندہ تعلق قائم کر لینے سے پیدا ہوگی۔ پس ہم میں سے ہر شخص کو یہ عہد کر لینا چاہیے کہ اس رمضان کے مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ قرآن مجید کی تلاوت اور ایک مرتبہ اس کے ترجمے سے لازماً گزرے گا، چاہے خود سے پڑھ لے، چاہے کسی سے سن لے۔

پاکستان کے ہر بڑے شہر میں بڑی مساجد میں نماز تراویح اور اُن میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کے پارہ کے خلاصہ یا ترجمہ بیان کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور کوشش کریں کہ کسی ایسی مسجد میں تراویح پڑھنے کا اہتمام کریں کہ جہاں کے قاری صاحب کی آواز اور لہجہ خوبصورت ہو کہ تراویح میں دلچسپی رہے اور دوسرا وہاں تراویح کے ساتھ روزانہ ہر پارے کا خلاصہ یا ترجمہ بیان کیا جاتا ہو اور بیان کرنے والے بھی کوئی اچھے اور باعمل مدرس ہوں کہ جن کے بیان سے قرآن مجید میں دلچسپی باقی رہے۔

اگر آپ کو ایسی کوئی مسجد میسر نہ بھی ہو تو ہمارے استاذ اکبر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے رمضان کے مہینے میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی ویڈیو ریکارڈنگ کروائی تھی جو کہ پڑھے لکھے طبقے کے لیے ترغیب کا باعث (motivating) ہے، اس میں سے ایک پارہ روزانہ سن لیں۔ اور یہ ریکارڈنگز، آڈیو اور ویڈیو میں نیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ اس سال تنظیم اسلامی کے تحت پرائم شادی ہال، نزد غوثیہ چوک، ٹاؤن شپ، لاہور میں منعقدہ نماز تراویح کے ساتھ ترجمہ قرآن بیان کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ نزدیک رہنے والے احباب کو اس میں شرکت کی دعوت ہے۔
 جزاکم اللہ خیراً۔

تلاوت اور تزکیہ

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ذریعے کو بنیاد بنا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ اور اصلاح

فرمائی تو وہ قرآن مجید کا ذریعہ ہے۔ یہ قرآن ہی تھا کہ جس نے ایک ایسی قوم کو کہ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ایک دوسرے پر جان نثار کرنے والا بنا دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں جو تبدیلی آئی اور ایسی آئی کہ انہیں قیامت تک آنے والے امتیوں پر فضیلت حاصل ہوئی، تو اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک قرآن مجید سے گہرا تعلق اور دوسرا اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت۔

ہمارے ہاں تزکیہ نفس کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں ہیں، سلاسل میں یا خانقاہوں میں، علمائے یا صوفیاء میں، ان سب میں صحبت کو تو اہمیت دی گئی اور اس کی اہمیت سے ہمیں انکار بھی نہیں ہے، اگرچہ مرشد کی صحبت، نبی کی صحبت کے مقابلے میں ذرہ برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی ہے، لیکن قرآن مجید کو اصلاح نفس کے پروگرام میں ہر جگہ یکسر نظر انداز کیا گیا ہے حالانکہ قرآن مجید سے تعلق آج بھی کسی درجے میں ویسا قائم ہو سکتا ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ پس تزکیہ نفس کی دو نبوی بنیادوں میں جو ہمارے لیے زیادہ مفید تھی، اس کو ہم نے ترک کر دیا۔ اور جو کم مفید تھی، اس اعتبار سے کہ نبی کی صحبت کے برابر تو اب کسی مرشد کی صحبت نہیں ہو سکتی، اس کو ہم نے واحد معیار تزکیہ بنا لیا۔ اور آج کل تزکیہ کسی شخصیت سے تعلق کے گرد ہی گھومتا رہتا ہے، چاہے یہ تعلق بیعت کا ہو یا ارادت کا۔

بہت ضروری ہے اس امت کی اصلاح بھی انہی بنیادوں پر کی جائے کہ جن پر خیر القرون کی ہوئی ہے اور وہ بنیادیں قرآن مجید سے تعلق اور صحبت صالحین کی ہیں۔ ایک مسلمان کی قرآن مجید سے تعلق کی دو نوعیتیں ہونی چاہئیں۔ ایک اس پر ایمان رکھنے اور اس کی تلاوت کرنے کی اور دوسرا اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی۔

قرآن مجید کی تلاوت کے بہت سے فضائل احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ قیامت والے دن قرآن مجید اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا:

«افْرءُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا لِأَصْحَابِهِ»¹
 ”قرآن مجید کی تلاوت کرو بے شک یہ قیامت والے دن اپنے پڑھنے والوں کی
 شفاعت کرے گا۔“

اور اصل نیکی تو وہی ہے کہ جس میں نفس کو مشقت اٹھانی پڑے کہ اس میں نیک
 عمل کرنے کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ پس اگر قرآن مجید کی تلاوت پر دل
 آمادہ ہو یا قرآن مجید روانی سے پڑھنے کی مہارت حاصل ہو تو اس پڑھنے کا اجر و ثواب تو ہے
 ہی لیکن اگر انسان اپنے نفس پر جبر کر کے قرآن مجید کی تلاوت کرے گا یا قرآن مجید پڑھ
 سکنے کی اہلیت نہ ہونے کے باوجود قرآن مجید پڑھنے کا اہتمام کرے گا تو اس کے لیے دو گنا
 اجر و ثواب ہے۔ ایک قرآن مجید پڑھنے کا اور دوسرا مجاہدہ کرنے اور اپنے نفس پر جبر
 کرنے کا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَثَلُ الَّذِي يَقْرَأُ
 الْقُرْآنَ، وَهُوَ حَافِظٌ لَهُ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَّةِ، وَمَثَلُ الَّذِي يَقْرَأُ،
 وَهُوَ يَتَعَاهَدُهُ، وَهُوَ عَلَيْهِ شَدِيدٌ فَلَهُ أَجْرَانِ»²

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو
 شخص قرآن مجید پڑھتا ہو اور وہ اس کا حافظ ہو تو اس کا حشران فرشتوں کے ساتھ
 ہو گا جو قرآن مجید کو لوح محفوظ میں لکھنے والے اور بزرگی والے اور نیک فرشتے
 ہیں۔ اور جو شخص قرآن مجید کو انک انک کر پڑھتا ہے اور اسے تلاوت میں
 مشکل پیش آتی ہے تو اس کے لیے تلاوت کا دو گنا اجر ہے۔“

قرآن مجید کی تلاوت کی بہترین صورت یہ ہے کہ اسے نماز میں قیام کی حالت میں
 پڑھا جائے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا معمول تھا
 کہ رات تہجد میں لمبے قیام میں لمبی تلاوت کرتے تھے بلکہ آپ ﷺ تو رات کا ایک تہائی
 یا نصف یاد و تہائی وقت قیام کی حالت میں تلاوت کے ساتھ گزارتے تھے جیسا کہ سورۃ

¹ صحیح بخاری، کتاب صَلَاةِ الْمَسَافِرِ وَقَصْرِهَا، بَابُ فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ، 553/1

² صحیح بخاری، کتاب تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، بَابُ {يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا}، 166/6

المزل کی شروع کی آیات میں منقول ہے۔ اور قرآن مجید نے تزکیہ نفس کے لیے بہترین طریق کار تہجد میں قیام کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت کرنے کو بتلایا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُزْمَلُ ﴿١﴾ قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢﴾ بَصِّفْهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿٣﴾ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ﴿٤﴾ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ﴿٥﴾ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ﴿٦﴾﴾ [المزمل: 6]

”اے نبی ﷺ! آپ رات بھر قیام کریں سوائے تھوڑے حصے کے۔ نصف رات قیام کر لیں، یا نصف رات سے کچھ وقت کم کر لیں، یا نصف رات سے کچھ وقت زائد کر لیں اور قرآن مجید کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ بے شک ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل فرمانے والے ہیں۔ اور بے شک رات کا اٹھنا نفس کو قابو کرنے کے لیے اور یکسوئی سے بات کرنے کے لیے بہت مفید ہے۔“

اگر کسی کو قرآن مجید یاد نہ ہو تو وہ تہجد کی نماز میں اپنے ہاتھ میں پاٹ ساڑز مصحف لے کر دیکھ کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ قیام الیل میں مصحف کھول کر پڑھنے کی اجازت جمہور علما کے ہاں موجود ہے کہ اس بارے ایک روایت یہ ملتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام ذکوان رضی اللہ عنہ رمضان کے مہینے میں گھر کی عورتوں کو مصحف کھول کر جماعت کروالیا کرتے تھے۔¹

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے جب یہ سوال ہوا کہ کیا قیام الیل میں مصحف کھول کر تلاوت کر سکتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ کر سکتے ہیں۔ جب ان سے سوال ہوا کہ کیا فرائض میں بھی کر سکتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ اس بارے ہمیں کوئی روایت نہیں پہنچی ہے۔² امام مالک، امام شافعی، امام محمد اور قاضی ابویوسف رضی اللہ عنہم کا موقف بھی یہی ہے کہ قیام الیل میں مصحف کھول کر تلاوت کی جاسکتی ہے کیونکہ نماز اور مصحف میں نظر

¹ أبو بکر بن أبي داود، كتاب المصاحف، الفاروق الحديثة، مصر، الطبعة الأولى، 2002ء، ص 456

² ابن قدامة المقدسي، أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الحنبلي، المغني لابن قدامة، مكتبة القاهرة، القاهرة، 1388ھ-1968ء، 411/1

دونوں عبادت ہی کی قسمیں ہیں لہذا ایک عبادت میں دوسری عبادت شامل کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔¹

قرآن مجید کی تلاوت ایک ایسی عبادت ہے کہ جو تزکیہ نفس کے علاوہ فرشتوں کے نزول کا بھی باعث ہے۔ عام طور جہاں قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے، وہاں سکینت اور فرشتے نازل ہوتے ہیں اور شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُورَةَ الْكَهْفِ، وَإِلَى جَانِبِهِ حِصَانٌ مَرْبُوطٌ بِشَاطِئَيْنِ، فَتَغَشَّتُهُ سَحَابَةٌ، فَجَعَلَتْ تَدْنُو وَتَذْنُو وَجَعَلَ فَرَسُهُ يَنْفِرُ، فَلَمَّا أَصْبَحَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ فَقَالَ: «تِلْكَ السَّكِينَةُ تَنَزَّلُ بِالْقُرْآنِ»²

”حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی سورۃ کہف کی تلاوت کر رہے تھے اور ان کا گھوڑا ایک جانب دو رسیوں سے بندھا ہوا تھا کہ دوران تلاوت انہیں ایک بدلی نہ گھیر لیا۔ پس جیسے جیسے وہ بدلی آسمان سے ان کے قریب ہوتی تھی تو ان کا گھوڑا ویسے ویسے بدکناشروع ہو جاتا تھا۔ انہوں نے صبح اس واقعے کا ذکر اللہ کے رسول ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ سکینت تھی جو کہ قرآن کی تلاوت کی وجہ سے نازل ہو رہی تھی۔“

قرآن مجید کی تلاوت کے بعد دوسرا بڑا فرض اس کو سمجھنے اور سمجھانے کا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر موجود ہیں۔ بعض اردو تراجم بعض مسالک کے نمائندہ ہیں تو بعض تراجم ایسے بھی ہیں کہ جو تمام مسالک میں یکساں طور معروف ہیں جیسا کہ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمہ اللہ، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمہ اللہ اور مولانا فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے۔ پہلا اور تیسرا با محاورہ جبکہ دوسرا

¹ النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف، المجموع شرح المذهب، دار الفكر، بيروت، 95/4؛ المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني، الهداية في شرح بداية المبتدي، دار احياء التراث العربي، بيروت، لبنان، 63/1

² صحيح بخاري، كتاب فضائل القرآن، باب فضل سورة الكهف، 188/6

لفظی ترجمہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:
«خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ»¹

”حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں کہ جنہوں نے قرآن مجید سیکھا اور سکھایا۔“

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے ہے کہ جو سب کے سب بہترین تھے لیکن ان میں بھی درجات ہیں لہذا ان میں سے بھی بہترین وہ ہیں جو قرآن مجید کی درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اسی طرح فرد کی اصلاح کے علاوہ قوموں کی مادی ترقی اور دنیاوی عروج میں بھی اللہ کی کتاب کے ساتھ ان کے گہرے تعلق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

نَافِعَ بْنِ عَبْدِ الْحَارِثِ، لَقِيَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ، وَكَانَ عُمَرُ يَسْتَعْمِلُهُ عَلَى مَكَّةَ، فَقَالَ: مَنْ اسْتَعْمَلْتُ عَلَى أَهْلِ الْوَادِي، فَقَالَ: ابْنُ أَبِيزَى، قَالَ: وَمَنْ ابْنُ أَبِيزَى؟ قَالَ: مَوْلَى مِنْ مَوَالِينَا، قَالَ: فَاسْتَخْلَفْتُ عَلَيْهِمْ مَوْلَى؟ قَالَ: إِنَّهُ قَارِئٌ لِكِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَإِنَّهُ عَالِمٌ بِالْفَرَائِضِ، قَالَ عُمَرُ: أَمَا إِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا، وَيَضَعُ بِهِ الْآخَرِينَ»²

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع بن عبد الحارث رضی اللہ عنہ کو مکہ کا گورنر مقرر کیا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے مکہ کے گرد و نواح میں وادی کے علاقے کے لیے کس کو امیر بنایا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ابن بزی رضی اللہ عنہ کو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ ابن بزی کون ہیں؟ نافع بن عبد الحارث رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ آزاد کردہ غلام ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا آپ نے ایک آزاد کردہ غلام کو امیر بنادیا؟ تو نافع بن عبد الحارث رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ قرآن مجید کے بہترین قاری ہیں اور دینی فرائض کے عالم ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر کہا کہ نبی کریم ﷺ

¹ سنن الترمذی، أبواب فضائل القرآن، باب ما جاء في تعليم القرآن، 173/5

² صحيح بخاري، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب فضل من يقوم بالقرآن، ويعلمه، 559/1

نے فرمایا ہے کہ بلاشبہ اس کتاب کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سی قوموں کو بلندی عطا فرماتے ہیں اور بہت سی قوموں کو زوال عطا کرتے ہیں۔“

امرواقعہ یہ ہے کہ اللہ کی کتاب سے تعلق ترک کر دینا امت مسلمہ کے زوال کا ایک بنیادی سبب ہے جیسا کہ مفکر پاکستان علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی مشہور نظم ”جواب شکوہ“ میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔¹

قرآن مجید نے اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ [البقرة: 121]

”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے تو وہ اس کی تلاوت ایسے کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔ یہی لوگ کتاب پر ایمان لانے والے ہیں۔ اور جو لوگ کتاب کا انکار کریں گے تو وہی لوگ ناکام ہیں۔“

قرآن مجید کی تلاوت کا حق تین قسم کا ہے۔ ایک یہ کہ اس کو سمجھ کر اور پوری توجہ سے پڑھے جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس آیت میں تلاوت کے حق سے مراد یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے جنت کا ذکر آئے تو اللہ سے جنت کا سوال کرے اور جب جہنم کا ذکر آئے تو اللہ سے جہنم کی پناہ مانگے۔² پس قرآن مجید کو اس طرح پڑھے کہ جیسے اللہ تعالیٰ تلاوت کرنے والے سے خطاب کر رہے ہیں اور بندہ اپنے رب کو اس کا جواب بھی دے رہا ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت کا دوسری قسم کا حق یہ ہے کہ بندہ قرآن مجید میں اللہ عزوجل کے جن احکامات کی تلاوت کرے تو تلاوت مکمل کرنے کے بعد ان پر عمل بھی کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں تلاوت کے حق سے

¹ وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

² ابن کثیر، أبو الفداء إسماعیل بن عمر القرشي، تفسیر القرآن العظیم، دار طبیۃ النشر والتوزیع، الطبعة

الثانیة، 1420ھ- 1999م، 403/1

مراد یہ ہے کہ بندہ قرآن مجید کی اتباع کرے کیونکہ قرآن مجید ہی میں سورۃ الشمس میں تلاوت کا لفظ اتباع کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔¹

اور تیسرا اور ظاہری معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کے پڑھنے کا خوب اہتمام کیا جائے۔ عام طور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول تھا کہ وہ ہفتے میں ایک مرتبہ قرآن مجید مکمل کر لیتے تھے یعنی دن بھر میں قرآن مجید کی ایک منزل کی تلاوت ان کے نصاب میں شامل تھی۔ روزانہ ایک منزل تلاوت کرنا بہترین عمل ہے کہ جس کو معمول بنانے کی حفاظت، علماء، خطباء، مدرسین، واعظین اور مصلحین کو کوشش کرنی چاہیے جبکہ عام آدمی کے لیے عمدہ نصاب یہ ہے کہ روزانہ ایک پارہ تلاوت کریں تاکہ مہینے میں ایک مرتبہ قرآن مجید مکمل ہو جائے۔

اور جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں تو انہی کو احادیث میں ”اصحاب القرآن“ کہا گیا ہے۔ تو ہمیں اصحاب القرآن بننا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ: اقْرَأْ، وَارْتَقِ، وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا، فَإِنَّ مَنَزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرُؤُهَا»²

”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ صاحب قرآن سے قیامت والے دن کہا جائے گا کہ آپ پڑھتے جائیں اور جنت کے درجات چڑھتے جائیں۔ اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں جیسے آپ دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ بے شک جنت میں آپ کا مرتبہ وہاں تک ہے جہاں آپ کی آخری آیت مکمل ہوگی۔“

قرآن مجید سے تعلق رکھنے والے دلوں کی تین قسمیں اللہ کے رسول ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔ ایک طرف وہ دل ہیں کہ جو قرآن مجید سے خود بھی اثر لیتے ہیں اور یہ اثر دوسروں کو بھی منتقل کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ دل ہیں جو کہ خود تو قرآن مجید

¹ ایضاً

² سنن أبي داود، باب تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الْوُثْرِ، بَابُ اسْتِخْبَابِ التَّوْبِيلِ فِي الْقِرَاءَةِ، 73/2

سے اثر نہیں لے پاتے لیکن قرآن مجید کا اثر ان کے ذریعے سے دوسروں کے دلوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اور تیسری قسم ان دلوں کی ہے جو نہ تو خود فائدہ اٹھا سکے اور نہ ہی کسی کو فائدہ دے سکے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ، كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيرِ أَصَابَ أَرْضًا، فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ، قَبِلَتِ الْمَاءَ، فَأَنْبَتَتِ الْكَلَّا وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ، وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ، أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَتَفَعَّ اللَّهُ بِهَا النَّاسَ، فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا، وَأَصَابَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ أُخْرَى، إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلًّا، فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقَّهَ فِي دِينِ اللَّهِ، وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَزَفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللَّهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ»¹

”اللہ عز و جل نے مجھے جو علم اور ہدایت دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال زور کی بارش کی سی ہے جو کسی زمین میں نازل ہو۔ پس اگر تو زمین پاک صاف ہو [زم ہو] تو وہ اس پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور اس سے خوب نباتات اور گھاس اگتی ہے۔ اور اگر وہ زمین سخت ہو تو پانی کو روک لیتی ہے [جیسا کہ جھیل، تالاب وغیرہ]۔ پس اللہ عز و جل لوگوں کو اس پانی سے فائدہ دیتے ہیں۔ لوگ اس سے خود بھی پیتے بھی ہیں، جانوروں کو بھی پلاتے ہیں اور کھیتی کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ بعض اوقات بارش کا یہ پانی کسی ایسی زمین میں جا پڑتا ہے کہ جو چٹیل میدان کی طرح ہے کہ نہ تو پانی جذب کرتی ہے کہ نباتات اگائے اور نہ ہی ذخیرہ کرتی ہے کہ دوسروں کو فائدہ دے۔ پس یہ مثال ان لوگوں کی ہے کہ جنہیں اللہ نے دین کی سمجھ عطا فرمائی اور اللہ نے انہیں اس علم کے ساتھ فائدہ دیا کہ جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا۔ پس انہوں نے اس علم کو خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھلایا۔ اور یہ مثال اس کی بھی ہے کہ جو تکبر کی وجہ سے وہ علم اور ہدایت حاصل نہ کر سکا کہ جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔“

اس روایت میں قرآن مجید اور وحی کے علم کو بارش کا پانی کہا گیا ہے اور انسانوں کے

¹ صحیح البخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم، 27/1

دلوں کو زمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس تشبیہ پر اگر غور کیا جائے تو بہت بلیغ تشبیہ ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ ہر دل اس قابل نہیں ہوتا کہ قرآن مجید کے اثرات اپنے اندر جذب کر سکے جیسا کہ ہر زمین بارش کے پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اسی طرح خود قرآن مجید اور وحی کی یہ صفت بھی ہے کہ اگر کوئی دل اس کے اثر اور فائدے کو جذب نہ بھی کر سکے تو اسے آگے منتقل کرنے کی صلاحیت پھر بھی رکھتا ہے۔

ذکر و فکر اور تزکیہ

بندہ اپنے مالک اور محسن کو کبھی بھولے سے بھی نہ بھولے اور ہمیشہ یاد رکھے تو اس کے لیے قرآن مجید نے ہمیں ہر حال میں ذکر کا حکم دیا ہے۔ اور ذکر بھی محض زبان سے ذکر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے نفس اور کائنات کی تخلیق میں غور و فکر کرنا کہ اس سے بھی اللہ کی خشت کے احوال حاصل ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: 191]

”جو لوگ اٹھتے، بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں غور کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ ہر قسم کے عیب سے پاک ہیں۔ پس آپ ہمیں آگ کے عذاب سے بچالیں۔“

قرآن مجید صرف ذکر کا حکم نہیں دیتا بلکہ بہت زیادہ ذکر کرنے کا حکم دیتا ہے اور صبح و شام ذکر کرنے کا حکم دیتا ہے کہ ذکر ایک ایسی عبادت ہے کہ جو ہم چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھیتے کودتے بھی کر سکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا﴾ ﴿41﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ [آل عمران: 42]

”اے اہل ایمان! اللہ کو بہت زیادہ کثرت سے یاد کرو اور اس کی تسبیح صبح و شام بیان کرو۔“

بہترین ذکر وہ ہے جو نہ تو بلند آواز سے ہو اور نہ ہی خاموش ہو بلکہ ایسا ہو کہ اس میں دل اللہ کی طرف متوجہ ہو اور زبان اس کی یاد سے تر ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ﴾ [الأعراف: 205]

”اور اپنے رب کو صبح اور شام کے اوقات میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور آہستہ آواز سے یاد کرو۔ اور اللہ کو بھلا دینے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔“

اعلیٰ درجہ تو یہی ہے کہ اللہ ہر حال میں یاد رہے لیکن اس سے کم تر درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو یاد رکھنے کی کوشش کرے لیکن اگر کبھی یاد نہ رہے تو اس پر بعد میں شرمندہ ہو اور استغفار کرے۔ اور اگر صورت حال یہ ہو کہ انسان جان بوجھ کر اللہ کی یاد سے غفلت اختیار کرے کہ جسے قرآن مجید نے اعراض کہا ہے کہ اللہ کے ذکر سے منہ ہی پھیر لے تو یہی لوگ ہیں کہ جن کے لیے اللہ عزوجل ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ان کا دوست بن جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَعْصِ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ﴾ [الزخرف: 36]

”اور جو شخص رحمان کے ذکر سے منہ پھیر لیتا ہے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔“

ذکر کتنی بڑی عبادت ہے، اس کا اندازہ اس روایت سے بھی ہو سکتا ہے کہ جس میں اسے جہاد و قتال اور سونا چاندی صدقہ کرنے سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَلَا أُبَيِّنُكُمْ بِخَيْرٍ أَعْمَالِكُمْ، وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِكِكُمْ، وَأَرْفَعَهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٌ لَكُمْ مِنْ إِنْفَاقِ الدَّهَبِ وَالْوَرِقِ، وَخَيْرٌ لَكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أَعْنَاقَكُمْ؟» قَالُوا: بَلَى. قَالَ: «ذِكْرُ اللَّهِ تَعَالَى»¹

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الذِّكْرِ، 459/5

”حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسے عمل کی خبر نہ دوں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور تمہارے لیے اللہ کے رستے میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بھی افضل عمل بلکہ اس جہاد سے بھی افضل عمل کہ جس میں تم اپنے دشمنوں کی گردنیں اڑاؤ اور وہ تمہاری گردنیں اڑائیں۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے نبی ﷺ! آپ ضرور ایسے عمل کی خبر دیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اللہ کا ذکر ہے۔“

افضل ذکر وہی ہے کہ جس میں انسان کی زبان حرکت میں ہو اور دل اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ شریعت میں نہ تو صرف قلبی ذکر مطلوب ہے اور نہ ہی محض لسانی ذکر۔ صوفیا کے بعض حلقوں میں صرف قلبی ذکر پر زور دیا جاتا ہے جو کہ مناسب نہیں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُسْرِ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ شَرَائِعَ الْإِسْلَامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ، فَأَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ أَتَشَبَّهُ بِهِ، قَالَ: «لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ»¹

”حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آکر کہا کہ اسلام کے احکامات مجھے بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسا حکم بتلا دیں کہ میں اس سے جڑا رہوں۔ تو آپ ﷺ نے کہا کہ تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔“

پس آپ ﷺ کا کہنا یہ ہے کہ ذکر وہ ہے کہ جس میں تیری زبان جاری ہو۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ زبان سے ذکر کرتے ہوئے قلب اللہ کی طرف متوجہ رہے لہذا زبان اور دل دونوں سے ذکر ہو تو یہ افضل ترین درجہ ہے۔ اور اگر صرف دل سے ہو تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ اس میں زبان اللہ کی عبادت میں مصروف نہیں ہے۔ اور اگر صرف

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الذِّكْرِ، 497/5

زبان سے ہو تو یہ تیسرا درجہ ہے کہ اس میں دل کی توجہ حاصل نہیں ہے لیکن اعضا کو عبادت میں مصروف رکھا ہوا ہے۔ اور چوتھا درجہ تو غفلت کا ہے کہ جس میں نہ دل سے اللہ کا ذکر ہو اور نہ ہی زبان سے ہو جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ رَبَّهُ، مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ»¹
 ”حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو شخص اللہ کا ذکر نہیں کرتا ہے تو دونوں کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔“

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان الفاظ سے اللہ کا ذکر کیا جائے کہ جن الفاظ سے اللہ کا ذکر کرنے کی اللہ کے نبی ﷺ نے ترغیب دلائی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَالَ: سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ، فِي يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ، حُطَّتْ خَطَايَاهُ، وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ»²
 ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے سبحان اللہ و بحمدہ دن میں سو مرتبہ کہا تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے، چاہے وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَأَنْ أَقُولَ سُبْحَانَ اللَّهِ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ، أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ»³

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہنا مجھے دنیا کی ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے کہ جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔“

¹ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب فُضِّلَ ذِكْرُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، 86/8

² صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب فُضِّلَ التَّسْبِيحُ، 86/8

³ سنن الترمذی، أبواب الدعوات عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 577/5

اب یہ جو اجر و ثواب ہے تو یہ انہی الفاظ میں اللہ کا ذکر کرنے پر ہے کہ جو الفاظ احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔ اور اگر ہم اپنے الفاظ میں اللہ کو یاد کریں گے تو ہمارا اللہ کو یاد کرنا ایک عبادت تو شمار ہوگا لیکن اس سے اللہ کا اتنا تقرب یا اتنا جوار و ثواب کبھی بھی نہ ملے گا کہ جتنا اللہ کے رسول ﷺ کے بتلائے ہوئے الفاظ میں یاد کرنے پر ملے گا۔

مسنون اذکار کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے خود اپنے نبی کو بتلایا دیا ہے کہ میرے بندوں کو کہہ دیں کہ مجھے یوں یاد کریں اور ان الفاظ میں میری حمد و ثناء بیان کریں۔ اب جب اللہ عز و جل نے خود بتلادیا ہے کہ مجھے ان الفاظ میں یاد کرو تو اس سے بڑی محرومی کیا ہوگی کہ میں اپنے محبوب کی تعریف ان الفاظ میں تو نہ کروں کہ جن میں اس نے مجھ سے اپنی تعریف کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور خود سے اپنے الفاظ میں کرنا شروع کر دوں۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ قَالَ فِي يَوْمٍ مِائَةَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، كَانَ لَهُ عَدْلُ عَشْرِ رِقَابٍ، وَكُتِبَتْ لَهُ مِائَةُ حَسَنَةٍ، وَمُحِبِّي عَنْهُ مِائَةُ سَلَامَةٍ، وَكُنَّ لَهُ حِزْبًا مِنَ الشَّيْطَانِ، سَائِرَ يَوْمِهِ إِلَى اللَّيْلِ، وَلَمْ يَأْتِ أَحَدٌ بِأَفْضَلَ مِمَّا أَتَى بِهِ، إِلَّا مَنْ قَالَ أَكْثَرَ»¹
 ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ایک دن میں سو مرتبہ پڑھ لیا تو اسے دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔ اس کے نامہ اعمال میں سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور سو گناہ معاف کیے جائیں گے۔ اور یہ کلمات اس دن میں رات تک اس کے لیے شیطان سے حفاظت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اور اس دن میں اس سے افضل عمل کسی کا نہ ہوگا سوائے اس کے کہ جس نے اس سے زیادہ مرتبہ یہ کلمات پڑھے ہوں گے۔“

صوفیاء کے بعض حلقوں میں نبوی اذکار کو ترک کر کے بزرگوں کے وظائف سا لکین کو تجویز کیے جاتے ہیں۔ اب ”اللہ ہو“ کا ورد کسی بھی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے

¹ سنن الترمذی، کتاب الأذکار، باب فَضْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، 1248/2

لیکن ہر ماں بچوں کو لوری دیتے ہوئے بھی یہی پڑھ رہی ہوتی ہے۔ اس کی بجائے ہمیں ”اللہ ہم“ کی لوری دینی چاہیے کہ جو مسنون لفظ ہے کہ اس کی اصل ”اللہم“ ہے۔ اور یہ لفظ بطور دعا اور ذکر قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے آیا ہے۔ مسنون اذکار میں اللہ کے رسول ﷺ کی صبح و شام کی دعائیں بھی شامل ہیں۔ کویت کے ایک عالم دین نے اللہ کے رسول ﷺ کے صبح و شام کے اذکار اور مختلف احوال کی دعائیں ”حصن المسلم“ کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دی ہیں کہ جو پاکٹ سائز میں بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کی جیب میں یہ کتاب ہونی چاہیے کہ سفر و حضر میں جب موقع ملا تو کچھ اذکار اور دعائیں یاد کر لیں یاد ہر لیں۔

ہمارے لیے وہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ جن کے ذریعے اللہ کے رسول ﷺ اللہ کو یاد کیا کرتے تھے، اللہ کی حمد و ثنائیاں کرتے تھے، اللہ کا قرب حاصل کیا کرتے تھے، اپنی بندگی کے احوال کو زندہ کرتے تھے۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے انحراف نہیں ہوگا کہ ہم آپ ﷺ کے اذکار کو ترک کر کے اپنے بنائے ہوئے و خائف پر لوگوں کو بھی لگائیں اور خود بھی ان کی پابندی کریں۔

اب اسی پر غور کر لیں کہ اکثر لوگ درود ابراہیمی نہیں پڑھتے کہ جس کے پڑھنے کی اللہ کے نبی ﷺ نے تلقین فرمائی ہے اور اپنی طرف سے بنائے ہوئے درود مثلاً درود تاج، درود تنجینا اور درود لکھی معلوم نہیں کیا کچھ پڑھتے رہتے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض کے الفاظ شرکیہ ہوتے ہیں کہ جن کے پڑھنے سے ثواب تو کیا الٹا گناہ ملنے کی وعید ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے پوچھا کہ آپ پر کیسے درود بھیجیں تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ درود ابراہیمی پڑھا کرو لیکن اس کے باوجود ہم اگر نبوی الفاظ کی بجائے اپنے الفاظ میں درود بھیجے کو زیادہ اہمیت دیں تو ہم سے بڑھ کر بد نصیب کون ہوگا؟ کیا نبی کریم ﷺ کے پسند فرمودہ اور تلقین کردہ درود شریف کے مقابلے میں کسی امتی کے درود شریف کی کوئی ذرہ برابر بھی اہمیت ہے؟

اسی طرح ذکر کی افضل ترین صورت وہ ہے کہ جو افضل ترین مقام یا افضل ترین

اوقات یا افضل ترین حالات میں ہو۔ لہذا مسجد میں ذکر، تہجد کے وقت ذکر اور نماز کی حالت میں ذکر، ذکر کی افضل ترین صورتیں ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ صَلَّى الْغَدَاةَ فِي جَمَاعَةٍ ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللَّهَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهُ كَأَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَامَّةٌ تَامَّةٌ تَامَّةٌ»¹

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی اور پھر اسی جگہ بیٹھ کر اللہ کا ذکر کیا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا اور پھر دو رکعتیں نماز ادا کی تو اس کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حج اور عمرے کا مکمل ثواب۔ اور یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ادا فرمائی۔“

ہر سال بے شمار لوگ لاکھوں روپے لگا کر حج اور عمرہ پر جاتے ہیں لیکن ان میں سے کس کا حج اور عمرہ قبول ہوتا ہے؟ تو یہ کسی کے علم میں نہیں ہے۔ اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ ایک ایسے حج اور عمرے کی بشارت دے رہے ہیں کہ جو اللہ کے ہاں قبول ہو چکا ہے لہذا ہمیں کبھی کبھار یہ عمل ضرور کر لینا چاہیے۔

ذکر کے ساتھ ایک اہم کام غور و فکر کا بھی ہے اور غور و فکر کی سب سے اعلیٰ صورت قرآن مجید کی آیات میں غور و فکر کرنا ہے اور خاص طور ان آیات میں غور و فکر کرنا جو کہ کائنات کے بارے میں ہیں کیونکہ یہی آیات ایمان اور خشیت میں اضافے کی بنیاد ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَخْبَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾

¹ سنن الترمذی، کتاب أُنْبَاءِ الشَّفَرِ، بَابُ ذِكْرِ مَا يُشَخَّصُ مِنَ الْجُلُوسِ فِي الْمَسْجِدِ بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ

حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، 727/1

[البقرة: 164]

”آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے لگاتار ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے بخیر ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق پھیلاتا ہے، اور ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، عقل والوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔“

سورۃ الانعام کی آیت نمبر 95 میں ارشاد ہے کہ اللہ عزوجل زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کو نکالتے ہیں۔ اس کی مثالوں میں گٹھلی سے آدم کا درخت اور آم کے درخت سے گٹھلی، بیج سے پودا اور پودے سے بیج، انڈے سے مرغی اور مرغی سے انڈا وغیرہ ہیں۔ ہم روزانہ مرغی کا انڈا کھاتے ہیں اور ہمارے مشاہدے میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ اس انڈے کو پکانے کے لیے جب توڑا جاتا ہے تو اس میں ایک زردی اور ایک سفیدی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن مرغی کا یہی انڈا اگر آپ مرغی کے نیچے اکیس دنوں کے لیے رکھ دیں تو اس میں سے چوزہ برآمد ہو جاتا ہے کہ جس کے ہاتھ پاؤں بھی ہیں، ناک کان آنکھیں بھی، دل جگر آنتیں بھی ہیں اور سر پیٹ ٹانگیں بھی۔ اس کا رنگ ضروری نہیں کہ سفید اور پیلا ہی ہو جیسا کہ انڈے کا ہوتا ہے بلکہ وہ کالے سیاہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے اور بالکل سفید بھی۔ غور و فکر کی بات یہ ہے کہ وہ کون ہے کہ جس نے اکیس دنوں میں اس انڈے سے کہ جسے ہمیں بڑے اطمینان سے کھا جاتے ہیں، ایک مکمل جان کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ذکر کے ساتھ فکر کی اصلاح نفس میں کیا اہمیت اور کردار ہے، اسے ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب کے ایک واقعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

”مجھے بچپن سے جانور پالنے کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ طوطے ہوں یا مختلف النسل

پرنڈے، خرگوش ہوں یا تیتڑ بیڑ، مرغیاں ہوں یا بلیاں، سب میرے پاس موجود رہے ہیں۔ میں انہیں بہت ہی پیار سے پالا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں ہمارے گھر ایک خاتون گھر کی صفائی کے لئے آیا کرتی تھیں، وہ مجھ پر خوب شفقت کرتی تھیں، مجھے بھی وہ ہمیشہ ماسی نہیں بلکہ ماں۔ سی لگتی تھیں۔ ایک بار مجھے کہنے لگیں کہ اب جب میں اپنے گاؤں جاؤں گی تو تمہارے لئے ایک اعلیٰ نسل کی مرغی لاؤں گی۔ میں سن کر خوش ہو جانا، پھر ایک دن واقعی وہ میرے لئے ایک عالی نسل کی نہایت صحتمند سی مرغی لے آئیں۔ یہ مرغی روزانڈے دیتی جنہیں میں روز آلیٹ کی صورت ہڑپ کر جاتا۔ پھر ان کے کہنے پر ہی میں نے انڈے کھانے کی بجائے جمع کرنا شروع کر دیے۔ کچھ عرصہ میں یہ مرغی کڑک ہو گئی اور بتایا گیا کہ اب ہم اس کے نیچے انڈے رکھ سکتے ہیں، جنہیں سینک کر چوزے پیدا ہوں گے۔ میرے لئے یہ تصور نہایت حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ انڈے رکھے گئے اور مرغی کو بڑے شاہانہ انداز سے ایک خوبصورت سی جگہ الاٹ کر دی گئی۔ میں روز سارا وقت اسی جگہ منڈلاتا رہتا۔ پورے وقت یہ مرغی میری منظور نظر بنی رہی اور بالآخر وہ دن آ گیا جب ان انڈوں سے چوزے نکلنے لگے۔ میں خوشی کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے سامنے بیٹھا مشاہدہ کر رہا تھا، جب ایک ایک کر کے انڈوں نے اندر سے چٹخنا شروع کیا۔ پھر یکے بعد دیگرے ان انڈوں سے ننھے منے چوزے برآمد ہوئے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ یہ چوزے انڈوں سے نکلنے ہی دوڑ کر اپنی ماں کی آغوش میں پناہ لیتے جاتے۔ میرے لئے یہ امر سمجھ سے بالاتر تھا کہ کیسے ان چوزوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی ماں سامنے ہے؟ اور کس نے انہیں دوڑنا بھگانا سکھا دیا؟ اب سوچتا ہوں کہ شعوری عمر میں یہ شاید میری زندگی کا پہلا براہ راست تجربہ تھا جس سے میرے دل میں اللہ کی عظمت کا احساس ابھرا تھا۔ ذرا سوچے کہ گائے چارہ کھاتی ہے ہر، اس سے اسکا خون بنتا ہے سرخ، پھر وہ گوبر کرتی ہے پیلا... وہ چارہ میرے کسی کام کا نہیں، وہ خون میرے لیے شریعت میں حرام

اور وہ گو براپنے اصل میں میرے لئے نجس!... یہ میرا پروردگار ہے جس نے اس حرام اور نجس کے بچے سے میرے لئے دودھ کی صاف اور پاک فیکٹری لگا رکھی ہے۔ ذرا سوچو! مچھلی کے بچے کو تیرنا کس نے سکھا دیا؟ سانپ کا سنپولیا ریٹگنا کیسے سیکھ گیا؟ ایک مرغی کا چوزہ انڈے کے خول میں دوڑنا بھانگنا کیسے جان گیا؟ ایک حقیر پانی کے قطرے سے جیتا جاگتا باشعور انسان کیسے اٹھ کھڑا ہوا؟ ایک ماں کے سینے میں بچے کے پیدا ہوتے ہی دودھ کیسے اتر آیا؟ آپ شیر کو گھاس دیں، وہ کبھی نہیں کھائے گا۔ آپ بکری کو گوشت پیش کریں، وہ صاف منہ پھیر لے گی کہ میرا پرہیز ہے۔ شیر کو گوشت دیں وہ کھائے گا، بکری کو گھاس دیجیے وہ کھائے گی؟ انہیں یہ سمجھ کون سمجھا گیا؟ اس کائنات کا ذرہ ذرہ زبان حال سے گواہی دے رہا ہے کہ کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے... وہی خدا ہے۔“¹

غفلت کا گناہ

گناہ عبادت کی لذت کے ساتھ سینے کے نور کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ عبادت اگر کسی درجہ میں احسان کو پہنچتی ہو تو انسان کے سینے میں ایک روشنی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ روشنی دیاسرائی کے ٹمٹماتے شعلے سے شروع ہوتی ہے اور معلوم نہیں کہاں تک جاتی ہے۔ اس نور کا ذکر اللہ عزوجل نے سورۃ النور میں کیا ہے:

﴿اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [النور: 35]

”اللہ زمین اور آسمان کا نور ہے۔ [بندہ مومن کے دل میں] اللہ کے نور کی مثال ایک طاقت کی مانند ہے کہ جس میں ایک چراغ پڑا ہو۔ اور وہ چراغ، کہ جسے

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

زیتون کے اس بابرکت درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرعی ہو نہ
غربی، ایک قندیل میں ہے۔ اور وہ قندیل گویا کہ ایک چمکتا ہوا تارا ہے۔ اور
چراغ کا تیل [اس قدر صاف شفاف ہے] کہ بغیر آگ کے مس کیے بھڑکنے
کے لیے تیار ہے۔ یہ نور پر نور ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس نور کی طرف جس کی
چاہتا ہے، رہنمائی کرتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت مبارکہ میں بیان شدہ نور کی مثال کو
بندہ مومن کے سینے کا نور قرار دیا ہے۔¹ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت
مبارکہ میں طاقے سے مراد مومن کا سینہ ہے اور چراغ سے مراد قرآن مجید اور ایمان
ہے۔ اور قندیل سے مراد انسان کا دل ہے۔² یعنی بندہ مومن کے دل میں قرآن مجید اور
ایمان کا نور ہے کہ جس نے اس کے سینے کو انتہائی روشن کر دیا ہے۔ اس نور کی مجسم
صورت کا مشاہدہ ہمیں قیامت والے دن ہوگا جیسا کہ سورۃ التحریم میں ہے:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ
يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاعْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾
[التحریم: 8]

”جس دن آپ دیکھیں گے مومن مردوں اور عورتوں کو کہ ان کا نور ان کی
دائیں جانب اور ان کے آگے آگے دوڑتا ہوگا۔ اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے: اے
ہمارے پروردگار! ہمارے نور کو ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہماری مغفرت
فرما۔ یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

اس آیت مبارکہ کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ قیامت والے دن انسان کے
سامنے اس کے قلب کا نور ہوگا جو اس کے ایمان کے برابر ہوگا جبکہ دائیں طرف اس کے
نیک اعمال کا نور ہوگا کیونکہ عموماً نیک اعمال کا سبب انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے۔
قرآن مجید اور ایمان کے اس نور کے سینے میں موجود ہونے کا احساس دنیا میں ہی

¹ الطبري، محمد بن جرير بن يزيد، جامع البيان في تأويل القرآن، مؤسسة الرسالة، 2000 م، 179/19

² ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، مختصر - الصواعق المرسلة على الجهمية والمعلظة، دار

الحديث، القاهرة، مصر، ص 427

بندہ مومن کو ہو جاتا ہے۔ جس نے اس نور کو اپنے سینے میں محسوس نہیں کیا، اس نے ایمان کی مٹھاس نہیں چکھی۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنے استاذ اور شیخ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إِنَّ فِي الدُّنْيَا جَنَّةً مَنْ لَمْ يَدْخُلْهَا لَمْ يَدْخُلْ جَنَّةَ الْآخِرَةِ.¹
 ”اس دنیا میں بھی ایک جنت ہے۔ جو دنیا کی اس جنت میں داخل نہ ہو سکا وہ آخرت کی جنت میں بھی داخل نہ ہوگا۔“

اس بارے شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا ایک اور قول بھی معروف ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد امام ابن قیم رحمہ اللہ سے قلعہ میں قید کر دیے جانے پر کہا تھا:

مَا يَصْنَعُ أَعْدَائِي بِي؟ أَنَا جَنَّتِي وَبُسْتَانِي فِي صَدْرِي، أَيْنَ رُحْتُ فَهِيَ مَعِيَ لَا تَفَارِقُنِي، أَنَا حَبْسِي خُلُوءٌ، وَقَتْلِي شَهَادَةٌ، وَإِخْرَاجِي مِنْ بَلَدِي سِيَّاحَةٌ.²

”میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ میری جنت تو میرے سینے میں ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں، یہ میرے ساتھ ہے۔ یہ مجھے قید کر دیں تو یہ قید میرے لیے خلوت کی نعمت ہے۔ اگر مجھے قتل کر دیں تو یہ قتل میرے لیے شہادت کی نعمت ہے۔ اور اگر ملک بدر کر دیں تو یہ ملک بدری میرے لیے سیاحت کی نعمت ہے۔“

یہ کلمات وہی شخص کہہ سکتا ہے کہ جو ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہنا سیکھ چکا ہو۔ اور وہ گناہ جو سینے سے نور ایمان کو ختم کر دیتا ہے، غفلت کا گناہ ہے یعنی اللہ کی یاد سے غفلت۔ غفلت ہی وہ پہلا گناہ ہے جو دیگر گناہوں کے لیے پہلی سیڑھی بنتا ہے۔ اور غفلت سے بچنے کا بہترین ذریعہ اللہ کی یاد ہے۔ جن مومن بندوں کے سینے میں موجود ایمان کے نور کی مثال اوپر بیان ہوئی، انہی کے بارے اگلی آیات میں ارشاد ہے:

﴿رَجَالٌ لَا تُلْهِيمُهُمْ تِجَارَةً وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ﴾ [النور: 37]

¹ ابن القيم الجوزية، الوابل الصيب ورافع الكلم الطيب، دار عالم الفوائد، مكة المكرمة، ص 109

² أيضاً

”یہ ایسے لوگ ہیں کہ کسی قسم کی تجارت یا خرید و فروخت انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی اور نہ ہی نماز قائم کرنے اور نہ ہی زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل کر سکتی ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے ہمیں کاروبار دنیا سے منع نہیں فرمایا کیونکہ ترک دنیا تو رہبانیت ہے اور اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن خالق نے ہم سے یہ ضرور مطالبہ کیا ہے کہ بازار اور آفس، سفر اور حضر، اٹھتے اور بیٹھتے، کھڑے اور چلتے پھرتے میں بھی مجھے ویسے ہی یاد رکھو جیسے مسجد میں رکوع اور سجدے کی حالت میں یاد رکھنا چاہیے۔ ایمان کا نور اس مومن کے سینے میں روشن ہوتا ہے جسے اللہ عز و جل بھولتے نہ ہوں اور ہر حال میں یاد رہتے ہوں۔ اور اللہ کو یاد رکھنے کا بہترین ذریعہ زبان پر مسنون کلمات ذکر کے جاری ہونے کی عادت ڈالنا ہے۔

تہجد اور تزکیہ

اصلاح نفس کے نبی منہج میں تہجد کی اہمیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ معاصر صوفیا اور سلاسل کے ہاں تہجد کے وقت بیداری کا اہتمام تو کیا جاتا ہے لیکن اس وقت میں ذکر و تلاوت قرآن اور مراقبہ کو نماز پر ترجیح دی جاتی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے کتاب و سنت میں یہ بات صراحت سے موجود ہے کہ تہجد کے اوقات میں ان کا شغل نماز میں طویل قیام کے ساتھ لمبی تلاوت کرنا اور رکوع و سجدہ میں کثرت سے دعائیں مانگنا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ﴾ [المزمل: 20]

”یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ ایک تہائی رات یا نصف رات یا دو تہائی رات تہجد کے لیے کھڑے رہتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی ایسا ہی کرتی ہے۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے فرض نماز کے بعد افضل نماز تہجد کو قرار دیا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَفْضَلُ الصَّلَاةِ، بَعْدَ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ، الصَّلَاةُ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ، وَأَفْضَلُ الصَّيَامِ بَعْدَ شَهْرِ رَمَضَانَ، صِيَامُ شَهْرِ اللَّهِ الْمُحَرَّمِ»¹
 ”فرض نماز کے بعد افضل ترین نمازرات کے درمیانی حصے میں نماز ادا کرنا ہے اور رمضان کے روزوں کے بعد افضل ترین روزے محرم کے مہینے کے ہیں۔“
 اللہ کے رسول ﷺ نے میاں بیوی میں سے ہر ایک کو ترغیب دلائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نماز تہجد کی ادائیگی کے لیے آمادہ کرے اور اس بارے میں تعاون کریں۔
 ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّى، ثُمَّ أَقْبَضَ امْرَأَتَهُ فَصَلَّتْ، فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَ فِي وَجْهِهَا الْمَاءَ، وَرَحِمَ اللَّهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ، ثُمَّ أَقْبَضَتْ زَوْجَهَا فَصَلَّى، فَإِنْ أَبَى نَضَحَتْ فِي وَجْهِهِ الْمَاءَ»²
 ”اللہ عزوجل اس شخص پر رحم کرے کہ جو رات کی نماز کے لیے کھڑا ہوا اور نماز پڑھی۔ اور اس نے اپنی بیوی کو بھی جگایا اور اس نے بھی نماز پڑھی۔ اور اگر اس نے جاگنے میں سستی کی تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اور اللہ عزوجل اس عورت پر بھی رحم کرے کہ جس نے رات میں قیام کیا۔ اور اس نے اپنے شوہر کو بھی جگایا اور اس نے بھی نماز پڑھی۔ اور اگر اس نے جاگنے میں سستی کی تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔“

آپ ﷺ نے تہجد شروع کرنے کے بعد اس کے ترک کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔
 ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہا:
 «يَا عَبْدَ اللَّهِ، لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ كَانَ يَتَقَوَّمُ اللَّيْلَ، فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ»³
 ”اے عبداللہ! اس شخص کی مانند نہ ہو جانا جو تہجد کی نماز پڑھا کرتا تھا اور پھر اس نے تہجد پڑھنا چھوڑ دیا۔“

¹ صحیح مسلم، کتاب الصَّیَامِ، بَابُ فَضْلِ صَوْمِ الْمُحَرَّمِ، 821/2

² سنن النسائي، کتاب قِيَامِ اللَّيْلِ وَتَطَوُّعِ النَّهَارِ، بَابُ الرَّغِيبِ فِي قِيَامِ اللَّيْلِ، 205/3

³ صحیح بخاری، کتاب التَّهَجُّدِ، بَابُ مَا يَكْرَهُ مِنْ تَرْكِ قِيَامِ اللَّيْلِ لِمَنْ كَانَ يَتَقَوَّمُ، 54/2

دعا اور تزکیہ

ایک دفعہ راقم نے اس سوچ سے اکابر اہل علم کی سوانح (biographies) کا مطالعہ شروع کیا کہ معلوم ہو کہ ان کو بڑا بنانے میں کس چیز کا اہم کردار تھا؟ یا وہ کون سا ایسا عمل کرتے تھے جس نے انہیں علم و فضل میں ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ بعد میں آنے والے لوگ ان پر رشک کرنے لگے۔ میں نے جو چیز ان کی حیات زندگی سے اخذ کی، وہ ان کا لمبی لمبی دعاؤں کو اپنا معمول بنانا تھا۔ معلوم نہیں میں نے جو چیز اخذ کی، اس کا ان کے بڑا بننے میں کیا کردار تھا لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ شے ان سب کی زندگیوں میں مشترک طور نظر آئی۔

اکثر اکابر علمائین اوقات میں دعا کا اہتمام کرتے تھے۔ بعض اہل علم تہجد کے وقت بیدار ہو کر لمبی چوڑی دعا فرماتے جبکہ بعض کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں ہی بیٹھے رہتے اور اشراق تک دعا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح عصر کی نماز کے بعد مغرب تک مسجد میں بیٹھ کر دعا کا اہتمام کرنا بھی بعض کے معمولات میں شامل تھا۔ ماضی میں راقم کو تقریباً ایک سال تک فجر سے اشراق اور عصر سے مغرب کے دوران لمبی دعا کرنے کی توفیق ملی تو اس سے بہت سی ایسی کیفیات میسر ہوئیں کہ جن کی یادیں آج بھی دل و دماغ میں تازہ ہیں۔

دعا میں زیادہ تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ دعا مسنون اور لمبی ہو۔ دعا کی تاثیر دو قسم کی ہے: ایک دنیوی اور دوسری دینی۔ دنیوی تاثیر سے مراد اس کا قبول ہونا ہے اور دینی تاثیر سے مراد اس کا تقرب الی اللہ اور سلوک کی منازل طے کرنے کا ذریعہ بن جانا ہے۔ اور لمبی دعا کرنا اور کثرت سے دعا کرنا ایک ایسا عمل ہے جو اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دینی تاثیر سے مراد یہ ہے کہ دعا اگر قبول نہ بھی ہو تو کم از کم ایک یقینی فائدہ تو ضرور ہے کہ دعا کرنے والے نے جس دنیاوی مسئلے میں دعا کی، اللہ عز و جل دعا کرنے کے بعد نہ صرف اس بارے فوری دلی سکون عطا فرماتے ہیں بلکہ اس کی یہ دعا قرب الہی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ اور دعا کرنے والے کا اللہ کی ذات پر ایمان اور توکل

بڑھ جاتا ہے۔

طواف وسعی کے دوران یا تہجد کے اوقات میں گھنٹوں دعا کرنا، ہمارے مدرسہ کے بعض اساتذہ کے عام معمولات میں رہا ہے۔ وہ خود اپنے جملہ دینی کام کو اپنی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لمبی دعا سے ہماری مراد کم از کم آدھ پون گھنٹے کی دعا ہے۔

اور دعا صرف اس لیے نہیں ہے کہ ہمیں کوئی آزمائش پیش آئے یا کوئی نعمت چاہیے تو اللہ سے دعا کریں۔ عموماً ہمارے ہاں دعا انہی دو مقاصد میں سے کسی ایک مقصد کے لیے کی جاتی ہے۔ اور اگر ان دو میں سے کوئی مقصد پیش نظر نہ ہو تو انسان دعا کو ایک اضافی کام سمجھتا ہے۔ دعا دراصل ایک ایسی مستقل عبادت ہے جو اللہ کو راضی کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا اسی طرح کا ذریعہ ہے جیسا کہ نماز، صدقہ اور دیگر عبادات ذریعہ ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دعا کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک دعائے مسئلہ اور دوسری دعائے عبادت۔ دعائے مسئلہ وہ ہے جو کسی مشکل یا مصیبت میں کی جائے اور دعائے عبادت وہ دعا ہے جو عبادت سمجھ کر کی جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ: وَقَالَ رَبُّكُمْ اذْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ»¹

”حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعا ہی عبادت ہے اور آپ نے اس کے بعد قرآن مجید کی اس آیت کی تلاوت کی: اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو کہ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں تو وہ جہنم میں ذلیل و خوار ہوتے ہوئے داخل ہوں گے۔“

اس آیت مبارکہ میں دعا کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور جو لوگ دعا نہیں کرتے انہیں متکبر کہا گیا ہے۔ دعا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ انسان میں عاجزی کی کیفیات پیدا کرتی ہے۔ جس قدر انسان کی زندگی میں دعا کی عبادت ہوگی، اسی قدر اسے عاجزی کے احوال

¹ سنن الترمذی، أبواب الدعوات، باب ما جاء في فضل الدعاء، 313/5

میسر ہوں گے۔ بعض مذہبی حلقوں میں نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کے انکار یا اسے بدعت قرار دینے کے عمل کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ لوگوں کی زندگی سے دوسرے ہی سے نکل گئی ہے۔

پس ایک طرف تو وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے دعا کو ایک رسم بنا دیا ہے جیسا کہ کسی کی فتیدگی پر تھوک کے حساب سے رسماً دعائیں کی جاتی ہیں اور لوگ گھنٹوں غفلت، لاپرواہی اور بے دلی سے ہاتھ اٹھانے اور ہاتھ گرانے کی مشق میں لگے رہتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءَ مَنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لِاهٍ»¹
 ”جان لو! اللہ عزوجل اس دل کی دعا قبول نہیں فرماتے کہ جو غفلت اور کھیل میں دعا کرے۔“

دوسری طرف وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ان رسموں کا انکار کرتے کرتے دعائی کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ تو دعا تزکیہ نفس کے عمل میں اور سالک کے راہ سلوک میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس کا التزام بہت ضروری ہے۔

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں لیکن قبول نہیں ہوتی۔ تو اس بارے ہم ایک بات تو یہ کر چکے ہیں کہ ایک دعائے مسئلہ ہے جو کسی مشکل میں کی جائے اور ایک دعائے عبادت ہے جو اللہ کا تقرب اور رضامندی حاصل کرنے کے لیے عبادت سمجھ کر کی جائے۔ یہ سوال پہلی قسم کی دعا کے بارے پیدا ہو سکتا ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کا وہ مفہوم ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے جو اللہ کے ﷻ نے واضح کیا ہے۔ اس سے ان شاء اللہ، دعا کرنے کے بعد کبھی مایوسی نہ ہوگی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ رَبَّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالَى حَيٌّ كَرِيمٌ، يَسْتَجِيبُ مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ، أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا»²

¹ سنن الترمذی، أبواب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، 517/5

² سنن أبي داود، باب ترفع أبواب الوتر، باب الدعاء، 78/2

”بے شک تمہارا رب بہت ہی کریم اور حیاء والا ہے۔ وہ اپنے بندے سے اس بارے حیا محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔“

اللہ عز و جل کسی بندے کے ہاتھوں کو خالی نہیں لوٹاتے تو اس سے کیا مراد ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا عَلَى الْمُسْلِمِ يَدْعُو اللَّهَ بِدَعْوَةٍ إِلَّا آتَاهُ اللَّهُ إِيَّاهَا أَوْ صَرَفَ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهَا مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةٍ رَحِمَ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ: إِذَا نَكُنْتُ، قَالَ: اللَّهُ أَكْثَرُ»¹

”جب بھی کوئی مسلمان اللہ سے دعا کرتا ہے بشرطیکہ اس کی دعا گناہ یا قطع رحمی کے بارے نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس دعا کے بدلے میں اسے تین میں سے ایک انعام ضرور دیتے ہیں: یا تو اس کی دعا فوراً قبول کر لیتے ہیں یا پھر اس کو آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیتے ہیں یا اس دعا کے بدلے میں اپنے بندے سے کوئی دوسری آزمائش ٹال دیتے ہیں۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اے نبی ﷺ! پھر تو ہم کثرت سے دعا کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے کہا: اللہ بھی کثرت سے ان تین میں سے کوئی ایک انعام دے گا۔“

پس انسان کی دعا کسی صورت رائیگاں نہیں جاتی اور اگر دنیا میں قبول نہ بھی ہو تو آخرت میں اس سے بہتر چیز اسے ملے گی کہ جس کے لیے اس نے دنیا میں دعا کی تھی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ انسان سے اس دعا کے بدلے کوئی آزمائش اور مصیبت ٹال دیتے ہیں کہ جو اسے لاحق ہوتی ہے یا مستقبل میں لاحق ہونے والی ہے۔ اور بعض اوقات تو اسے علم بھی نہیں ہوتا کہ یہ آزمائش فلاں دعا کے بدلے ٹل گئی ہے۔ باقی اللہ عز و جل دعا کو ضرور قبول فرماتے ہیں جبکہ بندے میں طلب، لگن اور تڑپ سچی ہو۔ ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

”شادی کے بعد کے ابتدائی سالوں میں میرے مالی حالات مستحکم نہیں تھے،

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ فِي انْخِطَارِ الْفَرَجِ وَغَيْرِ ذَلِكَ، 458/5

جنتا کھاتا تھا، اس سے الحمد للہ! بس ضروریات زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ میں، میری بیوی اور میری بیٹی ایک چھوٹے سے نہایت خستہ حال فلیٹ میں مقیم تھے یہ فلیٹ سستا ضرور تھا مگر اس کی حالت یہ تھی کہ ایک بوسیدہ قبرستان سے ملا ہوا اور بے ہنگم درخت سے گھرا ہوا تھا۔ دیواروں میں پانی سے سیلن اتر آئی تھی اور گھر میں ہیٹنگ یعنی گھر گرم کرنے کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ رات کے دوران جب سردی بڑھ جاتی تو اکثر میری بیٹی روتے ہوئے اٹھ کر شکایت کرتی کہ اس کے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ میں اور میری بیوی اٹھ کر اسے ایک اور کمرے میں لے جاتے اور اس کے پیروں پر دبا دیتے، یہاں تک کہ وہ دوبارہ سو جائے۔ اس تنگی کے باوجود ہمیں سکون اور خوشی کی دولت ایسے ہی میسر تھی جیسے الحمد للہ! آج میسر ہے۔ لیکن ایک بہتر گھر میں رہنے کی خواہش میرے دل میں ضرور دفن تھی۔ ان ہی دنوں علاقے میں فلیٹس کی ایک زبردست اسکیم کا اعلان کیا گیا۔ یہ فلیٹس قیمت میں دوسرے گھروں سے بہت زیادہ مہنگے مگر سہولیات سے مزین تھے۔ میرے دل میں کسی نذیرے بچے کی طرح یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کبھی میں بھی ان فلیٹس میں رہ سکوں۔ تعمیر کی ابتدا میں وہاں تین جگہ کی کمریں لگائی گئیں۔ میں جب اپنی فیملی کے ساتھ ان کے پاس سے گزرتا تو اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہتا کہ یہ سب سے بڑی والی کمر میں ہوں، یہ درمیانی والی کمر میں تمہاری ماما ہیں اور یہ چھوٹی والی کمر میں تم ہو۔ میرے اس بار بار کیے جانے والے مذاق سے چڑ کر میری بیٹی جواب دیتی کہ او گاڈ! آپ کو تو ہمیشہ ایک ہی جوک کرنا ہوتا ہے۔ میں مسکرا دیتا مگر اگلی بار پھر بے ساختہ یہی جملہ اسے کہتا۔ تعمیر کا کام آگے بڑھا تو دل سے مجبور ہو کر ایک روز میں قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فلیٹس میں چھپ کر داخل ہو گیا تاکہ انہیں اندر سے دیکھ سکوں۔ یہاں فلیٹوں کے چھ بڑے بڑے بلاکس تھے اور ان میں سینکڑوں کی تعداد میں فلیٹس تھے۔ ان بلاکس میں جو بلاک مجھے سب سے دلنشین لگا، میں اس میں کود گیا اور پھر اپنے پسندیدہ

پہلے فلور پر پہنچا۔ اس فلور پر آٹھ فلیٹس موجود تھے۔ ان میں سے جو فلیٹ مجھے سب سے بہتر جگہ پر لگا، میں اس میں چھپ کر اندر چلا گیا۔ دو کمروں کا یہ فلیٹ مجھے اپنے دل سے بہت قریب محسوس ہوا۔ کافی دیر گزارنے کے بعد اپنا دل تھامے واپس آگیا اور اپنی بیگم کو روئیداد سنائی۔ اسے بھی شوق ہوا تو میری حماقت کی حد دیکھیے کہ مزدوروں اور سیکورٹی سے چھپ کر اسے بھی وہاں لے گیا۔ اپنا دیکھا ہوا فلیٹ اسے دکھایا اور دونوں ایک دوسرے سے تعریفیں کرتے یہ کہتے واپس آگئے کہ کتنا اچھا ہوتا اگر ہم یہاں رہ پاتے؟ اسی طرح کچھ اور دن گزرے اور فلیٹس کی تعمیر اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ ایک روز بہت صبح مجھے فون آیا۔ دوسری طرف گورنمنٹ کونسل کی کوئی خاتون مخاطب تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ گورنمنٹ نے ایک اسکیم کے تحت ان سینکڑوں نئے فلیٹس میں سے چند گنتی کے فلیٹس خرید لئے ہیں جو وہ ان لوگوں کو کرائے پر دے رہی ہے جنہوں نے گورنمنٹ گھروں کے لئے درخواست دے رکھی تھی۔ آپ کی درخواست ہمارے پاس موجود ہے تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم وہاں موجود ایک فلیٹ آپ کو دے دیں اور آپ موجودہ کرائے سے کافی کم کرائے پر وہاں شفٹ ہو جائیں؟ میں نے بوکھلاتے ہوئے خوشی سے نہال ہو کر لڑکھڑاتی آواز میں جواب دیا کہ ضرور۔ اسی روز ہمیں دعوت دی گئی کہ ہم جا کر اپنا فلیٹ دیکھ لیں۔ وہاں بھاگ بھاگ پہنچے تو چھ بلاکس میں سے اسی بلاک میں، سات فلوروں میں سے اسی فلور پر اور سینکڑوں فلیٹوں میں سے وہی فلیٹ ہمارے نام نکلا تھا۔ آج الحمد للہ تم الحمد للہ میں کوئی سات آٹھ برس سے اسی فلیٹ میں بخوشی مقیم ہوں اور اپنے رب کی عطا کو سوچ کر شکر گزار ہوں۔ میں حیران ہوتا ہوں جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ دعا کی کوئی حقیقت نہیں۔ میں مسکرا دیتا ہوں جب لوگ مصر ہوتے ہیں کہ اب معجزات نہیں ہوتے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، اللہ اکبر، واللہ الحمد۔¹

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

عموماً مشاہدے میں آیا ہے کہ اللہ عزوجل ان بندوں کی دعائیں دنیا میں زیادہ قبول کرتے ہیں کہ جو دعوت اور تبلیغ کا کام زیادہ کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا سوال ہوتا ہے کہ آدھا پون گھنٹہ دعائیں مانگیں کیا؟ ہمیں اتنی دعائیں نہیں آتی۔ آسان حل تو یہ ہے کہ جو خیر اور بھلائی ذہن میں آئے، وہ اپنی زبان میں پروردگار سے مانگتے جائیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر سعید بن علی القحطانی کا ایک کتابچہ ”الدعاء من الكتاب والسنة“ اگر پاکٹ سائز میں مل جائے تو اسے سامنے رکھ کر صبح و شام لمبی دعائیں مانگی جاسکتی ہیں۔ اس کتابچے میں قرآن مجید سے تمام انبیاء اور احادیث سے اللہ کے رسول ﷺ کی تمام دعاؤں کو جمع کیا گیا ہے۔

اسمائے حسنی کی برکت

اسمائے حسنی کو یاد کرنا اور ان کے ذریعے دعا کرنا ایک ایسی سنت ہے کہ جسے تقریباً بھلایا جا چکا ہے۔ اور یہ ایسے بابرکت نام ہیں کہ ان کی برکت سے انسان بابرکت بن جائے۔ احادیث میں اسمائے حسنی کو یاد کرنے کی بھی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لِلَّهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ اسْمًا، مِائَةٌ إِلَّا وَاحِدًا، لَا يَحْفَظُهَا أَحَدٌ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ وَثَرٌ يُحِبُّ الْوَثَرَ»¹

”اللہ عزوجل کے ننانوے نام ہیں۔ جو بھی انہیں یاد کرے گا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔“

یہ واضح رہے کہ اللہ کے نام ننانوے کے علاوہ بھی ہیں جیسا کہ دوسری روایات میں موجود ہیں لیکن کم از کم ننانوے کو یاد کرنے کی فضیلت یہ بیان ہوئی ہے کہ ایسا کرنے والا جنت میں داخل ہوگا۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ جو شخص کسی غم یا آزمائش میں مبتلا ہو تو اللہ تعالیٰ اسمائے حسنی کے وسیلے سے دعا کرنے سے اس کا غم یا آزمائش دور کر دیتے ہیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا قَالَ عَبْدٌ قَطُّ إِذَا أَصَابَهُ هَمٌّ وَحَزَنٌ: اللَّهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ، وَابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ أَمَتِكَ، نَاصِيَتِي بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ

¹ صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب: لِلَّهِ مِائَةٌ اسْمٌ غَيْرُ وَاحِدٍ، 87/8

قَضَاؤُكَ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْ أُنْزِلَتْ فِي كِتَابِكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ، أَوْ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ، أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قَلْبِي، وَتُورَ صَدْرِي، وَجَلَاءَ حُزْنِي، وَذَهَابَ هَمِّي، إِلَّا أَذْهَبَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ هَمَّهُ، وَأَبْدَلَهُ مَكَانَ حُزْنِهِ فَرَحًا، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَعَلَّمَ هَؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ؟ قَالَ: أَجَلٌ، يَنْبَغِي لِمَنْ سَمِعَهُنَّ أَنْ يَتَعَلَّمَهُنَّ»¹

”جب کسی شخص کو کوئی غم یا آزمائش پہنچے اور وہ یہ دعا کرے: اے اللہ! میں، آپ کا غلام، آپ کے غلام کا بیٹا، آپ کی بندی کا بیٹا۔ میری پیشانی آپ کے ہاتھ میں ہے، میرے بارے آپ کا حکم جاری ہو کر رہنے والا اور میرے بارے آپ کا فیصلہ عدل پر مبنی ہے۔ میں آپ سے ہر اس نام کے ذریعے سوال کرتا ہوں جو آپ نے اپنے لیے رکھا ہو، یا وہ آپ ہی کا نام ہو، یا آپ نے وہ نام اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہو، یا آپ نے وہ نام اپنی کسی کتاب میں نازل کیا ہو، یا آپ نے وہ نام اپنے پاس علم غیب میں محفوظ کیا ہو۔ پروردگار! آپ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا، میری پریشانی کا علاج بنادیں۔ آپ نے فرمایا: اگر کوئی شخص اس طرح دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے غم اور پریشانی کو خوشی میں بدل دیں گے۔ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم یہ نام سیکھ نہ لیں۔ آپ نے فرمایا: بلکہ ہر اس شخص لیے کہ جس نے یہ بات سنی ہے، لازم ہے کہ وہ ان ناموں کو سیکھے۔“

قرآن مجید نے بھی ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اللہ عز و جل سے اس کے ناموں کے واسطے سے دعا کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا﴾ [الأعراف: 180]

”اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں۔ اللہ عز و جل سے ان ناموں کے ذریعے دعا کیا کرو۔“

بعض روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ایسا ہے جو

اسم اعظم ہے اور اگر اس نام سے اللہ سے دعا کی جائے تو اللہ عز و جل لازماً دعا قبول کرتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«عَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحَصِيبِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ أَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ، فَقَالَ: لَقَدْ سَأَلْتَ اللَّهَ بِالْإِسْمِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أُعْطِيَ وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ»¹

”حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا: اے اللہ! میں آپ سے اس بنیاد پر سوال کرتا ہوں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ہی اللہ عز و جل ہیں اور یہ کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ اکیلے اور بے نیاز ہیں۔ نہ کسی نے آپ کو جنم دیا اور نہ آپ نے کسی کو جنا اور آپ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: تو نے اللہ سے ایک ایسے نام کے ساتھ دعا کی ہے کہ جب بھی اللہ سے اس نام کے ساتھ سوال کیا جائے تو وہ پورا کیا جاتا ہے اور جب اس نام سے دعا کی جائے تو وہ قبول کی جاتی ہے۔“

اللہ کا اسم اعظم کیا ہے؟ اس بارے اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض نے تو اسے محض ایک کیفیت اور حال کہا ہے جیسا کہ جنید بغدادی رحمہ اللہ کا قول ہے جبکہ بعض نے اسے متعین نام قرار دیا ہے اور اس بارے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں 14 اقوال نقل کیے ہیں۔² درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسم اعظم سے مراد الفاظ اور کیفیات دونوں ہیں۔ پس اسم اعظم سے متعلق صحیح احادیث میں وارد الفاظ کو کسی خاص کیفیت اور حال میں ادا کرتے ہوئے اللہ سے دعا کی جائے تو وہ عالماً قبول ہوتی ہے۔

اللہ کے ناموں کا احصایا نہیں حفظ کرنے کے لیے بعض اہل علم نے انہیں نظم میں پرویا ہے جیسا کہ ”قصیدہ طوبی“ اس بارے بعض حلقوں میں کافی معروف ہے۔ اس

¹ سنن الترمذی، أبواب الدعوات، باب جامع الدعوات، 515/5

² ابن حجر، أحمد بن علي العسقلاني، فتح الباري شرح صحيح البخاري، دار المعرفة، بيروت، 1379،

قصیدے کا مقصد اچھا ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے ناموں کو نظم میں پرو دیا جائے تاکہ یاد کرنے اور رکھنے میں آسانی ہو اور دعا مانگنے میں بھی کام آئے لیکن اس قصیدے کے الفاظ زبان پر مشکل سے جاری ہوتے ہیں کہ ان میں غرابت اور ندرت ہے۔ اور اس قصیدے کے ایک شعر میں وحدت الوجود کے نظریے کو بھی شامل کیا گیا ہے جبکہ اللہ کی ذات کے بارے میں یہ عقیدہ نہ تو کتاب و سنت میں موجود ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام، تبع تابعین، ائمہ اربعہ، فقہاء، محدثین، متکلمین اور متقدمین صوفیاء رحمہم اللہ اس عقیدے کے قائل تھے۔

البتہ شیخ زید بن محمد المدخلی نے اسمائے حسنیٰ کو ایک نظم میں پرویا ہے کہ جس میں عبارت کی ایسی روانی و سلاست ملتی ہے کہ جو پڑھنے میں بھی بہت آسان ہے اور معنی میں بھی بہت جامع ہے۔ لہذا ہمیں ان کی نظم کے ذریعے اسمائے حسنیٰ کو یاد کرنا اور ان سے دعا کرنا زیادہ پسند ہے۔

دعا اور شکر

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی کسی دنیاوی آزمائش، مشکل یا غرض میں اللہ عزوجل سے دعا کرتے ہیں تو آزمائش ثلثی نہیں، مشکل حل نہیں ہوتی اور غرض پوری نہیں ہو پاتی جس سے رفتہ رفتہ دل میں ایک عجیب سی مایوسی کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس مایوسی کی پیدائش کا ایک سبب انسان کا ازلی دشمن شیطان بھی ہوتا ہے جو اسے اپنے مالک سے بدگمان کرنے کے لیے ہر وقت پھونکے مارتا رہتا ہے۔

اگر پروردگار کو اپنے بندے سے محبت ہو تو وہ اس کے ذہن میں کچھ ایسی باتیں ڈال دیتے ہیں کہ اس کی مایوسی کی کیفیت دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسان یوں سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے بغیر مانگے اتنی نعمتیں دی ہوئی ہیں۔ اگر ان میں سے فلاں فلاں نعمت نہ ہوتی تو وہ اس نعمت کے لیے کس قدر بے چین یا دعا گو ہوتا؟ پس اس طرح وہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ جو چیز اسے دعا کے نتیجے میں نہیں مل رہی، وہ بہت چھوٹی ہے جبکہ جو نعمتیں اسے دعا کیے بغیر ملی ہوئی ہیں، ان کا

کوئی شمار تظار نہیں ہے تو اس کی مایوسی کی کیفیت خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
اب وہ یہ سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ جو شے ہمارے پاس نہیں ہوتی ہے اسی کا تو ہم
روناروتے ہیں لیکن جو بیسیوں نعمتیں ہماری جیب میں ہوتی ہیں، ہم ان کا شکر ادا نہیں
کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف شکر ادا کرنا شروع کر دیں تو ہر وقت ذہن میں یہ تازہ رہے گا
کہ اللہ تعالیٰ مجھے بن مانگے بہت کچھ دے رہا ہے۔ اور اگر کبھی کوئی دعا قبول نہ بھی ہوگی تو
اس آزمائش سے مایوسی پیدا نہیں ہوگی۔

ہمارا حال کیا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کے پاس بیس ہزار کی ملازمت یا آمدن
ہوتی ہے لیکن وہ پچاس کی ملازمت یا آمدن کے لیے کوشش اور دعا کر رہا ہوتا ہے لیکن
اس کی کوشش یا دعا قبول نہیں ہو رہی ہوتی لہذا وہ مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ
اس دعا کے ساتھ ساتھ اس بیس ہزار کی ملازمت یا آمدن پر شکر کا حق ادا کر رہا ہوتا تو اسے
یہ سوچ کر مایوسی نہ ہوتی کہ میرے ارد گرد کتنے ایسے ہیں جو مجھ سے زیادہ باصلاحیت، ہنر
مند اور صالح ہیں لیکن ان کے پاس بیس ہزار کی ملازمت یا آمدن بھی نہیں جو کہ اللہ نے
مجھے یہ بن مانگے دی ہوئی ہے۔

اگر ستر ہویں گریڈ کا افسر اٹھارہویں گریڈ کے لیے اہل (qualify) نہ ہو سکے گا تو
مایوسی کا شکار ہو جائے گا لیکن وہ یہ بھی تو سوچے کہ اس کے پاس سترہویں گریڈ کی
ملازمت کی صورت میں ایک ایسی نعمت ہے جو لاکھوں کے پاس نہیں ہے۔ ایک دوست
نے بتلایا کہ وہ مسجد میں روزانہ ایک نوجوان کو لمبی لمبی دعائیں کرتے دیکھتے تھے اور انہیں
بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ اتنی لمبی دعا میں اپنے رب سے مانگتا کیا ہے۔ ایک دن انہوں نے
اس نوجوان سے اصرار کر کے پوچھ ہی لیا تو اس نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد بتلایا کہ وہ دعا
میں باری باری ان چیزوں کا نام لے کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ جو اس کے پاس موجود
ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «انْظُرُوا
إِلَى مَنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ

لَا تَزِدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ»¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو دیکھو جو تم سے نیچے ہے اور اس کی طرف مت دیکھو جو تم سے اوپر ہے۔ پس ایسا کرنے سے تم اللہ کی نعمتوں کی ناقدری نہیں کرو گے۔“

والدین کی دعا

دعا کی قبولیت کا ایک مجرب نسخہ یہ بھی ہے کہ اپنے والدین کی دعائیں حاصل کریں، خاص طور والدہ کی۔ والدہ جب بھی اپنی اولاد کے لیے اخلاص سے دعا کرتی ہیں تو ان کی دعا قبول ہوتی ہے۔ عظیم الرحمن عثمانی صاحب اپنی والدہ کی دعا کے بارے کہتے ہیں:

”میرا تعلق شہر کراچی کے ایک متوسط خاندان سے ہے۔ کچھ سال قبل جب میں تعلیم کے لئے لندن آیا تھا تو میرے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح اپنی ماسٹرز کی فیس جمع کرنی ہے اور ساتھ ہی ڈگری وقت پر مکمل کرنی ہے۔ آج کے حساب سے مجھے کم و بیش تیرہ لاکھ روپے درکار تھے۔ اس ہدف کا حصول قریب قریب ناممکن تھا۔ جن لوگوں کے ساتھ رہائش تھی، وہ سب مذاق اڑاتے اور کہتے کہ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ یہ ڈگری کرنے کا بھوت تمہارے سر پر کب تک رہتا ہے؟ وہ پورے خلوص سے مجھے مشورہ دیتے کہ اس ڈگری و گری میں کچھ نہیں رکھا، اصل کام تو پاؤنڈ چھاپنا یعنی کمانا ہے۔ خوش نصیبی سے آتے ہی ایک ریسٹورنٹ میں بیرے کی نوکری مل گئی۔ سارا دن اور دیر رات تک بیرا گیری کرتا، پلیٹیں دھوتا، فلور صاف کرتا، کیش کاؤنٹر سنبھالتا۔ یونیورسٹی کی کلاسز ہفتے میں تین روز ہوا کرتیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یونیورسٹی سے سیدھا کام پر آجاتا۔ کئی بار اڑتالیس گھنٹوں تک بغیر سوئے کلاسز لیں اور نوکری کی۔ ہوٹل کی اس نوکری کے علاوہ بھی الحمد للہ! طرح طرح کی مزدوریاں کیں۔ وقت گزرتا گیا اور میں نے ایک کے بعد ایک سیمسٹر نمایاں نمبروں سے پاس کر لئے مگر جب پروجیکٹ جمع کرانے کی صورت میں آخری مرحلہ آیا تو

¹ صحیح مسلم، کتاب الزہد والزانیق، 2275/4

اسے تیار کرنے کے لئے جولا زمی وقت و محنت درکار تھی وہ میں نہ نکال سکا۔ وجہ یہی تھی کہ فیس کی آخری قسط دینے کے لئے دہری نوکری کرنا پڑتی تھی اور اس کے بعد جسم و ذہن میں پروجیکٹ کے لئے قوت باقی نہ رہتی تھی۔ خیر بڑی مشکل سے ٹوٹا پھوٹا پروجیکٹ بنایا اور جمع کرا دیا۔ دل میں شدید خوف تھا کہ معلوم نہیں یہ پروجیکٹ پاس بھی کیا جائے گا یا نہیں؟ والدہ کا روز فون آتا جس میں وہ مجھ سے زلٹ کے بارے میں دریافت کرتیں۔ آخر ایک دن بذریعہ ڈاک مجھے اپنا رزلٹ گھر پر موصول ہوا۔ دھڑکتے دل سے جب لفافہ کھولا تو یہ دیکھ کر سانسیں ڈوبنے لگیں کہ میرے پروجیکٹ کو ریجیکٹ کر دیا گیا تھا، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مجھے چھ مہینے دوبارہ محنت کر کے نیا پروجیکٹ جمع کروانا ہو گا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جب پاکستان سے والدہ کا فون آیا، انہوں نے حسب معمول ریزلٹ کا دریافت کیا، مجھ میں سچ بولنے کی ہمت نہ تھی لہذا میں نے جھوٹ کہا کہ امی ابھی ریزلٹ آنے میں وقت ہے۔ جواب میں امی نے مجھے ڈھارس دیتے ہوئے کہا کہ عظیم بالکل فکر نہ کرنا، آج شب قدر ہے میں رات بھر تمہاری کامیابی مانگوں گی اور تم دیکھنا کہ تم کامیاب ہی رہو گے۔ میں نے دل میں سوچا، اب کون سی کامیابی؟ ریزلٹ تو میرے ہاتھ میں ہے جو مجھے ناکامی کی خبر سن رہا ہے۔ خیر وہ رات والدہ نے عبادت میں اور میں نے خاموش ماتم میں گزاری۔ صبح ہوئی تو یونیورسٹی سے فون آیا، میں نے گھبرا کر اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی کہ ہم بہت معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے آپ کو غلط ریزلٹ بھیج دیا ہے۔ اصل میں تو آپ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انگلینڈ جیسے نظم و ضبط والے ملک کی ایک نمایاں یونیورسٹی سے ریزلٹ بھیجنے میں ایسی زبردست چوک ہو جائے؟ مگر کہیں میرا دل یہ جانتا تھا کہ یہ معاملہ حسن اتفاق نہیں بلکہ عطائے الہی کا غماز ہے جو میری والدہ کی دعا کا نتیجہ ہے۔ ایسی کتنی ہی کرامات ہیں جو میری زندگی میں اپنے والدین کی دعاؤں سے برپا ہوئے ہیں۔

لوگ کسی بزرگ کی دعا کی لئے دن رات جتن کرتے ہیں مگر اکثر ویسی کوشش اپنے والدین کی دعا کے حصول کے لئے نہیں کرتے، حالانکہ یہ باپ کی دعا ہے جو رد نہیں ہوتی اور یہ ماں کی دعا ہے جو عرشِ ہلا دیتی ہے۔“¹

شام کے بچوں کے نام

وہ آنکھ مومن کی آنکھ نہیں ہو سکتی جو درندوں کے ہاتھوں خون میں لت پت معصوموں کی تصاویر دیکھ کر غم یا اشکبار نہ ہو۔ وہ دل مومن کا دل نہیں ہے جو ان مظلوموں کے لیے غمگیں اور بے چین نہ ہو۔ وہ زبان مومن کی زبان نہیں ہے جو ان پھولوں کے لیے ہمدردی کے دو کلمات نہ بول سکے۔

میرے بچو! میرے جگر کے ٹکڑو! آج ہمارے دل غمگیں ہے، آنکھیں اشکبار ہیں، تمہاری تصاویر ہمارے سینوں اور لبوں پر ہیں، ان ظالموں نے ہمارے بچوں پر بارود برسایا ہے، انہیں بری طرح سے قتل کیا ہے۔ یہ ظالم، زمین کے سینے اور آسمان کی چھت کے نیچے ہمیشہ کے لیے ملعون ٹھہریں۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى»²
 ”مسلمانوں کی آپس میں محبت، رحمت اور شفقت کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ ایک جسم کی کہ اگر جسم کے کسی عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم بخار میں مبتلا رہتا ہے اور بے چینی میں جاگتا رہتا ہے۔“

ہم میں ہر شخص جو کم از کم کر سکتا ہے، وہ دن یارات کے اوقات میں، ایک آدھ گھنٹہ نکال کر، مسجد میں یا گھر کے کسی کونے میں، تنہائی کے لمحات میں، اپنے اور امت کے گناہوں کی معافی مانگے۔ اور مظلوموں کے حق میں اور ظالموں کے خلاف، اللہ کی جناب میں گریہ و زاری کرے۔

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

² صحیح مسلم، کتاب الْبِرِّ وَالصَّلَاةِ وَالْأَدَابِ، بَابُ تَرَاحُمِ الْمُؤْمِنِينَ وَتَعَاطُفِهِمْ وَتَعَاذُهِمْ، 1999/4

درودِ مسلم

پروردگار! شام کے بچوں پر رحم فرما۔ مالک! شام کی عورتوں پر رحم فرما۔ مالک! شام کے بوڑھوں پر رحم فرما۔ مالک! شام کے مسلمانوں پر رحم فرما۔ مالک! نبی کریم ﷺ کی امت پر رحم فرما۔

مالک! اپنے بندوں پر رحم فرما۔ مالک! اپنے غلاموں پر رحم فرما۔ مالک! بہت ظلم ہو چکا، بہت ظلم ہو چکا، بہت ظلم ہو چکا۔ مالک! مسلمان نام کے سہی، آپ کی مخلوق تو ہیں۔ مالک! اپنے غلاموں پر رحم فرما، اس امت پر رحم فرما۔

پروردگار! شام، فلسطین، یمن، عراق، افغانستان، لیبیا، برما اور کشمیر میں مسلمانوں پر رحم فرما۔ مالک! اپنے غلاموں پر رحم فرما۔ مالک! پورا عالم اسلام آگ کی بھیٹی میں جل رہا ہے۔ مانا کہ یہ ہماری ہی کھیتی ہے لیکن پروردگار! بہت ہو چکا، اب تو معاف فرمادے۔ اب تو رحم فرمادے۔ مالک! ہم سے قوم موسیٰ کی طرح امید نہ لگا کہ ہم کچھ کر سکیں گے۔ مالک! ہم توجہ د کرنے نکلے تھے، فساد برپا کر بیٹھے۔ مالک! ہم تو مسائل حل کرنے نکلے تھے، انہیں بڑھا بیٹھے۔

مالک! ہم بے ایمان منافق ہوں یا متکبر درویش، ظالم حکمران ہوں یا نفس پرست صوفی، علمائے سوہو یا لبرل مسلمان، احمق بہادر ہوں یا سمجھدار بزدل، انتخاب تو آپ ہی کا ہیں۔ کہ آپ ہی نے اپنے دین کے لیے ہمارا انتخاب فرمایا ہے۔

مالک! ہم اگر بے وقوف ہیں، تو سمجھ عطا فرما۔ دل سخت ہیں تو نرمی عطا فرما۔ ظالم ہیں تو عادل بنا۔ ریاکار ہیں تو اخلاص نصیب فرما۔ بزدل ہیں تو شجاع بنا۔ متعصب ہیں تو محبت نصیب فرما۔ اے مالک! تو ہی مدد فرما۔ باقی سب تو ہمیں اجاڑنے والے ہیں، ہم خود بھی۔ مالک! رحم فرما۔

صدقہ اور تزکیہ

جن ذرائع سے اللہ کا تقرب حاصل کیا جاسکتا ہے، ان میں ایک اہم تر ذریعہ مال ہے۔ نفس انسانی میں رذائل، برے اخلاق اور عادات کا سب سے بڑا سبب دنیا کی محبت

ہے۔ اور دنیا کی محبت کا خلاصہ مال کی محبت ہے۔ مال کی محبت جہاں انسان میں کج نوسی، بخیلی، لالچ اور حرص پیدا کرتی ہے، وہاں تکبر، حسد، بغض، کینہ، ظلم اور نفاق جیسے رذائل کو بھی جنم دیتی ہے۔ صدقہ کرنے سے دل میں اللہ کی محبت، مال کی محبت پر غالب آجاتی ہے اور یہی تزکیے کا مطلوب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ [التوبة: 103]

”اے نبی ﷺ! آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں اس ذریعے ظاہری طور پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔ اور ان کے حق میں رحمت کی دعا فرمائیں کہ آپ کی دعا ان کے لیے موجب اطمینان ہوگی۔ اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“

قرآن مجید میں بار بار اللہ کے رستے میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں نماز کا حکم ہے، وہاں زکوٰۃ کا حکم ہے۔ جہاں حقوق العباد کا تذکرہ ہے، وہاں اللہ کے بندوں پر صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صلہ رحمی صرف یہ نہیں ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو اچھی طرح سلام کر لیا یا عید کے موقع پر ان کے گھر سویاں بھجوا دی بلکہ صلہ رحمی تو یہ ہے کہ اگر آپ کے رشتہ داروں میں سے کوئی مالی طور کمزور ہے، تو اس کی مدد کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تَبْذِرْ أَمْوَالَكَ تَبْذِيرًا﴾ [الإسراء: 26]

”اور رشتہ داروں کو ان کا حق دو۔ اور مساکین اور مسافروں کو ان کا حق دو۔ اور فضول خرچی مت کرو۔“

اللہ نے اسے رشتہ داروں کا حق قرار دیا ہے کہ اُن پر خرچ کیا جائے۔ اگر تو آپ پر زکوٰۃ فرض ہے اور آپ کے رشتہ داروں میں کوئی اس کا مستحق ہے تو آپ پر لازم ہے کہ آپ اس رقم سے اس کی مدد کریں۔ یہ رویہ درست نہیں ہے کہ رشتہ داروں میں صدقے کے مستحق لوگ موجود ہوں اور انسان دوسرے شہر میں صدقہ تقسیم کرتا

پھرے۔ یا پڑوسی ضرورت مند ہو اور انسان دوسرے محلے میں صدقہ کر رہا ہو۔ اور اگر آپ کے پاس زکوٰۃ کی رقم نہیں ہے تو بھی یہ اخلاقی حق تو ہے کہ ہم اگر نفلی صدقات سے رشتہ داروں کی بنیادی ضروریات (basic needs) پوری کرنے میں مدد کر سکتے ہوں تو ضرور کریں۔ اور اس میں بھی کسی رشتہ دار کو یہ بتلانا ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ اور صدقے کی رقم ہے کہ ان کی دل آزاری نہ ہو بلکہ غیر محسوس انداز میں پکڑا دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾
[البقرة: 262]

”جو لوگ اپنا مال اللہ کے رستے میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد نہ تو اس خرچ کا (کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں تو ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس (تیار) ہے۔ اور (قیامت کے روز) نہ ان کو کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے۔“

رشتہ داروں اور دوستوں میں یہ ہو جاتا ہے کہ اگر کسی مشکل وقت میں کسی مدد کر دی تو بعد میں کسی اختلاف یا لڑائی کے موقع پر جتلا دیا کہ میں نے فلاں وقت میں تمہاری مدد کی تھی۔ یہ جتلا نہ کسی مسلمان بھائی کو ذہنی افیت اور دلی تکلیف پہنچانے کے مترادف ہے لہذا قرآن مجید میں ارشاد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد جتلے گا تو اس کا صدقہ ضائع ہو جائے گا یعنی اس کا کچھ اجر و ثواب اس کو نہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثَرْابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ [البقرة: 264]

”اے اہل ایمان! اپنے صدقات (و خیرات) کو احسان جتلا کر یا تکلیف پہنچا کر برباد نہ کر دینا جیسا کہ وہ شخص ہے کہ جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ تو اس (کے مال) کی

مثال اس چٹان کی سی ہے کہ جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو۔ اور اس پر زور کا مینہ برسے اور اس مٹی کو صاف کر ڈالے۔ (اسی طرح) یہ (ریاکار اور احسان جتانے والے) لوگ اپنے صدقات کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ گاڑی چلا رہے ہیں اور اشارے پر کوئی سائل آپ کی گاڑی کے پاس آیا اور آپ سے سوال کیا اور آپ کے پیچھے ہی پڑ گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ نے پانچ دس روپے کا سکہ نکال کر اسے دے دیا اور ساتھ میں یہ بات بھی سنا دی کہ اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو، محنت کیوں نہیں کرتے۔ اگر آپ کو وہ پیشہ ور بھکاری معلوم ہوتا ہے تو اسے دینا یا نہ دینا یہ آپ کا فیصلہ ہے لیکن دینے کے بعد بات سنانا تو اس سے قرآن مجید نے منع کیا ہے کہ صدقہ کرنے میں اہم یہ نہیں ہے کہ آپ نے کس کو دیا ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ آپ نے کس کے لیے دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ﴾ [البقرة: 263]

”جس صدقہ کرنے کے بعد (لینے والے کو) اذیت دی جائے تو اس صدقہ سے تو بہتر ہے کہ نرم بات کر لی جائے اور (اس کی بے ادبی سے) درگزر کر دیا جائے۔ اور اللہ بے پروا اور بردبار ہے۔“

قلب کی تطہیر کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ صدقہ کو اپنے معمولات میں شامل کیا جائے۔ ہم مہینے میں ایک بار صدقہ کر لینے کا کافی سمجھتے ہیں حالانکہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ کریں۔ اگر دن میں پانچ مرتبہ نماز کا حکم ہے تو پسندیدہ تو یہی ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ صدقہ کرے، اگرچہ اپنی حیثیت کے مطابق ہو کہ جیسے ہی مسجد سے باہر نکلے تو کچھ رقم کسی سوا لی کے ہاتھ میں تمھادی۔ پانچ دس روپے کے صدقے کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا تَصَدَّقَ أَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللَّهُ إِلَّا الطَّيِّبَ، إِلَّا أَخَذَهَا الرَّحْمَنُ بِمِيمِنِهِ، وَإِنْ كَانَتْ تَمْرَةً، فَتَزُو فِي كَفِّ الرَّحْمَنِ حَتَّى

تَكُونُ أَغْظَمَ مِنَ الْجَبَلِ، كَمَا يُرِيّ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ أَوْ فَصِيلَهُ»¹
 ”جب بھی کوئی شخص اپنی حلال اور صاف ستھری کمائی سے اللہ کے رستے میں
 خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ حلال اور صاف ستھرے مال کے علاوہ قبول بھی
 نہیں کرتا تو اللہ عزوجل اس صدقے کو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑتے ہیں۔ اور
 اگر وہ ایک کھجور کا صدقہ ہو تو اللہ کے ہاتھ میں وہ پرورش پاتے ہوئے پہاڑ سے
 بڑا ہو جاتا ہے جیسا کہ تم کوئی شخص اپنے گھوڑے یا اونٹ کے بچے کی دیکھ بھال
 کر کے اسے بڑا کرتا ہے۔“

اور بہترین صدقہ وہ ہے جو اس چیز کا ہو کہ جو دل کو پسند ہو۔ گھر سے وہ کھانا نکال دینا
 کہ جسے خود کھانے کا دل نہ کر رہا ہو، بھی صدقہ کی ایک قسم ہے لیکن بہترین صدقہ وہی
 ہے کہ جو خود کھانے کا دل کر رہا ہو، وہ نکال کر مسکین کو دے، اور جو خود پہننے کو دل ہو، وہ
 اللہ کی راہ میں دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ
 اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ [آل عمران: 92]
 ”تم اس وقت تک نیکی کے مقام کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ وہ چیز اللہ کی راہ
 میں خرچ نہ کرو جو کہ جو تمہیں پسند ہو۔“

ہمارا حال یہ ہے کہ جب ہم کسی غریب کو دس روپے بٹوے سے نکال کر دیتے ہیں تو
 اس میں بھی ہماری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ نوٹ صدقہ کریں کہ جو پرانا اور پھٹا
 ہو ا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ
 مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ
 تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ [البقرة: 267]
 ”اے اہل ایمان! جو تم نے کمایا ہے اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا
 ہے تو اس میں سے صاف ستھرا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اپنے مال میں
 سے بری اور خراب چیز اللہ کے رستے میں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو کہ اگر

¹ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتزینتها، 702/2

تمہیں وہ چیز لین پڑی جائے تو اسے نہ لوگے الا یہ کہ تم اس کو لیتے وقت آنکھیں بند کر لو۔ اور جان لو کہ اللہ عزوجل بے پروا اور تعریف کیا گیا ہے۔“

اور بہترین صدقہ وہ ہے کہ جو اپنی اور اپنی گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد صدقہ کیا جائے۔ اور سارا مال اللہ کی راہ میں دے دینا کہ انسان فقیر ہو جائے اور اب اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے دوسروں سے سوال کرتا پھرے تو یہ اسے اللہ نے پسند نہیں کیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَأَبْدَأُ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ عَنْ ظَهْرِ غَنَى، وَمَنْ يَسْتَغْفِرْ يُعْفِهِ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللَّهُ»¹

”حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ، نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اور سب سے پہلے صدقہ اس پر کرو کہ جس کے تم ذمہ دار ہو [یعنی اپنے گھر والوں پر صدقہ کرے]۔ اور بہترین صدقہ وہ ہے کہ انسان صدقہ کرنے کے بعد بھی غنی رہے [یعنی اپنا سارا مال صدقہ کر کے فقیر بن جانا، شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے]۔ اور جو لوگوں سے سوال کرنے سے بچنا چاہے گا تو اللہ اسے بچالیں گے۔ اور جو اللہ سے غنی طلب کرے گا تو اللہ اسے غنی کر دیں گے۔“

اور صدقہ کی ابتدا اپنی ذات، گھر والوں اور ملازموں سے کرے کہ انسان اپنے گھر والوں پر جو خرچ کرتا ہے، وہ بھی صدقہ ہے جبکہ اسے اللہ کا حکم سمجھ کر خرچ کرے اور آخرت میں اس پر اللہ سے امید رکھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: أَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالصَّدَقَةِ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، عِنْدِي دِينَارٌ، فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى نَفْسِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى وَلَدِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى زَوْجَتِكَ» - أَوْ قَالَ: «زَوْجِكَ» -،

¹ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب لَا صَدَقَةَ إِلَّا عَنْ ظَهْرِ غَنَى، 112/2

قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى خَادِمِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «أَنْتَ أَبْصَرُ»¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ایک شخص نے کہا کہ میرے پاس ایک دینار ہے تو کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ ﷺ نے کہا کہ اپنی ذات پر کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ ﷺ نے کہا کہ اپنی اولاد پر کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ ﷺ نے کہا کہ اپنی بیوی پر کرو۔ تو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ نے کہا کہ اپنے ملازم پر کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ نے کہا کہ اب جس پر مناسب سمجھو، صدقہ کر دو۔“

اور صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔ مال بڑھنے سے مراد یہ بھی ہے کہ اللہ اس شخص کو اور زیادہ عطا کرتے ہیں جو اللہ کے رستے میں خرچ کرتا ہے۔ اور اس کا معنی یہ بھی ہے کہ اللہ عز و جل اُس کے مال میں برکت عطا فرمادیتے ہیں کہ جو اللہ کے رستے میں خرچ کرتا ہے کہ اُس کی دنیاوی آزمائش اور مصیبت ٹل جاتی ہے اور اس پر خرچ ہونے والا اس کا مال بچ جاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ، إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلْفًا، وَيَقُولُ الْآخَرُ: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُسْكِيًا تَلْفًا»²

”جب بھی صبح طلوع ہوتی ہے تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ جن میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! اس شخص کو اور مال عطا فرما کہ جو آپ کے رستے میں خرچ کرے۔ اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! اس شخص کے مال کو کم کر دے کہ جس نے آپ کے رستے میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ کو

¹ سنن أبي داود، كتاب الزكاة، باب في صلة الرّحم، 132/2

² صحيح بخاري، كتاب الزكاة باب قول الله تعالى: فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى، 115/2

روک رکھا ہے۔“

یہ تو صدقہ کرنے والوں کے لیے ہدایات ہیں اور جہاں تک لوگوں سے زکوٰۃ اور صدقہ وصول کرنے کے لیے سوال کرنا ہے تو اگر تو بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے سوال ہو تو جائز ہے لیکن اگر مال میں اضافے کے لیے ہو تو جہنم کی آگ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكْثُرًا، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرَ جَهَنَّمَ، فَلْيَسْتَقِلَّ مِنْهُ أَوْ لِيَكْثُرْ»¹

”جو لوگوں سے اس لیے سوال کرے کہ اپنے مال میں اضافہ کر سکے تو وہ یہ جان لے کہ وہ لوگوں سے جہنم کے انگارے مانگ رہا ہے، چاہے تو زیادہ مانگ لے اور چاہے تو کم کر لے۔“

پس اس شخص کا تزکیہ ممکن نہیں ہے کہ جس نے اللہ کے رستے میں مال خرچ کرنے کو اپنا محبوب عمل نہ بنالیا ہو۔



¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکاۃ، باب مَنْ سَأَلَ عَنْ ظَهْرِ عُنَى، 589/1

باب چہارم اصلاح خاندان

اس باب میں اصلاح خاندان کے ضمن میں میاں بیوی کے رویوں کی اصلاح، اولاد کی تربیت، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، رشتہ داروں سے نیکی اور حسن سلوک کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

میاں بیوی کے اختلافات

قرآن اکیڈمی کے شعبہ تحقیق اسلامی میں ملازمت کے دوران لوگ متنوع مسائل میں دینی رہنمائی کے لیے رجوع کرتے تھے۔ ان سائلین کی کثیر تعداد عموماً دو میں سے کسی ایک مسئلے میں مشاورت چاہ رہی ہوتی تھی؛ جادو ٹونے کا مسئلہ یا میاں بیوی کے اختلافات۔ اس وقت ہم دوسرے مسئلے پر کچھ گفتگو کرنا چاہ رہے ہیں۔

میاں بیوی کے اختلافات کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے اسباب معلوم ہوں۔ میاں بیوی کا اختلاف دو قسم کا ہوتا ہے؛ واقعی اور غیر واقعی (real and unreal)۔ واقعی اختلاف وہ ہے کہ جو حقیقی ہو اور اس اختلاف کے اسباب داخلی ہوتے ہیں یعنی میاں بیوی کے مزاج میں شامل ہوتے ہیں۔ اور غیر واقعی اختلاف وہ ہے کہ جو حقیقی نہ ہو یعنی اختلاف تو ہے لیکن بلا وجہ کا ہے اور اس کے اسباب خارجی ہوتے ہیں۔ یہاں اختلاف کا سبب مزاج نہیں ہے بلکہ شیطان یا حسد کرنے والے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ واقعی اختلاف کو کم تو کیا جاسکتا ہے لیکن ختم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مزاجوں کا اختلاف ہے اور مزاج ختم نہیں ہوتے۔ اور غیر واقعی اختلاف کو ختم بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کی وجہ شیطان یا حسد کرنے والے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ آپ ان کی باتوں پر کان نہ دھریں تو آپ کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔

واقعی اختلاف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو ایک مزاج پر پیدا کیا ہے کہ جس میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنْ أَعْوَجَ شَيْءٌ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبَتْ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ»¹

”عورتوں کے بارے میں میری نصیحت سن لو کہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہوتی ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنا

¹ صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبياء، باب خلق آدم صلوات الله عليه وذريته، 133/4

چاہو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے بارے میری نصیحت سن لو۔“

اس روایت میں خطاب مرد سے ہے یعنی میاں بیوی کے اختلافات میں شریعت نے مرد کو سمجھایا ہے کہ وہ بڑا ہے لہذا اسے بڑے پن کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی کہ مرد میں عقل جبکہ عورت میں جذبات کا پہلو غالب ہوتا ہے لہذا میاں بیوی کی لڑائی میں سمجھنے سمجھانے کے زیادہ امکانات مرد کی طرف میں ہوتے ہیں۔ پس مرد چونکہ ذمہ دار بھی ہے اور اس میں عورت کی نسبت عقل کا پہلو غالب ہے لہذا اسے اپنی ذمہ داری اور فطری تخلیق کا خیال رکھتے ہوئے گھر کو جوڑنے میں عورت کی نسبت زیادہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کا حق بھی مرد ہی کو دیا گیا ہے یعنی یہ مرد ہی ہے کہ جس نے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس نے گھر کو توڑنا ہے یا جوڑ کر رکھنا ہے۔ اور اگر طلاق کا حق عورت کے پاس ہوتا تو مسلم معاشروں میں طلاق کی نسبت (ratio) بہت بڑھ جاتی کہ عورتیں، مردوں سے زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔

اور اگر مرد یہ عزم کر لے کہ اس نے اپنی عورت کو سیدھا کر کے ہی رہنا ہے تو یہ اسے توڑنے کے مترادف ہے اور اس توڑنے کا معنی طلاق ہے۔ ثالث (mediator) کو بھی چاہیے کہ میاں بیوی کے اختلافات میں زیادہ مرد کو سمجھائے کیونکہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور کمزور بنایا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا روایت کے الفاظ ہیں۔ اس روایت کا یہ معنی نہیں ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو طعنہ دینے کے لیے اس روایت کو دلیل بنائے کہ تم تو ہو ہی ٹیڑھی لہذا تمہارے کیا کہنے بلکہ اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ کی مردوں کو نصیحت کا معنی یہ ہے کہ عورت کو چونکہ اللہ عزوجل نے کمزور بنایا ہے لہذا اس کی فطری کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے سمجھداری، بڑے پن اور حکمت کے ساتھ معاملہ کرو۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انسانوں میں باہمی مزاج کا بھی فرق ہوتا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبْضَهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ، فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدَرِ الْأَرْضِ: جَاءَ مِنْهُمْ الْأَحْمَرُ، وَالْأَبْيَضُ، وَالْأَسْوَدُ، وَبَيْنَ ذَلِكَ، وَالسَّهْلُ، وَالْحَزْنُ، وَالْخَبِيثُ، وَالطَّيِّبُ»¹

”اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور یہ مٹی تمام زمین سے لی گئی تھی۔ پس آدم علیہ السلام کی اولاد میں زمین کے تمام رنگ اور خصوصیات موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی سفید، کوئی سرخ اور کوئی سیاہ ہے۔ اور کوئی رنگت میں ان کے مابین ہے۔ اور کوئی مزاج میں نرم ہے تو کوئی سخت۔ اور کوئی طبعاً خبیث ہے تو کوئی طیب۔“

پس آدم کی اولاد میں مزاج کی کچھ کمزوریاں فطری ہیں لہذا دوسروں کو اس کا کسی قدر اعتبار (credit) دینا چاہیے۔ ایک شخص اگر پیدائشی طور غصیلے یا لا پرواہ مزاج کا حامل ہے تو وہ اپنے اس مزاج کو اپنی تربیت سے کسی قدر قابو تو کر سکتا ہے لیکن ختم نہیں کر سکتا کیونکہ وہ مزاج اس کے خمیر میں شامل ہے۔ اور مزاج کی یہ فطری کمزوریاں ہر شخص میں اس فرق کے ساتھ موجود ہیں کہ جو ایک میں ہیں وہ دوسرے میں نہیں ہیں۔

پس ان فطری کمزوریوں میں دو چیزیں مطلوب ہیں؛ ایک تو ہر فریق اپنی کمزوری کو دور کرنے کی امکان بھر کوشش کرے اور دوسرا یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی ایسی کمزوریوں کے بارے برداشت اور تحمل کا رویہ پیدا کریں۔ یہی بات ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے مردوں کو عورت کے حوالے سے بیان کی ہے کہ نہ تو اسے بالکل سیدھا کرنے کے چکر میں پڑو اور نہ ہی اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ان دو قسم کی انتہاؤں میں میاں بیوی میں ساتھ رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا اور نوبت علیحدگی تک جا پہنچے گی۔

مثلاً عام زندگی کی مشکلات میں سے یہ ہے کہ عموماً مرد گھر وقت پر آنے میں دیر لگا دیتے ہیں اور عورتیں گھر سے نکلنے میں دیر لگا دیتی ہیں اور اس پر اچھا خاصا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ یا بیوی جب کھانا لگاتی ہے تو شوہر اپنی بیوی کا انتظار کیے بغیر کھانا شروع کر دیتے ہیں اور بیوی غصے میں آ جاتی ہے یا بیوی اگر وہ کھانا نہیں بنا پاتی جس کی شوہر نے خواہش کی تھی

¹ سنن أبي داود، كتاب السنة، باب في القدر، 222/4

تو شوہر غصے میں آجاتے ہیں۔ اب اگر میاں بیوی کے مزاج کی یہ خامی ہے یا اس کے حالات ایسے ہیں جو دیری کا باعث بن جاتے ہیں تو میاں بیوی کو ممکن حد تک اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور فریق مخالف کو یہ چاہیے کہ دیر کی صورت میں ایک دوسرے کو جتلا دیں یا بعض اوقات ناراضگی کا اظہار بھی کر دیں لیکن اس ناراضگی میں شدت نہ لائیں کہ چھوٹا سا مسئلہ فساد بن جائے کیونکہ یہ مزاج کے مسائل ہیں اور آپ کو ان کے ساتھ سمجھوتہ (compromise) کرنا ہے۔

یہ واضح رہے کہ کچھ مزاج فطری نہیں ہوتے لیکن معاشرہ انہیں فطری سمجھ رہا ہوتا ہے۔ مثلاً میاں بیوی کی لڑائی میں عام طور پہی رواج ہے کہ غلطی چاہے شوہر کی ہو یا بیوی کی، معذرت شوہر ہی نے کرنی ہے۔ ایک دفعہ کسی کے ہاں جانا ہوا تو وہاں ٹیلی ویژن چینل پر ایک اشتہار (ad) چل رہا تھا جس میں میاں بیوی ناراض تھے اور بیوی اپنے شوہر کو جادوئی الفاظ (magical words) بولنے کا کہہ رہی تھی اور جادوئی الفاظ سے اس کی مراد یہ تھی کہ مرد یہ کہے کہ ”غلطی میری تھی“۔

عورت کا غلطی تسلیم نہ کرنا یہ اس کی پیدائشی کمزوری نہیں ہے بلکہ معاشرتی بگاڑ ہے یعنی معاشرے نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی ہے کہ جھگڑے کا حل یہی ہے کہ شوہر معذرت کر لے۔ یہ ایک ناممکن بات ہے کہ میاں بیوی کے جھگڑے میں ہمیشہ غلطی شوہر کی ہو۔ بعض اوقات شوہر کی غلطی ہوتی ہے اور بعض اوقات بیوی کی۔ جس کی غلطی ہے، اسے تسلیم کرنا چاہیے، یہ دینی تقاضا ہے اور ایک بندہ مومن کے اخلاقی اور روحانی نشوونما کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ کہنے کو تو ہر بار شوہر کے تسلیم کر لینے سے اختلاف رفع ہو جائے گا لیکن اگر یہی رویہ عادت بن جائے گا تو اس کا عورت کو دینی اور اخلاقی نقصان بہت زیادہ ہوگا۔ عورت کی زندگی سے اپنی غلطی تسلیم کرنے کا مادہ ہی نکلتا چلا جائے گا یہاں تک کہ ایسی خاتون اپنے رب سے بھی جھگڑا کرنے والی بن جائے گی اور استغفار اس کی زندگی میں کم ہی ملے گا۔ رویے جب عادت بن جاتے ہیں تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سامنے کون ہے؟ انسان یا خالق؟ بچے یا والدین؟ شاگرد یا استاذ؟ چھوٹا یا

بڑا؟ لہذا انسانوں کے سامنے غلطی تسلیم نہ کرنے کی عادت خدا کے سامنے بھی غلطی تسلیم نہ کرنے کی خوڈال دیتی ہے۔

میاں بیوی کے دوسری قسم کے اختلافات وہ ہیں جو غیر واقعی (unreal) ہیں یعنی حقیقی نہیں ہیں اور ان کا سبب شیطان مردود اور حسد کرنے والے رشتہ دار ہو سکتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ، فَأَذْنَاهُمْ مِنْهُ مَائِزَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً، يَجِيءُ أَحَدَهُمْ، فَيَقُولُ: فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، فَيَقُولُ: مَا صَنَعْتَ شَيْئًا، قَالَ: وَيَجِيءُ أَحَدَهُمْ، فَيَقُولُ: مَا تَرَكْتُهُ حَتَّىٰ فَرَقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَهْلِهِ، قَالَ: فَيُذْنِيهِ مِنْهُ - أَوْ قَالَ: فَيَلْتَزِمُهُ وَيَقُولُ: نِعَمَ أَنْتَ أَنْتَ»¹

”ابلیس سمندر پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اپنے لشکر لوگوں میں فساد کی غرض سے بھیجتا ہے۔ پس اس کے لشکروں میں اس کے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جس نے سب سے بڑا فتنہ برپا کیا ہو۔ اس کے بھیجے ہوئے چیلوں میں سے ایک آکر اسے اطلاع دیتا ہے کہ میں فلاں کے پیچھے ہی لگا رہا یہاں تک کہ اس نے یہ یہ بکواس کر ڈالی۔ تو ابلیس اسے کہتا ہے، اللہ کی قسم! تو نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس کا ایک چیلہ آکر اسے اطلاع دیتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو اس حال میں چھوڑا کہ اس کے اور اس کی بیوی کے مابین جدائی ڈلوادی تو ابلیس اپنے اس چیلے کو اپنے قریب کرتا ہے اور اپنے ساتھ چمٹا لیتا ہے اور کہتا ہے: کیا خوب کام کیا ہے! کیا خوب کام کیا ہے!“

پس میاں بیوی کے درمیان پھوٹ ڈلوانا ابلیس کے نزدیک اتنا عظیم کام ہے کہ اس کے ایسے چیلے اس کے مقررین میں شمار ہوتے ہیں جو میاں بیوی میں طلاق کا باعث بن جائیں۔ اور یہ شیطان مردود ہر وقت انسان کے دل میں وسوسہ ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿١﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿٢﴾ إِلَهِ النَّاسِ ﴿٣﴾﴾

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 275/22

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ﴿٤﴾ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ
﴿٥﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ [الناس: 6]

”اے نبی ﷺ! کہہ دیں، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے حقیقی معبود کی، اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔“

ان آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا شیطان جنات میں سے بھی ہو سکتا ہے اور انسانوں میں سے بھی کہ بعض اوقات رشتہ داروں میں بعض لوگ میاں بیوی میں جدائی ڈالنے کے لیے شیطان کا سا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان حالات میں میاں بیوی کو ایک تو خود باشعور ہونا چاہیے کہ رشتہ داروں میں سے کون ان کا خیر خواہ ہے اور کون لگائی بھجائی کرنے والا ہے اور دوسرا حاسدین کے شر سے بچنے کے لیے صبح، شام اور رات سونے سے پہلے تین مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا ورد کر لیں۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ، إِلَّا وَقَدْ وَكَّلَ بِهِ قَرِينُهُ مِنَ الْجِنِّ» قَالُوا: وَإَيَّاكَ؟
يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ: «وَإِيَّايَ، إِلَّا أَنَّ اللَّهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ، فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ»¹

”تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ایک شیطان جن نہ لگا ہوا ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے نبی ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی کوئی شیطان لگا ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، میرے ساتھ بھی ہے لیکن اللہ عزوجل نے میری اس کے خلاف مدد کی ہے لہذا وہ میرا فرمانبردار ہے اور مجھے نیکی کے علاوہ کسی بات کی ترغیب نہیں دیتا۔“

پس میاں بیوی میں جب بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی لڑائیاں اور جھگڑے ہونا شروع ہوں جائیں تو اس کا سبب شیطان ہوتا ہے۔ سائیکالوجی میں جسے ہم غیر معمولی

¹ صحیح مسلم، کتاب صفۃ النبیۃ والجنۃ والنار، باب تخریش الشیطان وبعثہ سراۃ، 2167/4

رویہ (abnormal attitude) کہتے ہیں، اس کی وجہ داخلی نہیں خارجی ہوتی ہے۔ اگرچہ ماہرین نفسیات اس کی وجہ داخلی قرار دیتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ نفسیاتی مسئلہ ہے لیکن جھاڑ پھونک کرنے والوں کا تجربہ اس کے خلاف کہتا ہے۔ روحانی معالجین کے مطابق غیر معمولی رویوں کی اصل وجہ شیطان مردود ہوتا ہے، چاہے وہ بچوں میں ہوں یا بڑوں میں۔ اور اکثر و بیشتر نفسیاتی مسائل شیطان کے وساوس ہیں۔

پس میاں بیوی میں سے کوئی ایک جب غیر معمولی رویے (abnormal attitude) کا اظہار کرے تو اختلاف حل کرنے کے لیے سب سے پہلے خارجی وجہ کو ختم کرنا چاہیے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے جو ذرا حواس (senses) میں ہے، دوسرے پر معوذتین، تعوذات¹ اور سورہ الصافات کی پہلی دس آیات دم کر کے پھونک ماریں۔ پس پہلے شیطان مردود کو بھگانیں اور اختلاف کو فطری سطح پر لے کر آئیں اور اب اس واقعی اختلاف اور مسائل کے حل کے لیے مشاورت (counselling) کریں یا مکالمہ (dialogue)۔

اسی طرح ایک غصہ فطری ہے اور ایک شیطان کی طرف سے ہے۔ شیطان کی طرف سے غصے کو اگر فطری سمجھ لیں گے تو مسئلہ کبھی حل نہ ہوگا۔ شیطان کی طرف سے غصے کا حل یہ ہے کہ وضو کر لے یا سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا کثرت سے ورد کرے۔ بعض اوقات کسی حسد کرنے والے رشتہ دار کی نظر بھی لگ جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے میاں بیوی میں جھگڑا بن جاتا ہے کیونکہ نظر لگنے میں بھی ایک شیطان ہوتا ہے۔ اس بارے ہم مزید بحث حسد کے مقامات کے عنوان کے تحت کریں گے۔ پس میاں بیوی کے اختلاف میں یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ وہ اختلاف نارمل ہیں یا ایبنا رمل۔ اگر

¹ تعوذات ان دعاؤں کو کہتے ہیں کہ جن میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہو۔ احادیث میں ایسی بہت سی دعائیں مروی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے: اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ الثَّامَاتِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَخْضَرُونَ۔ ترجمہ: میں اللہ کے پورے ہو کر رہنے والے کلمات کی پناہ مانگتا ہوں، اس کے غضب سے، اس کی پکڑ سے، اس کے بندوں کے شر سے، اور شیطان کی پھونکوں سے اور اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔ [سنن الترمذی: 429/5] موثر ترین تعوذات میں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ہیں۔

نارمل ہیں تو دو اصولوں، افہام و تفہیم اور تحمل و برداشت، کی روشنی میں انہیں حل کرنے کی کوشش کرے اور اگر دوسری قسم کے ہیں تو پھر تعوزات اور شرعی دم وغیرہ سے انہیں حل کرے۔

اکثر میاں بیوی کے مسائل دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن وہ پہلی قسم میں ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح ان کے مسائل عارضی طور پر حل ہو جاتے ہیں لیکن مستقل طور پر حل نہیں ہو پاتے۔ پہلے لڑائی کے خارجی سبب یعنی شیطان مردود یا حسد کے اثرات بد دور کریں اور پھر آپس کا اختلاف حل کرنے بیٹھیں۔ اور اس کے بھگانے کا طریقہ ہم نقل کر چکے ہیں۔ مزید برآں صبح و شام کے اذکار اور ادعیہ ماثورہ کی پابندی کریں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ، فَذَكَرَ اللَّهَ عِنْدَ دُخُولِهِ وَعِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: لَا مَبِيتَ لَكُمْ، وَلَا عَشَاءَ، وَإِذَا دَخَلَ، فَلَمْ يَذْكُرِ اللَّهَ عِنْدَ دُخُولِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: أَذْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ، وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللَّهَ عِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ: أَذْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ وَالْعَشَاءَ»¹

”جو شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے اللہ کا نام لے لے تو شیاطین آپس میں یہ کہتے ہیں کہ اس گھر میں تمہارے لیے رات گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہ لے تو شیاطین کہتے ہیں کہ اب تمہارے لیے یہ گنجائش ہے کہ تم اس گھر میں رات گزار سکو۔“

گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام لینے سے مراد یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کی دعا پڑھی جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ، وَخَيْرَ الْمُخْرَجِ، بِسْمِ اللَّهِ وَلَجْنَا، وَبِسْمِ اللَّهِ خَرَجْنَا، وَعَلَى اللَّهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا»²

¹ صحیح مسلم، کتاب الأُشریة، باب آداب الطَّعامِ وَالشَّرَابِ وَأَحْکَامُهَا، 3/1598

² سنن أبي داود، أَبْوَابُ النَّوْمِ، باب مَا يَقُولُ الرَّجُلُ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ، 325/4۔ امام أبو داود نے اس روایت کو "صالح" جبکہ علامہ ابن حجر اور شیخ بن باز رحمہما اللہ نے "حسن" کہا ہے۔

”اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ خیر کے ساتھ گھر میں داخل ہوں اور خیر کے ساتھ باہر نکلوں۔ اللہ کے نام کے ساتھ ہم گھر میں داخل ہوتے ہیں اور اللہ کے نام کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ اور اپنے رب پر ہی ہم توکل کرتے ہیں۔“

میاں بیوی کے حقوق

خاندان کے ادارے کو دو باتوں سے مضبوط کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک تو میاں بیوی کو اپنے حقوق اور فرائض (rights and responsibilities) کا شعور حاصل ہو۔ اور دوسرا یہ کہ ان میں تقویٰ اور اللہ کا ڈر موجود ہو۔ جب تک ایک دوسرے کے حقوق اور فرائض کا علم نہیں ہو گا تو ان کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی لہذا اختلاف نہ صرف پیدا ہوں گے بلکہ بڑھتے چلے جائیں گے۔ اور اگر ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا تو علم ہے لیکن اللہ کا ڈر اور خوف موجود نہیں ہے تو ایسی صورت میں ہر ایک فریق کے لیے اپنے فرائض کی ادائیگی ممکن نہیں ہوگی کہ اس کے پاس وہ جذبہ محرکہ (driving force) ہی نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر وہ دوسرے کے حقوق ادا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ میں جہاں جہاں تفصیل سے خاندان کے جڑنے اور ٹوٹنے یعنی نکاح اور طلاق کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے، وہاں وہاں بار بار تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ کے بغیر نہ تو خاندان قائم کرتے وقت عدل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے ٹوٹے وقت انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

شوہر کے جملہ حقوق کو اگر ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اور اطاعت کا معنی صرف ان باتوں میں اطاعت نہیں کہ جو بیوی کو پسند ہوں بلکہ ان میں اطاعت کہ جو بیوی کو ناپسند ہوں۔ اور بیوی کے حقوق کو اگر ایک لفظ میں جمع کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے حسن سلوک کرے۔ اور حسن سلوک کا معنی صرف بیوی کا کرنا نہیں ہے بلکہ اچھے طریقے اور سلیقے سے کرنا ہے۔

ہمارے ہاں بعض مفتی صاحبان معاشرتی نتائج پر غور کیے بغیر کچھ ایسے فتاویٰ جاری

کر دیتے ہیں کہ جو خاندان کے ادارے کو کمزور کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ ہمیں یہ واضح رہنا چاہیے کہ فتویٰ، کتاب و سنت نہیں ہوتا اگرچہ وہ کتاب و سنت کا فہم ہوتا ہے۔ چونکہ سمجھنے میں غلطی لگ سکتی ہے لہذا فتویٰ میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ پس مفتی صاحبان کو اپنے فتاویٰ پر کی جانے والی تنقید کی روشنی میں اپنی آرا پر نظر ثانی کرتے رہنا چاہیے۔

مثال کے طور بعض مفتی صاحبان نے کہا کہ بیوی کی یہ شرعی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ خاوند کے لیے کھانا بنائے، کپڑے دھوئے، برتن صاف کرے وغیرہ بلکہ یہ عورت کا احسان ہے۔ اب کہنے کو تو مفتی صاحب عورتوں کے حقوق بیان کر رہے ہیں لیکن اگر کوئی مفتی صاحب سے یہ سوال کرے کہ کیا یہ کوئی شرعی یا فقہی ذمہ داری ہے کہ مرد اپنی بیوی کو سپلٹ اے سی لگوا کر دے، ڈبل بیڈ اور صوفہ سیٹ خرید کر دے، گیزر اور ہیٹر کی سہولت مہیا کرے، بجلی اور گیس کا کنکشن لگوا کر دے لیکن اس کے باوجود اگر مرد ایسا کر رہے ہیں اور مفتی صاحب کوئی ایسا فتویٰ دیتے ہیں کہ جس میں مردوں کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ان پر واجب نہیں ہے تو فریق مخالف کی چیخیں نہیں نکلیں گی تو کیا ہو گا؟ اور یہی کام ہمارے مدوح مفتی صاحب کر رہے ہیں کہ عورتوں کے حقوق بیان کر کے مردوں کی چیخیں نکلوانا چاہتے ہیں۔

جب آپ نے عورت کی عرفی ذمہ داریاں ساری معاف کر دی ہیں اور ساتھ میں عرفی حقوق اسے سارے دے دیے ہیں تو اب دیندار نوجوان بھی شادی کے معاملے میں دین کو ترجیح نہیں دیں گے بلکہ اس بات کو ترجیح دیں گے کہ کوئی ایسی بیوی لے کر آئیں جو کم از کم گھر کا کام کاج تو کرے۔ اگر آپ شریعت اور فقہ ہی سے مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں تو عورت کو جس طرح شریعت اور فقہ کی روشنی میں ذمہ داریوں سے آزاد کیا ہے، اسی طرح اس کے حقوق بھی ختم کریں، تو توازن پیدا ہو گا۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ جب عورت کے کام کرنے کی باری آئے تو پھر اس کی دینی ذمہ داری اور جب اس کے لینے کی باری آئے تو اب عرف اور رواج کیا ہے؟ اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔

اور حقیقی بات یہی ہے کہ میاں بیوی کے حقوق و فرائض کا تعین عرف اور رواج سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرة: 228]

”جیسے بیویوں کے حقوق ہیں، ویسے ہی ان کے فرائض بھی ہے، عرف کے مطابق۔“

ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ بیوی گھر میں لانے کا مطلب خادمہ اور نوکرانی لانا ہے، یہ تصور بھی بالکل غلط ہے۔ لیکن یہ کون سا دین ہے کہ بیوی کہے کہ میں اپنے خاوند کو کھانا اس لیے بنا کر نہیں دے سکتی کہ یہ میری دینی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ دین، دین فطرت ہے۔ فتویٰ کے نام پر اتنی بڑی غلطی نہ کریں کہ فطرت چچہ چچ کر بتلائے کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ اگر اسی طرح مذہبی عورتوں کے حقوق کے لیے بے معنی فتاویٰ جاری ہوتے رہے تو وہ وقت بھی قریب آجائے گا جبکہ شوہر بستر پر پڑا ہو گا اور بیوی اپنی ساس سے کہے گی کہ ذرا اپنے بیٹے کو دوائی پلا دینا، اسے دوائی پلا نامیری دینی ذمہ داری نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خاندان صرف فقہی اور قانونی ضابطوں سے نہیں چلتے بلکہ ایثار اور قربانی کے جذبوں سے پروان چڑھتے ہیں۔

طلاق اور خلع کی وجوہات: جنس اور عشق

ہمارے معاشروں میں طلاق اور خلع کا تناسب بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ میاں بیوی کے اختلافات، جھگڑوں اور علیحدگی کے پیچھے بلاشبہ بیسیوں اسباب ہوتے ہیں لیکن ہمیں اس وقت ان اسباب میں سے دو اہم اسباب کا ذکر کرنا ہے کہ جو میاں بیوی میں اختلاف، جھگڑوں اور علیحدگی کا ایک بہت بڑا سبب ہوتے ہیں لیکن معاشرہ تو کجا بعض اوقات خود میاں بیوی اس قدر شرمیلے واقع ہوتے ہیں کہ اس بارے اپنے فریق مخالف کو کوئی واضح پیغام پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں۔

اللہ عزوجل نے مرد میں جنس کا جذبہ بہت قوی رکھا ہے جبکہ عورت کو رومانس کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ عورت کو مرد کی اس مجبوری کا علم ہے، کسی کو تھوڑا اور

کسی کو زیادہ، اور گھر میں معمول کے اختلافات کے نتیجے میں عورت اپنے شوہر سے اس کی اس خواہش کو پورا کرنے کے حوالے سے بچنے اور دور رہنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ اس کا شوہر بھی دباؤ میں رہے۔ اور بعض عورتوں کا خیال ہوتا ہے کہ شاید ان کے مردوں کا اس بارے تقاضا بہت زیادہ ہے لہذا وہ اس عمل سے چڑان (irritation) کی کیفیت میں رہتی ہیں اور اسی چڑکی کیفیت میں ان سے دور بھاگتی ہیں۔

شادی کے بعد مرد کا اگر جنس کا جذبہ پورا نہ ہو تو وہ فرسٹریشن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اگر بے دین ہو تو باہر منہ ماری کر لیتا ہے اور اس طرح گھر میں طاقت کا توازن بحال رکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ ثابت کرے کہ وہ بیوی کے سامنے مجبور نہیں ہے۔ اور اگر دیندار ہو تو یا تو اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کے لیے عورت کے سامنے جھک جائے گا یا اگر مرد ہونے کا احساس غالب رہا تو طلاق دے کر رخصت کر دے گا، بھلے طلاق کی وجوہات عجیب و غریب بیان کرے گا اور عورت بھی اس پر مطمئن نظر آئے گی کہ طلاق کی وجوہات فلاں فلاں تھیں حالانکہ گہرائی میں تجزیہ کیا جائے تو وجہ وہ نہیں ہوتی جو ظاہر کی جا رہی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ، فَأَبَتْ أَنْ تَجِيءَ، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ»¹

”اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور وہ انکار کر دے تو فرشتے اس عورت پر رات بھر لعنت بھیجتے ہیں۔“

اب عورتیں اگر یہ کہیں کہ اس حدیث میں ہمارے جذبات کا دھیان نہیں رکھا گیا کہ ہم ساس سُسر کی خدمت بھی کریں اور جب دن بھر کے کاموں سے تھک ہار جائیں تو اب میاں کو خوش کرنا بھی ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ عورتوں کی سوچ کا یہ انداز درست نہیں ہے کہ جنس کے معاملے میں مرد کی ضرورت، عورت سے کئی گنا زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ مردوں کو چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے۔ پس اگر مرد کی ضرورت پوری

¹ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب إِذَا بَاتَتْ الْمَرْأَةُ مُهَاجِرَةً فِرَاشَ زَوْجِهَا، 30/7

نہ ہوئی تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کو توڑ دے گا۔ شاید اسے بعد میں اس پر افسوس بھی ہو لیکن یہ جذبہ اتنا قوی ہے کہ اسے وہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور عورت کی ضرورت جو کہ رومانس ہے، مرد پوری نہ کرے تو اگر بے دین ہوگی تو فون، فیس بک وغیرہ پر باہر یاریاں لگائے گی۔ عورت کو مرد سے تعریف چاہیے، چاہے جھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ اسے مرد سے بس تحسین (appreciation) چاہیے، چاہے مبالغہ آمیز ہی کیوں نہ ہو۔ اسے مرد سے اگر لمس بھی چاہیے تو اس لیے نہیں کہ مرد اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ قدرت کا ایک ایسا عظیم شاہکار ہے کہ جسے چھونا مرد کے لیے ایک خوش نصیبی ہے۔ اور وہ اس بارے میں ویسی ہی مجبور ہے جیسا کہ مرد جنس کے بارے میں۔

اور اگر عورت دیندار ہوگی تو یا تو گھٹن سے زندگی کے دن پورے گی، خود بھی تنگ رہے گی اور اپنے مرد کو بھی تنگ رکھنے کی ممکن کوشش کرے گی، اور اگر کچھ خود اعتماد ہوئی یا اس کے پاس کچھ ذرائع آمدن ہوئے، تو خلع کے رستے علیحدگی کی طرف جائے گی۔ آپ ﷺ نے عورتوں کو نازک آگینے کہا ہے۔ پس دو لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ مرد کو بیوی کے نام پر لونڈی چاہیے اور عورت کو شوہر کے نام پر عاشق۔ اور ان دو انتہاؤں کے مابین گزارہ کرنا ہے دونوں نے اور اسی کا نام ازدواجی زندگی ہے۔

میاں بیوی کی بڑی لڑائیوں کی وجوہات ہمیشہ چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر بیوی کے کسی عزیز یا سہیلی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے دونوں گھر سے نکلے ہیں تو بیوی نے رستہ بتلانے میں غلطی کر دی کہ جس سے تاخیر ہو گئی۔ میاں کو غصہ آ گیا اور اس طرح ایک دوسرے پر تبصرے ہونے لگے یہاں تک کہ بیوی نے جذبات میں آکر کہا کہ اس سے تو بہتر تھا کہ آپ مجھے لے کر ہی نہ جاتے۔ اور اس پر شوہر صاحب بھی اتنے فرمانبردار نکلے کہ اسی لمحے گھر کی طرف گاڑی کا رخ موڑ لیا۔ پس اس طرح ایک چھوٹی سی بات ایک بڑے لڑائی جھگڑے کی بنیاد بن گئی۔

میاں بیوی کا کہنا یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہمیں خواہ مخواہ دوسرے سے چڑ

محسوس ہو رہی ہوتی ہے، معلوم بھی نہیں ہوتا کہ چھوٹی سی بات پر اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے؟ چھوٹی سی بات پر اگر زیادہ غصہ آئے تو کوئی نہ کوئی وجہ تو ایسی ہوتی ہے کہ جو خود آپ کو بھی نہیں معلوم۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے اس وجہ کو ڈھونڈنے کی اب تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ شوہر اپنے آفس کے کام کے بوجھ یا تناؤ کی وجہ سے تھکا ہار اگھر آتا ہے اور آرام کے لیے مناسب وقت نہ مل سکنے کی وجہ سے مزاج میں خواہ مخواہ کاچڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی بات پر لہجہ کاٹ کھانے والا ہوتا ہے۔ اس کا مناسب حل یہی ہے کہ آرام کے ذریعے اپنی تھکاوٹ دور کر لی جائے۔ اسی طرح کا معاملہ بیوی کا بھی ہو سکتا ہے کہ گھر کے کام کاج کی کثرت کی وجہ سے جسم ٹوٹ رہا ہے لہذا شوہر کی ذرہ ذرہ سی بات پر پارہ چڑھ رہا ہو اور خود بھی سمجھ نہ آ رہی کہ اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میاں بیوی کچھ دنوں سے ایک دوسرے کی ازدواجی یار و مانس کی ضرورت پوری نہ کر رہے ہوں اور اسی سبب سے رد عمل کی ایک فضا میں پہنچ چکے ہوں۔ بعض اوقات اس کی وجوہات خارجی بھی ہو سکتی ہیں کہ نظر وغیرہ لگ گئی ہو یا کسی رشتہ دار نے حسد میں کوئی تعویذ گنڈا کر دیا ہو۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی کو خواہ مخواہ کے باہمی کھچاؤ کی وجوہات کو تلاش کر کے انہیں ختم کرنا چاہیے اور کھچاؤ ختم کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی کوتاہی کے بارے برداشت اور تحمل کا رویہ پیدا کریں اور دوسرا یہ کہ اگر کچھ سمجھ نہ آئے تو اللہ عز و جل کے سامنے سجدے میں گر جائیں کہ پروردگار! کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا معاملہ ہے؟ آپ ہی اصلاح فرمادیں اور اس بارے اللہ عز و جل سے رورو کر دعا کریں۔

بچوں کی تربیت کے دو اصول

انسان کا ایک تعلق اپنے خالق سے ہے اور دوسرا مخلوق سے اور دونوں قسم کے تعلق کے بارے ہمارے دین میں ہدایات موجود ہیں۔ پہلی قسم کو ہم ”حقوق اللہ“ کہتے ہیں اور دوسری کو ”حقوق العباد“۔ اللہ کے حقوق اچھی طرح ادا کرنے سے ”اچھا مسلمان“ بنتا

ہے اور بندوں کے حقوق بہتر طور ادا کرنے سے ”اچھا انسان“ وجود میں آتا ہے۔ خالق کے حقوق کو ایک لفظ میں بیان کر س تو وہ ”عبادت“ ہے اور بندوں کے حقوق کو ایک لفظ میں جمع کرنا چاہیں تو وہ ”اخلاق“ ہیں۔

اپنے بچوں کے اگر ہم عبادت اور اخلاق درست کر دیں تو ان کا اپنے رب اور انسانوں دونوں سے تعلق اچھا ہو جائے گا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کامیاب زندگی گزاریں گے۔ عبادت چونکہ خالق کا حق ہے اور عبادت میں سب سے اہم نماز ہے لہذا بچے کی عبادت درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نماز درست کرادی جائے۔ اپنے بچوں کو اگر ہم اللہ کا اچھا بندہ بنانا چاہتے ہیں تو ان کی نماز پر خصوصی توجہ دیں۔ نماز کے اچھا کیے بغیر کسی کا اللہ کا اچھا بندہ بن جانا مشکوک امر ہے۔

اگر بچے کی نماز صحیح ہو جائے گی تو اس کی جملہ زندگی میں اللہ کی بندگی کے جمع پہلو بھی سنور جائیں گے، ان شاء اللہ۔ لیکن اگر اس کی نماز خراب رہ گئی تو زندگی کے دیگر شعبوں میں اس کا اللہ کا بندہ بن کر زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلَاتُهُ، فَإِنْ صَلَحَتْ فَقَدْ أَفْلَحَ وَأَنْجَحَ، وَإِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ»¹

”قیامت والے دن سب سے پہلے انسان کے اعمال میں سے اس کی نماز کا حساب لیا جائے گا۔ پس اگر نماز درست نکلی تو وہ فلاح پا جائے گا اور کامیاب ہو جائے گا اور اگر نماز خراب نکلی تو ناکام ہو جائے گا اور نقصان میں رہ جائے گا۔“

اور جہاں تک اخلاق کا معاملہ ہے کہ بچے کے رویے درست ہو جائیں تو اس میں جو ایک چیز کہ جسے توجہ (focus) کرنے سے بچے کے تمام رویے درست ہوتے چلیں جائیں گے، ان شاء اللہ، وہ خیر خواہی ہے۔ جس طرح نماز کے درست ہونے سے جملہ عبادات درست ہو جائیں گی، اسی طرح بچے میں خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو جانے سے اس کے تمام رویے اور اخلاق درست ہوتے چلے جائیں گے، ان شاء اللہ! ایک روایت کے

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الصَّلَاةُ، 535/1

الفاظ ہیں:

عَنْ تَمِيمِ الدَّارِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «الدِّينُ النَّصِيحَةُ» قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: «لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَيِّمَةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَاقَمَتِهِمْ»¹

”حضرت تميم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دین تو نام ہی خیر خواہی کا ہے۔ ہم نے کہا: اے رسول اللہ ﷺ! کس کے لیے خیر خواہی؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے لیے، اللہ کے رسول ﷺ کے لیے، اللہ کی کتاب کے لیے، مسلمان حکمرانوں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے۔“

اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب کے لیے خیر خواہی تو واضح ہے۔ عام لوگوں کے لیے خیر خواہی سے مراد ان کے ساتھ خالص اور کھرا تعلق رکھنا کہ جس میں کوئی کھوٹ، ملاوٹ، دھوکہ، فریب اور جھوٹ نہ ہو۔ یعنی کسی کا برا کرنا تو دور کی بات کسی کا برا سوچنا یا چاہنا بھی نہ ہو اور ہر ایک کی بھلائی مقصود ہو۔ بچوں میں اگر دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے۔

بچے جس فطرت پر پیدا ہوتے ہیں اس میں اپنی ذات کے ساتھ تو خیر خواہی کا جذبہ موجود ہوتا ہی ہے کہ بچہ اپنی ذات کی ہمیشہ خیر خواہی ہی چاہتا ہے لیکن دوسروں کے ساتھ صرف اتنا ہی اخلاص رکھتا ہے کہ وہ اس کی ذات کے ساتھ خیر خواہی سے ٹکراتا نہ ہو۔ شعوری عمر سے پہلے بچہ اپنی ذات کو اپنے بہن بھائیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور یہاں ہی سے والدین نے ان کی تربیت کا عمل شروع کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور گھر میں کوئی کھلونا آئے تو ہر بچے کی یہ خواہش ہوگی کہ یہ اسے ملے نہ کہ اس کے بہن بھائی کو۔ ہر بچہ اپنے مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور اسے دینی بھی چاہیے کیونکہ وہ اسی فطرت پر پیدا ہوا ہے لیکن تربیت کرنے کا میدان یہ ہے کہ بچے میں ایک تو خیر خواہی کا جذبہ پیدا کیا جائے کہ کسی کے نقصان کے بدلے میں اپنا مفاد حاصل کرنے سے اسے ہر گز خوشی نہ ہو اور دوسرا ایثار کا مادہ کہ وہ کبھی کبھار اپنا مفاد دوسرے کو ہبہ (gift) بھی کر دیا کرے۔ یہی رویہ عام

¹ صحیح مسلم، کتاب الإيمان، باب بیان أنَّ الدِّينَ النَّصِيحَةُ، 74/1

لوگوں سے اخلاص یا خیر خواہی رکھنا کہلاتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اخلاق دو قسم کے ہیں۔ ایک فطری یعنی پیدائشی جو بچہ اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے اور دوسرا دینی یعنی جن کی تعلیم دین نے دی ہے۔ فطری اخلاق کا مادہ یا جوہر حیا ہے۔ جس میں حیوانہ ہوا میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ ہم نے فطری اخلاق کا یہاں ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ تو بچہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے الا یہ کہ اس کا معاشرہ اس قدر بگڑا ہوا ہو کہ اسے فطرت سے پھیر دے۔ ہم نے یہاں دینی اخلاق کا ذکر کیا ہے جو کہ کسی (earned) ہوتے ہیں یعنی جنہیں حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے اور جملہ دینی اخلاق کی بنیاد اخلاص یعنی تعلقات میں خالص پن پر ہے اور لوگوں کے ساتھ تعلق کا خالص ہونا ہی ان کی خیر خواہی کہلاتا ہے۔

بچوں کی تربیت میں والدین کا کردار

بچوں کی تربیت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اردو زبان میں سراج الدین ندوی صاحب کی کتاب ”بچوں کی تربیت کیسے کریں“ ایک اچھی تحریر ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کے مسائل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بلوغت سے پہلے اور بلوغت کے بعد بچوں کے مسائل میں کافی فرق آجاتا ہے۔ فی الحال ہم سات سے دس سال کے بچوں کے بعض مسائل پر گفتگو کرنا چاہ رہے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کی تلقین کرو اور اگر دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اسے سزا بھی دو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا، وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ»¹
 ”جب بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دو۔ اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھیں تو انہیں سزا دو۔ اور دس سال کے بعد

¹ سنن أبي داود، کتاب الصَّلَاة، باب مَتَى يُؤْمَرُ الْغُلَامُ بِالصَّلَاةِ، 133/1

ان کے بستر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دو۔“

بچوں کو نماز کی طرف کیسے لایا جائے؟ یہ والدین کی ایک پریشانی ہے۔ بچوں کی نیکی شعوری نہیں ہوتی ہے بلکہ کسی جبر یا لالچ کے سبب سے ہوتی ہے۔ شعوری نیکی عموماً بلوغت کے بعد کی عمر میں ہوتی ہے۔ اس لیے بچوں سے کوئی بھی کام لینے کے دو طریقے ہیں: سختی یا پیار۔ بعض حالات میں پیار سے کام لینا پڑتا ہے اور بعض اوقات سختی کرنی پڑتی ہے۔ محض سختی یا صرف پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں۔

بعض والدین اپنے مزاج میں سخت ہوتے ہیں اور اگر صرف مزاج ہی کی سختی ہو تو بھی گزارہ چل جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ بچوں سے لاپرواہ بھی ہوتے ہیں اور ان کے پاس بچوں کی تربیت کے لیے وقت بھی نہیں ہوتا۔ ایسے والدین بچے کو عمر کے پندرہویں برس تک تو بالکل نہیں پوچھیں گے اور سولہویں برس ڈنڈے سے نماز پڑھانے کی کوشش کریں گے اور بچہ اس وقت سختی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو گا۔ بچوں کی تربیت کی یہ ترتیب بالکل غلط ہے۔

ایک والد صاحب نے مولانا صاحب سے اپنے بچے کی شکایت کی کہ وہ نماز نہیں پڑھتا اور جب میں اس پر سختی کرتا ہوں تو وہ مجھ سے الجھ پڑتا ہے۔ مولانا صاحب نے پوچھا کہ بچے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ سترہ سال کا ہو گا۔ مولانا نے کہا کہ کیا چودہ پندرہ سال کی عمر تک اسے کبھی نماز کے لیے کہا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ مولانا نے کہا تو آپ کی سختی کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

اسی طرح بعض والدین عمر کے ساتویں سال میں ہی بچے سے یہ امید کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ ابوعبصریؓ اور جنید بغدادیؓ بن جائیں۔ اسی طرح یہ بھی درست طریقہ نہیں ہے کہ ساتویں سال میں ہی بچے کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کے لیے ڈنڈے کا استعمال کیا جائے یا سات سال کی بچی کو زبردستی حجاب پہنا دیا جائے۔ یہ عمر اس معاملے میں سختی کرنے کی نہیں ہے۔

یہ بات بہتر معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی معاملے میں بچے کی تربیت میں تدریج کے

اصول کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً نماز ہی کا معاملہ لے لیں، عمر کے ساتویں برس والدین بچے کو نماز سکھا دیں اور اس کے پڑھنے کا کہنا شروع کر دیں۔ وہ کبھی پڑھ لے گا اور کبھی نہیں پڑھے گا۔ اگر پڑھ لیتا ہے تو اسے شاباش دیں اور اگر نہیں پڑھتا تو نظر انداز کریں۔ آٹھویں برس میں اسے نماز کا پابند بنانے کے لیے کچھ لالچ بھی دیں۔ اس لالچ میں نماز سے آخرت میں حاصل ہونے والے مادی فوائد اور دنیا میں نماز پڑھنے پر کسی قدر انعام بھی شامل ہو سکتا ہے۔ عمر کے نویں برس میں بچے کو نماز چھوڑنے پر ڈانٹ ڈپٹ کریں اور پھر دسویں برس میں اگر وہ نماز میں کوتاہی کرے تو سزا بھی دیں۔ اس طرح کی تدریج کو اگر ملحوظ رکھا جائے گا تو بچے میں دین سے رد عمل (reaction) پیدا نہیں ہوگا۔

ایک دوست کا بیٹا، جس کی عمر آٹھ سال تھی، کافی عرصے سے اپنے والد سے فلائنگ ہیلی کاپٹر مانگ رہا تھا۔ انہوں نے کہا یہ مہنگا کھلونا ہے، تمہیں ایسے نہیں لے کر دوں گا۔ اگر تم چالیس دن پانچوں نمازیں پڑھ لو تو لے دوں گا اور اس میں بھی کوئی جماعت کے ساتھ پڑھنے کی شرط نہیں لگائی اور یہ بھی کہا کہ صرف فرض پڑھ لو تو پھر بھی انعام مل جائے گا۔ یہ بات طے ہو جانے کے بعد نماز کا ایک چارٹ بنایا اور گھر میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر لگا دیا۔ انہیں ویسے امید نہ تھی کہ بچہ چالیس دنوں کی نمازیں پوری کرے گا لیکن بچوں میں ازربج اور جذبہ بہت ہوتا ہے لہذا اس نے ایک قیمتی کھلونا حاصل کرنے کی خواہش میں چالیس دن کی نمازیں مکمل کر لیں۔ وہ ہر دن کی نمازوں کے آگے اپنے سائن بھی کرتا رہا۔ اس طرح چالیس دن بعد اسے ہیلی کاپٹر تو مل گیا لیکن وہ فرائض کا بھی پابند ہو چکا تھا۔ اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ اب اسے نماز چھوڑنے پر الجھن ہوتی تھی۔ جب اس معاملے کو کوئی چھ ماہ گزر گئے تو اس کی نانی اماں نے اسے سنتوں کی ترغیب دلائی تو اب چونکہ فرائض کا عادی تو تھا ہی، ساتھ ہی ترغیب میں سنتیں بھی پڑھنے لگا۔ اگرچہ ابھی بھی اس کی نماز میں یہ کمی ہے کہ جلد پڑھتا ہے اور بعض اوقات دیر کر دیتا ہے لیکن پڑھتا ضرور ہے۔

کئی دفعہ والد نے دیکھا کہ کارٹون دیکھتے یا گیم کھیلتے ہوئے آذان ہوئی اور اس نے

درمیان میں وقفہ دے کمپیوٹر کے ساتھ خود سے ہی جائے نماز بچھائی اور نماز پڑھ لی۔ بچے کی والدہ نے والد سے پوچھا کیا یہ آپ کے ڈر سے نماز پڑھتا ہے یا سے اللہ کا خوف ہے؟ انہوں نے کہا مجھے اتنی خوش فہمی نہیں ہے۔ میرے خیال میں نہ میرا ڈر ہے اور نہ اللہ کا خوف بلکہ یہ اس کی عادت بن گئی ہے۔ اور عادت اگر پوری نہ ہو تو انسان الجھن اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے لہذا یہ عادت نماز پڑھ رہا ہے۔ اور اس عمر میں اتنا بھی کافی ہے۔

ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے بچوں کے بارے بڑی اونچی امیدیں لگائے بیٹھا ہے۔ اگر دین دار ہے تو اس کا دل ہے کہ میرا بچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ بن جائے۔ دنیا دار ہے تو اس کی خواہش ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر بن جائے۔ بچوں کے لیے آئیٹیل ہمیشہ چھوٹا رکھیں کہ جسے وہ حاصل کر سکتے ہوں۔ اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت ہو لیکن اس تعلیم و تربیت میں ہم سے کوئی مطالبہ نہ کیا جائے بلکہ یہ سارا کام اسکول یا مدرسہ کے اساتذہ کریں۔ ہمارے بچوں کی اس وقت تک اچھی تربیت نہیں ہوگی جب تک ہم خود ان کے لیے وقت فارغ نہیں کریں گے۔ بچے کو نماز سکھانی ہے تو ہماری خواہش ہے کہ قاری صاحب سکھادیں۔ اور یہ ایک آزمائی ہوئی بات ہے کہ اگر والدین خود سے بچے کو نماز سکھائیں تو بچے کی ایک تو نماز سیکھنے میں دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے اور دوسرا اس کے سیکھنے کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے۔

ایک دوست کا بیٹا حفظ کر رہا تھا، تین پارے کر لیے تھے۔ شروع میں ایک پارے تک اسے قاری صاحب سبق یاد کرواتے تھے تو نہ تو اس کا حفظ میں دل لگتا تھا اور روزانہ شکایات بھی آ جاتی تھیں کہ سبق صحیح یاد نہیں ہے، یا سبق یاد کرنے میں کافی وقت لگا دیتا ہے۔ پھر انہوں نے اسے خود سے وقت دینا شروع کیا اور گھر سے سبق یاد کروا کے قاری صاحب کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ اس طرح حفظ میں اس کی دلچسپی بڑھنی شروع ہو گئی۔ وہ جب اسے سبق یاد کرواتے تو ساتھ میں حوصلہ دیتے۔ اپنے حفظ کے کچھ واقعات سنا دیتے۔ کچھ ایسی تدابیر بتلا دیتے کہ جس سے وہ سبق جلد یاد کر لے۔ اب ظاہری بات ہے کہ جو توجہ والدین اپنے بچوں کو دے سکتے ہیں وہ کوئی بھی استاذ نہیں دے سکتا۔ بچے

کو جب کوئی چیز یاد نہ ہو تو وہ اسے بوجھ سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ پڑھائی سے بھاگے گا یا بہانے بنائے گا۔ اور جب اسے سبق یاد ہو گا تو وہ پڑھائی سے بھاگنے کا نام بھی نہ لے گا۔

جدید دور میں لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ، ٹیبلٹ، اسمارٹ فون اور آئی فون نے انسان کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ اس کے پاس اپنے بچوں کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ سوشل میڈیا نے ہماری حقیقی سوشل لائف کو ختم کر دیا ہے۔ ہم فیس بک کے ساتھیوں سے قریب اور گھر والوں سے دور ہو گئے ہیں۔ ایک اسکول کے بچوں کو اپنے آئیڈیل کے بارے میں لکھنے کو کہا گیا تو ایک بچے نے اپنے مضمون کا عنوان یہ رکھا کہ ”کاش میں ایک اسمارٹ فون ہوتا!“ کہ شاید اس بہانے مجھے اپنے والدین کی توجہ ملتی۔

اسی طرح والدین کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے بچے کو جو لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ یا اسمارٹ فون لے کر دیا ہے تو اس کی اس مشین پر سرگرمیاں (activities) کیا ہیں۔ بچے عموماً پڑھائی اور اسائنمنٹ کے بہانے یہ آلات خریدتے ہیں اور پھر منفی سرگرمیوں میں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ اور والدین اپنی اولاد پر اندھا اعتماد کرنے کی وجہ سے پہلے تو غافل رہتے ہیں اور جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو اب پریشان ہوتے ہیں۔ اگر بچوں کو کمپیوٹر وغیرہ لے کر دینا بھی ہو تو اسے لاؤنج میں رکھنا چاہیے تاکہ ان کی سرگرمیاں والدین کی نظروں میں رہیں۔

والدین اپنے بچوں کی تربیت میں کیسے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، اس بارے میں عظیم الرحمن عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

”میرے والدین نے بچپن ہی سے مجھے ہم نصابی سرگرمیوں اور مطالعہ کی جانب راغب کیے رکھا۔ پہلے عمرو عیار اور ٹارزن کی کہانیاں ہوتی تھیں، پھر اشتیاق احمد کے جاسوسی ناول آئے، پھر ابن صفی اور مظہر کلیم کی عمران سیریز نے جگہ لی، پھر ادبی شمارے شامل ہوئے اور ہوتے ہوتے آج الہامی صحائف تک بات آگئی۔ اس سب کے پیچھے حقیقی محرک بلاشبہ میرے والدین ہی

رہے۔ اسی طرح اسکول میں کوئی ڈرامہ ہو یا ٹیلو مجھے اس میں خوشی سے یا زبردستی حصہ لینا ہی ہوتا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا جب اسکول میں رزلٹ کے موقع پر ایک بڑے فنکشن کا انعقاد کیا گیا جس میں کچھ معروف نام بھی مدعو تھے اور سب بچوں کے خاندان والوں کی شرکت بھی لازم تھی۔ میری اردو کا تلفظ وادائیگی چونکہ دیگر بچوں سے بہتر تھا لہذا مجھے سورہ الرحمن کی تلاوت کے بعد اس کا ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ فنکشن کا دن آیا تو پنڈال کھپا کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے اسٹیج پر لوگوں کے سامنے اتنا طویل بولنا تھا۔ میرا ایک کزن جو میرے ہی ساتھ اسکول میں تھا، تقریر کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور بولنے کے لئے خوب پر اعتماد تھا۔ پروگرام شروع ہوا اور میری ترجمے کی باری آئی۔ اسٹیج پر میرا نام پکارا گیا اور میں لرزتا کانپتا ٹائیک کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ترجمہ کرنے کے لئے منہ کھولا تو لگا کہ جیسے آواز چلی گئی ہو۔ لاچارگی سے سامنے دیکھا تو سامعین میں سے کچھ گھور رہے تھے تو کچھ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ دماغ ماؤف ہو گیا اور الفاظ مفقود۔ بڑی مشکل سے سوری کہا اور اسٹیج سے اتر آیا۔ لوگ ہنس رہے تھے، دوست مذاق اڑا رہے تھے اور مجھ پر ذلت کا ایک شدید بوجھ تھا جس کے تلے میں دبا جاتا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے والدہ اور ٹیچر دونوں میرے پاس آئے تو میں نے روتے ہوئے قسم کھانی چاہی کہ اب کبھی اسٹیج پر نہ آؤں گا، لیکن والدہ نے لپک کر تسلی دی کہ کیا ہوا جو تم بول نہ سکے؟ تم نے حصہ لیا اور کوشش کی یہی سب سے اہم ہے۔ اگلی دفعہ بول بھی لو گے۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس دن میرے کزن کو بہترین تقریر کرنے پر پہلا انعام دیا گیا اور میں ایک شکست خوردہ انسان کی طرح خود کو چھپاتا رہا۔ وہ ہیر و تھا اور میں زیرو۔ والد صاحب نے بھی خوب ہمت بندھائی اور ناراض ہونے کی بجائے مجھے میری پسند کی جگہ کھانا کھانے لے گئے۔ اس بہترین برتاؤ کے باوجود میں اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد کراچی میں سیرت النبی ﷺ پر ایک بہت بڑے تقریری مقابلے کا اعلان کیا

گیا کہ جس میں شہر کے نمائندہ اسکولز نے شرکت کرنی تھی اور جسے میڈیا کی کوریج حاصل تھی۔ اس کے انتخابی مرحلے کا اسکول میں مہینوں پہلے اعلان کر دیا گیا اور اس کے لئے بچوں ہی کے ہاتھوں اسکول لیٹر گھر بھیجا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ لیٹر میری والدہ کے ہاتھ لگ گیا تو انہوں نے مجھے کوشش کرنے پر مجبور کر دینا ہے۔ میں نے لیٹر چھپا لیا مگر ہائے رے قسمت کہ جہاں چھپایا، وہاں والدہ نے صفائی کی نیت سے تلاشی لے لی اور یوں ان کے علم میں آ گیا۔ حسب توقع مجھے والدہ نے اپنی محبت سے مجبور کر دیا کہ میں کوشش تو کروں اور اگلے ہی روز میرے ساتھ اسکول جا پہنچی۔ انتخابی مراحل کے دو ابتدائی مرحلے ہو چکے تھے اور اس روز تیسرا اور حتمی مرحلہ تھا۔ والدہ نے استاذوں کو راضی کیا کہ وہ مجھے بھی سن لیں۔ میں نے آدھے دل سے پڑھا مگر پھر بھی استاذوں کو بھگا گیا۔ انہوں نے مجھے ہی بھیجنے کا فیصلہ کر دیا۔ یہ فیصلہ جہاں میرے والدین کے لئے خوشی کی نوید تھا، وہاں میرے لئے گویا موت کے پروانے سے کم نہ تھا۔ دن رات تیاری کر کے تقریر تیار کی اور اٹھتے بیٹھے اسے یاد کرتا رہا۔ رات میں سوتے ہوئے بھی اپنی سابقہ ذلت کا منظر سامنے آ جاتا اور میں گھبرا کے اٹھ بیٹھتا۔ مقابلے کا دن آیا اور ہم میزبان اسکول میں جا پہنچے۔ ایک سے ایک تقریریں ہوئیں اور سب سے بہترین تقریر میزبان اسکول ہی کی ایک لڑکی نے کی۔ میرا نام پکارا گیا تو والد صاحب نے مسکرا کر ہمت بندھائی۔ اسٹیج پر گیا اور تقریر کا آغاز کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے احساس ہوا کہ سننے والے بھی انہماک سے سن رہے ہیں اور کچھ خواتین توروٹنے لگی ہیں۔ ابھی میری تقریر آدھی ہی ہوئی تھی کہ اچانک مائیک بند ہو گیا اور کچھ کے بقول میزبان اسکول کی طرف سے بند کر دیا گیا تاکہ میں گھبرا جاؤں اور پھر انعام ان ہی کی طالبہ کے پاس آئے۔ واللہ اعلم۔ مائیک بند ہوتے ہی میرے چہرے پر گھبراہٹ آئی تو والد صاحب اپنی نشست سے کھڑے ہو کر پکارے کہ عظیم دگنی آواز سے بولو۔ والد صاحب کی صدائے مجھ میں نئی قوت پھونک دی اور میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ زور و شور

سے بولا۔ تقریر ختم ہوئی تو نہ صرف تالیاں بجتی رہیں بلکہ بہت سے استاذ مجھے چٹا کر پیار کرنے لگے۔ آخر میں مجھے پہلا انعام دیا گیا۔ لوگ غول بنا کر مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ اگلے روز اسکول میں والہانہ استقبال ہوا اور کچھ لوگوں نے تو آٹو گراف تک لیا۔ ایک ہی دن میں مجھے وہ عزت حاصل ہوئی جس کا تصور بھی میرے گمان میں نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے تقریری مقابلے جیتے، کالج آیا، یونیورسٹی آئی مگر میری جیت کا سلسلہ نہیں رکا۔ شہری اور ملکی سطح کا کوئی اعزاز شاید ہی ایسا ہو جسے حاصل نہ کیا ہو۔ میری مہنگی یونیورسٹی نے نہ صرف میری فیسیں معاف کر دیں بلکہ طرح طرح کے مالی انعامات بھی مجھے ملتے رہے۔ اسی کی بنیاد پر مجھے مختلف آن اسکرین اور آف اسکرین آفرز آتی رہی، اخباروں میں انٹرویوز آتے رہے اور آج تک اسی فن خطابت کے ثمرات مجھے مختلف طریق سے حاصل ہوتے رہے ہیں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ کیا ہوتا؟ اگر میں پہلی ذلت سے گھبرا کر کوشش ترک کر دیتا؟ کیا ہوتا جو میرے والدین نے میری ہمت بندھا کر مجھے کوشش کرنے پر مجبور نہ کیا ہوتا؟ کیا ہوتا جو اس دن والدہ کو میرا چھپایا ہوا لیٹر نہ ملا ہوتا؟ الحمد للہ! کہ ایسا کچھ نہ ہوا اور میں یہ بھی سمجھ پایا کہ پائیدار کامیابی کی کلید عارضی ناکامی کے بعد بھی مسلسل کوشش ہے۔“¹

بچوں کی عمر کے اعتبار سے ان کے مسائل مختلف ہوتے ہیں۔ بلوغت سے پہلے کے مسائل کچھ اور ہیں۔ بلوغت کے بعد کے کچھ اور۔ اور ان کی شادیوں کے بعد کے بالکل کچھ اور۔ والدین کو یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ جیسے ہی بچی بالغ ہو تو والدہ اسے حیض (menses) وغیرہ کے مسائل کی تعلیم دے۔ اور لڑکا جب بالغ ہو جائے تو والد اسے اختتام وغیرہ کے مسائل سے آگاہ کرے تاکہ وہ پاکی اور ناپاکی کے مسائل جان سکیں۔ اسی نوے فی صد اولاد کا شکوہ یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے نوجوانی میں بلوغت کے مسائل کا علم اپنے دوستوں سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ اور لڑکوں میں اپنے دوستوں سے ایسی باتیں

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

سکھنے کا یہ رجحان بعض اوقات انہیں غلط رستے کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ والدین کو اس سب کچھ کا احساس کرنا چاہیے۔

اسی طرح شادیوں کے بعد بہن بھائیوں میں حسد کے مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ جس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔ بعض اوقات تو والدین اور اولاد کے تعلق کی نوعیت ایسی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے گہرے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرائیڈ خاندانی الجھاؤ کی نشاندہی کرنے میں تو درست ہے لیکن اس کی وجہ مخالف جنس کی خواہش (Oedipus complex) قرار دیتے ہوئے قطعی طور غلط تجربہ کرتا ہے۔ خاندان میں ماں کا جھکاؤ عام طور بیٹے کی طرف اس لیے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو اپنا حریف سمجھنے کے سبب سے اس کے مقابلے میں گھر ہی سے اپنے لیے ایک سہارا تلاش کرتی ہے اور یہ سہارا اسے بیٹے کی صورت میں میسر آتا ہے لہذا ماں کی توجہ بیٹوں کی طرف زیادہ ہو جاتی ہے۔ اب بیٹی جب والدہ کے بیٹوں کی طرف زیادہ میلان کو واضح طور محسوس کرتی ہے تو اسے یہ ماں کی زیادتی معلوم ہوتی ہے اور اس کے اور ماں کے مابین تعلقات میں ایک کھچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کھچاؤ کے نتیجے میں بیٹی کا رجحان منطقی طور باپ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح خاندان تقسیم ہو جاتا ہے اور باپ اپنے بیٹوں اور ان کی ماں کو ایک ایسی پارٹی سمجھنا شروع کر دیتا ہے جو خاندان میں اس کی حیثیت اور اختیار کو چیلنج کرتی ہے۔ خیر یہ تو خاندانی الجھاؤ کے بارے ایک عمومی بات ہے اور اس بارے کچھ اور بھی باتیں کہی جاسکتی ہیں کہ جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم جب تک خاندانی جھگڑوں کے صحیح اسباب تک نہ پہنچ پائیں گے تو ان کا حل بھی نہ کر سکیں گے۔

والدین کے حقوق

ہمارا ایک تعلق اپنے رب سے ہے اور اس تعلق کا نام ”بندگی“ ہے۔ اور دوسرا تعلق اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، بیوی بچوں، دوست احباب، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ملازمین سے ہے کہ جس تعلق کا نام ”معاشرت“ ہے۔ پس انسان کی فلاح اس میں ہے

کہ وہ اپنی بندگی میں حسن پیدا کرے اور اپنی معاشرت کو خوبصورت بنائے۔
 اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں چار مقامات پر اپنا حق بیان کرنے کے فوراً بعد والدین کا حق بیان کیا ہے کہ جس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ کے بعد انسان پر اگر کسی کا سب سے زیادہ حق بنتا ہے، تو وہ اس کے والدین کا حق ہے۔ انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح کا دار و مدار ”حسن بندگی“ اور ”حسن معاشرت“ پر ہے۔ انسان کی بندگی میں حسن اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ اپنے رب کے ساتھ تعلق کو بہتر بنالے اور رب کے سب سے بڑے حق کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے اور وہ حق یہ ہے کہ وہ رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اور ”حسن معاشرت“ کی بنیاد بلکہ ابتدا والدین سے ہوتی ہے۔ اگر کسی انسان کا تعلق اپنے والدین سے اچھا نہیں ہے تو وہ انسان کبھی بھی معاشرے کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص خود غرضی اور نفس پرستی کی انتہا پر ہوتا ہے کہ جس نے دنیا میں اپنے سب سے بڑے محسن کا شکر ادا نہ کیا تو وہ اور کیا کسی کا بنے گا؟ یا اور کیا کسی کا شکر ادا کرے گا؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک شخص اپنے والدین سے اچھا نہ ہو لیکن دوسروں سے اچھا ہو۔ دوسروں سے اس کی جو اچھائی نظر آتی ہو گی تو وہ نظروں کا دھوکا ہوگا، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ پس اچھا انسان وہی ہے جو اپنے والدین سے اچھا ہو ورنہ بچوں سے اچھا کرنا تو جانوروں میں بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۖ﴾ (23) **وَاحْفَظْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا** ﴿[الإسراء: 24]

”اور آپ کے رب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو گے۔ اور یہ کہ تم اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے۔ پس اگر تمہارے والدین میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں ہی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک مت کہو۔ اور انہیں جھڑک کر جواب مت دو۔ اور ان سے نرم

لہجے میں احترام کے ساتھ بات کرو۔ اور ان کے لیے نرمی اور شفقت کے ساتھ اپنے بازو پھیلانے رکھنا۔ اور ان کے لیے یہ دعا کرتے رہنا کہ اے اللہ تعالیٰ! ان پر ایسے رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔“

والدین کی خدمت اس قدر ضروری ہے کہ اسے جہاد و قتال پر بھی ترجیح حاصل ہے۔ اگر ایک طرف جہاد کے لیے منادی ہو جائے اور دوسری طرف انسان کے بوڑھے والدین ہوں تو اسے اپنے والدین کی خدمت کرنی چاہیے کہ ان حالات میں یہی اس کا جہاد ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَسْتَأْذِنُهُ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ: «أَحْيِ وَالِدَاكَ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ»¹

”عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے جہاد میں شرکت کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں! آپ نے کہا کہ جا کر ان کی خدمت کرو اور یہی تمہارا جہاد ہے۔“

بندگی کوئی لذت اور شہرت حاصل کرنے کا نام تھوڑا ہی ہے کہ جس نیکی میں قلب کو لذت حاصل ہو یا نفس کو شہرت ملے تو انسان اس کی طرف تودوڑ کر جائے اور جس نیکی کی اللہ اور رسول ﷺ تاکید فرما رہے ہوں لیکن اس پر دل آمادہ نہ ہو اور نفس پر جبر کرنا پڑتا ہو تو انسان اس نیکی کو ترک کر دے۔ ہمارے ہاں عموماً نیکیاں اس بنیاد پر ہوتی ہیں کہ اس میں میرے قلب کو کیفیات کتنی حاصل ہوگی اور اس نیکی کو معاشرے میں کتنی بڑی نیکی سمجھا جاتا ہے حالانکہ نیکی کرنے میں اصلاً یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان حالات میں اللہ کی نظر میں میری کون سی نیکی بہت بڑی نیکی شمار ہوگی۔

والد کی حیثیت گھر کے سربراہ کی ہوتی ہے لہذا والد کا اصل حق ان کی بات ماننا ہے اور والدہ کی ذمہ داری اولاد کی پرورش کی ہوتی ہے لہذا ان کا اصل حق ان سے حسن

¹ صحیح مسلم، کتاب الزَّكَاةِ وَالصَّلَاةِ وَالْأَدَابِ، بَابُ بَرِّ الْوَالِدَيْنِ وَأَتْمَتِهَا أَحَقُّ بِهِ، 1975/4

سلوک رکھنا ہے۔ والد کے جمیع حقوق کو اگر ہم ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ لفظ اطاعت ہے اور والدہ کے تمام حقوق کو ایک لفظ میں جمع کریں تو وہ لفظ حسن سلوک ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «رِضَى الرَّبِّ فِي رِضَى الْوَالِدِ، وَسَخَطُ الرَّبِّ فِي سَخَطِ الْوَالِدِ»¹

”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے رب کو راضی کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے والد کو راضی رکھے۔ اور جو اپنے رب کو ناراض رکھنا چاہتا ہے تو اپنے والد کو ناراض رکھے۔“

والد کو راضی رکھنے سے مراد یہی ہے کہ گھر کے جمیع معاملات میں اپنے والد صاحب کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے۔ اور بعض اوقات صورت حال ایسی ہوتی ہے کہ کسی مسئلے میں اولاد کا دل اپنے والد کی اطاعت کی طرف مائل نہیں ہوتا اور انہیں اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے تو یہ بھی اولاد کے لیے بہت بڑی نیکی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «الْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَإِنْ شُتَّتْ فَأَضْعُ ذَلِكَ الْبَابُ أَوْ أَحْقَطَهُ»²

”ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ والد جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے۔ پس اگر تم چاہو تو اس دروازے کی حفاظت کر لو اور چاہو تو اس کو ضائع کر دو۔“

انسان جنت میں کسی دروازے سے ہی داخل ہو گا اور جنت میں داخل ہونے کے لیے جو دروازے ہیں، ان میں آسان ترین والد کا دروازہ ہے۔ یہ دروازہ کھلے گا تو انسان جنت میں داخل ہو سکے گا اور دروازے کے کھلنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا والد اس سے خوش ہو۔ اور دروازہ بند ہو گا تو انسان کے لیے جنت میں داخلہ بھی ممکن نہیں ہو گا اور دروازے کے بند ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کا والد اس سے ناراض ہو۔

¹ سنن الترمذی، أبواب البرِّ والصَّلة، باب ما جاء من الفضل في رضا الوالدين، 310/4-311

² سنن الترمذی، أبواب البرِّ والصَّلة، باب ما جاء من الفضل في رضا الوالدين، 311/4

اور والدہ سے حسن سلوک کا کیا معنی ہے، اس بارے ایک خوبصورت روایت پیش خدمت ہے کہ جو والدہ سے حسن سلوک کی بنیاد قائم کر دے گی، ان شاء اللہ۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّهُ قَالَ: كَانَ جُرَيْجٌ يَتَعَبَّدُ فِي صَوْمَعَةٍ، فَجَاءَتْ أُمُّهُ... فَقَالَتْ: يَا جُرَيْجُ أَنَا أُمُّكَ كَلِّمْنِي فَصَادَفْتُهُ يُصَلِّي، فَقَالَ: اللَّهُمَّ أُمِّي وَصَلَاتِي، فَأَخْتَارَ صَلَاتَهُ، فَرَجَعْتُ، ثُمَّ عَادْتُ فِي الثَّانِيَةِ، فَقَالَتْ: يَا جُرَيْجُ أَنَا أُمُّكَ فَكَلِّمْنِي، قَالَ: اللَّهُمَّ أُمِّي وَصَلَاتِي، فَأَخْتَارَ صَلَاتَهُ، فَقَالَتْ: اللَّهُمَّ إِنَّ هَذَا جُرَيْجٌ وَهُوَ ابْنِي وَإِنِّي كَلَّمْتُهُ، فَأَبَى أَنْ يُكَلِّمَنِي، اللَّهُمَّ فَلَا تُمَتِّهِ حَتَّى تَرِيَهُ الْمُؤَمَّسَاتِ. قَالَ: وَلَوْ دَعَتْ عَلَيْهِ أَنْ يُفَتَّنَ لَفُتِنَ. قَالَ: وَكَانَ رَاعِي ضَايٍ يَأْوِي إِلَى دَيْرِهِ، قَالَ: فَخَرَجَتْ امْرَأَةٌ مِنَ الْقَرْيَةِ فَوَقَعَ عَلَيْهَا الرَّاعِي، فَحَمَلَتْ فَوَلَدَتْ غُلَامًا، فَقِيلَ لَهَا: مَا هَذَا؟ قَالَتْ: مِنْ صَاحِبِ هَذَا الدَّيْرِ، قَالَ فَجَاءُوا بِفُتُوسِهِمْ وَمَسَاجِيهِمْ، فَنَادَوْهُ فَصَادَفُوهُ يُصَلِّي، فَلَمْ يُكَلِّمَهُمْ، قَالَ: فَأَخَذُوا يَهْدُمُونَ دَيْرَهُ، فَلَمَّا رَأَى ذَلِكَ نَزَلَ إِلَيْهِمْ، فَقَالُوا لَهُ: سَلْ هَذِهِ، قَالَ فَتَنَبَّسَ، ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَ الصَّبِيِّ فَقَالَ: مَنْ أَبُوكَ؟ قَالَ: أَبِي رَاعِي الضَّيَّانِ، فَلَمَّا سَمِعُوا ذَلِكَ مِنْهُ قَالُوا: نَبْنِي مَا هَدَمْنَا مِنْ دَيْرِكَ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، قَالَ: لَا، وَلَكِنْ أَعِيدُوهُ تُرَابًا كَمَا كَانَ، ثُمَّ غَلَاةً.¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بزرگ حضرت جرتج رضی اللہ عنہ اپنی خانقاہ میں ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی والدہ ایک دفعہ ان سے ملنے آئیں جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے تو والدہ نے کہا کہ اے جرتج! میں تیری والدہ ہوں، مجھ سے بات چیت کرو۔ حضرت جرتج رضی اللہ عنہ نے دل میں کہا کہ اے پروردگار! ایک طرف یہ نماز ہے اور دوسری طرف والدہ۔ تو انہوں نے نماز کو جاری رکھا اور والدہ کی بات نہ سنی۔ پھر کچھ دنوں بعد وہ دوبارہ تشریف لائیں اور کہا کہ اے جرتج! میں تیری والدہ ہوں، مجھ سے بات چیت کرو۔ حضرت جرتج رضی اللہ عنہ نے دل میں کہا کہ اے

¹ صحیح مسلم، کتاب البرِّ والصلۃ والأداب، باب تقدیم برِّ الوالدین علی التَّلَوُّع، 1976/4

پروردگار! ایک طرف یہ نماز ہے اور دوسری طرف والدہ۔ تو انہوں نے نماز کو جاری رکھا اور والدہ کی بات نہ سنی۔ تو اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ اے پروردگار! یہ جرتج میرا بیٹا ہے۔ میں نے اس سے بات چیت کرنی چاہی لیکن اس نے مجھے جواب نہ دیا۔ اے اللہ! یہ مرنے سے پہلے بدکار عورتوں کا منہ ضرور دیکھے۔¹ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اگر ان کی والدہ ان کے لیے عورتوں کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کی بددعا کرتیں تو وہ بھی قبول ہو جاتی۔ ایک چرواہا ان کی خانقاہ کے پاس کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ ایک دن ایک عورت بستی سے نکلی اور اس چرواہے نے اس سے بدکاری کی۔ پس وہ حاملہ ہو گئی اور اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ عورت سے جب پوچھا گیا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس کا ہے جو اس خانقاہ میں رہتا ہے۔ پس لوگ اپنی کلہاڑیاں اور نیچے لے کر وہاں پہنچے اور انہوں نے حضرت جرتج رضی اللہ عنہ کو پکارا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور انہوں نے لوگوں کی بات کا جواب نہ دیا۔ تو لوگوں نے ان کی خانقاہ کو گرانا شروع کر دیا۔ پس انہوں نے جب یہ دیکھا تو خانقاہ سے باہر نکلے اور لوگوں نے عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس سے پوچھیں کہ کیا معاملہ ہے؟ پس حضرت جرتج رضی اللہ عنہ مسکرائے اور بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ تمہارا باپ کون ہے؟ بچے نے جواب دیا کہ چرواہا ہے۔ پس جب لوگوں نے یہ کرامت دیکھی تو ان سے کہنے لگے کہ ہم آپ کی خانقاہ سونے اور چاندی سے بنا دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح یہ پہلے مٹی کی تھی، ویسے ہی بنا دو۔ اس کے بعد وہ پھر خانقاہ میں داخل ہو گئے۔“

اولاد کے حقوق

ہماری شریعت نے جس وضاحت سے والدین کے حقوق کو بیان کیا ہے، اتنی تفصیل

¹ والدہ نے یہ دعا نہیں کی تھی کہ بدکاری میں مبتلا ہوں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اگر ان کی والدہ یہ دعا بھی کر دیتیں تو وہ بدکاری میں بھی مبتلا ہو جاتے۔ والدہ نے صرف یہ بددعا دی کہ بدکار عورتوں کا منہ دیکھ لیں تاکہ ان سے اپنی پرہیزگاری کا زعم جانا رہے۔

سے اولاد کے حقوق بیان نہیں فرمائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کا کرنا انسان کی جبلت اور عادت میں شامل ہے کہ جانور بھی اپنی اولاد کا کرتے ہیں۔ اگر والدین اپنی اولاد کا کرنا چھوڑ دیں تو نسل انسانی تباہ ہو جائے۔ زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں کہ جن میں والدین اپنی خواہش پر اپنی اولاد کی خواہش کو ترجیح دیتے ہیں اور اس اشار میں سکون اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ اولاد اگر زیادہ ہو تو ایک کی طرف زیادہ میلان ہونے کی وجہ سے دوسری اولاد کے حقوق متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ تو فطری بات ہے کہ کسی اولاد سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور کسی سے کم کہ اس میں انسان کا اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے جیسا کہ عام طور گھر میں سب سے چھوٹے بچے کو والدین کا پیار زیادہ ملتا ہے۔ لیکن اللہ عزوجل نے والدین کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ ظاہری معاملات میں اپنی اولاد کے مابین عدل کریں۔ والدین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ اپنی زندگی میں ہی بعض اولاد کو تولاؤلوں کی طرح نوازتے رہیں اور بعض کو یتیموں کی طرح بھلائے رکھیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ»¹

”اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنی اولاد میں عدل کرتے رہو۔“

ایک صحابی نے اپنے ایک بیٹے کو اپنا ایک باغ ہبہ (gift) کرنا چاہا تو انہوں نے آپ ﷺ سے اس بارے کہا کہ آپ اس واقعے کے گواہ بن جائیں۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تمہاری اور بھی اولاد ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، ہے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ میں اس ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا۔² اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے یہ بھی کہا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری ساری اولاد تمہاری فرمانبرداری ہو تو ایسا امت کرو۔³ آپ ﷺ نے اس بات کو ظلم قرار دیا ہے کہ والدین اپنی کسی اولاد کو جائیداد ہبہ کریں اور کسی کو محروم

¹ صحیح البخاری، کتاب الہبۃ وفضلہا والتحریر علیہا، باب الإشہاد فی الہبۃ، 158/3

² صحیح مسلم، کتاب الہبات، باب کراہۃ تفضیل بعض الأولاد فی الہبۃ، 1243/3

³ ایضاً

رکھیں بلکہ آپ نے ساتھ ہی یہ توجہ بھی دلا دی ہے کہ جس اولاد کو محروم رکھو گے اسے تم اپنی اس بے انصافی سے خود اپنا نافرمان بنا دو گے لہذا ایسا مت کرو۔

اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بیٹا عطا فرمائے لہذا جب ان کے ہاں بیٹی ہوتی ہے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو اپنی خواہش کی وجہ سے اور کچھ معاشرتی دباؤ کے سبب سے۔ لہذا ایسے والدین بیٹیوں کو عموماً اپنے لیے بوجھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ بیٹیاں ہی تو ہیں کہ جن سے آدم علیہ السلام کی نسل آگے چل رہی ہے۔ اگر یہ آج طے کر لیں کہ انہوں نے اولاد پیدا نہیں کرنی تو نسل انسانی کا سلسلہ رک جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا مِنْ رَجُلٍ تَذَرُكُ لَهُ ابْنَتَانِ، فَيُحْسِنُ إِلَيْهِمَا مَا صَحَبَتَاهُ - أَوْ صَحَبَتْهُمَا - إِلَّا أَذْخَلْتَاهُ الْجَنَّةَ»¹

”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص کے دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کی اچھی تربیت کرے تو وہ دونوں اس کو جنت میں داخل کرنے کا سبب بن جائیں گی۔“

اولاد کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ والدین خاص طور والد انہیں وقت دیں، ان کے پاس بیٹھیں، ان کے مسائل سنیں۔ ہمارے ہاں والد صاحب کی اولاد سے محبت ذمہ داری والی محبت ہوتی ہے کہ ان کی تعلیم، صحت اور کھانے پینے کی ذمہ داری اٹھالی تو گویا محبت کا اظہار ہو گیا جبکہ اولاد کی خواہش ہوتی ہے کہ والد صاحب انہیں ویسے ہی پیار کریں، ساتھ چمٹائیں، باتیں کریں، وقت دیں جیسے کہ والدہ کرتی ہیں۔

کورٹ میرج

جہاں تک میرے علم میں ہے تو کورٹ میرج ایک غلط اصطلاح ہے۔ کورٹ میں

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الأَدَب، باب بِرِّ الْوَالِدِ، وَالْإِحْسَانِ إِلَى الْبَنَاتِ، 1210/2

کوئی میرج نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی ہمارے حج حضرات اتنے فارغ ہیں کہ شادیاں کرواتے پھریں۔ ہوتا اصل میں یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی حج کے سامنے حاضر ہو کر یہ بیانِ حلفی دیتے ہیں کہ ہم نے اپنی آزاد مرضی سے نکاح کر لیا ہوا ہے۔ پس کورٹ میرج میں وہ حج کے سامنے نکاح پڑھواتے نہیں ہیں۔ یہ نکاح وہ کسی دوست کے گھر میں، تھانے میں یا وکیل کے آفس میں کروا چکے ہوتے ہیں اور حج کو صرف اس کی رپورٹ کرتے ہیں۔ اور اس رپورٹ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کے گھر والے لڑکے پر اغوا کا مقدمہ نہ درج کروادیں۔

اب جو نکاح تھانے، وکیل کے آفس یا کسی دوست کے گھر میں ہوتا ہے، تو مختلف کمیسرز میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اکثر وکیل تو ماشاء اللہ! سے امام مسجد اور گواہوں کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے البتہ نکاح کی رجسٹریشن کے لیے فارم فل کروالیتے ہیں۔ اور اب بعض وکیلوں نے آن لائن نکاح کروانے کی سہولت بھی میسر کر رکھی ہے کہ جس کی باقاعدہ ویب سائٹس بنی ہوئی ہیں کہ بس آپ وکیل کی فیس ادا کریں اور وکیل لڑکا اور لڑکی کے نکاح کے رجسٹریشن فارم فل کروادے گا اور حج کے سامنے بیان حلفی دلوادے گا اور یہی کورٹ میرج ہے بس۔ اور گواہان میں لڑکے کے دوستوں یا وکیل کے منشیوں کے نام کاغذات میں درج کر دیے جاتے ہیں۔

یہ نقطہ بھی واضح کرتا چلوں کہ نکاح میں ایجاب و قبول کسے کہتے ہیں؟ ایجاب کا معنی واجب کرنا ہے اور قبول کا معنی قبول کرنا ہے۔ اب لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ ہم لڑکی قبول کرتے ہیں۔ اہم سوال یہ ہے کہ قبول کیا کرتے ہیں؟ لڑکا وہ قبول کرتا ہے، جو واجب کیا جاتا ہے۔ اور واجب جو کیا جاتا ہے، وہ لڑکی کی ذمہ داری اور نان نفقہ ہے۔ اور لڑکی کی ذمہ داری اور نان نفقہ ولی کی ذمہ داری ہے نہ کہ خود لڑکی کی۔ ولی، ایجاب کرتے وقت یہ ذمہ داری لڑکے پر ڈالتا ہے اور لڑکا قبول کرتا ہے۔ اسلامی معاشرت میں لڑکی ساری زندگی مرد کی کفالت میں ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے باپ اور شادی کے بعد شوہر۔ تو ایجاب و قبول کے ذریعے یہ کفالت اور ذمہ داری منتقل ہو رہی ہوتی ہے۔ اگر نکاح

خواں شادی کے موقع پر شوہر کو یہ احساس دلادیا کریں کہ وہ اس بندھن کے ذریعے ایک ذمہ داری قبول کر رہے ہیں تو اس سے بھی شوہر کے ذمہ دار بننے پر مثبت اثر پڑے گا۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بیٹیوں کے حقوق کے بارے حدیث سننا سنا کر باپوں کا بیٹیوں سے اتنا تعلق پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنا سب کچھ ان کے لیے قربان کر دیتے ہیں اور جب بیٹی گھر سے بھاگ جاتی ہے تو ہمیں بیٹی کے حقوق یاد آ جاتے ہیں۔

بھئی! اگر آپ لوگوں نے اسے گھر سے بھاگنے کا حق دینا ہی ہے تو باپ کو اس کے حقوق سننا سنا کر اس کی محبت میں پاگل مت بنائیں۔ اور باپوں کو تعلیم دیں کہ بیٹیوں سے کم محبت رکھیں اور ان کا کم کریں تاکہ ان کے بھاگنے کے بعد نفسیاتی مریض نہ بن جائیں۔ شریعت اولاد کو کسی ایسے عمل کی اجازت کیسے دے سکتی ہے کہ جس سے ایک باپ نیم پاگل ہو جائے؟ کہیں تو غلطی ہو رہی ہے، اسے تلاش کریں۔ فتویٰ میں صرف اتنا کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا کہ گھر سے بھاگنا ہے تو بے غیرتی لیکن فقہ میں جائز ہے۔ اب جامعہ بنوریہ عالمیہ کے مفتی صاحب کو یہ بھی احساس نہیں کہ فتویٰ میں لکھ کیا رہے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں کسی مسئلے کو صرف فقہ کی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیے کہ میری فقہ میں جائز ہے تو اس کے نتائج چاہے جو بھی ہوں، ایسا کر گزرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض اوقات فقیہ کو کسی مسئلے میں معاشرتی، نفسیاتی، جذباتی اور معاشی پہلوؤں کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو فتویٰ تو چل جائے گا لیکن خاندان کا ادارہ تباہ ہو جائے گا۔ اور خاندانی مسائل کو تو ایک نہیں دس زاویوں سے دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

صلہ رحمی

صلہ رحمی سے مراد رشتہ داروں سے تعلق ناٹھ جوڑنا اور ان سے اچھا سلوک کرنا ہے اور قطع رحمی رشتہ داری کو توڑ دینے یا تعلق ختم کرنے کو کہتے ہیں۔ اسلام ہمیں صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور قطع رحمی کو حرام قرار دیتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

»مَنْ مَسَّهٗ أَنْ يُسْطَلَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، أَوْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحْمَتَهُ»¹
 ”جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے یا اس کی عمر لمبی ہو
 تو وہ صلہ رحمی کرے۔“

صلہ رحمی صرف یہ نہیں ہے کہ رشتہ داروں سے اخلاق کے ساتھ پیش آیا جائے
 بلکہ صلہ رحمی میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر رشتہ داروں میں سے کچھ معاشی طور کمزور
 ہوں تو ان کی مالی امداد کرے۔ اگر دنیا میں کسی اچھے عہدے پر ہو تو اپنے رشتہ داروں کا
 دھیان رکھے۔ دھیان رکھنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کے ناجائز کام کرے بلکہ مراد یہ
 ہے کہ ان کے جائز کاموں میں بھاگ دوڑ کرنا بھی صلہ رحمی میں شامل ہے۔

اسی طرح صلہ رحمی یہ نہیں ہے کہ کوئی رشتہ دار ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرے تو
 ہم بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں، یہ تو ادا لے کا بدلہ ہے جو کہ دنیا میں چلتا ہے۔ اور
 صلہ رحمی تو یہ ہے کہ جو ہم سے رشتہ توڑے، ہم اس سے ناٹھ جوڑیں۔ جو ہم سے منہ
 پھیرے، ہم اسے سلام کریں۔ جو ہم سے برا کرے، ہم اس سے اچھا کریں۔ ایک
 روایت کے الفاظ ہیں:

»لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي، وَلَكِنْ هُوَ الَّذِي إِذَا قُطِعَتْ رَحْمَتُهُ وَصَلَهَا»²
 ”صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں ہے جو بدلے میں حسن سلوک کر رہا ہو بلکہ صلہ
 رحمی تو یہ ہے کہ جب کوئی رشتہ توڑے تو اس کے ساتھ رشتہ جوڑا جائے۔“

اور یہی انسانوں کے ساتھ تعلق میں احسان کا درجہ ہے۔ ایک احسان عبادت میں ہے اور
 ایک احسان اخلاق میں ہے۔ اخلاق کا احسان یعنی اعلیٰ ترین درجہ کیا ہے، اس بارے ایک
 روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ لِي قَرَابَةً أَصِلُهُمْ
 وَيَقْطَعُونِي، وَأَحْسِنُ إِلَيْهِمْ وَيُسَيِّئُونَ إِلَيَّ، وَأَحْلُمُ عَنْهُمْ وَيَجْهَلُونَ
 عَلَيَّ، فَقَالَ: «لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ، فَكَأَنَّمَا تُسْفِهُمُ الْمَلَأَ وَلَا يَزَالُ مَعَكَ

¹ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب مَنْ أَخْبَ الْبَشَطُ فِي الرِّزْقِ، 56/3

² سنن أبی داود، کتاب الزَّكَاةِ، باب فِي صَلَاةِ الرَّجْمِ، 132/2

مَنْ اللَّهُ ظَهَرَ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلَى ذَلِكَ»¹

”حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اس شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں کہ میں ان سے رشتہ جوڑتا ہوں اور وہ مجھ سے رشتہ توڑتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بری طرح پیش آتے ہیں۔ میں ان کے رویے برداشت کرتا ہوں جبکہ وہ میرے ساتھ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو تم ان کے مونہوں میں راکھ ڈال رہے ہو۔ اور جب تک تم ان کے ساتھ اسی طرح پیش آتے رہو گے اس وقت تک اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تمہاری مدد کرتا رہے گا۔“

پس صلہ رحمی یہ نہیں ہے کہ کسی نے عید کے موقع پر ہمارے گھر کھیر بھجوا دی اور ہم نے ان کے گھر سویاں بھجوا دیں۔ یہ تو ادلے کا بدلہ ہے کہ دنیا میں یہی نظام چلتا ہے۔ صلہ رحمی تو یہ ہے کہ جس کے بارے یقین ہو کہ وہ کچھ نہیں بھجوائے گا تو اس کی طرف کچھ بھجوایا جائے۔ یہ صلہ رحمی میں احسان کا درجہ ہے۔ اور اس کے لیے ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔

قرض کی نیکی

اصلاح نفس کے ذرائع میں سے ایک بہت بڑا ذریعہ مال کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح کرنا ہے کہ جس میں زکوٰۃ، صدقہ اور قرض وغیرہ شامل ہیں۔ صدقے میں عبادت کا پہلو غالب ہے جبکہ قرض میں صلہ رحمی کا۔

ہماری شریعت میں قرض دینے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے جبکہ لینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ اگر آپ کے کسی رشتہ دار اور دوست کو قرض کی ضرورت ہے تو اسے قرض دے کر آپ نے اپنے نفس کی اصلاح کی بنیاد رکھ دی۔ آپ نے اللہ کی محبت کو مال کی محبت پر غالب کرنے کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ کیا اور یہی جہاد بالنفس ہے۔ اللہ کے

¹ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ والصدقات، باب صِلَةِ الرَّحِمِ وَتَحْرِيمِ قَطِيعَتِهَا، 1982/4

رسول ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

«وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ»¹

”مجاہد تو وہ ہے جو اپنے نفس کو اللہ کا فرمانبردار بنانے کے لیے اس سے جہاد کرے۔“

قرض دینے کا روایات میں صدقہ دینے سے بھی زیادہ اجر و ثواب بیان ہوا ہے۔ صدقہ تو عموماً وہ رقم ہوتی ہے کہ جو ضرورت سے زائد ہو لیکن قرض عموماً وہ رقم ہوتی ہے کہ جو آپ کی ضرورت کی ہو۔ پیسہ کس کی ضرورت نہیں لیکن اگر آپ نے اپنی ضرورت پر اپنے بھائی کی ضرورت کو ترجیح دی تو یہ وہ اثرا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کے لیے کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِيهِ صَدَقَةٌ، قَالَ: ثُمَّ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِيهِ صَدَقَةٌ، قُلْتُ: سَمِعْتُكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ تَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِيهِ صَدَقَةٌ، ثُمَّ سَمِعْتُكَ تَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِيهِ صَدَقَةٌ، قَالَ لَهُ: بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ قَبْلَ أَنْ يَحِلَّ الدِّينُ، فَإِذَا حَلَّ الدِّينُ فَأَنْظَرَهُ فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِيهِ صَدَقَةٌ²

”حضرت سلیمان بن بریدہ اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی تو اس کو ہر دن اتنا صدقہ کرنے کا اجر ملے گا کہ جتنا اس نے اسے قرضہ دے رکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر ایک دن میں نے آپ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی تو اس کو ہر دن اس سے دو گنا صدقہ کرنے کا اجر ملے گا کہ جتنا اس نے اسے قرضہ دے رکھا تھا۔ تو وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! پہلے آپ نے یہ بات

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 381/39

² مسند الإمام أحمد بن حنبل: 153/38

کی کہ جتنی رقم قرض دی ہے، ہر دن اتنا صدقہ کرنے کا اجر ملے گا۔ اور بعد میں آپ نے یہ بات کی کہ جتنی رقم قرض دی ہے، ہر دن اس سے دو گنا صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا کہ جس دن سے قرضہ دیا ہے، اس دن سے قرضے کی مدت ختم ہونے تک ایک گنا صدقہ کا ثواب ہے۔ اور جس دن قرضے کی میعاد ختم ہو گئی اور پھر اسے مہلت دے دی تو اس دن سے دو گنا صدقہ کا ثواب ہے۔“

اگر آپ نے کسی رشتہ دار یا دوست کو تین ماہ کے لیے دس ہزار قرض دیا ہے تو اب تین ماہ تک ہر دن میں آپ کو دس ہزار صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ اور جب آپ تین ماہ بعد اپنے رشتہ دار یا دوست سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کے حالات اتنے اچھے نہیں ہیں کہ وہ فوراً واپس کر سکے اور وہ آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ اسے مزید تین ماہ کی مہلت دے دیں اور آپ اسے یہ مہلت دے دیتے ہیں تو اب ان اگلے تین ماہ میں آپ کو ہر دن میں بیس ہزار صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بعض اوقات کچھ بھی نہیں ہوتا تھا لیکن کسی دوسرے سے قرض لے کر کسی کی ضرورت پوری کر دیتے تھے۔

مقروض کو مہلت دینے کا یہ ثواب تو ہے ہی اور اگر مقروض کے حالات ایسے ہوں کہ وہ قرض واپس نہیں کر سکتا اور آپ اسے قرض معاف کر دیتے ہیں تو اس بارے میں ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ وَضَعَ لَهُ، أَظْلَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ»¹

”جس نے کسی مقروض کو مہلت دے دی یا اس کا قرض ہی معاف کر دیا تو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمائیں گے کہ جس دن اللہ کے عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

¹ سنن الترمذی، أَبَوَاتُ الْبُيُوعِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِنْظَارِ الْمُعْسِرِ وَالزَّفَقِ بِهِ، 591/3

«كَانَ تَاجِرٌ يُدَايِنُ النَّاسَ، فَإِذَا رَأَى مُعْسِرًا قَالَ لِفَتْيَانِهِ: تَجَاوَزُوا عَنْهُ، لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا، فَتَجَاوَزَ اللَّهُ عَنْهُ»¹

”ایک تاجر لوگوں کو قرض دیتا تھا۔ اور جب وصولی کا وقت آتا تو اپنے خادموں سے کہتا تھا کہ اگر کوئی تنگ دست ہو تو اسے قرض معاف کر دینا، شاید اللہ بھی ہمیں معاف کر دے۔ تو اللہ عز و جل نے اسے معاف فرمادیا۔“

یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض واپس کر سکتا ہو اور پھر بھی ٹال مٹول سے کام لے جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں تو اللہ کے رسول ﷺ کی ایسے شخص کے بارے و عید ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ»²

”غنی اور مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيْلُ الْوَاحِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ»³

”جو شخص قرض ادا کر سکتا ہو اور پھر ٹال مٹول کرے تو اس کی بے عزتی بھی جائز ہو جاتی ہے اور اس کو سزا بھی دی جاسکتی ہے۔“

جس طرح ہمارے دین نے قرض دینے کو پسند کیا ہے، اسی طرح قرض لینے کو ناپسند جانا ہے بلکہ اللہ کے رسول ﷺ تو اس شخص کی نماز جنازہ نہ پڑھاتے تھے کہ جو مقروض ہوتا تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّي عَلَى رَجُلٍ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، فَأَتَيْتُ بِمَيْتٍ، فَقَالَ: «أَعَلَيْهِ دَيْنٌ؟» قَالُوا: نَعَمْ، دِينَارَانِ، قَالَ: «صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ» فَقَالَ أَبُو قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيُّ: هُمَا عَلَيَّ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: فَصَلَّى عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «أَنَا أَوَّلُ بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ، فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ

¹ صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب مَنْ أَظْفَرَ مُعْسِرًا، 58/3

² الموطأ، كتاب البيوع، باب جامع الدين والأجل، 972/4

³ سنن ابن ماجه، أبواب الصدقات، باب الخُبس في الدين والمُلازمة، 497/3

مَالًا فَلَوْ رَزَقْتَهُ¹

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اس شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھاتے تھے کہ جس کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ یہ مقروض فوت ہوا ہے۔ ایک بار ایک میت لائی گئی تو آپ نے پوچھا کہ کیا اس پر قرض ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ دو دینار قرض ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے لے جاؤ اور خود اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ! اس کا قرض میرے ذمہ ہے تو پھر اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پس جب آپ ﷺ کو فتوحات حاصل ہوئیں [اور بیت المال میں مال غنیمت وافر مقدار میں آیا] تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اہل ایمان سے ان کی اپنی جان سے بھی زیادہ تعلق رکھتا ہوں لہذا آئندہ جو مومن مقروض فوت ہو گا تو اس کا قرض میرے ذمہ ہے جبکہ اس کی وراثت اس کے ورثا کا حق ہے۔“

ہمیں قرض دینے والا بننا چاہیے نہ کہ لینے والا کہ قرض دینا نیکی ہے نہ کہ قرض لینا۔ اور قرض دینے والے کا تزکیہ ہوتا ہے نہ کہ لینے والے کا کہ لینا تو پھر سوال ہی کی ایک قسم ہے۔ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ جہاد پر خطبہ دیا تو ایک شخص نے سوال کیا:

أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، تُكْفَرُ عَنِّي خَطَايَايَ؟ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «نَعَمْ، إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ»، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «كَيْفَ قُلْتَ؟» قَالَ: أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَنْتُكَفَّرَ عَنِّي خَطَايَايَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «نَعَمْ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ، إِلَّا الدَّيْنَ، فَإِنَّ جَبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِي ذَلِكَ»²

¹ سنن أبي داود، کتاب النبوة، باب فی التَّشْدِيدِ فِي الدَّيْنِ، 247/3

² صحیح مسلم، کتاب الإمامة، باب مَنْ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كُفِّرَتْ خَطَايَاهُ إِلَّا الدَّيْنُ، 1501/3

”اگر میں اللہ کے رستے میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے؟ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اگر تو تم نے صبر اور حوصلے سے لڑائی کی اور ثواب کی امید میں کی اور میدان جنگ سے فرار نہ ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ نے اس شخص سے کہا کہ تم نے کیا سوال کیا تھا؟ تو اس نے دوبارہ کہا کہ میں نے یہ پوچھا تھا کہ اگر میں میدان جنگ میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اگر تو تم نے صبر اور حوصلے سے لڑائی کی اور ثواب کی امید میں کی اور میدان جنگ سے فرار نہ ہوئے اور تم پر کوئی قرض نہ ہو۔ یہ قرض والی بات ابھی جبریل علیہ السلام نے آکر مجھ سے کہی ہے۔“

تو شہید کے بھی تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر قرض معاف نہیں ہوتا لہذا قرض لینا ہر گز پسندیدہ امر نہیں ہے۔ پس قرض دینا تو نیکی کا کام ہے لیکن لینا نیکی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کو نئی گاڑی، نیا گھر اور نئی فیکڑی لگانے کے لیے قرض لینے کی اس طرح ترغیب دی جاتی ہے جیسے یہ نیکی کا بہت بڑا کام ہو۔¹

یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے، اسی لیے ہم نے اس کتاب میں اصلاح علما کے باب میں یہ واضح کیا ہے کہ ہماری فقہ اسلامی کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے، اور وہ زاویہ نگاہ تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ کا ہے۔ ہمارے مفتی حضرات فتویٰ دیتے ہوئے اس پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور فقہ اسلامی فقہی جمود اور خشک قانون کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔



¹ اپنی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک شخص دوسرے سے قرض لے لے تو یہ جائز ہے لیکن نظام بینکاری کی بنیاد ہی قرض پر رکھی گئی ہے اور یہ انتہائی تشویش ناک بات ہے کہ دنیا کی ہر آسائش حاصل کرنے کے لیے اسلامی بینک مراجعہ کے نام سے اور روایتی بینک لون کے نام سے ادھار لینے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

باب پنجم اصلاح معاشرہ

اس باب میں اصلاح معاشرہ کے ضمن میں دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، راستوں کی اخلاقیات، رسوم و رواج، تعلیم اور ادب کی اصلاح اور فکر کی درستگی پر گفتگو کی گئی ہے۔

دعوت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں فرق

دعوت تو نیکی اور خیر کے کام کی طرف لوگوں کو بلانے کا نام ہے اور منت سماجت والا کام ہے جبکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی قدر سختی کا عنصر بھی شامل ہے۔ حکم دینے اور روکنے کے الفاظ میں ہی سختی (strictness) کا معنی شامل ہے۔

اگر سوسائٹی میں بگاڑ زیادہ ہو اور مذہبی طبقات کی حیثیت معاشرے میں ایک اقلیت (minority) کی سی ہو تو وہاں ”دعوت الی الخیر“ (calling to the good) کا کام ہونا چاہیے۔ اور اگر اصحاب اختیار و اقتدار کا ذہن مذہبی ہو اور انہیں سوسائٹی میں اثر و رسوخ حاصل ہو تو انہیں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرنا چاہیے۔ تبلیغی جماعتوں کا انداز ”دعوت الی الخیر“ کا انداز ہے۔

ایک باپ اپنے بیٹے کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کر سکتا ہے جبکہ بیٹا اپنے باپ کو صرف دعوت دے سکتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اولاد کے نماز نہ پڑھنے کی صورت میں والد کو سختی کرنے بلکہ مارنے کا بھی حکم دیا ہے۔ یہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے کہ جس میں ڈانٹ ڈپٹ، سختی اور مار تک بھی شامل ہے۔ لیکن اگر والد نماز نہ پڑھے تو اولاد صرف دعوت ہی دے سکتی ہے۔

بعض دوستوں نے تبصرہ کیا کہ اگر والدین نماز کے معاملے میں اپنی اولاد پر سختی کریں گے تو اولاد ان کے سامنے تو نماز پڑھ لے گی لیکن ان کے پیچھے نہیں پڑھے گی لہذا اس معاملے میں اولاد پر سختی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کے دین کے معاملے میں سختی وہاں کی جاسکتی ہے کہ جہاں آپ ذمہ دار کی حیثیت میں ہوں یا صاحب اختیار ہوں۔ جہاں آپ ذمہ دار نہیں ہیں یا آپ کے پاس اختیار نہیں ہے تو وہاں دین کے معاملے میں سختی درست نہیں ہے۔ والدین چونکہ اپنی اولاد کے ذمہ دار اور نگران ہیں لہذا انہیں اولاد پر دین کے معاملے میں سختی کرنے کا حق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ والدین دنیا کے معاملات میں بھی تو اپنی اولاد پر سختی کرتے ہیں۔ مائیں اسکول کی تعلیم کے حصول میں چھوٹے بچوں پر کتنی سختی کرتی ہیں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ بات بات پر

تھپڑ لگا دینا بھی مناسب نہیں ہے کہ اس سے بچے ڈھیٹ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اتنا رعب بھی درست نہیں ہے کہ والد جیسے ہی گھر میں داخل ہو، بچوں کا سانس ہی سوکھ جائے جیسے والد نہ ہو، کوئی جلاد ہو۔ اس بارے معتدل رویہ ہونا چاہیے، کبھی نرمی کر لی اور کبھی سختی سے کام لے لیا۔

دعوت و تبلیغ کا مطالبہ ہر کسی سے ہے جبکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے دائرہ اختیار میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مکلف ہے۔ والد اپنے گھر، ہیڈ ماسٹر اپنے اسکول، پرنسپل اپنے کالج، وائس چانسلر اپنی یونیورسٹی، مدرسہ کا منتظم اپنے مدرسہ، فیکلٹی کا مالک اپنی فیکلٹی، تھانیدار اپنے تھانے کی حدود، اسسٹنٹ کمشنر اپنی تحصیل، افواج کے سربراہان اپنی مسلح افواج، وزیر اپنی وزارت، وزیراعظم اپنی حکومت اور صدر اپنی ریاست میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذمہ دار ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْخَادِمُ فِي مَالِ سَيِّدِهِ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»¹

”تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے پوچھا جائے گا۔ امیر المومنین نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت (wards) کے بارے پوچھا جائے گا۔ اور وہ شخص جو اپنے گھر کا سرپرست ہے، اس سے اپنے گھر والوں کے بارے سوال ہو گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر میں ذمہ دار ہے لہذا اس سے شوہر کے گھر کے بارے سوال ہو گا۔ اور خادم اپنے مالک کے مال میں نگران ہے لہذا اس سے مالک کے مال کے بارے سوال ہو گا۔“

راستے کے حقوق [Road Ethics]

ہمارے معاشرے میں حقوق کی سب سے زیادہ پامالی راستوں میں ہوتی ہے۔ کبھی

1 صحیح البخاری، کتاب الوصایا، باب تأویل قول اللہ تعالیٰ: مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ ذَيْنَ، 5/4

کبھار ایسا ہوتا ہے کہ آپ سڑک پر سفر کر رہے ہوں تو کوئی موٹر سائیکل یا گاڑی کسی دوسری موٹر سائیکل یا گاڑی سے ٹکرا جائے تو چند لمحوں میں صورت حال کس قدر گھمبیر ہو جاتی ہے۔ لوگ معمولی خراش (scratch) پر گالم گلوچ اور گریبان پھاڑنے پر اتر آتے ہیں۔

علاوہ ازیں شادی بیاہ کے موقع پر گلی کو بند کر دینا یا دوسروں کے گھروں کے مین گیٹ کے سامنے گاڑی کھڑی کر دینا وغیرہ بھی عام ہے۔ یورپ میں بھی گاڑیوں میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے لیکن وہاں نظام مضبوط ہے۔ اگر آپ کی گاڑی سے کسی کی گاڑی ٹکرا جائے تو باقاعدہ اس نقصان کو پورا کرنے کا ایک قانونی طریق کار مقرر ہے اور لوگ اپنی خوشیوں کی خاطر دوسروں کا راستہ بند نہیں کرتے ہیں۔

شاہراہوں پر لوگ کس قدر ذہنی اذیت سے خود بھی دوچار ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اذیت دیتے ہیں، اس کا اندازہ ان لوگوں کو بخوبی ہے، جو ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کا سارا ذہنی دباؤ اور تناؤ سڑکوں پر ہی نکلتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ فِي الطَّرِيقَاتِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا نَتَحَدَّثُ فِيهَا، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «فَإِذَا أَيْبَنْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ» قَالُوا: وَمَا حَقُّهُ؟ قَالَ: «غَضُّ الْبَصَرِ، وَكَفُّ الْأَذَى، وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ»¹

”راستوں میں مت بیٹھو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں راستے پر بیٹھنا پڑتا ہے کہ ہمارے جمع ہونے اور مل بیٹھنے کی جگہ یہی راستے ہی تو ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اگر تم نے راستوں پر مجلس لگانی ہی ہے تو ان راستوں کا حق ادا کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ ان کا حق کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ان کا حق یہ ہے کہ اپنی نظروں کو دبا کر

¹ صحیح مسلم، کتاب البیاس والزیۃ، باب النہی عن الجلوس فی الطرقات، 1675/3

رکھو! کہ کسی عورت کو گھور کر نہ دیکھو]۔ کسی راہ گیر کو تکلیف نہ دو۔ گزرنے

والے کے سلام کا جواب دو۔ نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو۔“

تو راستے پر کسی راہ گیر کو اذیت دینا گناہ کا کام ہے، چاہے یہ اذیت جسمانی ہو یا زبانی۔ ہم لوگ ٹریفک اشاروں کے مقامات پر ایک دوسرے کے لیے بہت زیادہ ذہنی اذیت کا بھی باعث بنتے ہیں۔ راستہ ملنے میں دو چار سیکنڈ کی دیر ہو جانے پر گزرتے گزرتے کسی کو ہاتھ اور منہ سے ایسا اشارہ کریں گے کہ جس سے وہ جل بھن کر رہ جائے لیکن یہ اشارہ کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہو کر ہمیں اس اشارے کے نتیجے میں پہنچائی جانے والی تکلیف کا حساب بھی دینا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «اتَّقُوا مَنْ الْمُفْلِسُ؟ قَالُوا: الْمُفْلِسُ فِينَا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهُ وَلَا مَتَاعَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الْمُفْلِسُ مَنْ أُمِّي مَنْ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاتِهِ وَصِيَامِهِ وَزَكَاتِهِ، وَيَأْتِي قَدْ شَتَمَ هَذَا وَقَذَفَ هَذَا، وَأَكَلَ مَالَ هَذَا، وَسَفَكَ دَمَ هَذَا، وَضَرَبَ هَذَا فَيَقْعُدُ فَيَقْتَصُّ هَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، وَهَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْتَصَّ مَا عَلَيْهِ مِنَ الْخَطَايَا أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ»¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے نبی کریم ﷺ! ہم تو مفلس اس کو کہتے ہیں کہ جس کے پاس درہم اور دینار نہ ہو اور دنیا کا مال و متاع نہ ہو۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ ہے کہ جو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے اعمال نامے میں نمازیں بھی ہوں گی، روزے بھی اور زکاتیں بھی لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی اور کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا اور کسی کا خون

¹ سنن الترمذی، أبواب صفۃ القیامۃ والرقائق والوزع، باب ما جاء فی شأن الجسَاب والقصاص،

بہایا ہوگا، اور کسی کو مارا ہوگا تو اس شخص کو بٹھایا جائے گا اور اس سے قصاص لیا جائے گا تو بدلہ میں لوگوں میں اُس کی نیکیاں تقسیم ہوں گی۔ اور اگر اُس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور پھر بھی کچھ بدلہ لینے والے باقی رہ گئے تو اُن کے گناہ اُس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے، یہاں تک کہ یہ اُن گناہوں کے ساتھ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔“

اسی طرح کبھی آپ سڑک پر جارہے ہوں تو آگے ناکہ لگا ہو تو گاڑیوں کی ایک قطار بن جاتی ہے۔ ایسے میں کوئی صاحب دوسری گاڑیوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ دراصل ان کا حق مار رہے ہوتے ہیں اور قیامت والے دن اس حق کے بارے بھی جوابدہی ہوگی کہ اس سے دوسروں کو ذہنی افیت اور کوفت ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ»¹

”مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے کہ جس سے دوسرے لوگوں کا خون اور مال محفوظ رہے۔“

اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمان اور مومن کی تعریف کی ہے۔ اب ہم میں سے ہر شخص اس تعریف پر اپنے آپ کو پرکھ لے کہ وہ کتنا مسلمان اور کس قدر مومن ہے؟ کہ سڑک پر اس کے ہاتھ اور زبان سے کتنے لوگ محفوظ ہیں۔ اور یہ تو سڑک پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ صبر کس بلا کا نام ہے، ورنہ تو مسجد اور مدرسہ کے ماحول میں تو ہر دوسرا شخص فرشتہ معلوم ہوتا ہے کہ معمولی سی بات پر معذرت کر رہا ہوتا ہے۔

بلا وجہ ہارنا دینا

ہمارے ہاں روڈ کی اخلاقیات میں کمی تو کیا، محسوس ہوتا ہے کہ بیڑا ہی غرق ہے۔ لوگ روڈ پر ایک دوسرے کو جتنی ذہنی افیت پہنچاتے ہیں، لعن طعن اور گالم گلوچ کرتے

¹ سنن الترمذی، أبواب الايمان، باب ما جاء في أنَّ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، 17/5

ہیں، شاید ہی کسی اور موقع پر ایسا کرتے ہوں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ روڈ کی اخلاقیات پر لکھا جائے بلکہ قانون سازی کی جائے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جرمانہ کیا جائے۔

اب بلاوجہ ہارن دینے کی عادت بد ہی کو دیکھ لیں کہ بعض اوقات آپ اگر گاڑی چلا رہے ہیں اور اشارہ بند ہے یا ٹریفک بلاک ہے تو آپ کے پیچھے موجود کوئی عجلت پسند ہارن پر ہارن دیے چلے جاتا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آتی کہ آپ اسے کیسے سمجھائیں کہ آپ کے پاس گاڑی ہے، ہوائی جہاز نہیں۔ بعض اوقات کچھ لوگ آپ کو کراس کرنے کے لیے بھی بلاوجہ ہارن دیتے چلے جاتے ہیں کہ اگر آپ نے پچھلی گاڑی کو راستہ دینے کے لیے اشارہ لگا بھی دیا ہے لیکن ظاہری بات ہے کہ آپ کو ایک طرف ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے لیکن عجلت پسند اس دوران ہارن پر ہارن بجاتے ہیں جو کہ آپ کی ذہنی افیت کا سبب بنا رہے گا۔ اسی طرح آپ نے سڑک کے کنارے کہیں گاڑی کھڑی کی تھی اور اب آپ اپنی گاڑی نکالنا چاہ رہے ہیں تو پیچھے سڑک پر آنے والوں کو ایک دو منٹ انتظار کرنا پڑ سکتا ہے لیکن وہ اس وقفے میں ہارن بجا بجا کر آپ کے لیے گویا صور اسرافیل پھونکنے کا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

البتہ ایک بات مشاہدے میں آئی ہے کہ بڑی گاڑی والے چھوٹی گاڑی والوں کو ہارن کثرت سے دیتے ہیں لیکن بڑی گاڑی والا بڑی گاڑی والے کو ہارن کم ہی دیتا ہے۔ مثلاً کرولا اور سٹی والا مہران کو بہت ہارن دے گا جبکہ کرولا والا کرولا والے کو بہت کم ہارن دے گا اور کروزر والے کو بالکل بھی نہیں دے گا۔ ہمارے ایک دوست کا تو کہنا ہے کہ پاکستان میں چھوٹی گاڑی خریدنا اپنے لیے ذلت کا سامان پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ آپ کے پاس جتنی چھوٹی گاڑی ہے، آپ روڈ پر اتنے ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے ہیں اور آپ کے پاس جتنی بڑی گاڑی ہے، آپ کاروڈ پر اتنا ہی احترام ہے۔

آج سے اگر ہم خود سے یہ عہد کر لیں کہ کسی کو بلاوجہ ہارن دے کر پریشان نہیں کریں گے، اور خاص طور پر پیدل چلنے والوں، سائیکل سواروں اور چھوٹی گاڑی والوں کا

احترام کریں گے، تو ہم نے سڑک کی اخلاقیات کی بنیاد رکھ دی ہے، ان شاء اللہ۔ ہمیں راستے اور سڑک پر کسی مسلمان کو تکلیف دینے کے بجائے اس کی راحت کا باعث اور سبب بننے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ، وَأَمْرُكَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَإِرشَادُكَ الرَّجُلَ فِي أَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَبَصْرُكَ لِلرَّجُلِ الرَّدِيءِ الْبَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَإِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشُّوْكَهَ وَالْعِظْمَ عَنِ الطَّرِيقِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَإِفْرَاقُكَ مِنْ دَلُوكَ فِي دَلْوٍ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ»¹

”تیرا اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے۔ تیرا کسی نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے منع کرنا بھی صدقہ ہے۔ اور تیرا کسی ویران علاقے میں اپنے بھائی کو راستہ دکھلا دینا بھی صدقہ ہے۔ اور تیرا کسی اندھے کو راستے پر ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔ اور تیرا راستے سے پتھر، ہڈی اور کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اور تیرا اپنے ڈول میں سے پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔“
راستوں کے حقوق کی ادائیگی کی صورت میں کون کون سی نیکیاں کی جاسکتی ہیں۔
اس بارے ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

”پچھلے دسمبر ایک روز جب انگلینڈ میں شدید برف باری ہو رہی تھی اور ہر کسی کو سردی نے جکڑ رکھا تھا تو میں نے اپنی آفس کی کھڑکی سے دیکھا کہ میرا ایک ساتھی اس منجھ کر دینے والی ہوا میں باہر دستانے چڑھائے اور ہاتھ میں بیلچہ تھامے راستے سے لوگوں کے لئے برف کے انبار صاف کر رہا ہے۔ میں حیرت سے ٹھٹھرتا ہوا اسے دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد جب اس سے ملاقات ہوئی تو پوچھا کہ تم تو میری طرح انجینیئر ہو پھر تمہارے ذمہ اس سردی میں یہ سخت کام کس نے لگا دیا؟ اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ یہ میری آج کی چھوٹی سی نیکی ہے۔“

¹ سنن الترمذی، أبواب البرِّ والصَّلة، باب ما جاء في صنائع المعروف، 339/4

چند روز پہلے آفس کے کچن میں رکھاؤش واشر خراب ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صفائی کرنے والوں کے لئے برتنوں کے انبار لگنے لگے۔ دن کے اختتام پر کام ختم کر کے جب میں گھر جانے لگا تو دیکھا کہ ایک سینئر مینجر آستینیں چڑھائے سارے برتن مانجھ مانجھ کر دھو رہی ہے۔ میری استفسار کرتی نظروں کو دیکھا تو مسکرا کر مخاطب ہوئی کہ یہ میری آج کی چھوٹی سی نیکی ہے۔ ایسے ہی ان گنت مشاہدوں سے مجھے یہ سمجھ آنے لگا کہ نیکی صرف یہ نہیں کہ میں دو رکعت نماز زیادہ پڑھ لوں یا چندے کے ڈبے میں چند روپے ڈال آؤں بلکہ برتر نیکی یہ ہے کہ ایسے مواقع تلاش کروں جہاں مخلوق کے خاموشی سے کام آسکوں، کسی کی مشقت کم کر سکوں۔ کچھ روز پہلے ہمارے فلیٹس کی لفٹ خراب ہو گئی، جس کے بغیر کچر اینچ لے جانا محال تھا۔ گھر کا کچرا پھینکنے کے لئے نکلا تو دیکھا کہ ایک پڑوسی خاتون نے بھی اپنا بہت سا کچرا باہر رکھ رکھا ہے۔ میں نے اس کا کچرا بھی ساتھ اٹھالیا۔ پھر اس خیال سے کہ کچرے والے کو مشکل نہ ہو، ان کچرے کے بڑے بڑے بستوں کو گرہ لگا کر باندھ دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے میرے ہاتھ خراب ہو گئے۔ ساتھ چلتی ہوئی ایک کم عمر بچی نے حیرت سے میری طرف دیکھا تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ یہ میری آج کی چھوٹی سی نیکی ہے۔¹

اساتذہ اور مشائخ کے حقوق

ایک دوست نے توجہ دلائی کہ بعض اوقات کوئی صاحب کوئی کام کہتے ہیں جو ہم وقت پر نہیں کر سکتے تو وہ اس کا شکوہ رکھ لیتے ہیں یا شکایت کا اظہار کر دیتے ہیں کہ ہم نے تو آپ کو ایک ہی کام کہا تھا اور آپ نے وہ بھی نہ کیا حالانکہ شکوہ رکھنے یا شکایت کرنے والے صاحب کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ان دس اشخاص میں سے ایک ہیں، جنہوں نے اس دن میں ہمیں صرف ایک ہی کام کہا ہوتا ہے۔ اس سے میرا ذہن علما و مدر سین کے اس حق کی طرف متوجہ ہوا جس کا عام طور لوگ خیال نہیں رکھتے۔

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دین کی تعلیم و تعلم، درس و تدریس، وعظ و نصیحت، دعوت و ارشاد اور بحث و تحقیق میں اپنے اوقات کا ایک بڑا حصہ کھپا دیتے ہیں۔ کسی مدرس قرآن ہی کی مثال کو لے لیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اچھا درس قرآن دینے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ اب ان کے کچھ درس تو روزمرہ کے ہوتے ہیں جو ان کی جملہ دیگر دینی اور دنیاوی مصروفیات مثلاً ملازمت اور گھر بار وغیرہ کی ذمہ داریوں کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اور ان کے بعض درس ایسے ہوتے ہیں جو عارضی اور وقتی ہوتے ہیں کہ جن کا تقاضا ان کے بعض سامعین کی طرف سے آتا ہے کہ وہ یہ درس ان کے گھر، مسجد یا گاؤں وغیرہ میں فلاں وقت میں دیں۔

یہ سامعین ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس مدرس کے چاہنے والے ہوتے ہیں، اس کے درس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے درس سے دوسروں کو بھی مستفید کروانا چاہتے ہیں۔ مدرس قرآن کے شیڈول میں بعض اوقات اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ کسی اضافی درس کے لیے علیحدہ سے وقت نکال پائیں لیکن لوگ اصرار کرتے ہیں لہذا مدرس صاحب اس اصرار کی بنا پر یا اس وجہ سے کہ لوگ انہیں متکبر نہ سمجھیں یا شکوہ و شکایت کا اظہار نہ کریں یا تبلیغ کی دینی ذمہ داری کے احساس وغیرہ جیسی وجوہات کی بنا پر ایسے درس قرآن کی بھی حامی بھر لیتے ہیں کہ جس کی گنجائش ان کے گھر اور دیگر علمی و دعوتی کام کو کسر لگائے بغیر نہیں نکلتی۔ لہذا مدرس صاحب عموماً یہ سب کچھ ایک مشین کی طرح کرتے رہتے ہیں اور اس پر خود اپنی ذات اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے پریشانی کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ایک محقق (researcher) کی مثال لے لیں۔ کوئی ایک صاحب انہیں ایک حدیث کے بارے کہتے ہیں کہ اس کا حوالہ (reference) چاہیے جبکہ ایک دوسرے صاحب ان سے ایک دوسری حدیث کی صحت (authenticity) کے بارے معلوم کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ ایک تیسرا دوست ان سے اپنے مقالہ کی اصلاح مانگ رہا ہے تو چوتھے صاحب کسی فقہی مسئلے میں فتویٰ کے طلب گار ہیں۔ اب ہر

ایک کے نزدیک انہوں نے اسے ایک ہی کام کہا ہے لیکن ہر ایک کو یہ معلوم نہیں، سوائے محقق کے، کہ اسے کتنے لوگوں نے ایک ہی دن میں کتنے کام کہے ہیں یا وہ اپنی ملازمت، گھر بار اور اپنی روزمرہ کی لگی بندھی دینی مصروفیات کے علاوہ کتنا وقت اس قسم کی دینی خدمات کے لیے نکال سکتے ہیں؟

اسی طرح ایک عالم دین کی مثال لے لیں۔ ان سے موبائل پر مسئلہ پوچھنے والا شخص ایک ہی مسئلہ پوچھتا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اس دن میں بیسواں شخص ہے، جو اس عالم دین سے ایک مسئلہ پوچھ رہا ہے۔ لہذا بعض لوگ ایسے علمایہ اعیان دین کہ جن کی طرف لوگ کثرت سے رجوع کرتے ہیں، سے شکایت رکھ لیتے ہیں کہ ان کے موبائل فون اکثر بند رہتے ہیں یا وہ اپنا موبائل اٹھاتے نہیں ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس قسم کے حالات میں ان کی اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی تو نظر انداز ہو رہی ہوتی ہے جبکہ بعض اوقات ان کی لگی بندھی دینی مصروفیات بھی متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک عالم دین نے بتلایا کہ ان کا گھر میں اپنی اہلیہ سے اکثر یہ اختلاف رہتا ہے کہ ان کا موبائل گھر میں داخل ہونے کے بعد بند (off) رہنا چاہیے کیونکہ اہلیہ کا کہنا ہے کہ یہ ان کے بیوی بچوں کا وقت ہے جو وہ دوسرے لوگوں کو دے دیتے ہیں۔ گھر والوں کا موقف ہے کہ اہل خانہ کا وقت ان کا حق ہے اور یہ حق دوسرے لوگوں کو دینا کس طرح جائز ہے اور وہ بھی دین کے نام پر؟

قرآن مجید نے ہمیں کسی کے گھر جانے کے جو آداب سکھائے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دستک دینے پر اگر جواب نہ ملے تو واپس آ جائیں لیکن ہمارے ہاں لوگ مس کال پر مس کال دیے چلے جاتے ہیں اور اگلے کی پرائیویسی کا ذرا بھی دھیان نہیں کرتے اور گویا اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے کسی کو فون کیا ہے تو وہ لازماً ہماری بات سنے۔ ایسا کوئی حق ہمیں شریعت میں اس ملاقاتی کے لیے بھی نہیں ملتا ہے کہ جو بغیر وقت لیے آپ سے ملاقات کے لیے آپ کے گھر کے دروازے پر آ گیا ہو۔ آپ چاہیں تو اپنے اہل خانہ سے اجازت لے کر ان کا وقت اس ملاقاتی کو دے دیں، اور چاہیں تو

نہ دیں اور کسی دوسرے وقت میں اس سے ملاقات طے کر لیں۔

ایسے میں عامۃ الناس (public) کو دھیان رکھنا چاہیے کہ ایسے مدرسین، علماء، داعیان دین یا واعظین کی طرف کسی مسئلہ میں رجوع کرتے ہوئے ان سے اس قدر اصرار نہ کریں کہ وہ اپنی ذات میں تنگ ہو کر مروت میں آپ کا کوئی کام کریں بلکہ کسی خواہش کے اظہار میں ہمیشہ ایسا انداز اختیار کریں کہ وہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں اور اگر کسی کام سے انکار بھی کرنا چاہیں تو سہولت سے انکار کر سکیں اور ان کے انکار کو محسوس بھی نہ کریں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپ ﷺ کے گھر کھانے کی دعوت پر تشریف لاتے تو کھانا کھانے کے انتظار میں بہت پہلے سے آکر بیٹھ رہتے یا کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے کہ جس سے آپ ﷺ کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی تھی لیکن آپ ﷺ کے مزاج میں لحاظ اور مروت اس قدر تھا کہ کسی کو جانے کو کہتے نہ تھے۔ اس پر اللہ عز و جل نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ [الأحزاب: 53]

”پس جب تم کھانا کھاؤ تو چلے جایا کرو اور باتیں کرنے کے لیے نہ بیٹھ رہو۔ بے شک تمہارا یہ طرز عمل اللہ کے نبی ﷺ کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے لیکن وہ تم سے کچھ کہنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ حق بات کرنے سے نہیں شرماتا۔“

مزدور کی حوصلہ افزائی

صدقہ کی ایک بہترین صورت یہ ہے کہ ہاتھ سے کمانے والے کی حوصلہ افزائی کریں۔ آپ کسی ریڑھی والے سے پھل خریدتے ہیں اور آپ کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی دیہاڑی نہیں لگتی ہوگی کہ جس سے اس کے گھر کا خرچہ چل سکتا ہو تو اس نیت سے پھلوں کا ریٹ کم نہ کروائیں کہ غریب کے لیے صدقہ ہی نکل جائے گا۔ آپ نانائی کی دکان پر بال کٹوانے کے لیے گئے ہیں اور اس کا رو بار سے اس کی کوئی خاطر خواہ آمدن

نہیں ہے تو اسے کٹنگ کے بیس تیس روپے زیادہ دے دیں۔ آپ نے اپنی گلی کے کٹ پر بیٹھے موچی سے جو تا مرمت کروانا ہے تو اگر اس نے تیس مانگے ہیں تو پچاس دیں کہ یہی لوگ ہیں جو آپ کے صدقہ کے صحیح مستحق ہیں۔

بھانساؤ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن غریب کو ہمیشہ دو چار پیسے زیادہ ہی دے دینے چاہئیں بلکہ بعض اوقات تو اگر کسی چیز کی ضرورت نہ بھی ہو اور پھر بھی صرف اسی نیت سے خرید لے کہ غریب کی مدد ہو جائے گی تو یہ بھی صدقہ ہے۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بھانساؤ کروا کے قیمت کم کروالی اور پھر اس کی منہ مانگی قیمت اسے ادا کر دی۔ یا اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ چیز خرید لی اور قیمت ادا کرے۔ اور اب وہی خریدی ہوئی چیز دوبارہ اسی غریب کو واپس کر دے کہ جس سے خریدی ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک غزوے میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ شریک تھا کہ میرا اونٹ پیچھے رہ گیا اور اس نے مجھے تھکا دیا تھا۔ آپ ﷺ میرے پاس آئے تو میں نے اپنے اونٹ کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے اسے اپنی لاشی سے ہانکا تو وہ ایسے دوڑنے لگا کہ مجھے اسے روکنا مشکل ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ اونٹ مجھے پیو گے؟ تو میں نے ہاں کر دی۔ آپ ﷺ نے وہ اونٹ مجھ سے خرید لیا اور مدینہ پہنچنے پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے قیمت ادا کر دیں۔ جتنی قیمت میں آپ ﷺ نے مجھ سے اونٹ خریدا تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس سے زیادہ قیمت مجھے ادا کی۔ جب میں قیمت وصول کر کے واپس ہونے لگا تو آپ ﷺ نے مجھے واپس بلوا کر کہا:

«خُذْ جَمَلَكَ وَلَكَ ثَمَنُهُ»¹

”اپنا اونٹ بھی لے جاؤ اور اس کی قیمت بھی رکھ لو۔“

استخارہ اور مشاورت

استخارہ عربی زبان کا لفظ ہے کہ جس کا معنی خیر طلب کرنا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ

¹ صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب براء التَّوَاتِبِ وَالْحُمْرِ، 62/3

کی یہ سنت تھی کہ آپ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اللہ عزوجل سے بھی مشورہ کرتے تھے اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کرتے تھے۔ اللہ عزوجل سے کسی کام میں خیر اور مشورہ طلب کرنے کو دینی اصطلاح میں استخارہ کہتے ہیں۔ روایات میں ملتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو استخارہ کرنا ایسے سکھاتے تھے جیسا کہ قرآن مجید کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔ اس سے استخارہ کی اہمیت کا علم ہوتا ہے۔

ہر چھوٹے بڑے کام میں اللہ عزوجل سے مشورہ کرنا چاہیے، یہی سنت ہے اور یہی استخارہ ہے۔ ہمارے ہاں استخارے کے طریقے کے بارے کچھ غلط فہمیاں عام ہو گئی ہیں، جن میں ایک ”آن لائن استخارہ“ ہے۔ استخارہ وہی ہے کہ جو آپ خود سے کریں کہ آپ کے مسئلے میں جتنا تعلق (concern) آپ کو ہے، اتنا کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ استخارہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بندہ دو رکعت نفل نماز پڑھے اور کسی بھی وقت میں پڑھ سکتا ہے، تہجد کے وقت، اشراق کے وقت، ظہر کے بعد، عشا کے بعد، اور اس کے بعد استخارہ کی دعا مانگے اور دعا مانگتے ہوئے اس کا ترجمہ ذہن میں رکھے۔ استخارہ کی دعا اور اس کا ترجمہ ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا الْإِسْتِخَارَةَ فِي الْأُمُورِ كُلِّهَا، كَالسُّورَةِ مِنَ الْقُرْآنِ: إِذَا هَمَّ بِالْأَمْرِ فَلْيَرْكَعْ رَكَعَتَيْنِ ثُمَّ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَامُ الْغُيُوبِ، اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أُمْرِي - أَوْ قَالَ: فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ - فَاقْدُرْهُ لِي، وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أُمْرِي - أَوْ قَالَ: فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ - فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِي الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ رَضَيْتَ بِهِ، وَيُسَبِّحُ حَاجَتَهُ»¹

”حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہمیں

¹ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء عند الاستخارة 81/8

تمام کاموں میں استخارہ کرنے کی یوں تعلیم فرماتے تھے جیسے قرآن مجید کی کسی سورت کی تعلیم فرماتے تھے۔ اور استخارہ یہ ہے کہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو تو دو رکعت نفل نماز پڑھے اور اس کے بعد یوں دعا مانگے: اے اللہ! میں آپ سے آپ کے علم کے ساتھ خیر طلب کرتا ہوں، اور آپ کی قدرت کے ساتھ قدرت طلب کرتا ہوں، اور آپ سے عظیم فضل کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! آپ کے پاس قدرت ہے، میرے پاس نہیں ہے، آپ کے پاس علم ہے، میرے پاس نہیں ہے، اور آپ غیب کی باتیں جاننے والے ہیں۔ اے اللہ! آپ کے علم کے مطابق اگر یہ کام میرے دین، میرے معاش اور میرے آخرت کے اعتبار سے خیر ہے تو اس کام کو میرا مقدر بنادیں۔ اور آپ کے علم کے مطابق اگر یہ کام میرے دین، میرے معاش اور میری آخرت کے اعتبار سے شر ہے تو اس کام کو مجھ سے دور کر دیں اور مجھے اس سے دور کر دیں۔ اور اس کے علاوہ کہیں سے مجھے خیر دے دیں اور پھر اس پر مجھے راضی رہنے کی توفیق بھی عطا فرمائیں۔ حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ دعا کرتے ہوئے کام کے لفظ کی جگہ اس متعین کام کا نام لے لے کہ جس کے لیے استخارہ کر رہا ہوں۔“

استخارہ کرنے کے بعد سونا لازمی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ استخارہ کے بعد خواب میں کوئی باباجی آکر آپ کو بتلائیں گے کہ بچے آپ نے یہ کام کرنا ہے یا نہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ استخارہ کے بعد اپنے خوابوں میں استخارے کا جواب تلاش کرتے رہتے ہیں حالانکہ خواب میں جواب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی کے استخارے کے نتیجے میں اللہ عزوجل اسے خواب میں کوئی اشارہ فرمادیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ اس لیے استخارے کے بعد الم غلم خوابوں میں اس کا جواب تلاش کرنا مناسب نہیں ہے کہ خواب تو ہماری زندگی کا حصہ ہیں، ہم روزانہ خواب دیکھتے ہیں بلکہ خواب کا نہ آنا بیماری ہے۔ پس استخارہ کے بعد معمول کے خوابوں میں تکلف سے اس کا جواب تلاش کرنا انسان کو کسی اور راستے پر لے جاسکتا ہے۔

تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ دیکھیں! اگر آپ استخارہ کی دعا پر غور کریں تو اس کے الفاظ میں

ہی یہ بات شامل ہے کہ اے اللہ! اگر یہ کام میرے لیے بہتر ہے تو اسے میرا مقدر بنا دے اور اگر بہتر نہیں ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے۔ پس اگر وہ کام آپ کے حق میں بہتر ہو گا تو اللہ عز و جل آپ کے دل کو اس کی طرف مائل کر دیں گے اور ذہن اس کی طرف لگا دیں گے۔ اور اگر وہ کام آپ کے حق میں بہتر نہ ہو تو ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے یا آپ کے خیالات ایسے بن جائیں گے کہ آپ اس کام سے بھاگیں گے اور وہ کام آپ سے بھاگے گا۔

استخارہ کے ساتھ اہل لوگوں سے مشاورت کرنا بھی سنت کا حصہ ہے۔ آپ ﷺ نے جنگوں کے معاملات تک میں عمومی مشاورت کی ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے تو آپ اپنے گھر کے معاملات میں بھی مشاورت کر لیتے تھے۔ پس استخارہ کے بعد اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے مشاورت بھی بہت ضروری ہے اور ان سے مشاورت کے بعد دل جس کی طرف مائل ہو اور ذہن کا جس طرف رجحان بنے تو یہی استخارے کا نتیجہ ہے کہ آپ نے یہی استخارے کی دعا میں مانگا ہے۔

خود کشی

خود کشی اسلام میں حرام ہے کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان خود سے لے سکے۔ یہ جان انسان کے لیے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے اور خود کشی کر لینا اس نعمت کی ناشکری ہے۔ خود کشی کرنے والا اللہ عز و جل سے یہ جھگڑا کرتا ہے کہ اللہ عز و جل نے اسے زندگی کی نعمت عطا کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ غلط تھا اور اگر وہ اس فیصلے کو صحیح سمجھتا تو خود کشی کیوں کرتا؟ خود کشی کرنے والا اللہ کی تقدیر پر راضی نہیں ہے، وہ تقدیر کو مٹانا چاہتا ہے اور اس کے لیے خود مٹ جاتا ہے۔ خود کشی ایسے کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ جس کی سزا جہنم بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيدَةٍ فَحَدِيدَتُهُ فِي يَدِهِ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارٍ

جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ شَرِبَ سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدَّى فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا»¹

”جس نے لوہے کے کسی تیز دھار آلے سے اپنے آپ کو قتل کیا تو جہنم میں اس کے ہاتھ میں وہ تیز دھار آلہ ہو گا کہ جسے وہ اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑا رہے گا۔ اور جس شخص نے زہری کر اپنے آپ کو قتل کیا تو وہ جہنم میں زہر پیتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑا رہے گا۔ اور جس شخص نے پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا کر قتل کر لیا تو وہ جہنم میں اپنے آپ کو پہاڑ سے گراتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑا رہے گا۔“

بعض دوستوں کا تبصرہ ہے کہ مذہبی لوگ وعیدیں سنا دیتے ہیں لیکن مسائل نہیں حل کرتے۔ تو جو لوگ خود کشی کر رہے ہیں، ان کے مسائل معلوم کریں اور ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

یہ بات درست ہے کہ خود کشی کرنے والوں کے مسائل پر بھی غور ہونا چاہیے اور انہیں حل کرنے کے لیے کوشش بھی کرنی چاہیے لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں لوگ جن مسائل کی وجہ سے خود کشی کرتے ہیں، وہ عموماً ایسے نہیں ہیں کہ جن کی وجہ سے خود کشی کرنے والے سے کوئی ہمدردی پیدا ہوتی ہو۔ اخبارات میں عموماً یہ خبریں شائع ہوتی ہیں کہ رشتہ نہ ملنے پر لڑکی کے گھر والوں کو مار کر خود کشی کر لی، عشق میں ناکامی پر ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا دی، اور عشق بھی وہ جو اس نے ایشوریہ رائے سے کیا تھا کہ اس کی شادی ہوئی نہیں اور اس نے غم اور دکھ میں ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا دی، میاں بیوی کے جھگڑے میں خاوند یا بیوی نے خود کشی کر لی، عید کے کپڑے نہ ملنے پر ماں نے بچوں سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی، ملازمت نہ ملنے پر نوجوان نے مینار پاکستان سے چھلانگ لگا دی، ماں کے ڈانٹ پلانے پر بچی نے زہر پھانک لی وغیرہ۔

¹ صحیح مسلم، کتابُ الإیمان، بابُ غُلَطِّ تَحْرِیمِ قَتْلِ الْإِنْسَانِ نَفْسَهُ، 1/103

اس دنیا میں آزمائش ہر شخص کے لگی ہوئی ہے اگرچہ نوعیت مختلف ہے کہ کسی کی آزمائش جسمانی ہے، کسی کی مالی ہے اور کسی کی ذہنی ہے۔ یہ بھی فرق ہے کہ کسی کی آزمائش زیادہ ہے اور کسی کی کم ہے۔ اب اگر خود کشی کرنے والے کی آزمائش اور حالات پر غور کیا جائے کہ جن کے سبب سے اس نے خود کشی کی ہے تو آپ کو احساس ہو گا کہ معاشرے میں اس سے بدتر حالات اور آزمائش میں لوگ مبتلا ہیں لیکن زندگی گزار رہے ہیں اور مطمئن بھی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں صبر کا مادہ ہے۔ جس شخص نے صبر کرنا سیکھ لیا تو وہ زندگی گزارنا اور جینا بھی سیکھ لیتا ہے اور جس نے صبر کرنا نہ سیکھا تو زندگی گزارنا اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔

اور صبر کے بغیر زندگی نہیں ہے کہ المیہ (tragedy) اور طہیہ (comedy) آپ کی زندگی کے دورخ ہیں۔ اور انہی دو پہلوؤں کے حوالے سے ہمارے دین میں صبر اور شکر کا حکم دیا گیا ہے کہ آزمائش میں صبر کرو اور آسائش میں شکر کرو۔ اس کتاب کے آخری باب میں ہم نے صبر اور شکر پر مستقل بحث کی ہے کہ یہ دونوں رویے ہم اپنی زندگیوں میں کیسے پیدا کر سکتے ہیں کہ ان دونوں ہی سے اس زندگی کی خوبصورتی اور توازن ہے۔

اصلاح رسوم

ہمارے دین میں انسانی ضروریات، حاجیات، طبائع، میلانات، رجحانات اور فطرت کا خصوصی دھیان رکھا گیا ہے لہذا معاشرتی اقدار اور رسوم و رواج کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام انہی رسوم و رواج کو پسند کرتا ہے کہ جن میں معاشرے کی فلاح و بہبود کا پہلو ہو اور جو رسوم و رواج معاشرے میں ظلم اور بگاڑ کا باعث بنتے ہوں تو اسلام ان پر قدغن لگاتا ہے۔

سوسائٹی میں رسوم و رواج کا پیدا ہونا یا ختم ہونا، یہ اسلام کا موضوع نہیں ہے۔ اسلام کا موضوع یہ ہے کہ ان میں سے کوئی رسم اسلامی اقدار کے منافی نہ ہو، دین کے مقاصد کے خلاف نہ ہو، اس سے معاشرے میں ظلم اور بگاڑ پیدا نہ ہو رہا ہو، اسے دین نہ بنالیا

جائے، اسے فرض اور قانون کا درجہ نہ دے دیا جائے، اور اس میں اسراف اور فضول خرچی نہ ہو۔ اور رسوم و رواج میں انہی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی اصلاح دین میں مطلوب ہے نہ کہ رسوم و رواج کو ختم کرنے کی تحریک چلانا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دو جہالت کی اکثر رسوم کی اصلاح کی نہ کہ سب رسوم کو بالکل ہی ختم کر دیا۔ البتہ جو ظالمانہ رسوم و رواج تھے تو انہیں آپ نے ختم کیا۔

آپ ایک رسم ختم کریں گے، دوسری اس کی جگہ لے لی گی کیونکہ رسوم و رواج کا تعلق انسان کے جذبات اور تعلقات سے ہے۔ اور جب تک انسانی جذبات اور تعلقات قائم رہیں گے، یہ رسوم و رواج پیدا ہوتے رہے گے لہذا اسلام کا مقصود رسوم و رواج کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ان کی اصلاح ہے۔ یہ اہم نکتہ ہے کہ جسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور رسوم کی بھرمار تو یہ ایک دوسری انتہا ہے اور غیر متوازن رویہ ہے لہذا یہ بھی پسندیدہ امر نہیں ہے کہ ہر وقت کھیل تماشے میں ہی لگے رہو۔

پیدائش، شادی اور وفات انسانی زندگی کے تین اہم مراحل ہیں۔ ان مواقع کے حوالے سے کچھ رسومات ایسی ہیں کہ جنہیں دین نے خود جاری کیا ہے جبکہ بعض رواج ایسے بھی ہیں کہ جنہیں مسلمان معاشروں نے ہندوانہ اور مغربی تہذیب سے ادھار لیا ہے۔ اور یہ رسوم و رواج وہ ہیں جو شریعت اسلامیہ کی تعلیمات اور مقاصد کے خلاف ہیں اور معاشرے میں ظلم اور بگاڑ کا باعث ہیں لہذا ممنوع ہیں۔

بچے کی پیدائش کے موقع پر اس کے کان میں آذان کہنا، اسے گھٹی ڈالنا، اس کا ختنہ کروانا اور ساتویں دن بچے کا نام رکھنا، اس کی طرف سے عقیقہ کرنا، اور اس کے سر کے بال منڈوانا مسنون اعمال ہیں۔ بچے کی پیدائش کے موقع پر مٹھائی وغیرہ بائٹنا جائز ہے کہ یہ دوسروں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح بچے کی پیدائش کے موقع پر تحفے تحائف دینا بھی جائز ہے کہ اس سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«تَهَادُوا تَحَابُّوا»¹

”ایک دوسرے کو تحفے دیا کرو کہ اس سے باہمی محبت بڑھتی ہے۔“

تحفہ دینا سنت ہے لیکن اگر تحفہ دینے میں مقصود یہ ہو کہ جواب میں مجھے بھی تحفہ دیا جائے تو یہ مسنون نہیں ہے بلکہ ایک ایسی رسم ہے کہ جس میں دوسرے سے محبت کی بجائے اپنی ذات کے لیے لالچ کا عنصر غالب آگیا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ بچے کی پیدائش پر جو رسوم و رواج ہیں تو وہ سنت سے ثابت نہیں ہیں۔ اور آذان، گھنٹی، نام رکھنا، بال منڈوانا، عقیقہ کرنا، ختنہ کرنا اور مٹھائی بانٹنے وغیرہ سے بڑھ کر اور کرنا بھی کیا ہے؟ کیا یہ رسمیں کم ہیں کہ ہمیں اور رسموں کی ایجاد کی ضرورت محسوس ہو۔ اور اگر اولاد کی زیادہ خوشی منانی ہو تو انہی رسموں میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھرپور انداز میں شریک کر لیں۔

اسی طرح شادی کے لیے منگنی کرنا، نکاح کا اعلان کرنا اور دعوت ولیمہ مسنون اعمال میں سے ہیں۔ پس منگنی کے موقع پر بات چیت کرنے میں تاکید لانے کی غرض سے لڑکی کو سونے یا چاندی وغیرہ کی انگوٹھی پہنانے یا کپڑوں کا تحفہ بھیجنا جائز ہے لیکن اس میں اسراف کا پہلو نہ ہونا چاہیے کہ اسراف اور فضول خرچی سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک نکاح کی بات ہے تو احادیث میں نکاح علی الاعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے یعنی محلے اور بستی والوں کو پتہ چلے کہ فلاں کا نکاح ہو رہا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«أَعْلَنُوا هَذَا النِّكَاحَ»²

”اس نکاح کا اعلان کیا کرو۔“

اور نکاح کا اعلان کرنا لازم ہے کہ اس میں اور زنا میں بھی فرق ہے کہ نکاح علی الاعلان ہوتا ہے اور زنا چوری چھپے ہوتا ہے۔ لہذا شادی والے گھر میں لائٹنگ وغیرہ کرنا ایک جائز امر ہے کیونکہ یہ نکاح کے اعلان کا ایک ذریعہ ہے۔

¹ البخاری، محمد بن اسماعیل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي، الأدب المفرد، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الثالثة، 1409ھ - 1989ء، ص 208

² سنن الترمذی، أبواب النکاح، باب ما جاء في إعلان النکاح، 390/3

شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی اور اسراف بہت زیادہ ہوتا ہے کہ جس کا نتیجہ ظلم، فساد اور بگاڑ ہے۔ دلہن کا عروسی جوڑا چار چار لاکھ میں تیار ہوتا ہے کہ جو اس نے صرف ایک دن پہننا ہے اور برائڈل میک اپ ایک لاکھ تک میں ہوتا ہے جو ایک دن بھی باقی نہیں رہنا ہے۔ بارات اور مہندی کے کھانے کا ویسے کی طرح اہتمام کیا جاتا ہے حالانکہ ویسے میں بھی سادگی کا حکم ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأْتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تَبْذُرْ تَبْدِيرًا﴾ [26] إِنَّ الْمُبْذِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿[الإسراء: 27]

”اور رشتہ داروں کو ان کا حق دو اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دو۔ اور فضول خرچی مت کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا بہت ہی ناشکر ہے۔“

فضول خرچ کو شیطان کا بھائی اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ وہی کام کرتا ہے جو شیطان کرتا ہے۔ اور شیطان کا کام لوگوں کے دلوں میں بغض اور نفرت ڈالنا ہے جبکہ فضول خرچ اپنی فضول خرچی کے ذریعے معاشرے کے پسے ہوئے غریب اور مسکین طبقے میں اپنے خلاف بغض اور نفرت کے بیج بوتا ہے۔ جب ایک طرف لوگوں کو دو وقت کی روٹی نہ مل رہی ہو اور دوسری طرف مہندی اور بارات میں دس قسم کے کھانے پیش کیے جا رہے ہوں تو وہاں معاشرے میں طبقاتی تقسیم پیدا ہوگی۔ امیر اور غریب میں نفرت بڑھے گی۔ قرآن مجید نے ہمیں کھانے پینے کے معاملات میں بھی فضول خرچی سے منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ [الأعراف: 31]

”اور کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔“

شادی بیاہ کے موقع پر کھانا ضرورت سے زائد بنانا اور ضائع کرنا فضول خرچی میں

شامل ہے۔ انسان کے پاس بچوں کی شادی بیاہ کے لیے جس قدر پیسے موجود ہوں، اسی میں گزارہ کرے اور قرض وغیرہ لے کر اپنی حیثیت سے زائد ہر گز خرچ نہ کرے، چاہے دعوت ولیمہ ہی کیوں نہ ہو۔ نکاح کے بعد لڑکے کی طرف سے دعوت طعام مسنون عمل ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے لیکن اس میں بھی آپ ﷺ نے سادگی کی تلقین کی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أُولِمُوا، وَلَوْ بِشَاةٍ»¹

”ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی کیوں نہ ہو۔“

شادی بیاہ کے موقع پر عموماً مردوں اور عورتوں کے لیے بیٹھنے اور کھانے کا انتظام ایک ہی جگہ، ایک ہی ہال اور سائبان کے نیچے کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی مخلوط محافل میں عموماً عورتیں فل میک اپ، جیولری، تنگ، باریک اور مختصر لباس کے ذریعے اپنی زیب و زینت اور جسمانی اعضا کا اظہار کرتی ہیں کہ جس سے نامحرم مردوں کے دلوں میں ہيجانی کیفیات کے راستے بے حیائی کا راستہ ہموار ہوتا ہے کہ جس سے قرآن مجید نے منع فرمایا ہے۔ عورتوں میں دو بچکانہ خواہشات بہت عام ہیں۔ ایک یہ کہ میں اپنی ملنے جلنے والی خواتین میں حسین ترین عورت نظر آؤں کہ جس کے لیے وہ نئے فیشن، ڈیزائننگ اور ڈریسنگ کرے گی حالانکہ یہ بات طے ہے کہ ان میں سب سے زیادہ حسین ایک ہی ہو سکتی ہے نہ کہ ساری۔ اور دوسری یہ کہ میں مردوں کی توجہ کا مرکز بنوں حالانکہ یہ طے ہے کہ مرد کو اس کے حسن سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، اسے تو اپنی ہوس پوری کرنی ہے، چاہے آنکھوں کی ہویا پیٹ کی۔

اور مہندی تو اسلام میں مہندی لگانا جائز ہے۔ لہذا اگر دلہن کی گھر کی خواتین اور سہیلیاں اس کی زیب و زینت کے لیے اس کے گھر اجتماع کر لیں اور مہندی لگالیں، کوئی خوشی کر لیں، گپ شپ لگالیں تو اس قسم کا اجتماع بالکل جائز ہے لیکن عرف عام میں ”رسم حنا“ سے مراد مخلوط معاشرت، گانا، بجانا، ڈانس پارٹی، اجتماعی کھانا، دلہا کے گھر سے

¹ الموطأ، کتاب النکاح، ما جاء في الوليمة، 783/3

دلہن کے گھر جلوس کی صورت میں مہندی لگانے کے لیے جانا وغیرہ ہے تو اس میں بے حیائی اور فضول خرچی شامل ہے اور ان دونوں سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں میں یہ غلط فہمی بھی عام ہو گئی ہے کہ گانے بجانے کے بغیر تفریح کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے حالانکہ بہترین تفریح ہوتی ہی گانے بجانے کے بغیر ہے۔ اس بارے ہم ساتویں باب میں ”فلم بنانا“ کے عنوان کے تحت مزید گفتگو کریں گے۔ اگر آج کل کے معاشرے کی صورت حال یہ ہے کہ جہاں تھوڑی دیر وائے فائے نہ ملے، وہاں انسان بور ہو جاتا ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وائے فائے سے پہلے کے زمانے میں سارے لوگ بور رہتے تھے۔

اسی طرح شادی والے گھر میں ایک اسٹیج تیار کیا جاتا ہے کہ جہاں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے تیز میوزک پر ڈانس کرتے ہیں۔ دین اسلام نے ہر طرح کے آلات موسیقی کو ناجائز قرار دیا ہے کہ انسان میں شہوانی اور سفلی جذبات کو بھڑکانے کا سبب بنتے ہیں۔ اور میوزک، شراب نوشی اور زنا کی طرف انسان کو صرف مائل نہیں کرتا بلکہ دھکیل دیتا ہے۔ تیز میوزک میں انسان کو اپنے وجود پر قابو نہیں رہتا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تھرکنا شروع کر دیتا ہے جیسا کہ شراب نوشی کے نتیجے میں انسان اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ پاتا۔ یہی تھرکنا، رقص بنتا ہے اور رقص میں وجد کی حالت میں وہ شراب نوشی کرتا ہے۔ اور شراب نوشی سے حواس گم کرتا ہے اور زنا اور بدکاری میں پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن محفلوں میں میوزک ہو، وہاں عموماً شراب اور زنا عام ہوتا ہے جیسا کہ نئے سال کی رات میں ہونے والی تقریبات وغیرہ کے احوال تو ہمارے سامنے کے ہی ہیں۔ آلات موسیقی، شراب نوشی اور زنا کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ، يَسْتَحِلُّونَ الْحَرَ وَالْحَرِيرَ، وَالْخَمْرَ
وَالْمَعَازِفَ»¹

¹ صحیح بخاری، کتاب الأشربة، باب مَا جَاءَ فِيهِ يَسْتَحِلُّونَ الْحَمْرَ وَيُسَوِّبُهُ بَغَيْرِ اسْمِهِ، 106/7

”میری امت میں کچھ لوگ زنا، ریشم، شراب اور آلات موسیقی کو جائز قرار دے دیں گے۔“

البتہ یہ جائز ہے کہ گھر کی بچیاں گھر میں دف وغیرہ بجا کر دلہا اور دلہن کی تعریف میں کوئی گیت گائیں کہ یہ سب کچھ نکاح کے اعلان میں شامل ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ أَبُو بَكْرٍ، وَعِنْدِي جَارِيَتَانِ مِنْ جَوَارِي الْأَنْصَارِ تُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتْ بِهِ الْأَنْصَارُ فِي يَوْمِ بُعَاثٍ، قَالَتْ: وَلَيْسَتْ بِمُغَنِّيَتَيْنِ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: أَيْمَزُومُورُ الشَّيْطَانِ فِي بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ وَذَلِكَ فِي يَوْمِ عِيدِ الْفِطْرِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَا أَبَا بَكْرٍ، إِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيدًا، وَهَذَا عِيدُنَا»¹

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عید والے دن ان کے گھرانے کے والد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور ان کے پاس اس وقت انصار کی دو بچیاں موجود تھیں جو کہ وہ گیت گارہی تھیں جو انصار نے جنگ بعثت کے موقع پر کہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ وہ بچیاں کوئی پیشہ ور گانے بجانے والی نہ تھیں۔ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہا کہ اللہ کے نبی ﷺ کے گھر میں شیطانی آلات۔ اور یہ عید الفطر کا دن تھا تو اللہ کے نبی ﷺ نے کہا کہ اے ابو بکر! ہر قوم کا ایک خوشی کا دن ہوتا ہے اور یہ ہمارا خوشی کا دن ہے [یعنی انہیں اس سے منع نہ کرو]۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«فَصَلُّ مَا بَيْنَ الْحَرَامِ وَالْحَلَالِ، الدُّفُّ وَالصَّوْتُ»²

”حلال اور حرام [نکاح اور زنا] کے مابین فرق دف اور آواز کا ہے۔“

یعنی نکاح کے موقع پر شادی والے گھر میں دف اور گیت وغیرہ ہوتا ہے کہ جس سے اس کا اعلان ہوتا ہے جبکہ زنا اور بدکاری کو چھپایا جاتا ہے لہذا اس پر اس طرح خوشی نہیں

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب النِّعَاءِ وَالذِّفِّ، 612/1

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ النِّكَاحِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِغْلَانِ النِّكَاحِ، 390/3

منائی جاتی۔ پس نکاح کے گھر کا منظر یہ بھی نہیں ہونا چاہیے جیسے ماتم کا گھر ہو۔ اور شادی بیاہ کے موقع پر بھی دلہا یاد لہن کو کوئی تحفہ دینا جائز ہے لیکن جب یہ دینا دلانا رسم بن جاتا ہے تو پھر یہ ایک وبال ہے۔ عموماً شادی بیاہ کے موقع پر دیے جانے والے تحائف کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے تاکہ اپنے موقع پر واپس لیے جاسکیں۔ یہ تحفہ دینے کی بدترین صورت ہے کہ جس میں اس سے بہتر تحفہ کی واپسی کی امید رکھی جائے اور اگر جوابی تحفہ نہ ملے تو خاندانی ناراضگی تک نوبت جا پہنچے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مَثَلَ الَّذِي يَعُودُ فِي عَطِيَّتِهِ، كَمَثَلِ الْكَلْبِ أَكَلَ، حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءً، ثُمَّ عَادَ فِي قَيْئِهِ، فَأَكَلَهُ»¹

”اس شخص کی مثال جو تحفہ دے کر واپس لینا چاہتا ہے، اس کتے کی سی ہے کہ جس نے کھانا کھایا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے قے کر دی۔ پھر اس نے اپنی قے ہی واپس دوبارہ کھالی۔“

لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے عموماً بات کے لیے کھانے کا انتظام بھی ہوتا ہے جو لڑکی کے والدین اور سرپرستوں کے لیے ایک اضافی معاشی بوجھ ہے کہ جس کے سبب سے غریب والدین کی اکثریت قرض کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک قبیح رسم جہیز کی رسم ہے کہ اکثر بچیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ساری عمریں بیاہے اپنے والدین کے ہاں گزار دیتی ہیں اور ان کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں ملتا۔ دوسری طرف کم جہیز لانے والی بہوؤں کو طعنے دیے جاتے ہیں اور سسرال میں ان کی زندگی اجیرن بنادی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کی ایک باقاعدہ فہرست لڑکی والوں کو بھیجوائی جاتی ہے اور اسے لڑکے والے مال غنیمت کی طرح اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں۔ یہ قباحیت بھی عام ہے کہ بیٹی کو جہیز کے نام پر کچھ دے دلا کر وراثت سب بیٹوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے اور بیٹی کو اس کے وراثت کے جائز حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بیٹے اور بیٹی دونوں کے لیے وراثت میں حصہ مقرر

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الوہبات، باب الرجوع فی الہبۃ، 797/2

کیا ہے اور بیٹی کو وراثت میں اس کا حصہ دینا فرض ہے۔

اور اگر والدین شادی کے موقع پر اپنی بیٹی کو کچھ تحائف خاموشی سے دے دیں کہ ان کی نمود و نمائش نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تحائف کی نمود و نمائش سے ایک تو شادی میں شریک غریب رشتہ داروں میں حسرت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کو وہ نہیں دے سکتے جو یہاں دیا جا رہا ہے اور دوسرا دلہن کے والدین میں فخر اور غرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ عموماً رشتہ داروں کو دکھلانے کے لیے ہی یہ کام کر رہے ہوتے کہ دیکھو ہم نے اپنی بیٹی کو کیا کچھ نہیں دیا؟ اور دلہا کے گھر والوں میں اس سے لالچ پیدا ہوتی ہے کہ کسی طرح کوئی ایسی لڑکی اپنے گھر لائی جائے کہ جو اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ مال غنیمت جہیز کی صورت میں لے کر آئے۔ ایسی رسومات کو قرآن مجید نے ”اصروا غلال“ کا نام دیا ہے یعنی ایسا بوجھ اور طوق جو قیدیوں کی پیٹھوں اور گردنوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ دور جاہلیت میں موجود ایسے رسوم و رواج کے بوجھ سے معاشرے کو آزاد کروانے آئے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ [الأعراف:

[157]

”اور آپ ﷺ ان سے ان کا بوجھ اتارتے ہیں اور ان کے گلے کے پھندوں سے انہیں آزاد کراتے ہیں۔“

خلاصہ کلام یہی ہے کہ اسلام رسوم و رواج میں سادگی کو پسند کرتا ہے اور اگر رسوم و رواج میں اسراف، فضول خرچی، ظلم اور بگاڑ ہو تو یہ ناجائز ہیں۔ اسی طرح اسلام رسوم و رواج کی پابندی پسند نہیں کرتا اور اگر کسی علاقے میں رسوم و رواج کی پابندی یوں کی جانے لگے کہ جیسے فرائض اور قانون کی پابندی کی جاتی ہے تو ایسی صورت میں یہ خاندانی رسوم و رواج، خاندان کے غریب افراد کے لیے بوجھ اور گلے کا پھندا بن جاتے ہیں لہذا اسلام ان کی لازم حیثیت ختم کرنے کے لیے ان کے خلاف مجاہدے کا حکم دیتا ہے۔

سا لگرہ مبارک

سات دسمبر راقم کا یوم پیدائش تھا۔ بہت سے دوستوں نے پیپی برتھ ڈے کا پیغام بھیجا۔ فوری طور تو پیغام بھیجنے والوں کو یہ کہا کہ بھائی اس موقع پر کوئی دعا بھی دے دینی چاہیے لیکن اس موضوع پر مذہبی حوالے سے کچھ گفتگو کرنے کا دل چاہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور اہل علم کی رائے ہے کہ یوم پیدائش (birth day) منانا ایک بدعت ہے۔ اگرچہ میں نہیں مناتا لیکن کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بدعت تو دین میں اضافے کا نام ہے اور یوم پیدائش دینی شعائر کے طور تو نہیں منایا جاتا۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ انگریز اقوام سے تشبہ ہے کیونکہ یہ رسم ان سے آئی ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر کوئی رسم مسلمان معاشروں میں اس قدر عام ہو جائے کہ ان کا عرف بن جائے تو پھر تشبہ کا اعتراض باقی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اب تو یہ خود مسلمان معاشروں کا رواج ہے۔ ہاں اگر کسی رسم یا رواج کے خلاف کتاب و سنت میں کوئی صریح نص موجود ہو تو پھر اس کا مسلمان معاشرے میں رائج ہو جانا بھی دلیل نہیں بنے گا بلکہ یہ عرف فاسد کہلائے گا۔

انسان کے جبلی تقاضوں (inherent requirements) میں یہ بات شامل ہے کہ وہ دوسروں کو خوش کرنا چاہتا ہے یا ان کی خوشیوں میں شریک ہونا چاہتا ہے، چاہے اس کا مقصد اس سرگرمی (activity) سے دراصل اپنی خوشی ہی کا حصول کیوں نہ ہو۔ اور یہ مقاصد کے اعتبار سے اچھی چیز ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اگر ہم مغرب کی نقالی کو درمیان سے نکال دیں اور اس موقع کو اپنے دین سے جوڑ دیں تو اس طرح ایک رسم کا ہم امالہ (divert) کر سکتے ہیں یعنی اسے ایک صحیح رخ دے سکتے ہیں۔ اور یہ اس سے آسان ہے کہ ہم اس رسم کا ازالہ (eliminate) کریں۔

اس ضمن میں پہلی تجویز تو یہ ہو سکتی ہے کہ کسی کو اس کے یوم پیدائش کی مادری زبان میں مبارک باد دی جائے مثلاً پیپی برتھ ڈے کی بجائے جنم دن مبارک ہو، یوم پیدائش مبارک ہو یا یوم ولادت مبارک ہو، کے الفاظ کہے جائیں۔ صرف زبان کے بدل

دینے سے اس رسم پر مغربی اور انگریزی کلچر کی لگی چھاپ بہت حد تک ختم ہو جائے گی۔ مزید اس کو اسلامی تہذیب سے جوڑنے کے لیے یہ کیا جائے کہ اس موقع پر کوئی دعادی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جنم دن مبارک کرے۔ اب اس رسم میں خدا کا تصور آگیا، دعا شامل ہو گئی، برکت بھی آگئی اور انسان کی خواہش بھی پوری ہو گئی۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا منقول ہے:

﴿وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا﴾ [مریم: 33]

”اور مجھ پر سلام ہو اس دن میں کہ جس دن میں پیدا ہوا۔ اور اس دن میں بھی مجھ پر سلام ہو کہ جس دن میں میری وفات ہوئی۔ اور اس دن میں بھی مجھ پر سلام ہو کہ جس دن میں اٹھایا جاؤں گا۔“

ہمارے معاشرے میں بعض لوگوں نے عید کے موقع پر گلے ملنے کو بھی بدعت قرار دے دیا ہے کہ یہ آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے حالانکہ اتنی سختی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسلام تو ایسی چیزوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ جو مسلمانوں میں باہمی محبت اور الفت بڑھانے میں اہم کردار ادا کریں۔

بس اس تناظر میں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب یا دوسرے معاشروں سے جو بہت سے رسمیں ہمارے ہاں آگئی ہیں تو ان میں ازالے (elimination) کی بجائے اگر امالے (diversion) کا تصور دیا جائے کہ ان رسموں یا رواجات کو اس طرف موڑ دیا جائے کہ دینی مقاصد پورے ہو جائیں اور وہ رسمیں اسلامی کلچر اور دینی تہذیب کے چوکٹھے (framework) میں سازگار (fit) ہو جائیں تو یہ بھی ایک کرنے کا کام ہے۔ واللہ اعلم۔ میں کوئی مفتی نہیں کہ اس موضوع کو فتویٰ کے انداز میں دیکھا جائے۔ ایک تجویز دل میں آئی، سو بیان کر دی کہ مروجہ رسوم میں ازالے کی بجائے امالے پر محنت کی جائے۔ اگر کسی دوست کے ملاحظات ہوں تو ضرور پیش کیے جائیں۔

نبی کریم ﷺ کا یوم پیدائش منانا

ایک دوست نے سوال کیا کہ آپ میلاد منانے کے قائل ہیں؟ میں نے کہا: ہاں!

لیکن اس طرح جس طرح آپ ﷺ نے منائی۔ انہوں نے کہا: آپ ﷺ نے کیسے منائی؟ میں نے کہا: روزہ رکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ الْإِثْنَيْنِ؟ فَقَالَ: «فِيهِ وُلِدْتُ وَفِيهِ أُنْزِلَ عَلَيَّ»¹

”حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ سے سوموار کے

روزے کے بارے سوال ہوا؟ آپ نے فرمایا: اس دن میں، میں پیدا ہوا اور اسی

دن میں مجھ پر وحی نازل کی گئی۔“

اللہ کے رسول ﷺ اس امت کے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑی نعمت ہیں لہذا اگر ہم اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ ﷺ کے یوم پیدائش میں روزہ رکھ لیں تو ایسا عمل پسندیدہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب چونکہ آپ ﷺ کی تاریخ پیدائش میں تو بہت اختلاف ہے لیکن پیدائش کا دن متعین ہے۔ لہذا سوموار کے دن میں اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع میں روزہ رکھنا مستحب ہے۔

پس آپ کی پیدائش کی خوشی منانے میں اختلاف نہیں ہے جب تک کہ اس میں دو باتیں ملحوظ رہیں۔ ایک یہ کہ تاریخ کی بجائے دن کو بنیاد بنایا جائے کیونکہ وہ یقینی ہے اور دوسرا یہ کہ روزہ رکھ کر منایا جائے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ آپ سال میں میلاد منانے کی بات کرتے ہیں، ہم تو ہر ہفتے منانے کے قائل ہیں۔ لیکن ہم جھنڈیاں لگا کر اور پہاڑیاں بنا کر منانے کو پسند نہیں کرتے کہ اس میں فضول خرچی اور نمود و نمائش ہے کہ جس سے کتاب و سنت نے منع کیا ہے بلکہ عبادت کے ذریعے منانے کو پسند کرتے ہیں کہ جو نبی کریم ﷺ کا طریقہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کی پیدائش ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے نعمت ہونے سے انکار ناممکن ہے۔ اور اللہ کی نعمت پر اس کا شکر ادا کرنا بھی لازم ہے۔ اب شکر کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ کچھ طریقے ایسے ہو سکتے ہیں جو واقعاً شکر ادا کرنے میں شمار ہوتے ہوں اور کچھ ایسے ہو سکتے ہیں جو شکر ادا کرنے کی بجائے ناشکری کہلانے کے زیادہ مستحق

¹ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب استیجابِ صیامِ ثلاثَةِ اَیَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ، 820/2

ہوں۔ پس ناشکری کے ایسے طریقوں سے بچنا چاہیے اور یہ تصور درست نہیں ہے کہ ہمیں نہ تو اپنی پیدائش کی خوشی ہوئی چاہیے اور نہ نبی کریم ﷺ کی۔ جس دن میں اللہ نے آپ ﷺ کو پیدا کیا ہے یعنی سوموار کے دن تو اس دن شکر کے طور روزہ رکھ لیں یا آپ ﷺ کے نام سے کوئی صدقہ خیرات کر دیں یا درود شریف پڑھنے کا اہتمام کر لیں۔ واللہ اعلم۔

جادو اور خواب

عالمین کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی پر جادو، ٹونا، تعویذ، گنڈا، آسیب یا نظر ہندی وغیرہ ہو، تو اس کی سب سے بڑی علامت انسان کے خواب ہیں۔ برا عظم افریقہ وغیرہ میں کہ جہاں سینکڑوں قسم کا جادو ٹونا پایا جاتا ہے، روحانی عالمین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آ چکی ہے کہ جنہوں نے جادو ٹونے کے بارے نہ صرف بیسیوں کتب مرتب کر دی ہیں، بلکہ روحانی ہسپتال بھی قائم کر دیے ہیں اور ایسے دسیوں فورمز بنا دیے ہیں جہاں وہ اپنے مشاہدات اور تجربات سینکڑوں موضوعات کے تحت بیان کر رہے ہوتے ہیں۔

مختصر اُگھنے کا مطلب یہ ہے کہ جادو جس طرح ایک علم کے طور مروج رہا ہے، اسی طرح اب جادو کا علاج بھی ایک سائنس بن چکا ہے کہ جس میں بیسیوں پہلوؤں سے تحقیق ہو رہی ہے۔ کچھ عالمین سائیکالوجی اور جھاڑ پھونک دونوں کو جمع کر کے ایک نیا مکتبہ فکر بنا رہے ہیں تو کچھ میڈیکل سائنس کے ساتھ دم درد کو استعمال کر رہے ہیں۔

عالمین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اگر آپ کو خواب میں بار بار سانپ نظر آئے تو یہ جادو گر کا خادم جن ہے جو آپ کو تنگ کر رہا ہے۔ اگر وہ سانپ آپ کے پیچھے لگتا ہے تو ابھی تک وہ جن آپ کے جسم میں داخل نہیں ہوا اور اگر وہ آپ کو خواب میں کاٹ لیتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس جن نے آپ کو مس (touch) کیا ہے۔ اگر وہ اڑدھا ہے تو یہ کوئی بہت بڑا جن ہے اور اگر عام سائز کا سانپ ہے تو عام جن ہے کہ جنہیں اصطلاح میں ”عمار“ کہا جاتا ہے۔ اگر کالے سیاہ رنگ کا سانپ ہے تو یہودی جن ہونے کا امکان زیادہ ہے، اگر زرد رنگ کا ہے تو عیسائی جن اور سفید رنگ ہے تو مسلمان

جن ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ جادو اور سانپ میں تعلق کے بارے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے جادو گروں کے واقعے میں بھی صریح اشارے موجود ہیں۔

اگر خواب میں بلی بار بار نظر آئے تو عاشق جن ہے۔ اور عاشق جن خواب میں ایسی صورت میں آتا ہے کہ جس سے انسان کو مانوسیت ہو۔ اگر خواب میں اونٹ کو دیکھے کہ وہ پیچھے لگا ہے تو یہ سرکش شیطان ہے۔ اور اگر چیتا دیکھے تو یہ بھی متمرّد شیطان ہے اور صحرائی ہے۔ اگر بار بار مچھلی دیکھے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ حملہ آور شیطان پانی کا رہائشی ہے۔

اگر خواب میں شیر دیکھے تو یہ جنات میں کوئی مقام اور رتبہ رکھنے والے جن کی علامت ہے اور اگر گدھا دیکھے تو یہ بہت ہی بڑا جن ہے کہ جسے عام جادو گروں کے لیے قابو کرنا مشکل ہے اور عاملین کے لیے اس کا علاج آسان نہیں ہے۔ اگر خواب میں کتا دیکھے تو یہ بھی جادو گر کا خادم جن ہے، اگر کالا ہو تو یہ یہودی جن ہے اور اگر زرد رنگ کا ہے تو اس کا ایک معنی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ عیسائی جن ہے اور دوسرا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واش روم، بیت الخلا وغیرہ جیسے مکان میں رہتا ہے۔ اور اگر خواب میں چھپکلی دیکھے تو یہ حاسد کی نشانی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ حاسد کی نظر لگنے کی علامت ہے۔

ان چیزوں کا خواب میں دیکھنے کا ضروری مطلب یہ نہیں ہے کہ جادو ٹونایا تعویذ گنڈا ہی ہوا ہے بلکہ اگر یہ چیزیں خواب میں بار بار نظر آئیں اور خواب میں یا خواب کے بعد بے چینی اور اضطراب کا باعث بنیں تو آپ کو روحانی علاج کی ضرورت ہے۔ اور بہتر یہی ہے کہ آپ اپنا روحانی علاج خود سے کریں۔ آپ کے لیے آپ سے بہتر روحانی معالج کوئی نہیں ہو سکتا۔

بعض اوقات کچھ بھی نہیں ہوتا، صرف انسانی وہم ہوتا ہے اور انسان اسے جادو ٹونایا تعویذ گنڈا سمجھ لیتا ہے لیکن وہم اور حقیقت کو جاننے کے کئی ایک ذرائع ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اچانک انسان کے خواب غیر معمولی ہو جائیں۔ اسی طرح جادو ٹونا ہے یا نہیں، تو یہ معلوم کرنے کا دوسرا راستہ شرعی جھاڑ پھونک اور مخصوص اور ادو وظائف

ہیں کہ جن کا پڑھنا فوراً تیر کی طرح جا کر لگتا ہے اور چیزیں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں یا پڑھنے والے کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیتی ہیں، چاہے وہ پیشہ ور ہو یا نہ ہو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «إِنَّ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: مِنْهَا أَهْأَوِيلُ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ بِهَا ابْنُ آدَمَ، وَمِنْهَا مَا يَهْمُ بِهِ الرَّجُلُ فِي يَقْظَتِهِ، فَيَرَاهُ فِي مَنَامِهِ، وَمِنْهَا جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النَّبُوءَةِ»¹

”حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جو شیطان کی طرف سے ڈراوا ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے انسان کو پریشان رکھے۔ دوسرا وہ خواب ہیں کہ جو کچھ ہم بیداری میں دیکھتے ہیں تو وہ خواب میں نظر آتا ہے۔ اور تیسرا وہ خواب ہیں جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں [یعنی یہ اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور سچے خواب ہوتے ہیں]۔“

جھاڑ پھونک: اثرات اور موانع

آسیب، سحر اور نظر بد تین چیزیں ہیں۔ آسیب تو یہ ہے کہ کسی نے کوئی جادو ٹونا نہیں کروایا لیکن کسی سبب سے کوئی شریر جن یا جننی کسی انسان سے چٹ گئی یا اسے اذیت پہنچانے لگی۔ اس کا عموماً سبب یہ ہوتا ہے کہ ”عمار“² کو کسی انسان سے لاشعوری طور کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ غصہ اور رد عمل میں اس انسان کو تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا کوئی شخص جنات قابو کرنے کے لیے چلہ کاٹتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ یا کوئی جن کسی انسان پر کسی سبب سے عاشق ہونے کی وجہ سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اس کی شادی میں رکاوٹ بن رہا ہوتا ہے اور ایسا بہت ہی نادر ہے۔ یا پھر کسی قسم کی خوشبو لگانے سے کوئی جن کسی انسان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ یا بعض اوقات نیک لوگوں کی نیکی میں

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب تَغْيِيرِ الرُّؤْيَا، بَابُ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ، 1285/2

² وہ جنات جو گھروں میں رہتے ہیں۔

رکاوٹ ڈالنے کے لیے بھی جنات شرارتیں کرتے ہیں تاکہ انہیں پریشان کر کے ان کی نیکی میں رکاوٹ بن جائیں۔ اور بعض لوگوں کو یہ خوابوں میں ڈراتے یا پریشان کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات صرف وہم ہوتا ہے کہ جنات ہیں جبکہ وہ حقیقت میں نہیں ہوتے۔ اور بعض اوقات کوئی نفسی مسئلہ ہوتا ہے مثلاً خاص طور نوجوان لڑکوں یا لڑکیوں کا بروقت شادی نہ ہونے کا مسئلہ ہوتا ہے لیکن اسے جنات کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے۔

اس بارے ہمارے معاشرے میں دونوں انتہائیں موجود ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جن وغیرہ کچھ نہیں ہے، بس ماہر نفسیات کو دکھائیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو بچوں کے نفسی مسائل کو بھی جنات کا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ اگر روحانی معالج اچھا اور نیک ہو تو جھاڑ پھونک سے اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ جنات کا نہیں ہے بلکہ نفسی ہے یا شادی وغیرہ کا ہے۔ اور ماہرین نفسیات تو وہ اکثر و بیشتر جنات وغیرہ کی حقیقت کو ماننے ہی نہیں ہیں لہذا انہیں کبھی یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ مسئلہ نفسی ہے یا روحانی۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ نفسی طریقہ علاج سے کسی قدر مریض کو افاتہ ہوتا ہے لیکن مکمل صحت نہیں ملتی۔ روحانی مریض کو نفسی طریقہ علاج سے جو کسی قدر شفا ملتی ہے، تو اس کی وہ یہ ہے کہ جنات کا حملہ انسان کے دل و دماغ اور جسم کے ان حصوں پر ہوتا ہے جو کمزور ہوں۔ پس اگر ان اعضا میں قوت مدافعت بڑھ جائے تو مریض کو نقصان کم پہنچتا ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ شیطان، انسان کے جسم میں بیماری پیدا نہیں کرتا بلکہ انسانی خون میں موجود بیماری کے جراثیم کو چھیڑتا ہے اور دل و دماغ میں وسوسہ پیدا کرتا ہے اور یہ وسوسہ بڑھتے بڑھتے ذہنی بیماری کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ پہلی صورت سے جسمانی اور دوسری سے ذہنی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ»¹

”بے شک شیطان انسان کی رگوں میں خون کی جگہ میں دوڑتا ہے۔“

¹ صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف، باب زِيَارَةِ الْمَرْأَةِ زَوْجِهَا فِي اغْتِكَافِهِ، 50/3

روحانی معالج جسمانی اور نفسی بیماری کے بیرونی سبب کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ طبیب (physician) اور ماہر نفسیات (psychologist) مریض کے جسم اور دماغ میں قوت مدافعت پیدا کر کے اور بیماری کے جراثیم کا مقابلہ کروا کے علاج کرتے ہیں۔

سحریہ ہے کہ کسی رشتہ دار، دوست، پڑوسی، دشمن نے حسد، بغض، نفرت کے سبب تعویذ گنڈایا جادو ٹونا کروادیا۔ جادو گر کفریہ اور شرکیہ عمل کے ذریعہ شیاطین جنات کو خوش کر کے اس کے بدلے میں اُن کی مدد حاصل کرتا ہے۔ اور اُن شیاطین کو اُس کی طرف بھیجتا ہے کہ جس پر جادو کیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے جادو گر جادو کروانے والے سے ایک رقم وصول کرتا ہے۔

اور جادو کرنا کفر ہے کہ جادو گر کو اپنے جادو میں شیاطین کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت بھی کرنی پڑتی ہے۔ جادو کرنے والا اپنے کفر کے سبب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جادو گر کی سزایہ بیان کی ہے کہ اس کی گردن اڑادی جائے۔ ایک موقوف روایت کے الفاظ ہیں:

«حَدَّ السَّاحِرُ ضَرْبَةً بِالسَّيْفِ»¹

”جادو گر کی سزا اس کو قتل کرنا ہے۔“

اور نظر سے مراد نظر کا لگ جانا ہے اور نظر کا لگ جانا برحق ہے۔ جس طرح انسان کی گفتگو دوسرے کو متاثر کرتی ہے کہ آپ کسی کو گالم گلوچ کریں تو اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کے جذبات بھی دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر آپ کسی سے حسد کا جذبہ رکھتے ہیں تو یہ جذبہ (feeling) آپ کی آنکھوں کے راستے اس شخص کو متاثر کر سکتا ہے کہ جس سے آپ کو حسد ہو۔ اور اسی کو نظر لگ جانا کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الفلق میں حاسدین کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

¹ سنن الترمذی، أبواب الحدود، باب ما جاء في حد الساحر، 112/3

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ 1 ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ 2 ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ﴾ 3 ﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ﴾ 4 ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ [الفلق: 5]

”نبی ﷺ کہہ دیں، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی۔ ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی۔ اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے۔ اور گریہوں میں پھونکنے والوں (یا دالیوں) کے شر سے۔ اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے۔“

ان تینوں قسموں آسیب، جادو اور نظر کارو حانی علاج الگ ہے جو کہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم اس وقت یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ بعض روحانی معالج بعض اوقات شرعی دم کرتے ہیں لیکن ان کی جھاڑ پھونک کے نتائج برآمد نہیں ہوتے تو اس کی کیا وجوہات ہیں؟ یا شرعی دم کو اثر انگیز بنانے والی کیا چیزیں ہوتی ہیں؟ ذیل میں ہم چھ چیزیں نقل کر رہے ہیں۔

پہلی چیز روحانی معالج کا متقی اور عالم ہونا ہے۔ جھاڑ پھونک کرنے والا جس قدر زیادہ علم اور تقویٰ کا حامل ہوگا، اسی قدر اس کے دم میں اثر ہوگا۔ اور انسان کی زندگی میں جس قدر علم اور تقویٰ کم ہوگا، اسی قدر اس کے دم کا اثر بھی کم ہوگا۔ مثال کے طور بہترین بارش بہترین فصل پیدا کرتی ہے۔¹

دوسری چیز مریض کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت رکھنا ہے۔ اگر کسی عامل کا دم مریض کو فائدہ نہیں دے رہا تو سارا الزام عامل کو نہیں دیا جاسکتا کیونکہ بعض اوقات مریض میں دم کے اثرات کو قبول اور جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی یا کوئی رکاوٹ حائل ہوتی ہے۔ فصل کے لیے صرف بارش کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ زمین بھی اس

¹ ہمارے ایک دوست قاری شفیق الرحمن صاحب جادو ٹونا اور تعویذ گنڈا کے علاج کے لیے مستند عامل ہیں۔ ان کا ادارہ ”الحکمة“ کے نام سے ٹاؤن شپ، لاہور میں ہے۔ ان کا موبائل نمبر یہ ہے: 0301 5989211 اس کے علاوہ کتاب وسنت ویب سائٹ پر اس کے علاج کے بارے مستند کتب سافٹ کاپی میں موجود ہیں کہ جن کے مطالعہ سے ایک انسان خود سے بھی اس کا علاج کر سکتا ہے۔ <http://kitabosunnat.com>

قابل ہونی چاہیے کہ پیداوار دے سکے۔ اگر زمین بجز یا سخت ہے تو بارش اسے فائدہ نہیں پہنچا جاسکتی۔ ایک روحانی معالج نے بتلایا کہ انہوں نے ایک خاتون کو ہفتوں دم کیا لیکن دوران دم تو کچھ تکلیف کم ہو جاتی تھی لیکن جب وہ گھر جاتی تھیں تو تکلیف دوبارہ لوٹ آتی تھی۔ بعد ازاں معاملہ یہ کھلا کہ وہ سود کھانے میں ملوث ہیں کہ جس کی وجہ سے دم کے اثرات ان تک نہیں پہنچ رہے تھے۔ بلاشبہ حرام کھانا انسانی جسم تک کلام الہی کے انوارات اور برکات کے پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر مریض متقی اور شریعت پر عمل کرنے والا ہے تو اس پر دم کا اثر زیادہ اور جلدی ہوتا ہے اور مریض جس قدر معصیت میں مبتلا ہو، اس میں دم کے اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت اسی قدر سست ہوتی ہے۔

معالج اور مریض کے علاوہ تیسری چیز دم کے لیے آیات اور ااد کا انتخاب ہے اور اس کے لیے معالجین کے علم اور تجربے سے فائدہ لینا چاہیے۔ مثلاً اگر تو مریض کو اذیت دینے والا جن یہودی ہو تو اس پر وہ آیات زیادہ اثر کرتی ہیں جو یہود پر لعنت کے بارے میں ہیں۔ اگر ہندو جن ہے تو اس پر مشرکین پر سختی کرنے والی اور توحید کی آیات بہت اثر کرتی ہیں۔ اگر تو کوئی جن مرتد ہے تو پھر ارتداد والی آیات فائدہ دیتی ہیں۔ اسی طرح اگر جادو گر یا جنات کے دل میں رعب ڈالنا ہو تو آیات رعب کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر مسلط جن کی حاضری لگوانی ہو تو آیات حضور کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر جن کو ہلاک کرنا مقصود ہو تو آیات احراق کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر جن کو مسلمان کرنا ہو تو اسلام پیش کرنے والی آیات تلاوت کی جاتی ہیں۔ اگر مریض کو خوف اور ڈر محسوس ہوتا ہو تو ایسی آیات کی تلاوت کی جاتی ہیں جن میں اہل ایمان کے لیے خوف یا غم کے نہ ہونے کا ذکر ہے۔

چوتھی چیز مریض کا جن ہے۔ جس طرح انسان اپنی قوت برداشت میں مختلف ہوتے ہیں یعنی کوئی پہلوان ہے اور کوئی کمزور تو اسی طرح کا معاملہ جنات کا بھی ہے۔ بعض مریضوں پر جو جنات مسلط کیے جاتے ہیں، ان کی قوت برداشت (stamina)

بہت زیادہ ہوتی ہے۔ معالج ان پر ایک آدھ گھنٹہ دم کر کے تھک جاتے ہیں اور جن یہ تاثر دیتا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہو رہا حالانکہ اسے اذیت ہو رہی ہوتی ہے لیکن وہ معالج کو دھوکا دیتا ہے۔ بہت سے معالجین نے یہ بیان کیا ہے کہ جب انہوں نے دم کا دورانیہ بڑھایا یعنی کئی گھنٹے مسلسل دم کیا تو جن کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے اقرار کیا کہ اثر تو مجھ پر شروع سے ہی ہو رہا تھا لیکن وہ میرے لیے قابل برداشت تھا۔ اس لیے جن کی قوت برداشت بھی بعض اوقات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر مریض کا جن معالج کو یہ چیلنج کرے کہ مجھے کچھ نہیں ہو رہا یا کچھ نہیں ہو گا تو وہ جھوٹا ہے۔ اور اگر معالج ہمت کرے کہ اسے کئی گھنٹے مسلسل دم کرے تو جن کا تکبر اور غرور خاک میں مل جائے گا، ان شاء اللہ۔ جنات اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ایک مریض کے لیے معالجین کے پاس اتنا وقت نہیں ہے لہذا تھوڑی دیر برداشت کر لو اور معالج خود ہی مایوس ہو کر چھوڑ دے گا۔ اس لیے وہ برداشت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر معالج کے ہاتھ میں ہر بیماری کی شفا نہیں رکھی جیسا کہ ہر طبیب کے ہاتھ میں ہر بیماری کا علاج نہیں ہے۔ اور معالج اپنے علم اور تجربے میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا ایک خاص وقت میں اگر کسی معالج سے فائدہ نہ ہو رہا ہو تو اپنا معالج تبدیل کر کے دیکھیں۔ اس سے بھی بعض لوگوں کو فائدہ ہو جاتا ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ انسان پر کوئی آزمائش کچھ خاص وقت تک لیے باقی رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ انسان جسمانی بیماری کا علاج کروانا ہی رہتا ہے لیکن شفا نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف امر اور قضا نہیں ہے۔ اس لیے اگر جھاڑ پھونک کی تاثیر کے مذکورہ بالا تمام اسباب موجود ہوں اور پھر بھی دم اثر نہ کر رہا ہو تو اسے اللہ کا فیصلہ سمجھے، اللہ عز و جل سے اس آزمائش کے ٹل جانے کی دعا کرے اور صبر سے کام لے لیکن دم کو ترک نہ کرے۔ اس صورت میں صبر اور صبر کے ساتھ دعائی ایک ایسی صورت ہے جو آپ کو اس آزمائش سے نجات دلا سکتی ہے۔

تعلیم کا المیہ

ہمارے قومی مسائل کی فہرست میں نظام تعلیم کا مسئلہ ایک اہم تر موضوع ہے۔ ایک دوست سے اس بارے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ایک المیہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی مادری زبان میں سائنسی علوم نہیں پڑھاتے، ہمیں انگریزی کا ”ہوکا“ ہے۔ دوران بحث یہ بات سامنے آئی کہ بعض علوم تو مادری زبان میں منتقل ہی نہیں کیے جاسکتے۔ اب ریاضی تو انگریزی میں ہے ہی نہیں بلکہ اس کی زبان تو لاطینی ہے یا یونانی ہے وغیرہ۔ اب آپ ریاضیاتی مساواتوں (mathematical equations) کو کیسے اردو میں ترجمہ کریں گے۔ علاوہ ازیں پاکستانی یونیورسٹیوں میں سائنس کے یہ مضامین پڑھاتے ہوئے کتنی انگریزی بولی جاتی ہے، بلکہ پی ایچ ڈی پروفیسر پنجابی میں بھی پڑھا رہے ہوتے ہیں۔ تو عملاً تو ہم اردو میں ہی سائنس کے مضامین پڑھتے ہیں۔

باقی ہر مضمون کی کچھ اصطلاحات ہیں۔ اردو میں انگریزی زبان کے اتنے الفاظ شامل ہو گئے ہیں اور اس طرح ہماری زبان کا حصہ بن گئے ہیں کہ ان کا اردو ترجمہ ہماری قوم کے لیے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دے گا۔ مثلاً ہم بائیالوجی کے طالب علم کو بلڈ پریشر پڑھائیں تو شاید اسے مشکل پیش نہ آئے بلکہ ایک دیہاتی کو بھی یہ لفظ سمجھنے میں مشکل نہیں ہو گی۔ لیکن اگر ہم اسے بلند فشار خون سے ترجمہ کر کے بتلائیں گے تو اس اردو لفظ کی ادائیگی اور اسے یاد رکھنا اس کے لیے انگریزی لفظ سے زیادہ مشکل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اردو میں اگر آپ نے کوئی نئی اصطلاح لانی ہی ہے تو وہ یا تو فارسی سے لائیں گے یا عربی سے کیونکہ اردو تو خود متنوع زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اب کمپیوٹر کے لیے ترجمہ کہاں سے لائیں گے؟ آپ اس کے ترجمے کے لیے فارسی یا عربی کی طرف دیکھیں گے۔ عربی والوں نے ”آلة الحساب“ ترجمہ کیا ہے، آپ ”آلہ حساب“ کر لیں گے۔ پھر بھی لیا تو غیر زبان ہی سے ہے۔ تو اس سے بہتر ہے کہ اردو کے مصادر میں ترکی، فارسی، عربی، سنسکرت کے علاوہ انگریزی زبان کا بھی اضافہ کر لیں۔

تو دو باتیں سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ سائنس کے مضامین کی اصطلاحات کو ہماری قوم

انگریزی میں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے لہذا ان کا اردو میں ترجمہ کرنا مفید نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کلاس میں لیکچر کا مادری زبان یعنی ایسی اردو میں ہونا ہی مفید ہے کہ جس میں انگریزی کی آمیزش ہو۔ ورنہ تو مکمل انگریزی کی صورت میں طلباء کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

پھر نصاب پر بات چلی تو انہوں نے کہا کہ نصاب میں تبدیلی ہونی چاہیے یہاں تک کہ سائنس کے مضامین میں بھی۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست ہے۔ ہمیں کیمبرج یا آکسفورڈ کے فزکس، کیمسٹری، بائیالوجی اور ریاضی وغیرہ کے نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے اور اس محنت کا مقصود صرف اتنا ہو کہ سائنس پڑھنے والا الحاد کی بجائے خدا پر ایمان کی طرف راغب ہو کیونکہ اہل مغرب نے ہر علم کو نظریہ ارتقا کا تڑکا لگا کر خدا کے انکار تک پہنچانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ یہی کچھ ہمیں سماجی اور انسانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں کرنا چاہیے۔

فلکیات (Astronomy)، حیاتیات (Biology)، ریاضی اور نظریاتی فزکس (Theoretical Physics)، تو خدا تک پہنچا کر رہتی ہے، اگر کوئی صاحب دل اس پر کام کرے تو اسلام اور سائنس یا قرآن اور سائنس کے حوالے سے جو کام ہوا، اس کا مقصود بھی یہی ہے۔

پھر یہ بات چلی ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں رٹا سسٹم ہے یعنی ہم علم کو نقل (reproduce) کرتے ہیں، اس کی تطبیق (application) نہیں کرتے جبکہ یورپ میں علم کی تطبیق ہوتی ہے لہذا وہ ہم سے آگے ہیں۔ میں نے کہا: یہ تجزیہ بھی بالکل درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں دینی مدارس کا بھی یہی المیہ ہے کہ وہاں علم نقل (reproduce) ہو رہا ہے، تطبیق (application) نہیں ہو رہی اور قوم کی ذہانت علم کی تطبیق سے بڑھتی ہے نہ کہ اس کی نقل سے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ سابق چیئرمین ایچ ای سی ڈاکٹر عطاء الرحمن صاحب نے ایک انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہا کہ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں

کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ انٹرویو کرنے والے نے کہا کہ پاکستان میں تو ایک سو پچاس یونیورسٹیاں ہیں اور آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ کالجز ہیں، یونیورسٹی کوئی نہیں ہے کیونکہ یونیورسٹی کا کام علم کی تخلیق اور پیداوار (creation and production of knowledge) ہے جبکہ کالجز یہ کام کرتے ہیں کہ جو علم پیدا ہو چکا ہو، اسے دوبارہ پیش (reproduce) کرتے ہیں اور یہی کام ہمارے ہاں کی پاکستانی یونیورسٹیاں کر رہی ہیں۔

پھر مقاصد تعلیم (objectives and goals) کی بات چلی تو اس میں تو بیڑا ہی غرق ہے۔ ہم یہ کیوں پڑھنا چاہتے ہیں اور پڑھ کر کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اس بارے نہ طالب علم کا ذہن واضح نہ ہے، نہ استاذ کا اور نہ ہی تعلیمی ادارے کا۔ تعلیم کے مقاصد متعین نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر لڑکیاں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں؟ سوال تو یہ ہے کہ کیا لڑکیوں کو انجینئرنگ کی تعلیم کی ضرورت ہے؟ یا اگر وہ حاصل کر لیں گی تو ان کی مارکیٹ میں کیا کچھ ہوگی؟ مثلاً اگر وہ گانگی کی تعلیم حاصل کر لیں یا چائلڈ سپیشلسٹ بن جائیں یا ہوم اکنامکس میں کچھ کر لیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کیا کریں گی۔ لیکن یہاں تو جیسے کچھ متعین ہی نہیں ہے کہ کس کو کیا پڑھنا چاہیے یا کس کے لیے کون سی ڈگری حاصل کرنا مفید ہے۔ بس اسی ڈگری کے پیچھے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں لگی ہیں کہ جس کا مارکیٹ میں نام ہے، یا اشتہار بازی (advertisement) کے ذریعے اس کی اہمیت نمایاں کر دی گئی، یا جس میں فیس کم ہے، یا جس میں کم نمبروں کی وجہ سے داخلہ مل گیا، یا جوان کے والدین کی خواہش ہے، یا جس میں دو چار پیسے زیادہ کی ملازمت کی امید ہو وغیرہ۔

وقت سے پہلے تجربہ

ایک دوست سے بات چیت ہو رہی تھی کہ کیا کرنا چاہیے؟ یہ کریں، وہ کریں، یہ کچھ کر لیا، وہ کر لیا لیکن نتائج نہیں نکلے۔ ہماری سوسائٹی میں بہت سے جذبے والے نوجوان ہیں جو دین اور سوسائٹی کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن عمر، تجربہ اور وسائل نہیں

ہیں۔ یہ بات سامنے آئی کہ اگر کسی کام کو مشن بنا کر کرنا ہے تو وہ اپنے آپ کو وقف کر کے ہی کرنا ہو گا اور ابھی آپ پر بیوی بچے اور گھر وغیرہ کی ذمہ داریاں ہیں۔ تو جو نوجوان کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ چالیس سال کی عمر کے بعد ہی کچھ کریں کہ جب وہ معاشی طور کسی قدر مستحکم ہوں۔ اس وقت تک بس اپنے گھر بار کو سنبھالیں، اپنی ملازمت کریں، اپنا وژن مکمل کریں، اپنی ٹیم بنانے کی کوشش کریں کیونکہ کوئی بھی بڑا کام ٹیم ورک کے بغیر نہیں ہوتا۔ 37 سے 40 سال کی عمر میں اگلے تین سالوں کے بھی کچھ بچت (saving) کر لیں اور چالیس سال کے بعد کم از کم تین سال کے لیے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کرنے کا تجربہ کر لیں، کہ جسے آپ بطور مشن اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان تین سالوں میں مصلے پر بیٹھ جائیں اور اللہ سے مانگیں اور اگر اللہ نے کسی راستے پر ڈال دیا تو اس کا شکر ادا کریں، اور اللہ تعالیٰ آپ کے اخلاص پر آپ کو ضائع نہیں کریں گے، ان شاء اللہ۔ بڑے کام ایک خاص عمر کے بعد ہی ہوتے ہیں جبکہ آپ کی کچھ ساکھ (credibility) بن چکی ہو۔ پس امت کے نوجوانوں کو جوانی میں جاگتے میں خواب ضرور دیکھنے چاہیے اور جب تک یہ خواب دیکھنے والے ہزاروں میں نہیں ہوں گے، اس امت میں احیا (renaissance) کا عمل شروع نہیں ہو گا لیکن ان خوابوں کی تعبیر کا مناسب وقت چالیس کے بعد کا ہے جبکہ شخصیت میں کچھ پختگی آچکی ہو۔

اور خوابوں کی تعبیر مکمل کرنے کے لیے تو یہی تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ چالیس سال تک گھر بار کی خدمت کریں اور اس کے بعد کسی بھی دینی مشن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں اور ٹیم ورک کے ساتھ کوئی بڑا دینی کام کریں کیونکہ اکیلا شخص کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ آپ ٹیلی ویژن چینل کھولنا چاہتے ہیں یا اسلامی یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں، یا ریسرچ سنٹر قائم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، یا این جی او بنا کر ویلفیئر کا کام کرنا چاہتے ہیں، یا عوامی دعوتی کام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں یا اسلامی اسکول کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مناسب وقت چالیس کے بعد کا ہے، اس سے پہلے تو لوگ یہی کہیں گے کہ عمر دیکھو اور نعرے دیکھو۔ کم از کم آپ کی ڈاڑھی میں چند بال تو سفید ہوں کہ لوگ آپ کو

”سمجھدار (mature) خیال کریں۔ اور اگر کسی کو عمر کے اس حصے سے پہلے ہی کوئی موقع مل جاتا ہے تو ضرور فائدہ اٹھائے۔ واللہ اعلم۔

وقت سے پہلے تجربہ انسان کے لیے نقصان دہ بھی ہوتا ہے۔ ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

”ایک شخص اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک نو مولود تتلی پر پڑی جو اپنے خول سے باہر آنے کے لئے بہت کوشش کر رہی تھی، مگر خول میں موجود باہر نکلنے کے لئے سوراخ ابھی بہت باریک تھا، اس لئے وہ چاہ کر بھی نکل نہیں سکتی تھی۔ اس شخص کو رحم آیا اور اس نے آگے بڑھ کر اس خول کو قینچی سے کتر ڈالا۔ تتلی باہر نکل آئی مگر اس کے پنکھ ابھی بھی اس کے جسم سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ شخص مسکراتے ہوئے انتظار کرنے لگا کہ اب بس کسی بھی وقت یہ پنکھ کھل جائیں گے اور تتلی آزادی سے اڑنے لگے گی۔ مگر جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی پنکھ نہ کھل سکے تو اس شخص کو معلوم ہوا کہ اس نے ہمدردی میں تتلی کو زندگی بھر کے لئے محتاج و معذور کر دیا ہے۔ وقت سے پہلے خول سے نکال کر اس نے تتلی کی نشوونما کو روک دیا تھا۔ ہم میں سے بھی اکثر لوگ اپنے پیاروں کو وقت سے پہلے ان حقائق سے روشناس کروادینا چاہتے ہیں جو انہوں نے تلخ اور مشکل تجربات سے گزر کر سیکھے تھے۔ ایسا ہم محبت اور اخلاص سے کرتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کر کے ہم نے انہیں دریافت کرنے کے خوبصورت عمل سے محروم کر دیا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے پیاروں کو ٹھوکر نہ لگے مگر یہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ اس فطری طریق کو روک کر ہم انہیں ان کے شعوری ارتقا سے محروم کر رہے ہیں۔ انہیں اس تتلی کی مانند مفلوج کر رہے ہیں جو پھر کبھی آزاد فضا میں نہیں اڑ سکتی۔ اپنے تجربات ضرور بیان کریں، مشورہ بھی ضرور دیں مگر اسے کسی پر مسلط نہ کریں۔ راستہ دکھائیں مگر سفر انہیں خود کرنے دیں۔ خدا کی معرفت بھی ایک شعوری دریافت ہے۔ آپ بس تحقیق کی ترغیب دیں، اس تحقیق میں ان کی مدد کریں

مگر نتائج انہیں خود اخذ کرنے دیں۔“¹

وقت ایک بہت بڑا ستاذ ہے۔ اگر آپ کو کوئی سکھانے والا نہ بھی ہو تو وقت انسان کو بہت کچھ سکھا جاتا ہے۔ میں چونکہ سوشل میڈیا پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں لہذا بعض اوقات اپنی کسی تحریر پر قارئین کی طرف سے کیے جانے والے تبصرے کے اسلوب سے اندازہ لگالیتا ہوں کہ تبصرہ نگار کی عمر کتنی ہو گی اور یہ اندازہ عموماً درست ہوتا ہے۔ مثلاً انسان میں وقت کے ساتھ ساتھ عاجزی اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ عاجزی اور ٹھہراؤ کی بعض صورتیں نوجوانی میں بھی حاصل ہو جاتی ہوں گی لیکن ان صفات کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ وہ وقت کے ساتھ ہی حاصل ہو پاتی ہیں۔ پس کسی بیس سال کے نوجوان یہ توقع رکھنا کہ وہ ایسی باتیں کرے یا ایسی صفات سے متصف ہو یا ایسے رویوں کا حامل ہو کہ جو چالیس کی عمر میں حاصل ہوتے ہیں، درست نہیں ہے۔ بعض چیزیں صرف وقت سے حاصل ہوتی ہیں، اس کے علاوہ سے نہیں۔ اور جب تک وہ وقت نہیں گزرے گا، اس وقت تک وہ چیز حاصل نہیں ہو گی۔ اسی طرح بعض انسانی اوصاف بھی وقت کے ساتھ ہی حاصل ہوتے ہیں، وقت سے پہلے نہیں، یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ انسانی شعور کی پختگی میں وقت کی کتنی اہمیت ہے، اس کا اندازہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت مبارکہ میں غور کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِإِلَادِهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُثَبِّتُ الْإِنِّكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ [الأحقاف: 15]

”اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف جھیل کر پیٹ میں رکھا اور تکلیف برداشت کر کے پیدا کیا۔ اس کا حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے کی ہے۔

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

یہاں تک کہ جب وہ بچنگی اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا تو کہنے لگا اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر بجالاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں ایسے نیک عمل کروں جن سے تو خوش ہو جائے اور تو میری اولاد بھی صالح بنا، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔“

اردو ادب

اردو ادب کا ذوق رکھنے والے ایک دوست نے یہ تحریر لکھی: ”منٹو نے صرف غلاظت میں انگلیاں کرید کر بدبو پھیلانے کا کام کیا ہے۔ سماج کے لیے منٹو سے زیادہ مفید وہ بھنگی ہے جو غلاظت صاف کرتا ہے۔“

منٹو کے حق میں اور اس کے خلاف بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ آپ کو منٹو کے جتنے مخالفین ملیں گے، اتنے ہی مویدین بھی مل جائیں گے کہ جو یہ کہتے نظر آئیں گے کہ منٹو کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں ہے۔ اگر منٹو نے ایسے موضوعات نہ چھیڑے ہوتے کہ جن کی زد میں مذہبی تصورات براہ راست آتے ہوں تو ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس نے کیا لکھا ہے؟

منٹو کے مؤیدین سے سوال یہ ہے کہ منٹو کے افسانے پڑھ کر ایک عام قاری کو حاصل کیا ہوتا ہے؟ دل میں جو قیمتی احوال پیدا ہوتے ہیں اور دماغ میں جو اعلیٰ سوچیں بیدار ہوتی ہیں، اسے موضوع بحث بنا لیا جاتا تو شاید فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے میں آسانی ہو سکتی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق وہ بھی تو شاعر ہی تھا کہ جس کے کلام پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان کو پکڑو۔

مسند احمد میں مروی ایک روایت میں امرؤ القیس کو جہنم کے راستے پر چلنے والے شعر اکار ہنما کہا گیا ہے۔ پس ایک ہے ادب کو ”ادب برائے ادب“ کی نظر سے دیکھنا تو امرؤ القیس جیسا شاعر نہیں ہے اور منٹو جیسا ادیب نہیں ہے۔ اور ایک ہے ادب کے بارے اسلام کی نظر سے فیصلہ کرنا تو اس تناظر میں بالکل مختلف فیصلہ سامنے آئے گا۔

کامیاب شاعر یا ادیب ہونے کا ہر گز مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے کلام کو دین اسلام کی روشنی میں خیر کی سند جاری کی جائے۔ ادب کے پہلو سے منٹو کا کلام اعلیٰ ہے کیونکہ ادب اپنے ادب ہونے یا بننے یا کھلوانے کے اپنے معیارات رکھتا ہے جبکہ خیر و شر ہونے کے پہلو سے منٹو کے کلام کی حیثیت وہی ہے جو امر و القیس کی شاعری کی پیغمبر اسلام ﷺ نے متعین کر دی ہے۔ خیر و شر کا تعین ادب کا موضوع نہیں ہے بلکہ مذہب کا ہے۔

ایک شخص شاعر ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس درجے کا ہے، یہ ادب کا موضوع ہے۔ باقی دین صرف یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ اچھا شاعر ہے یا برا۔ اسی طرح ایک شخص ادیب ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس پائے کا ہے؟ یہ ادب کے معیارات سے طے ہو گا۔ باقی وہ ادیب اچھا ہے یا برا، اس کا پیش کردہ ادب خیر ہے یا شر، تو یہ دین سے طے ہو گا۔

منٹو کے ادیب ہونے سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ امر و القیس کے شاعر ہونے کا انکار کر دینا۔ باقی دونوں کا ادب فحش ہے لہذا اسلام کی نظر میں اسے شر قرار دیا جائے گا۔ مصوری یا مجسمہ سازی ایک فن ہے۔ کوئی شخص ان فنون میں ماہر ہے یا نہیں، یہ مذہب کا موضوع نہیں ہے۔ باقی یہ کہ ایک مصور کی مصوری کا فن پارہ اور مجسمہ سازی کا شاہکار خیر ہے یا شر، تو یہ دین کا موضوع ہے۔ اور اس بارے علماء کوئی فتویٰ جاری کریں گے تاکہ معاشرے کو ان فنون سے پیدا ہونے والے بگاڑ سے بچایا جاسکے۔

اسلام فنون کے مخالف نہیں ہے لیکن جب ان فنون کو بے حیائی، عریانی، فحاشی اور بے غیرتی کے پھیلانے کا آلہ بنالیا جاتا ہے تو پھر اسلام ان پر قدغن عائد کرتا ہے۔ انسان کی حس جمال یہ نہیں ہے کہ کسی عورت کا بے لباس مجسمہ بنائے، یا انسان کا ذوق جمال یہ نہیں ہے کہ اپنی شاعری میں عورت کے نازک اعضا کی تعریف کرے۔ جمالیات کا تعلق تخلیق سے ہے نہ کہ بے حیائی اور فحاشی سے۔ آرٹ اور ادب جب بے حیائی اور فحاشی کا مترادف بن جاتا ہے تو پھر اسلام کو اس پر اعتراض ہے اور شدید اعتراض ہے۔ معروف کالم نگار اور یا مقبول جان لکھتے ہیں:

”میر تقی میر سے لے کر فراق گھور کھپوری تک سب کے ادبی محاسن اور

لونڈوں سے محبت کے انداز کو جس خوبصورتی کے ساتھ نقادوں نے سراہا اور جس طرح انہیں معاشرے میں عزت و تکریم کے مقام پر فائز کیا، اس سے ہماری پستی اور زوال کی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ الطاف حسین حالی نے جب مسدس لکھی تو انھی شعراء کے بارے میں کہا تھا ”جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے“... کیا حیرت انگیز دعویٰ ہے استاذ الشعراء میر تقی میر کا۔

ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا ہم نے کہے رفتہ رفتہ ہندوستان سے شعر مرا ایران گیا ادب کے اس عظیم سپوت نے چھ دیوانوں میں 13,590 اشعار تحریر کیے جن میں 86 فیصد شعروں میں معشوق کی جنس مرد ہے، لونڈا، طفل یا نونہال۔ یہ اشعار فحش گوئی اور مرد پرستی کے نمونے ہیں۔ نمونے بھی ایسے کہ انھیں نقل کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لڑکے یا لونڈے کے حسن کے قصے اور طرح درایوں کے افسانے اس کے خال و خد سے لے کر عشوہ طرازیوں تک چلے جاتے ہیں۔ چہرے پر ہلکے ہلکے رویں آنے کو خط آنا کہتے ہیں۔ اس کو بھی ان شاعرانِ عظیم نے سو طرح کے مضمون سے باندھا ہے۔

وہ جو عالم اس کے اوپر تھا وہ خط نے کھو دیا مبتلا ہے اس بلا میں میر اک عالم ہنوز اور اب اسیر آسی خط کے آنے کو ایک اور طریقے سے بیان کرتا ہے

خط نمودار ہوا، وصل کی راتیں آئیں جن کا اندیشہ تھا منہ پر وہی باتیں آئیں یوں تو یہ و بابر صغیر پاک و ہند میں ایران سے آئی، بلکہ نقاد جنہوں نے عربی ادب کا مطالعہ کیا، وہ بھی کہتے ہیں کہ ایران ہی سے لونڈوں سے عشق کے مضامین عرب شاعری میں داخل ہوئے۔ حافظ کا مشہور شعر تو ہر کوئی کس لذت سے سنتا ہے

اگر آں ترک شیرازی، بدست آرد دل مارا

بخالِ ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را
 (اگر وہ شیراز کا ترک لڑکا مجھے مل جائے تو میں اس کی گال کے تل کے بدلے
 سمرقند اور بخارا کے شہر اسے بخش دوں)۔ یوں لگتا ہے شاعری میں لطف و کمال
 اور ذوقِ جمال اسی ایک شوق کے گرد گھومتا تھا۔ ان شعراء کی ذاتی زندگی کے
 قصوں میں بھی اس شوق کی جھلک نظر آتی ہے۔ جوشِ سلیخ آبادی نے کس فخر
 کے ساتھ لڑکوں سے اپنے معاشقوں کا ذکر کیا۔ ان شعراء کی محفل میں ایک
 نوجوان شاعر ساغر نظامی آنکلا، خوبصورت تھا، کیا کیا قصے اس کے ساتھ مشہور
 نہیں ہوئے۔ سیماب اکبر آبادی کا یہ مصرعہ تو ادبی تاریخ کے منہ پر غلیظ طمانچہ
 ہے ”ساغر کی تہہ میں قطرہ سیماب رہ گیا“۔ فراق گھور کھپوری کہ جس کی
 انھی حرکتوں کی وجہ سے اس کے بیٹے نے خودکشی کر لی تھی کہ اس کا باپ اس
 کے دوستوں سے بھی باز نہ آتا تھا۔ ہوسِ زندگی کا وہی عالم جو میر تقی میر میں تھا
 کہ

وے نہیں تو انھوں کا بھائی اور
 عشق کرنے کی کیا منائی ہے
 ”ہندو لڑکے سے کیا معیشت ہو“ سے لے کر ”یہ نرم شانہ لڑکے ہیں مخمل
 دو خابہ۔“ اور پھر ”اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں“ جیسے نسبتاً گم فحش
 مصرعوں کو ہی اگر اردو شاعری میں چھانٹا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ہمارے ارد
 گرد ایک ایسا ماحول آباد تھا اور ہے جو اس قدر بیمار ہے جس میں ہیر و وہ ہے جو
 اپنے ساتھ ایک لڑکا معشوق لیے پھرتا ہے یا جس نے اپنی مردانگی کے زیر اثر
 شہر کے خوب رو لڑکوں کو اپنے قابو میں رکھا ہوا ہے۔ وہ ان سے دھونس اور
 زبردستی سے بھی اپنی ہوس پوری کرتا ہے اور ان کے ناز و خیرے اور خرچہ اٹھا کر
 بھی۔ ایسا کردار سعادت حسن منٹو کے دودا پہلوان میں بھی آکر اجاگر ہوتا ہے
 اور وہ اسے کیسے ایک سچے عاشق کے طور پر پیش کرتا ہے۔¹

¹ اوریا مقبول جان، قصور کا رونا، قصور کس کا، روزنامہ ایکسپریس، 14 اگست، 2015ء

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ نَسِيرُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَجَجِ إِذْ عَرَضَ شَاعِرٌ يُنْشِدُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «خُذُوا الشَّيْطَانَ، أَوْ أَمْسِكُوا الشَّيْطَانَ لَأَنْ يَمْتَلِيْ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَمْتَلِيْ شِعْرًا»¹

”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ مقام ”عرج“ سے گزر رہے تھے تو ایک شاعر شعر کہتا ہوا سامنے آیا۔ آپ ﷺ نے اس کا کلام سن کر کہا: اس شیطان کو پکڑو یا روکو کیونکہ کسی شخص کا پیٹ قے سے بھرا ہو، یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرا ہو۔“

زاویہ نگاہ

ایک دوست نے سوال کیا کہ اسلام میں چار شادیاں کیوں کرتے ہیں؟ جواب: اس کا جواب تب سمجھ میں آئے گا جب کر لیں گے۔ میرا مطلب ہے تزکیہ نفس کے لیے کرتے ہیں۔ جب ایک بیوی سے انسان کا تزکیہ نہ ہو رہا ہو تو اسے دوسری شادی کر لینا چاہیے۔

اس جواب میں یہ پہلو بھی ہے کہ ہر سوال کا جواب ہمیشہ نیے تلے انداز میں دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اور ہر سوال کا جواب ہمیشہ سنجیدہ بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات سنجیدہ سوال کا جواب اگر آپ مزاحیہ انداز میں دے دیں گے تو سنجیدہ جواب سے جو لایعنی بحث شروع ہو سکتی تھی، اس سے آپ بچ سکتے ہیں۔

اور اس جواب میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی شے کو دیکھنے کا ایک ہی زاویہ نہیں ہوتا بلکہ آپ ایک شے کو مختلف زاویوں (angles) سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور بعض اوقات آپ اگر کسی اور زاویے سے اس شے کو دیکھیں تو آپ کو اس شے پر جو اعتراض ہوتا ہے، وہ دور ہو جاتا ہے کیونکہ آپ کے اعتراض کا سبب دراصل وہ زاویہ ہوتا ہے کہ جس سے آپ اس شے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اہل سائنس کا کہنا ہے کہ کسی شے کی

¹ صحیح مسلم، کتاب الشَّغَر، 1769/4

حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسے گیارہ جہات (dimensions) سے دیکھیں اور اسے وہ اسٹرنگ تھیوری کا نام دیتے ہیں۔

ایک سے زائد جہات سے کسی شے کو دیکھنے سے اس کا تصور مکمل ہوتا ہے۔ یہ امکان ہے کہ باہر گلی میں اگر ہم اپنے گھر کے روزن سے جھانکیں تو کچھ اور منظر دکھائی دے اور اگر ہمارا پڑوسی اسی گلی میں اپنے گھر کے روزن سے جھانکے تو کچھ اور منظر دکھائی دے۔ اور جو کچھ انہیں دکھائی دے رہا ہے، وہ درست ہے کیونکہ وہ اپنے زاویے سے اس کو دیکھ رہے ہیں لہذا ان کے بیان میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ تو کبھی کبھی اگر پڑوسی دعوت دے تو اس کے گھر کے روزن سے بھی گلی میں جھانک لینا چاہیے کہ حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اہل ایمان میں بھی ایک شے کے اچھے یا برے ہونے کے بارے اختلاف ہو جاتا ہے تو ایسا اختلاف عموماً مختلف زاویوں سے ایک شے کو دیکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اسے اختلاف تنوع کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا تفسیر میں جو اختلاف ہے، وہ اسی نوعیت کا ہے۔

ہمارے معاشرے میں دوسری شادی کو ہمیشہ اس زاویے سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ عورت کے ساتھ ظلم ہے کہ مرد کو تو ایک سے زائد کی اجازت ہے جبکہ عورتوں کو نہیں ہے۔ لیکن دوسری شادی کو دیکھنے کا ایک ہی زاویہ نہیں ہے بلکہ دسیوں ہیں کہ جن سے معاشرے نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ ان زاویوں میں سے ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں مرد کو انسان بنانے میں عورت کا اہم کردار ہے۔ شادی کے بعد ایک مرد کی شرافت، اخلاق اور ذمہ داری میں واضح طور تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے اور اس کی وجہ بلاشبہ اس کی بیوی ہی ہوتی ہے۔ تو ایک مرد کو مزید انسان بنانے کے لیے بھی اس کی دوسری شادی کرائی جاسکتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ، يَمِيلُ مَعَ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْآخَرَى، جَاءَ يَوْمٌ

الْقِيَامَةِ وَأَحَدُ شَقِيئِهِ سَاقِطٌ»¹

”جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک کی طرف زیادہ مائل رہتا ہو تو قیامت والے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہو گا۔“

دوسری شادی کی اجازت اسی صورت میں ہے کہ جب شوہر بیویوں کے مابین عدل کرے اور اگر وہ عدل نہ کر سکے تو پھر اسے ایک ہی پر اکتفا کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں ایک سے زائد شادیاں اس کے لیے آخرت میں وبال بن جائیں گی۔ اور وہ اس حال میں اللہ کے حضور میں پیش ہو گا کہ جیسے اس کا ایک پہلو فالح کے سبب سے مردہ ہو گیا ہو۔ تو دوسری شادی کو دیکھنے کا ایک زاویہ یہ ہے کہ یہ انسان کے عدل کا امتحان ہے اور اس امتحان میں وہ اسی صورت کا میاب ہو سکتا ہے جبکہ اس کا تزکیہ ہو چکا ہو۔

اسی طرح ایک دوست نے کہا کہ بعض یورپی حکومتوں کو کیا آفت آ پڑی ہے کہ نقاب کو عوامی مقامات پر پابند (ban) کرنے کے لیے قانون سازی کر رہی ہیں حالانکہ ان کا یہ رویہ ان کے ملکی آئین میں فرد کی آزادی کے بارے موجود تصورات سے بھی متصادم ہے۔

میں نے کہا کہ نقاب محض ایک مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اعلان جنگ ہے جو ہر نقاب پہننے والی خاتون 270 بلین ڈالر کی بیوٹی انڈسٹری کے خلاف کرتی ہے کہ اتنی بڑی انڈسٹری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور کیپٹلزم کے خلاف اعلان جنگ ہے لہذا مغربی اقوام اس کے خلاف قانون سازی کی خواہاں ہیں۔ ایک سروے کے مطابق بیوٹی انڈسٹری کا تقریباً 70 فی صد افریقین ممالک میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ کمال نہیں ہے کہ انہوں نے ملین ڈالر کی اشتہار بازی کے ذریعے ایک حبشن (negress) کو بھی یہ یقین دلادیا ہے کہ ان کی بنائی ہوئی کریم استعمال کرنے سے اس کا رنگ گورا ہو سکتا ہے۔

یہ نقاب اور حجاب کے مسئلے کو دیکھنے کا ایک دوسرا زاویہ ہے جو کہ مذہبی نہیں معاشی

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الْقِسْمَةِ بَيْنَ النِّسَاءِ، 633/1

ہے۔ اسی طرح نقاب اور حجاب کو دیکھنے کا ایک زاویہ معاشرتی بھی ہو سکتا ہے۔ ایمان ہی کے مسئلے کو لے لیں کہ ہمارے دین میں اسے دیکھنے کے ستر سے زائد زاویے ہیں کہ جنہیں ”شعب الایمان“ بھی کہتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْإِيمَانُ بَضْعٌ وَسَبْعُونَ بَابًا، فَأَذْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَأَنْفَعُهَا قَوْلٌ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ»¹

”ایمان کے ستر سے زائد دروازے ہیں کہ جن میں سے ادنیٰ ترین یہ ہے کہ راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دیا جائے اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کہا جائے۔“

کسی شخص میں ایمان دیکھنے کا معیار صرف اس کا لباس اور وضع قطع نہیں ہے بلکہ اخلاق بھی ایمان دیکھنے کا زاویہ ہے، طہارت اور صفائی بھی ایمان ہی کا ایک پہلو ہے، حیا بھی ایمان کا حصہ ہے وغیرہ۔ پس میک انڈسٹری نے دنیا کی ہر دوسری خاتون کو یہ یقین دلوا دیا ہے کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت بن سکتی ہے بشرطیکہ اُن کی مصنوعات کو استعمال کرے۔ قرآن مجید نے نہ صرف جنات شیاطین سے متنبہ کیا ہے کہ ان سے دور رہو بلکہ انسانی شیاطین سے بھی ہمیں خبردار کیا ہے کہ ان سے بچ کر رہو جیسا کہ سورۃ الناس میں ہے۔

جنات شیاطین تو صرف سینے میں وسوسہ ڈالتے ہیں اور انسانی شیاطین تو دل میں ایسی خواہشات کا بیج پیدا کرتے ہیں کہ جو اس دنیا میں کبھی بھی پوری ہونے والی نہیں ہیں۔ پھر وہ خواہش کے اس بیج کو ایک تناور درخت بناتے ہیں اور پھر اس پر پھول چھڑک کر اسے آگ لگا دیتے ہیں اور انسان اپنی خواہشات کی آگ میں جلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی بے سکونی اور بے اطمینانی کی کیفیت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

خواہشات کی یہ آگ اگر ٹھنڈی ہو سکتی ہے تو وہ دین اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونے سے ہی ہو سکتی ہے اور یہ بات کمپیٹلزم کے پجاریوں کو اچھی طرح سمجھ آگئی ہے کہ دین اسلام جس سادگی اور دنیا سے بے رغبتی کا حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ ان کا کاروبار

¹ سنن الترمذی، أبوابُ الإيمان، بابُ مَا جَاءَ فِي اسْتِكْمَالِ الْإِيمَانِ وَزِيَادَتِهِ وَتَفْصِيلِهِ، 10/5

نہیں چلنے والا لہذا وہ ایک تو اپنی ایڈورٹزمنٹ کے ذریعے اپنی مصنوعات کی خواہشات کی آگ بھڑکاتے ہیں اور دوسری طرف ان مصنوعات کو استعمال نہ کرنے والوں پر قانون سازی کے ذریعے جرمانے عائد کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَزَالُ قَلْبُ الْكَبِيرِ شَابًّا فِي اثْنَتَيْنِ: فِي حُبِّ الدُّنْيَا وَطُولِ الْأَهْلِ»¹

”بوڑھے کا دل بھی دو چیزوں میں ہمیشہ جوان رہتا ہے، ایک دنیا کی محبت میں اور دوسرا لمبی امیدوں میں۔“

فکر کی کجی

تزکیہ نفس میں جہاں عمل کی اصلاح شامل ہے، وہاں فکر کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ اس شخص کا تزکیہ کیا تزکیہ ہے کہ جس کی فکر کج ہے اور وہ اپنے اخلاق کو سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک شخص کی فکر میں کجی ہو اور اس کے رویے درست ہو جائیں۔ انسان اسی پر عمل کرتا ہے جو اس کی فکر ہوتی ہے لہذا عمل سے پہلے فکر کی اصلاح ضروری ہے۔ ہمارا دین فکر کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے کہ اسی فکر ہی سے انسان کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

صالح فکر سے اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور کج فکری سے برے اخلاق جنم لیتے ہیں۔ بندہ مومن جس قدر اپنے اخلاق کی اصلاح کے لیے مجاہدہ کرتا ہے، اس سے زیادہ اپنی فکر کی اصلاح میں فکر مند رہتا ہے کہ اللہ عزوجل نے فکر کی اصلاح کو اخلاق کی اصلاح پر اہمیت دی ہے۔ قرآن اس بارے میں واضح ہے کہ جس کی فکر توحید پر قائم ہو گی تو بالآخر نجات پالے گا لیکن جس کی فکر میں کفر اور شرک ہو گا تو اس کی نجات کبھی بھی نہ ہوگی۔

ایک دہریے (atheist) نے مسلمان سے کہا: کیا آپ نے دی گرینڈ ڈیزائن (The Grand Design) پڑھی ہے؟ مسلمان نے کہا: کیا آپ نے دی گرینڈ پلان

¹ صحیح بخاری، کتاب الزقاق، باب مَنْ بَلَغَ سِتِّينَ سَنَةً، فَقَدْ أَغْدَرَ اللَّهُ إِلَيْهِ فِي الْغُمْرِ، 8/89

(The Grand Plan) پڑھی ہے؟ دہریے نے کہا: نہیں، ویسے یہ کس کی کتاب ہے مسلمان نے کہا: دی گرینڈ ڈیزائن میں تو صرف ڈیزائن کا ذکر ہے، ڈیزائنر غائب ہے جبکہ دی گرینڈ پلان میں گرینڈ ڈیزائن کے ساتھ ڈیزائنر کا بھی ذکر ہے۔ دہریہ کہنے لگا: واہ، کمال کی بات ہے۔ لیکن بتاؤ تو سہی کہ لکھی کسی نے ہے؟ مسلمان نے کہا: خود ڈیزائنر نے۔

دی گرینڈ ڈیزائن، اسٹیون ہاکنگ کی تصنیف ہے کہ جسے پوری دنیا میں آئن سٹائن کے بعد ذہین ترین سائنسدان سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب 2010ء میں شائع ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک ارب سے زائد نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں ہاکنگ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ دنیا، حیات اور کائنات کی ابتدا جاننے کے لیے کسی خدا کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قدرت کے قوانین (laws of nature) ہمیشہ سے ہیں اور وہ وہی اس گرینڈ ڈیزائن کی علت (cause) ہیں۔

اس مکالمہ میں دی گرینڈ پلان سے مراد لوح محفوظ تھا کہ جس میں انسان اور کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ موجود ہے۔ اسے ہم مذہب کی اصطلاح میں ”تقدیر“ بھی کہتے ہیں۔ تقدیر ہی علم کی حقیقت (reality) ہے اور جو تقدیر کے نکتے کو نہ جان سکا، تو وہ علم کی حقیقت سے محروم رہا۔ خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل یہی تقدیر ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«دَخَلْتُ عَلَىٰ عِبَادَةٍ، وَهُوَ مَرِيضٌ أَتَخَايَلُ فِيهِ الْمَوْتَ فَقُلْتُ: يَا أَبَتَاهُ أَوْصِنِي وَاجْتَنِبْ لِي. فَقَالَ: اجْلِسُونِي. فَلَمَّا أَجْلَسُوهُ قَالَ: يَا بُنَيَّ إِنَّكَ لَنْ تَطْعَمَ طَعْمَ الْإِيمَانِ، وَلَنْ تَبْلُغَ حَقَّ حَقِيقَةِ الْعِلْمِ بِاللَّهِ حَتَّىٰ تَوْمَنَ بِالْقَدَرِ خَيْرَهُ وَشَرَّهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا أَبَتَاهُ وَكَيْفَ لِي أَنْ أَعْلَمَ مَا خَيْرُ الْقَدَرِ مِنْ شَرِّهِ؟ قَالَ: تَعْلَمُ أَنَّ مَا أَخْطَأْتُكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ، وَمَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ. يَا بُنَيَّ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْقَلَمَ، ثُمَّ قَالَ: اكْتُبْ فَجَرَىٰ فِي تِلْكَ السَّاعَةِ بِمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، يَا بُنَيَّ إِنْ مِتَّ وَلَسْتُ

عَلَى ذَلِكَ دَخَلَتِ النَّارُ»¹

”حضرت ولید بن عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے مرض الموت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ ابا جان! مجھے اچھی طرح وصیت کریں۔ تو انہوں نے کہا کہ مجھے بٹھا دو۔ پس جب انہیں بٹھا دیا گیا تو انہوں نے کہا: اے میرے بچے! تجھے ایمان کا ذائقہ اس وقت تک محسوس نہیں ہو گا اور تو اللہ کے بارے علم کی حقیقت تک اس وقت تک نہیں پہنچ پائے گا جب تک کہ تو اچھی بری تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔ تو میں نے کہا کہ ابا جان! مجھے اچھی اور بری تقدیر کا علم کیسے ہو گا؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ جان لو کہ جو چیز تجھے نہ مل سکی تو وہ تجھے کبھی بھی نہ ملنے والی تھی۔ اور جو چیز تجھے مل گئی تو وہ کبھی تجھ سے خطا نہ ہونے والی تھی۔ اور جان لو کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ عز و جل نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے کہا کہ لکھو تو اس نے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا، اسے لکھ دیا۔ اے میرے بچے! اگر تیری موت اس حال میں ہوئی کہ تیرا اس پر ایمان نہ ہو تو آگ میں داخل ہو گا۔“

اس دنیا کا نظام اسی گرینڈ پلان کے مطابق چل رہا ہے اور آج تک کسی سائنسدان اور فلسفی کو یہ جرات نہ ہو سکی کہ اس گرینڈ پلان کے اس جزوی فیصلے کو ہی اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکے کہ جو اس کی ذاتی زندگی اور آزمائش سے متعلق ہے۔ مثلاً انسان اپنے لیے جیسی شکل و صورت پسند کرتا ہے، کیا ویسی شکل و صورت کے ساتھ اس دنیا میں آسکتا ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [آل عمران: 6]

”وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے۔ اُس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔“

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 379-378/37

یہ گریڈ پلان بتلاتا ہے کہ انسان کس قدر بے بس، محتاج اور مسکین ہے۔ نہ اس دنیا میں آنے میں اس کی مرضی غالب ہے اور نہ جانے میں اور نہ دونوں کے درمیانی وقت میں۔ اس بیچارے کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کس وقت کیا ہونے والا ہے یا کیا ہونے جا رہا ہے بلکہ یہ تو خواہش بھی اپنے رب کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ [التکویر: 29]

”اور تم پروردگار عالم کے چاہے بغیر کچھ چاہ بھی نہیں سکتے۔“

علمی بات یہ ہے کہ اللہ کا ارادہ دو قسم پر ہے: تکوینی اور شرعی۔ تکوینی ارادے کے تحت اللہ عزوجل نے ہر شے کی تخلیق فرمائی ہے، خیر کی بھی اور شر کی بھی، جبکہ شرعی ارادے کے تحت اللہ نے انسان سے کچھ مطالبات کیے ہیں کہ جنہیں ہم شریعت کہتے ہیں۔ پس تقدیر امر تکوینی ہے اور شریعت امر شرعی ہے۔ امر تکوینی میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہوتی بلکہ تخلیق مقصود ہے جبکہ امر شرعی میں اللہ کی رضا بھی شامل ہے۔ تکوینی امور کو مشیت بھی کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَفْتَنَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾ [البقرة: 253]

”اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے مرنے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ شر کا خالق ہے جبکہ اس سے راضی نہیں ہے اور خیر کا خالق بھی ہے اور اسی سے راضی بھی ہے۔ پس کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کائنات کا ڈیزائن عظیم ہے تو ڈیزائنر بھی عظیم ہوگا۔ کتنی سیدھی سی بات ہے لیکن سمجھ جب شیطان کے حوالے ہو جائے تو پھر انسان ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

اسی طرح تنظیم اسلامی کے کچھ دوستوں کی وساطت سے قرآن اکیڈمی میں ایک منکر حدیث سے ملاقات ہوئی۔ ملتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی کہ آپ کی تعلیم، ڈگری، مسلک، تعلیم حاصل کرنے کے مقاصد کیا تھے؟ میں نے کہا کہ کام کی بات کریں کہ مسئلہ کیا ہے جس کے لیے آپ ملاقات کے خواہاں تھے؟

انہوں نے کہا: میں حدیث کو نہیں مانتا، آپ حدیث کو ثابت کریں۔ میں نے کہا: آپ قرآن کو مانگتے ہیں؟ انہوں نے کہا: مانتا ہوں۔ میں نے کہا: میں قرآن کو نہیں مانتا، آپ قرآن کو ثابت کریں۔ انہوں نے کہا: یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا: یہی تو بات ہے۔ انہوں نے کہا: آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: جس طریقے سے آپ قرآن مجید کو ثابت کریں گے، اسی طریقے سے میں حدیث کو ثابت کروں گا۔ انہوں نے کہا: آپ کے نزدیک قرآن مجید کیسے ثابت ہوتا ہے؟ میں نے کہا: جس طرح حدیث ثابت ہوتی ہے۔

انہوں نے کہا: پھر بھی کیسے؟ میں نے کیا: میں نے اپنے استاذ سے سنا، انہوں نے اپنے استاذ سے، انہوں نے اپنے استاذ سے اور اسی طرح یہ سلسلہ سند اللہ کے رسول ﷺ تک جا پہنچتا ہے۔ مدرسہ کے طالب علم کے پاس اپنے استاذ سے اللہ کے رسول ﷺ تک کی مکمل سند موجود ہوتی ہے۔ جس طرح ہم نے قرآن ”قاری المقری“ سے لیا، اسی طرح حدیث ”شیخ الحدیث“ سے لی۔ قاری المقری نے جس طرح قرآن کی سند اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچائی، اسی طرح شیخ الحدیث نے حدیث کی سند نبی کریم ﷺ تک پہنچائی۔¹

¹ مثلاً ہمارے استاذ مولانا حافظ عبد الرحمن مدنی صاحب نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ محمد بن عطیہ السلام سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ آل باز سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد الحق ہاشمی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ احمد بن عبد اللہ بن سالم بغدادی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد الرحمن بن حسن بن محمد بن عبد الوہاب سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ اور دادا شیخ محمد بن عبد الوہاب سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد اللہ بن ابراہیم مدنی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد القادر التغلبی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ المحدث عبد الباقي سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ احمد بن مفلح الوفاقی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ احمد بن محمد المقدسی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ علاؤ الدین مرادوی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابراہیم بن قندس البعلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن اللحام حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن رجب الحنبلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن قیم الجوزیہ سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ امام ابن تیمیہ سے حاصل کیا۔

انہوں نے کہا: قرآن تو اس لیے ثابت ہے کہ اللہ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ میں نے کہا: کہاں لیا ہے؟ انہوں نے آیت پڑھی۔ میں نے کہا: قرآن کے ثبوت ہی کی بات چل رہی ہے اور آپ دلیل بھی قرآن مجید ہی سے دے رہے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ میں حدیث کو ثابت کرنے کے لیے حدیث ہی کو دلیل بناؤں۔

انہوں نے کہا: آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: آپ کوئی مثبت کام کریں مثلاً حدیث پر اعتراضات کی بجائے قرآن مجید کا دفاع کریں۔ انہوں نے کہا: قرآن مجید پر کیا اعتراض ہے؟ میں نے کہا: اہل مغرب نے بہت کیے ہیں اور ان اعتراض کرنے والوں کو مستشرقین (orientalists) کہتے ہیں۔ میرے پاس تقریباً اڑھائی صد تحریریں ہیں کہ جن میں مغرب کی معروف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں نے قرآن مجید کو بائبل کی طرح تحریف شدہ کتاب ثابت کرنے کے لیے تحقیقات پیش کی ہیں، معاذ اللہ!¹

یہ مکالمہ تو اپنے انجام کو پہنچا جبکہ ہمارے ایک دوست کا انکار حدیث کے معاشرتی رویے پر یہ تبصرہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے واقعے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں

انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ فخر ابن البخاری سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ ابن قدامہ المقدسی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے دو استاذوں شیخ عبد القادر جیلانی اور شیخ علامہ ابن جوزی سے حاصل کیا۔ ان دونوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ ابو الوفاء علی بن عقیل الحنبلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد اور والد شیخ ابن عقیل الحنبلی اور شیخ ابو الخطاب الکلوذانی سے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ ابو یعلی الفراء سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ ابن حامد الحنبلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ ابو بکر البغوی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ ابو بکر الخلال سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ ابو بکر المروزی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ امام احمد بن حنبل سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ امام محمد بن ادریس الشافعی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد شیخ امام مالک بن انس سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد امام نافع سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا۔

¹ اس بارے بہاری کتاب "اسلام اور مستشرقین" ملاحظہ فرمائیں۔

منقول ہیں، اگر حدیث میں موجود ہوتی تو شرط یہ کہا جاسکتا ہے کہ منکرین حدیث کی وہ جماعت جو اب قرآن میں اس واقعے کے منقول ہونے کی وجہ سے اسے منقول بنانے کے لیے اس کی تاویلیں ہی کرتی رہتی ہیں، حدیث میں وارد ہونے پر جھٹ سے اس کا انکار کر دیتی۔ تو انکار حدیث علمیت نہیں بلکہ ذہنی رویہ ہے۔ اگر یہ علمی رویہ ہوتا تو جن باتوں کے حدیث میں وارد ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کیا جاتا ہے، ویسی ہی باتوں کے قرآن مجید میں منقول ہونے پر ان کی تاویل کی جاتی ہے نہ کہ انکار۔¹ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقْتَلْتَنِي نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا﴾ [الكهف: 74]

”پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک لڑکے کو ملے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی جان کے عوض مار ڈالا؟ بے شک آپ نے تو بڑی ناپسندیدہ حرکت کی۔“

روایتی بیانیے کا اصل مسئلہ

کیا روایتی مذہبی بیانیے معاشرے کے مسائل کو مخاطب (address) نہیں کرتا اور معاصر معاشرے کے لیے قابل عمل (applicable) نہیں ہے لہذا اسی لیے وقت کے ساتھ تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے؟ یہ ایک اعتراض ہے جو جدید بیانیے کے حاملین روایتی بیانیے رکھنے والوں پر کرتے ہیں۔ ہماری نظر میں روایتی بیانیے نہ تو وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے اور نہ ہی یہ ناقابل عمل ہے۔

روایتی بیانیے کا مسئلہ علمی نہیں بلکہ اخلاقی ہے۔ ہمارے پاس قوت استدلال کی کمی نہیں بلکہ ہم اخلاقی بحران کا شکار ہیں۔ ہمارا بیانیہ تو فطرت کو چھونے والا ہے لیکن ہم نے اپنے رویوں سے معاشرے کو اس سے متنفر کر دیا ہے۔ مفتیان کرام اور معاشرے کے

¹ انکار حدیث کے رویہ پر مفصل بحث ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب ”مکالمہ“ میں کی ہے۔

عام افراد میں موجود معاشرتی خلا کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔

آج معاشرے کے ایک گناہ گار فرد کو مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ یقین مانیے! مجھے کئی ایسے فون آتے ہیں کہ لوگ مسئلہ پوچھنے سے پہلے ہچکچاتے ہیں، ڈرتے ہیں، خوف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ آپ کا مزاج کیسا ہے، بات سن کر ناراض تو نہیں ہوں گے؟ پھر میں انہیں مانوس کرتا ہوں، اور بتلاتا ہوں کہ بھئی! میں بھی آپ کے جیسا گناہ گار ہوں۔ انہیں کہتا ہوں کہ یہ تو آپ کے ایمان کی نشانی ہے کہ آپ اس بدترین گناہ سے نکلنا چاہتے ہیں کہ آپ نے خود ہی سے رابطہ کیا ہے۔

سامنے کی بات ہے کہ ٹی ٹی پی کے بیانیے کو خود علما نے اٹھا کر پھینک دیا لیکن تبلیغی جماعت اپنے ساتھ جرنیلوں کو بھی چلا لیتی ہے کہ فرق صرف رویوں کا ہے۔ ٹی ٹی پی نے تھانیدار بننے کی کوشش کی اور تبلیغی جماعت نے منت ساجت کا رویہ اپنایا۔ اب تبلیغی جماعت کیا ایک سیکولر، لبرل اور جدیدیت پسند تحریک ہے؟ ہر گز نہیں! ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کم از کم وہ روایت پسند تحریک ضرور ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

اسی طرح روایتی بیانیے نے اپنے رویوں سے سنت عادت کو سنت مؤکدہ، مستحب کو فرض، مکروہ کو حرام کا درجہ دے دیا تو اس سے بھی لوگ متنفر ہوئے۔ جس معاشرے میں لوگ سود کھا رہے ہوں، رشوت لے رہے ہوں، نماز نہ پڑھتے ہوں، زنا اور شراب نوشی میں مبتلا ہوں، شرک و بدعت میں آٹے ہوں، وہاں آپ لوگوں کو ٹوپی پہنانے پر زور لگائیں گے، سوٹ پہننے پر فتویٰ لگا دیں گے، کالر پہننے اور ایک طرف سے مانگ نکالنے پر انگریز کی اولاد کہہ دیں گے تو لوگ آپ سے نہ صرف خوف میں مبتلا ہوں گے بلکہ ایک فاصلے پر رہنا شروع کر دیں گے۔

ہم کبھی معاشرے میں نکل کر تو دیکھیں کہ معاشرہ کس قدر برائی میں گرا ہوا ہے اور معاشرہ گناہ کی اس دلدل سے نکلنا چاہتا ہے۔ وہ آپ کے پاس آنا چاہتا ہے، مفتی صاحب کے پاس، عالم دین کے پاس، لیکن وہ ہمدردی کے دو بول آپ سے سننا چاہتا ہے،

فتویٰ نہیں۔ آپ اگر اپنا عمامہ اتار کر کسی گناہ گار کو یہ تاثر دے دیں کہ آپ اس کے جیسے ہی ہیں، آپ اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے کی ایک پیالی پی لیں اور وہ اس دوران آپ سے اپنا رونا دھونا (catharsis) کر لے تو اللہ عز و جل آپ سے یقیناً خوش ہو گے۔

بھائی! دو لفظوں میں بات سننا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ اگر اپنے بیانیے کو معاشرے کے لیے زیادہ قابل عمل بنانا چاہتے ہو تو اپنے تصورات مفتیوں کے جیسے رکھو اور رویے صوفیوں کے جیسے۔ ذہن تمہارا فقیہوں جیسا تیز ہو اور دل تمہارا صوفیوں جیسا نرم ہو۔ ہماری مراد وہ فقیہ اور صوفی ہیں جو قرون اولیٰ کے فقہاء اور صوفیاء کی یاد تازہ کر رہے ہوں کہ اکثر و بیشتر پیر طریقت ہوں یا رہبر شریعت، دینی کاروبار میں ملوث ہیں۔



باب ششم اصلاح مسالک

اس باب میں اصلاح مسلک کے ضمن میں تنقید میں اعتدال، اپنے مسلک، جماعت اور تحریک کی اصلاح، دیگر مسالک، جماعتوں اور تحریکوں سے خیر خواہی، فرقہ واریت، غلو، تعصب اور جنت میں داخل ہونے کے حقیقی راستوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

تنقید یا تنقیص؟

آج کل تنقید ایک عام عادت بن چکی ہے۔ تنقید اگر ”تنقید برائے تنقید“ نہ ہو اور اصلاح کی غرض سے ہو تو واقعاً ایک مستحسن امر (appreciable) ہے لیکن عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ تنقید، خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ نہیں بلکہ دوسروں کی عیب جوئی کے لیے کرتے ہیں۔ اور تنقیدی عمل کو دوسروں کی کوتاہیوں کی نشر و اشاعت کے لیے ایک واسطہ اور ذریعہ کے طور استعمال کرتے ہیں۔ کون سے عوامل (factors) ایسے ہیں جو کسی تنقید کو تنقید برائے تنقید (undue criticism) یا تنقیص (humiliation) یا تعیب (faultfinding) سے بالاتر کرتے ہوئے ایک اصلاحی عمل بنا سکتے ہیں؟ ذیل میں ہم ان کا ایک جائزہ لے رہے ہیں:

تنقید کے اسباب اور مقاصد

اکثر ناقدین کے ہاں نقد کرتے ہوئے اسباب اور مقاصد (motives and goals) کا تعین نہیں ہوتا ہے۔ لوگوں کی تنقید کے پیش نظر تنقید برائے تنقید یا تنقیص ہوتی ہے۔ کچھ لوگ تنقید اس لیے کرتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تنقید کرنا ان کے بنیادی انسانی حقوق میں سے ایک حق ہے اور اسے استعمال کرنا اسی طرح لازم ہے جس طرح کہ ووٹ کے حق کو۔ علاوہ ازیں تنقید کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی نے آپ کی ذات، مسلک، جماعت پر تنقید کی ہے تو آپ نے رد عمل کی نفسیات میں اس پر تنقید شروع کر دی۔

تنقید اکثر و بیشتر خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نہیں ہوتی ہے اگرچہ دعویٰ ہر ناقد کا یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے اصلاح اور تعمیر کا طلب گار ہے۔ تنقیدی عمل میں کسی بھی ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنی نیت و ارادے اور مقاصد کا جائزہ لے تاکہ یہ نہ ہو کہ جسے وہ اصلاح سمجھ رہا ہو، وہ درحقیقت اُس کی اپنی مایوسی (depression)، ناکامی (frustration)، اور تناؤ (tension) ہو جسے وہ مد مقابل پر نکال رہا ہو۔ یا ناقد فریق مخالف پر اضطراب (anxiety) نکالنے کو اعلیٰ

درجے کی کوئی معاشرتی اور دینی خدمت سمجھ رہا ہو۔ ہماری یہ عادت ہونی چاہیے کہ تنقید کرنے کے بعد تنہائی میں اکثر اپنی تنقید کا تجزیہ کریں۔ اس طرح ناقد کو اپنی بعض باتیں درست معلوم ہوں گی تو بعض رویوں کے بارے احساس پیدا ہوگا کہ یہ صحیح نہیں ہوا اور اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ ہمارے معاشرے کو ہر طبقہ سے ایسے ناقدین چاہئیں جو تنقید سے پہلے اپنے مخالف کے حق میں خیر خواہی کے آنسو بہاتے ہوئے دعا گو ہوں اور تنقید کے بعد اپنی طرف سے کسی ممکنہ زیادتی کے شبہ میں روتے ہوئے اپنے لیے استغفار کے طلب گار ہوں۔

تنقید کی تعریف

اکثر لوگ ناقد تو ہوتے ہیں لیکن وہ تنقید کی تعریف سے کما حقہ آشنا نہیں ہوتے۔ پس تنقید ایک اعتبار سے عیب جوئی کا مترادف بن چکا ہے۔ تنقید عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ (root word) ن-ق-د ہے اور اسی سے لفظ نقدی بھی بنا ہے۔ عربی زبان میں ”نقد الدرہم“ کا معنی درہموں میں چھان پھٹک کے بعد کھوٹے سکوں (coins) کو کھرے سکوں سے علیحدہ کرنا ہے۔ آسان الفاظ میں تنقید صحیح و غلط کی تمیز کا نام ہے۔ پس تنقید میں کسی چیز کا تجزیہ (analysis)، اس کی تشریح (interpretation)، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا (evaluation) اور پسندیدگی (appreciation) بھی اس میں شامل ہے۔

ایک دفعہ ایم۔ اے انگریزی ادب کی کلاس میں پروفیسر صاحب نے فرانسس، لیکن کے ایک مضمون پر نقد کرنے کے لیے اسائنمنٹ دی۔ جب مطالعہ کیا تو فرانسس، لیکن پر نقد کے نام پر تنقیدی پسندیدگی (critical appreciation) دیکھنے کو ملی یعنی تنقید کے نام پر لیکن کی مدح و ثنا نقل ہو رہی تھی۔ بعد ازاں پروفیسر صاحب نے وضاحت فرمائی کہ ادب میں تنقید (criticism) کا معنی صرف اگلے کی دھلائی کرنا ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی اچھائی بیان کرنا بھی اس پر نقد کی تعریف میں شامل ہے۔

لغوی اعتبار سے بھی یہ بات درست ہے کیونکہ لغت میں بھی نقد کا معنی سکوں میں

سے کھوٹے سکوں کو علیحدہ کرنا ہے۔ پس جب کھوٹے سکے علیحدہ کریں گے تو کچھ کھرے سکے بھی ہوں گے کہ جن کی نشاندہی ہوگی۔ بس کسی شخص پر تنقید کا حقیقی معنی اس کے صحیح کو غلط سے جدا کرنا ہے اور اس معنی میں تنقید ہمارے معاشرے میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں تنقید تضحیک، استہزاء، طنز، کسی کی کوتاہی کے بیان اور اس کی نشر و اشاعت کا دوسرا نام بن گیا ہے۔ پس تنقید میں کسی کی غلطی اور کوتاہی تو بیان ہو جاتی ہے لیکن اس کی صحیح بات کیا ہے، یہ بیان نہیں کیا جاتا ہے۔

تنقید کی اہلیت

ناقد (critic) کے لیے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ وہ متعلقہ موضوع میں نقد کی اہلیت بھی رکھتا ہوں۔ اہلیت سے مراد یہ ہے کہ جس موضوع (subject)، فن (art) اور میدان (field) میں نقد کرنا ہو تو اس میں مہارت (skillfulness) اور رسوخ (expertness) حاصل ہونا چاہیے۔ کسی فن سے متعلق عمومی گفتگو کے لیے تو شاید اس فن میں مہارت تامہ اور رسوخ کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن نقد و تنقید ایک اعلیٰ تر علمی کام ہے کہ جس کے لیے ضروری ہے کہ ناقد کا علم محض مبتدیات (foundations) تک محدود نہ ہو۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نقد کا معنی صحیح کو غلط سے جدا کرنا ہے تو کسی بھی فن میں صحیح کو غلط سے جدا کرنے کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو اس فن کے ماہرین میں سے ہو۔ پس ایک میڈیکل فزیشن کی انجینئرنگ اور ایک انجینئر کی میڈیکل سائنس میں نقد غیر متعلقہ تنقید کہلائے گی کیونکہ یہ متعلقہ فنون کے رجال کی نقد نہیں ہے۔

ہمارا یہ المیہ ہے کہ سائنسز اور سوشل سائنسز کے ماہرین اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ وہ مذہب اور مذہبی علوم پر نقد کریں جبکہ انہیں مذہب اور مذہبی علوم کی الف با کا بھی علم نہیں ہوتا ہے۔ کیا یہ درست طرز عمل ہو گا کہ کوئی شخص گھر بیٹھے میڈیکل سائنس کی چند کتب کے مطالعہ کے بعد سند یافتہ گریجویٹ ڈاکٹروں پر نقد شروع کر دے۔ نفسیات میں پی ایچ ڈی کے ایک طالب علم نے ایک دینی کتاب پر یہ نقد کی کہ یہ کتاب موضوع

سے متعلق نہیں ہے جبکہ اس دینی کتاب کا موضوع اصول قانون تھا۔ انہوں نے اپنی اس تنقید کا جواز یہ پیش کیا کہ تنقید کرنا ان کا بنیادی حق ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تنقید ہر شخص کا بنیادی حق نہیں ہے بلکہ یہ اس شخص کا حق ہے جو تنقید کا اہل ہے۔ اور جس علم (science) پر نقد کر رہا ہے، اس علم کے ماہرین میں سے ہو۔ بعض علماء نے جو فلسفہ و منطق یا فلکیات و علم کلام میں ناقدانہ تحقیقات پیش کی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صدیوں یہ علوم مدارس دینیہ کے نصاب میں شامل رہے ہیں لہذا وہ علماء ان علوم و فنون کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔

شخصی اور علمی نقد

عام طور تنقید میں کسی شخص کے افکار و نظریات کی بجائے اس کی ذات اور شخصیت کو رگید اجاتا ہے۔ شخصی تنقید کو دراصل تنقیص کہنا چاہیے۔ اس کی بنیاد عموماً علمی رویہ (academic approach) نہیں ہوتا ہے بلکہ حد سے بڑھا ہوا تعصب، انتہا پسندی اور جذباتی نفسیات ہوتی ہیں۔

اگر دفع مضرت (warding off some harm) کی غرض سے شخصی نقد ناگزیر ہو بھی جائے تو بھی اعلانیہ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کی اعلانیہ برائی کو پسند نہیں فرماتے ہیں الا یہ کہ کسی کے ساتھ ظلم ہو ہو تو مظلوم کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا بدلہ لینے کے لیے ظالم پر اعلانیہ نقد کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نقد اگر علمی ہو تو اس علمی نقد کی بنیاد بھی تعصب اور گروہی نسبت نہ ہو۔ جب ہم تعصب اور ضد کا نام لیتے ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں اہل مدرسہ آ جاتے ہیں۔ بلاشبہ اہل مدرسہ میں بھی تعصب ہے لیکن یونیورسٹی میں بھی تعصب موجود ہے۔

عصر حاضر کے برطانوی ماہر فلکیات اور معروف ریاضی دان اسٹیون ہاکنگ نے لکھا ہے کہ روسی ریاضی دان (mathematicians) محض تعصب کی بنیاد پر امریکی ریاضی دانوں کی تحقیقات کا رد کرتے ہیں۔¹ ان کی سوچ ہی یہ بن چکی ہے کہ چونکہ

¹ Stephen Hawking, A Brief History of Time from Big Bang to Black Holes,

امریکی محقق مارکسی (Marxist) نہیں ہیں لہذا ہر حال میں ہم نے ان کا رد ہی کرنا ہے۔ یہی رویہ اہل مذہب میں بھی ہے کہ چونکہ فلاں عالم دین، فلاں مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے تو اب میرا یہ بنیادی فرض ہے کہ میں اس کی کسی بھی بات کی تائید نہ کروں یا اس کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤں، چاہے وہ میرے نزدیک حق ہی کیوں نہ کہہ رہا ہو۔ ہمارے ہاں علمی نقد میں اس اصول کا بہت عمل دخل ہوتا ہے کہ فلاں کا تعلق ہمارے مکتبہ فکر ہے یا نہیں۔ علمی نقد کی بنیاد کسی بھی قسم کا جماعتی، گروہی، قومی، لسانی، شخصی یا ذاتی تعصب نہیں ہونا چاہیے ورنہ ایک غیر متوازن اور غیر معتدل نقد سامنے آئے گی۔ اس معاملہ میں مجھ سمیت ہم سب کو اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

غیر متعلق نقد

ہمارے ہاں اکثر نقد ایسی ہوتی ہے جو غیر متعلق ہوتی ہے۔ مثال کے طور آپ کسی شخص سے مباحثہ کے دوران گرما گرمی میں اس کے خاندان، مسلک اور بڑوں کو رگیدنا شروع کر دیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی میں بھی ایک دوسرے کے متعلقین کو نشانے پر دھر لیا جاتا ہے جو کہ ایک غیر مناسب رویہ ہے۔ جب آپ کا مکالمہ کسی شخص سے جاری ہو تو یہ غیر متعلق نقد ہے کہ آپ اس کے متعلقین پر چڑھائی کر دیں۔ غیر متعلقہ تنقید کی مثال یہ بھی ہے کہ آپ نے کسی موضوع پر کسی ایک فن کی روشنی میں گفتگو کی ہے اور اب ایک دوسرے صاحب اس پر ایک دوسرے فن کی روشنی میں نقد شروع کر دیتے ہیں۔ آپ نے تاریخ پر ایک مقالہ لکھا ہے اور ایک صاحب علم نفسیات اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اس مقالے کا معیار جانچنے کی کوشش کرتے ہیں اور آپ کے مقالہ کو ایک غیر معیاری مقالہ قرار دے دیتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ناقد کسی فلسفی کے فلسفے کو سائنسی تجربہ گاہ میں پرکھنا چاہتے ہیں۔ اور کوئی ناقد کیمسٹری اور بائیالوجی کو علم منطق کے معیارات کی روشنی میں دیکھ رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ غیر متعلق نقد ہے۔

اسی طرح جب ماہرین نفسیات نے علم وحی کو علم نفسیات کی روشنی میں سمجھنا چاہا تو انبیاء و رسل پر نازل شدہ وحی کو کبھی بچپن کی نامکمل خواہشات، کبھی خوابات اور کبھی جنون سے جوڑ دیا حالانکہ علم وحی اور علم نفسیات کا موضوع کلیتاً الگ ہے۔ اہل سائنس کی مذہب پر نقد کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے کہ وہ مذہب کو سائنسی اصولوں کی روشنی میں پرکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مافوق العقل (supernatural) کو عقل اور مافوق الحواس کو حواس کے ذریعے جانچنا چاہتے ہیں۔ کسی چیز کے معیار کو پرکھنے کا یہ اسلوب ایک غیر علمی اسلوب ہے۔

غیر متعلقہ تنقید کی مثال وہ نقد بھی ہے جو کسی گفتگو کے موضوع اور مرکزی خیال سے ہٹ کر ہو۔ پس معیاری تنقید کے لیے لازم امر ہے کہ وہ متعلقہ فن کے اصول و ضوابط، مبندیات و معیارات کی روشنی میں ہو۔

اصلاحی تنقید

اگر تو تنقید کا مقصد اصلاح ہو تو کسی شخص کی غلطیاں بیان کرنے سے پہلے اس کی خوبیوں کو سراہا جائے۔ ہمارے ہاں کسی صاحب میں بیسیوں خوبیاں ہوتی ہیں لیکن ہم اس پر نقد کے دوران ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر خوبیوں کا ذکر نہ بھی کیا جائے اور صرف اتنی بات ہو جائے کہ فلاں صاحب کے کلام میں یہ بات تو درست ہے لیکن فلاں بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے تو اس سے بھی اصلاح کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں عام طور پر نقد کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ مجھے فلاں سے یہ اختلاف ہے جبکہ اصلاح کی غرض سے کی جانے والی نقد کا آغاز یوں ہو گا کہ مجھے فلاں سے ان باتوں میں اتفاق ہے لیکن فلاں بات میں نہیں ہے یعنی بات کا آغاز یوں کرنا چاہیے۔ مخالف کی کسی خوبی کی تعریف، اس کی بعض باتوں کو سراہنے اور ان سے اتفاق رائے کر لینے سے ہماری علمی دھاک، معاشرتی مقام اور روحانی مرتبے میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ بعض لوگوں کو جیسے یہ وہم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے مخالف کی کچھ تعریف کر دی تو اس کا پلڑا بھاری ہو جائے گا گویا کہ علمی مکالمہ نہ ہو رہا ہو، کوئی دنگل

(wrestling) ہو رہا ہو۔

اگر کسی شخص کی ایک صد تحریریں ہیں اور کوئی صاحب ان کی ایک دو تحریروں سے عدم اتفاق کی بنا پر ان پر نقد شروع کر دیتے ہیں تو یہ نقد ان کا حق تھا لیکن انہیں اس نقد سے پہلے اس شخص کی اکثر تحریروں کا مطالعہ کر لینا چاہیے تھا تاکہ اختلاف کے ساتھ ساتھ اتفاقات بھی سامنے آجائے۔ اس تفصیلی مطالعہ کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جس پر آپ نقد کر رہے ہوتے ہیں، اس کی شخصیت کا ہر پہلو آپ کے سامنے نکھر کر آ جاتا ہے اور نقد میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

سطحی تنقید

سطحی تنقید وہ ہے جو مخالف کا اصل موقف سمجھ بغیر کی گئی ہو۔ کسی ایم فل یا پی ایچ ڈی کے مقالہ سے بھی عدم اتفاق دو سطروں میں بھی ہو سکتا ہے لیکن اسے نقد کا نام نہیں دینا چاہیے۔ نقد اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اعلیٰ تر علمی اور تحقیقی کام ہے نہ کہ عدم اتفاق کا اعلان۔ کسی کو غلط ٹھہرانے کی بنیاد علمی دلائل اور ٹھوس تجزیہ ہونا چاہیے نہ کہ شاہی اسالیب اور جرنیلی لب و لہجہ۔

جذباتی تنقید

جذباتی تنقید کوئی بری چیز نہیں ہے۔ عقل پرستوں نے یہ غلط فہمی عام کر رکھی ہے کہ جس تنقید کی اہمیت کم کرنی ہو اسے جذباتی تنقید کا عنوان دے دیتے ہیں۔ ایمان اور تقویٰ بھی تو ایک جذبہ ہی ہے تو کیا ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر کی جانے والی تنقید غلط تنقید ہوگی؟ اسی طرح خیر خواہی اور غیرت بھی ایک جذبہ ہی ہے اور ان دونوں بنیادوں پر کی جانے والی تنقید میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ مثبت جذبات ہیں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ بعض جذبات منفی ہوتے ہیں جیسا کہ بغض اور نفرت وغیرہ تو ایسے منفی جذبات کی بنیاد پر کی گئی تنقید مناسب نہیں ہے۔ تنقید ہمیشہ عقلی نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات جذباتی بھی ہوتی ہے۔

مسکلی اور جماعتی نام

اس بارے اہل علم کا اختلاف ہے کہ مسکلی اور جماعتی نام اپنے ساتھ لگانا ضروری ہے یا نہیں۔ بعض اس کو ضروری سمجھتے ہیں جبکہ بعض کے نزدیک اصل چیز سوچ اور رویہ ہے جو کہ صحیح ہونا چاہیے، نام چاہے کچھ بھی ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ کا عقیدہ اور اخلاق درست نہیں ہے تو آپ کو اہل حدیث، سلفی، صوفی، دیوبندی، بریلوی، چشتی اور نقشبندی لاحقے آخرت میں کچھ کام نہ آئیں گے۔ پس اصل نام نہیں ہے بلکہ فکر و عمل ہے، وہ درست ہونا چاہیے۔

یہود و نصاریٰ میں بھی ایک وقت میں ناموں کے بارے حساسیت بہت بڑھ گئی تھی، یہاں تک کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے بھی اختلاف کرنے لگے۔ یہودیوں نے کہا کہ وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا کہ عیسائی تھے۔ اس پر اللہ عز و جل کی طرف یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا

كَانَ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ [آل عمران: 68]

”حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی بلکہ وہ یکسو مسلمان تھے

اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔“

ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے بارے یہ مکالمہ ہوا ہے کہ وہ بریلوی تھے، دیوبندی یا اہل حدیث۔ ہر مکتبہ فکر نے انہیں اپنا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ ہمارے خیال میں اس کی ضرورت نہ تھی۔

مسکلی اور جماعتی نام رکھنے کی نہ تو ممانعت ہے اور نہ ہی یہ اسلام میں حرام ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب ان ناموں کے بارے حساسیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ یہ اسلام کا مترادف قرار پانا شروع ہو جاتے ہیں تو ایسی سوچ شریعت کی نظر میں درست نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خیر القرون صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کی زندگیوں کو اپنانے کی کوشش کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ اور کوئی آپ

پر کسی مسلک اور جماعت کا لیبل لگاتا ہے یا نہیں یا کسی مسلک اور جماعت میں شامل کرتا ہے یا نہیں، اس سے صرف نظر کرتے ہوئے بس اصلاح کا کام کرتے جائیں۔
 عمل نہ ہو تو مسلکی، خانقاہی اور جماعتی نسبتیں کچھ بھی کام نہ آئیں گی۔ کیا نبی کریم ﷺ کے امتی ہونے سے بڑھ کر کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ نہیں ہر گز نہیں! تو یہ نسبت بھی قیامت والے دن صرف اسی صورت کام آئے گی جبکہ کچھ عمل ہاتھ میں ہو گا تو دوسری نسبتوں کا کیا بھر و سا؟ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: لَمَّا أُنْزِلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ {وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ}، دَعَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُرَيْشًا، فَاجْتَمَعُوا فَحَمَّ وَخَصَّ، فَقَالَ: «يَا بَنِي كَعْبٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي عَبْدِ شَمْسٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي هَاشِمٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا فَاطِمَةُ، أَنْقِذِي نَفْسَكَ مِنَ النَّارِ، فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا، غَيْرَ أَنَّ لَكُمْ رَحِمًا مَسْبُلًا بِبِلَالِهَا»¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ﷺ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں تو آپ ﷺ نے قریش کی دعوت کی۔ پس ان کے عام و خاص سب جمع ہوئے۔ آپ نے کہا: اے بنو کعب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو شمس! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے فاطمہ بنت محمد رضی اللہ عنہا! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائیں۔ بلاشبہ میں تمہیں اللہ کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آؤں گا۔ البتہ جو تمہارے ساتھ رشتہ داری ہے تو اس میں صلہ رحمی کروں گا۔“

¹ صحیح مسلم، کتاب الایمان، ثابت فی قوله تعالى: وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، 1/192

مسکلی اور جماعتی نام کی شرعی حیثیت

کچھ دوستوں نے ہماری سابقہ تحریر پر شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ اس بارے ہم یہ وضاحت کیے دیتے ہیں کہ ہم نے یہ نہیں کہا کہ مسکلی یا جماعتی نام نہیں رکھا جاسکتا۔ آپ اپنے ساتھ بریلوی، دیوبندی، سلفی، نقشبندی اور چشتی کا لاحقہ لگائیں، ہمیں کوئی ٹینشن نہیں ہے اور نہ ہمارا اس قسم کے نام رکھنے پر آپ سے کوئی بحث کرنے کا ارادہ ہے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ مسکلی نام کے لاحقے کے بغیر اسلام کی فکر کو پھیلانا اور عام کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کے پاس وہ کون سی شرعی دلیل ہے کہ جس کے مطابق جماعتی نام رکھ کر ہی اسلام کی دعوت و فکر کو پھیلانا واجب یا فرض قرار پاتا ہے؟

آپ جماعتی اور مسکلی نام رکھنے کی شرعی حیثیت بیان کریں کہ یہ نام رکھنا واجب ہے یا فرض، مستحب یا مباح۔ ہمارے نزدیک اس کا درجہ مباح (allowed) کا ہے۔ آپ کے نزدیک جو درجہ ہے آپ اس کے مطابق کوئی شرعی حکم بیان کریں اور اس کی دلیل بھی نقل فرمادیں۔ ہم اس دلیل پر غور کر لیں گے اور اگر دلیل قابل غور ہوئی تو اپنی بات سے رجوع کر لیں گے۔ اور اگر جماعتی یا مسکلی نام رکھنا فرض یا مستحب ہے تو یہ بھی بیان کر دیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ فرض یا مستحب پورا کیوں نہ کیا؟

اگر تو آپ بھی جماعتی اور مسکلی نام رکھنے کو مباح اور جائز سمجھتے ہیں تو معلوم نہیں آپ بحث کس چیز پر کرنا چاہ رہے ہیں؟ قانون اسلامی میں مباح کام وہ ہوتا ہے کہ جس کا کرنا جائز ہو اور نہ کرنا بھی جائز ہو۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف جماعتی اور مسکلی نام کا لیل ہی آپ کی نجات کے لیے کافی ہے تو اس صورت میں آپ کو اس آیت مبارکہ کے معانی و مفاہیم پر غور کرنا چاہیے:

﴿إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مِمَّا أُنْزِلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَى﴾ [الشوری: 23]

”وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لئے ہیں۔ خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور

خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔“

فرقہ واریت

صحابہ اور تابعین ایک عقیدے اور منہج کے حامل تھے لیکن انہوں نے اپنے لیے کوئی جماعتی نام مخصوص نہیں کر رکھا تھا۔ اور نام رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس کا مقصد تعارف ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

[الحجرات: 13]

”اور ہم نے تمہیں قوموں اور قبائل میں تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرو۔ بلاشبہ تم میں سے اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو سب سے زیادہ متقی ہے۔“

اگر تو جماعتی نام مثلاً اہل حدیث کہلوانے کا مقصد اہل الرائے کے بالمقابل اپنا تعارف ہو تو اس مقصد سے مسلکی نام استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاریخ فقہ اسلامی کی کتب میں اہل الحدیث اور اہل الرائے کی تقسیم واضح طور موجود ہے۔ اہل الحدیث کا مرکز مدینہ تھا اور ان کے امام، امام مالک رحمہ اللہ تھے جبکہ اہل الرائے کا مرکز کوفہ تھا اور ان کے امام، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تھے۔

لیکن مسئلہ کسی بھی مسلک کی معاصر جمعیت کا ہے کہ جس کے کچھ امتیازی اخلاقی معیارات، ترجیحات، مقاصد، مناج دعوت، اسالیب تبلیغ اور باہمی جماعتی نزاعات و اختلافات ہوتے ہیں کہ جن میں سے بعض باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہوتا۔ پس اس مسلک کا اپنے اوپر لیبل چسپاں کرنے کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہمیں اس جمعیت کے تمام افکار، رویوں اور سرگرمیوں سے اتفاق ہے۔

پس اگر جماعتی نام سے مقصود فرقہ واریت ہو تو ایسی صورت میں جماعتی نام کو اپنا تشخص بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ جماعتی ناموں کے فوائد اپنی جگہ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ان ناموں سے ہمارے معاشرے میں فرقہ واریت بھی پیدا ہوئی

ہے۔ اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ ایک بار رمضان المبارک میں جامعہ البیت العتیق میں نماز تراویح کے وقفے میں بیان کے دوران راقم نے یہ کہا:

”فروعی مسائل میں بعض اوقات ایک سے زیادہ اقوال کی گنجائش نکلتی ہے لہذا ہمیں سختی نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ ہمارے ہاں اہل حدیث اہل علم میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے مثلاً بعض تشہد کی حالت میں ایک دفعہ انگلی کا اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں جبکہ بعض مسلسل حرکت دینے کا فتویٰ جاری کرتے ہیں۔ بعض رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کا فتویٰ دیتے ہیں جبکہ اکثر رکوع کے بعد ہاتھ کھولنے کا کہتے ہیں۔ اسی طرح بعض رکوع کی رکعت کے قائل ہیں اور اکثر قائل نہیں ہیں۔ اکثر جہری اور سری دونوں نمازوں میں فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور بعض صرف سری [خاموش] نمازوں میں اس کے پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں کہ جن میں امام خاموشی سے تلاوت کرتا ہے۔“

چار رکعات تراویح کے درمیانی وقفہ میں مجھے ایک اہل حدیث نوجوان ملا اور کہنے لگا کہ آپ نے یہ کیا بیان کر دیا کہ رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ بیان نہیں کیا کہ رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ بعض اہل حدیث علماء کا فتویٰ ہے کہ رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے مثلاً شیخ بن باز رحمہ اللہ۔

نوجوان نے کہا کہ جب حدیث میں ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی تو شیخ بن باز رحمہ اللہ کون ہے؟ اس پر میں نے اپنی مادر علمی کے بعض شیوخ کا تذکرہ کیا کہ جو رکوع کی رکعت کے قائل تھے لیکن وہ نوجوان بصد تھے کہ رکوع کی رکعت ہوتی ہی نہیں، مجتہد اور مفتی کی بھی۔ چلیں! یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر اہل علم میں دو آراء ہیں تو آپ ایک رائے کے قائل ہیں لیکن اس نوجوان کا یہ بھی اصرار تھا کہ یہ بات کہ اس مسئلہ میں اہل حدیث علماء میں اختلاف ہے، بھی بیان نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اب اس جذباتیت اور جہالت کا کوئی علاج نہیں ہے۔

اب یہ شدت پسندی ایک ہی مسلک اور فرقے میں زیادہ دیکھنے کو مل رہی ہے اور ایک ہی مسلک اور فرقے سے تعلق رکھنے والے اپنے ہی مسلک اور فرقے کے لوگوں کو

چھوٹے چھوٹے اختلافات کی بنیاد پر مسلک اور فرقے سے اندر باہر کرنے کی عظیم خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اس بدترین فرقہ واریت کا حل یہی ہے کہ ایک مسلک سے وابستہ علماء کو دوسرے مسلک کے اہل علم کے لیے بھی اختلاف کی گنجائش باقی رکھنی چاہیے۔ ورنہ تو فرقہ واریت ایک مزاج ہے، یہ صرف دوسرے فرقے سے نہیں الجھتا بلکہ اپنے فرقے میں بھی موجود ہر دوسرے شخص سے الجھ پڑتا ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ اگلے دن وہ نوجوان چار مناظر اپنے ساتھ لے آئے۔ چار رکعات تراویح کے بعد انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور سمجھانا شروع کر دیا۔ ایک صاحب کی تو ڈاڑھی بھی نہ تھی، مزدور پیشہ لگتے تھے لیکن بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اسی طرح اس علمی مناظرہ میں جو سب سے پیش پیش تھے، انہیں ترجمہ قرآن بھی نہ آتا تھا، بس حدیث کی چند ترجمہ شدہ کتابوں کے بعض ابواب کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کئی بار سمجھایا کہ میں مناظرے کے میدان کا آدمی نہیں ہوں، میں نے کچھ غلط بیان نہیں کیا ہے، زیادہ حساسیت کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بات ان کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ اس دوران تراویح کی نماز ہوتی رہی اور ہم مسجد کے صحن میں صف کے آخر میں بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ اس طرح تقریباً بیس منٹ کا قیام الیل انہوں نے خود بھی ضائع کیا اور میرا بھی کروایا۔ اور یہ اصحاب تقریباً 15 کلو میٹر کا سفر کر کے یہاں آئے تھے، مجھے سمجھانے کے لیے۔ بہر حال میں نے ان سے معذرت کی اور کہا کہ ہمیں اس وقت نماز میں قیام کرنا چاہیے کہ جس پر ہم سب کا اتفاق ہے کہ وہ نیکی کا کام ہے لیکن وہ وفد اس بات پر بضد تھا کہ میں قیام الیل کی بجائے یہ وقت ان سے مناظرہ میں گزاروں کہ یہ ان کے نزدیک قیام الیل سے بڑھ کر نیکی کا کام تھا۔ میں معذرت کر کے قیام الیل میں شامل ہو گیا جبکہ یہ مناظر حضرات آدھ گھنٹہ پیچھے بیٹھ کر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے لیکن انہیں قیام الیل جیسی نیکی میں شامل ہونے کی توفیق نہ ہوئی۔

اور اگر وہ اپنی اس بد عملی پر اس حدیث سے استدلال کریں کہ عالم کو عابد پر فضیلت

ہے تو اسے جہل مرکب نہ کہیں تو کیا کہیں؟ اسی لیے میں یہ کہتا ہوں جماعتی اور مسلکی مبلغین یہ غور کریں کہ ان کی ترجیحات کیا ہیں؟ مناظرے و مباحثے یا تقویٰ و للہیت؟ اب اس میں اس نوجوان کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ اسے اہل حدیث کرنے والوں کے نزدیک اہل حدیث ہونا آٹھ سے دس مسائل کا نام ہے اور اسے جب پوری اہل حدیثیت انہی مسائل کے گرد گھومتی نظر آئے گی تو اس کی زندگی کا مقصد انہی فروعی مسائل کے لیے جینا مرنا ہی قرار پائے گا حالانکہ اکابر اہل حدیث علماء کافروعی مسائل میں منہج اور رویہ بالکل مختلف تھا۔¹

یہود پر بھی ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ موسوی شریعت کے ظاہری پہلو میں اس قدر الجھے کہ اپنی باطنی اصلاح سے کلی طور غافل ہو گئے۔ اس زمانہ میں ان میں تورات کے بڑے بڑے فقہاء اور علماء تو موجود تھے اور ظاہر شریعت پر عمل بھی خوب ہو رہا تھا لیکن منکسر المزاجی، تواضع، انکساری، نرم دلی، خدا خونی، للہیت، خشیت، تقویٰ اور تقرب الی اللہ جیسے اوصاف حسنہ مفقود تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح اور تربیت کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاصر انجیل میں موجود خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے علمائے یہود کو اپنے باطن کی اصلاح اور تزکیہ نفس نہ کرنے کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک جگہ انجیل میں ہے:

”اس وقت یسوع یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کیں کہ فقیہ اور فریسی [یہودی علماء] موسیٰ علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن انکے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر

¹ شیخ الكل في الكل مولانا نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو مجتہد اور متبع سنت جبکہ علامہ ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ نے اہل سنت کے بزرگ امام قرار دیا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کہتے تھے کہ میں اجتہادی مسائل میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مقلد ہوں جبکہ مولانا اسامیل سلفی، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو اہل الحدیث کا امام اور مجتہد قرار دیتے ہیں۔ تو یہ اکابر اہل حدیث علماء کا احناف کے ائمہ سے حسن سلوک تھا۔ کمی۔ سے اختلاف کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔

لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ ان کو اپنے انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں۔ اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی [علماء] کہلانا پسند کرتے ہیں... اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو [یہودی علماء کی جماعت] تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! تم بیواؤں کا گھر دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو، تمہیں زیادہ سزا ہوگی۔ اے ریاکار و فقیہو فریسیو تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کافر زند بنا دیتے ہو... اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دھکی [زکوٰۃ] دیتے ہو، پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو مجھڑ چھانٹتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو... اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو... اے سانپو! اے افنی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟¹

میرا کوئی فرقہ نہیں ہے

ہمارے ہاں یہ جملہ (statement) ایک فیشن کی صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے کہ میرا کوئی فرقہ نہیں ہے۔ انسان ہمیشہ سے دو انتہاؤں میں جینے کا عادی رہا ہے کہ ایک

¹ متی کی انجیل: باب: 23، آیت: 1-33، بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور

شر سے نکلا تو دوسرے شر میں جا گھسا اور درمیان میں کوئی مقام اعتدال نہیں ہے کہ جہاں پڑاؤ ڈالا جائے۔ جس طرح فرقہ واریت ایک شر بن چکی ہے، اسی طرح فرقہ واریت کا رد کرنے والے خود ایک بدترین فرقے کا سارویہ اور اخلاق پیش کر رہے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمارا کوئی فرقہ نہیں ہے، ہم مسلمان ہیں کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں ہمارا نام مسلمان رکھا ہے۔ پس انہوں نے اپنے آپ کو ”جماعت المسلمین“ کہلوانا شروع کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی رجسٹرڈ جماعت المسلمین کے چند صد اراکین کے علاوہ سب کو غیر مسلم ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔¹

یہ ذہن میں رہے کہ فرقہ واریت ایک مزاج ہے جو اس شخص میں بھی ہو سکتی ہے جو صبح وشام فرقہ واریت کے رد میں وعظ کر رہا ہو۔ فرقہ وارانہ مزاج ایک منفی مزاج ہے کہ جس میں ہمیشہ کسی فرد یا مسلک کی کمی کوتاہی کو بیان کر کے اس کی ذات اور جماعت کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ کسی کی برائی کو اچھالا جاتا ہے اور اچھائی کو چھپایا جاتا ہے۔ انسان اپنے علاوہ سب کو غلط سمجھتا ہے اور اس کا جینا مرنا دوسروں کا رد بن جاتا ہے۔ اس کا مثبت کام آپ کو دیکھنے کو نہ ملے گا لیکن منفی کام بہت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ منفی ذہن رکھنے والے لوگ اس کے گرد جمع ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ فرقہ واریت کا رد کرتے کرتے خود ایک فرقہ بن جاتے ہیں کہ اپنے سے اختلاف برداشت ہی نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ اس قدر سمجھدار ہوتے ہیں کہ انہیں تو دوسروں سے اختلاف کا حق حاصل

¹ جماعت المسلمین رجسٹرڈ کی بنیاد جناب سید مسعود احمدی۔ ایس۔ سی (1915-1997) نے ڈالی۔ موصوف پہلے بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد ازاں اہل حدیث ہو گئے۔ پھر بعض اہل حدیث علماء سے بد ظن ہو کر اہل حدیث کو بھی ایک فرقہ قرار دیا اور اپنی جماعت، جماعت المسلمین کی بنیاد رکھی اور یہ دعویٰ کیا کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور اہل حدیث پانچوں مذاہب اسلام کے خلاف ہیں۔ [سید وقار علی شاہ، افکار وعقائد وفتاویٰ جماعت المسلمین رجسٹرڈ کراچی، ضیاء سنز پرنٹرز، پشاور، 2002ء، ص 39]۔ ان کے علاوہ ایک اور صاحب کیپٹن ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی ہیں کہ جو فرقہ واریت کے سخت خلاف ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں اور بریلوی، دیوبندی اور اہلحدیث تینوں کو مشرک قرار دیتے ہیں۔ [خواجہ محمد قاسم، کراچی کا عثمانی مذہب اور اس کی حقیقت، ادارہ اشاعت القرآن والحديث، پاکستان، ص 124-125]۔

ہوتا ہے لیکن جب دوسرے ان سے اختلاف کریں تو ان کا دعویٰ ہوتا ہے کہ دوسروں کے پاس دلیل نہیں ہے لہذا انہیں ہم سے اختلاف کا حق نہیں ہے۔ پس دلیل کیا ہے، کیا نہیں ہے، یہ بھی انہوں نے طے کرنا ہے۔ گویا مدعی بھی خود، گواہ بھی خود اور قاضی بھی خود۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں درست ہوں اور باقی سارے غلط ہیں۔

اسی طرح اسلامی تحریکوں کے کارکنان، مسالک کے پیروکاروں پر تو خوب نقد کرتے ہیں کہ مسالک نے فرقہ واریت کو بہت ہوا دے رکھی ہے لیکن خود یہی کارکنان اپنی جماعت کے نظریات کے بارے اسی قسم کے تعصب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جیسا تعصب مسالک کے پیروکار ایک دوسرے کے بارے رکھتے ہیں۔ بعض تحریکیں دوسری تحریکوں کا اسی طرح رد کر رہی ہوتی ہیں جیسا کہ مسالک ایک دوسرے کا رد کرتے ہیں لہذا فرقہ واریت ضروری نہیں کہ صرف مسالک میں ہی ہو بلکہ ہر اُس جگہ ہو سکتی ہے کہ جہاں غلو اور تعصب موجود ہو۔

مذہب، مسالک اور جماعتوں میں دوسروں کے بارے میں جو سختی، تشدد اور تعصب آگیا ہے، اسے ختم ہونا چاہیے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے سوائے چند ایک جہلا کے۔ اور ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے مذہب، مسلک اور جماعت کی بھی اصلاح کرے اور ہر وقت دوسروں کے مذہب، جماعت اور مسلک کی اصلاح ہی میں نہ لگا رہے۔ فرقہ واریت اور جماعتی تعصب کی بنیاد ہی یہ رویہ ہے کہ ہمارا مسلک اور جماعت تو سو فی صد درست ہے اور دوسرا سو فی صد غلط ہے لہذا ہمیں اپنی نہیں دوسروں کی اصلاح کرنی ہے۔ اگر ہم میں ہر مسلک اور جماعت کے لوگ اپنی تبلیغی مساعی کا تیس فی صد بھی اپنی جماعت اور مسلک کی اصلاح میں لگا دیں گے تو فرقہ واریت اور جماعتی تعصب ختم ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ!

اسی طرح اپنے مذہب، جماعت اور مسلک پر ہی ہر وقت تنقید کرتے رہنا بھی متوازن رویہ نہیں ہے۔ اگر آپ کی کسی مذہب، جماعت اور مسلک سے وابستگی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اس میں خیر کا پہلو غالب نظر آیا ہے تو آپ اس سے وابستہ

ہیں۔ پس اپنے مذہب، مسلک اور جماعت کے مثبت پہلو کی تعریف کریں اور جہاں اصلاح کی گنجائش ہے تو وہاں اصلاح کے لیے کوشش کریں، چاہے آپ کے مذہب، مسلک اور جماعت کے لوگ آپ کی اصلاح کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ کسی مذہب، مسلک اور جماعت سے وابستہ رہ کر آپ اس کی جو اصلاح کر سکتے ہیں، اس سے علیحدگی کی صورت میں نہیں کر سکتے کہ اس مذہب، مسلک اور جماعت کے لوگوں کی نفسیات یہ بن جاتی ہے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے لہذا ہم نے اس کی بات سنی ہی نہیں ہے۔ پس مذہب، مسلک اور جماعت سے وابستہ رہتے ہوئے اس کی اصلاح کرنا یہی رویہ متوازن اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ [التحریم: 6]

”اے اہل ایمان! اپنی جانوں کو اور اپنے گھروالوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔“

روایت سے تمسک

ایک دوست سے کسی مسئلے میں کچھ بحث ہو رہی تھی اور وہ جو اعتراض کرتے، میں اس کا عقلی و نقلی جواب پیش کر دیتا۔ بحث کے آخر میں انہوں نے کہا کہ آپ ہر بات کا جواب اسی وقت گھڑ لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسے نہ کہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں ایک ایسی علمی روایت (academic tradition) کا حامل اور امین ہوں جو تیرہ صدیوں چلی آرہی ہے اور اس میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اہل علم کی زندگیاں کھپ گئی ہیں۔ وہ روایت دین کی ایک ایسی جامع تعبیر اور مکمل نظام پیش کرتی ہے کہ جس میں نہ صرف دین کے ہر گوشے کے بارے رہنمائی موجود ہے بلکہ انسان کے ذہن میں اس تعبیر دین پر جس قدر اعتراضات آ سکتے ہیں، ان کا جواب بھی اس روایت کے حاملین صدیوں پہلے نقل کر چکے ہیں۔ پس چونکہ میرا اپنی روایت کا مطالعہ اچھا ہے اور آپ کے اعتراضات نئے نہیں ہیں لہذا آپ کو اس پر حیرانگی ہو رہی ہے کہ ایک شخص کو اتنے اعتراضات کا جواب اتنی جلدی کیسے سوچ سکتا ہے؟

”عقیدے“ میں ہمارے ہاں دو علمی روایات موجود ہیں کہ جن کی تاریخ ہزار سال

سے زائد عرصہ کو محیط ہے۔ یہ روایات سلفی اور غیر سلفی [اشعری ماتریدی] ہیں اور میرا تعلق ”سلفی روایت“ سے ہے کہ جس کے بانی ائمہ اربعہ ہیں اور اس کے مختصر مطالعہ کے لیے آپ شیخ محمد بن عبد الرحمن النخعیس کی کتاب ”اعتقاد الأئمة الأربعة“ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے انہیں بتلایا کہ اعتزال، خوارجیت، باطنیت اور جمہیت وغیرہ اگرچہ قدیم نظریات ہیں لیکن ان نظریات کی بنیاد روایت پسندی نہیں بلکہ عقل پرستی (rationalism) ہے۔

اسی طرح فقہ میں دو بڑی علمی روایات موجود ہیں کہ جن کی تاریخ 13 سو سال پرانی ہے اور یہ ”اہل الاثر“ اور ”اہل الرائے“ کی روایات ہیں۔ میرا تعلق اہل الاثر کی روایت سے ہے کہ جس کے بانی ائمہ ثلاثہ اور فقہائے محدثین ہیں۔ اخلاق و اصلاح نفس میں بھی دو قسم کی روایتیں موجود ہیں سلفی اور صوفی۔ اور میرا تعلق سلفی روایت سے ہے کہ جس کے بانی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔ صوفی روایت کے بانی سیدۃ الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ ہیں اور تصوف کے جو تصورات سید الطائفہ سے تصدیق حاصل نہ کر سکیں تو وہ روایت نہیں عقل پرستی ہے۔

ہم تقلیدی جمود کے حق میں نہیں لیکن علمی روایت سے تمسک کو ضروری سمجھتے ہیں لہذا سب سے پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ کسی دینی روایت سے وابستہ ہو جائیں۔ اور دوسرا کام یہ ہے کہ اس روایت کی اتباع کے ساتھ اس کی اصلاح بھی کریں کیونکہ یہ نبی کی روایت تو ہے نہیں کہ اس میں اصلاح کی گنجائش نہ ہو اور یہ آپ کی روایت کا آپ پر حق بھی ہے۔ اور تیسرا کام یہ ہے کہ متوازی روایت کے حاملین کا احترام کرتے ہوئے ان سے علمی مکالمہ کریں۔ یہ مکالمہ اگر تعصب کے رویے سے نہ ہو گا تو اس سے ایک تو آپ کی علمی روایت میں نکھار اور امتیاز پیدا ہو گا اور دوسرا اصلاح کی گنجائش سے اعتدال کا راستہ ہموار ہو گا۔

ہماری رائے میں کسی نہ کسی علمی روایت سے تمسک بہت ضروری ہے ورنہ تو آپ کٹی پٹنگ ہیں اور آج کے دور کے سارے متجددین (modernists) کٹی پٹنگیں ہیں۔

اور کئی پتنگ کو ہمیشہ زوال ہی ہوتا ہے یعنی وہ نیچے ہی آتی ہے، اوپر نہیں جاتی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کئی پتنگ ہوا کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، وہ جس طرف چاہے، اُسے لے جائے۔ اگر ہوا تیز ہوگی تو شاید اسے بہت اونچا بھی اڑالے جائے لیکن یہ اونچی اڑان عارضی ہوگی۔ سرسید اور پرویز وغیرہ جیسے افکار تو یہ ساری کئی پتنگیں ہیں اور ان کے پیچھے لگنے والوں کی مثال بھی کئی پتنگ کے پیچھے لگنے والوں کی سی ہے۔

پس حنفی یا حنبلی روایت کے امین اور حامل ہونے کو اپنے لیے قابل فخر سرمایہ سمجھیں لیکن اسے اپنے لیے ایسی عصیت نہ بنائیں کہ جس کے سبب اسلام کے دائرے میں آپ اکیلے ہی موجود ہوں۔ پس دینی روایات کے حاملین کے مابین ایک دوسرے کے مذاہب اور مسالک کے لیے برداشت ہونی چاہیے لیکن یہ سمجھداری کی بات نہیں ہے کہ اگر مولوی لڑ رہے ہیں، اور وہ غلط کر رہے ہیں، تو میں ہزار سالہ علمی روایات کو چھوڑ کر کئی پتنگوں کو لوٹنے کے لیے اُن کے پیچھے بھاگتا پھروں۔

اہل روایت (traditionalists) کو چاہیے کہ وہ روایت کے ساتھ تمسک کو لوگوں کے لیے ایک قابل فخر چیز بنائیں اور یہ اسی صورت ممکن ہوگا کہ جب اہل روایت ایک دوسرے کی روایت کا احترام کریں گے۔ اور اہل روایت کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان کی تنقیدی کاوشوں کا اصل محاذ کئی پتنگیں ہیں نہ کہ وہ خود۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَتْتُونِي بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِن كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

[الأحقاف: 4]

”اگر تم سچے ہو تو [اپنے حق میں دلیل کے طور پر] اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا نقل کیے گئے علم سے ہی کچھ لے آؤ۔“

علمی روایت کے بارے ہم نے کچھ مزید گفتگو اسی باب میں ”ایک منکر حدیث سے مکالمہ“ کے عنوان کے تحت کی ہے۔ اگر اس بارے مزید کچھ بحث ملاحظہ کرنی ہو تو وہ ہماری زیر ترتیب کتاب ”مکالمہ“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نیکی پر تعاون

ایک دوست سے گفتگو کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ ہمارے معاشرے میں مسلک اور جماعت کا تعصب اس قدر زیادہ ہے کہ ایک مسلک اور جماعت کے لوگ دوسرے مسلک اور جماعت کے لوگوں سے بالکل بھی تعاون نہیں کرتے ہیں۔ اس بارے ہمارے اخلاق اس قدر پستی کا شکار ہیں کہ فیس بک پر کسی کی اچھی تحریر کو اچھا سمجھنے کے باوجود محض اس لیے لائیک نہیں کرتے کہ اس کا تعلق ہمارے مسلک اور جماعت سے نہیں ہے۔

کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اللہ عز و جل اس امت کے کام کو اس دنیا میں اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ یہ آپس میں نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا نہ سیکھ لے۔ اور دنیا میں امت کے کام کی قبولیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ عز و جل اس کے نتائج نکال دیں۔ ہمارے معاشرے میں کتنی مذہبی جماعتیں اور دینی تحریکیں کام کر رہی ہیں لیکن ان کی محنت کے نتیجے میں معاشرے میں تبدیلی ویسی نہیں ہیں جیسی کہ ہونی چاہیے تھے۔

اب اسی پر غور کر لیں کہ ہمیں دوسروں سے ملاقات کے وقت ہمیشہ اختلافات یاد رہتے ہیں لہذا بات بات پر اپنے اختلاف کو بیان کرنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ غور نہیں کرتے کہ ہم میں اور دوسروں میں کتنی باتیں مشترک اور متفق علیہ ہیں۔ میں تو اکثر اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ ہمیں تبلیغی جماعت سے اختلاف سہی لیکن ان کی اس بات سے توافق ہے کہ وہ محلے میں گشت کر کے لوگوں کو مسجد میں نماز کے لیے لاتے ہیں لہذا ہمیں ان سے اس نیکی میں تعاون کرنا چاہیے۔ ہمیں جماعت اسلامی سے بہت اختلاف سہی لیکن اس بات سے توافق ہے کہ اسمبلی میں دینی ذہن رکھنے والوں کی بھی نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ پارلیمنٹ میں ایسی قانون سازی نہ ہو جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ پس ہمیں جماعت اسلامی کے نمائندگان کے حق میں ووٹ ڈالنا چاہیے۔

تبلیغی جماعت والوں کو تنظیم اسلامی کے طریق کار سے اختلاف سہی لیکن ان کی اس

بات سے توافق ہو گا کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید سیکھنے اور سکھانے کی طرف راغب کرتے ہیں تو ان سے اس بات میں تعاون کر لیں۔ مدارس کے علماء کو ڈاکٹر ذاکر نانیک، ڈاکٹر فرحت ہاشمی، ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا طارق جمیل وغیرہ جیسے مبلغین سے سینکڑوں فقہی اختلافات سہی لیکن ان کی اس بات سے توافق ہے کہ ان کی محنت کے نتیجے میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد دین کی طرف راغب ہو رہی ہے اور ان کی زندگیاں تبدیل ہو رہی ہیں لہذا اس کی تحسین کر دیں۔

اللہ عزوجل نے ہمیں کسی خاص گروہ، مسلک اور جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ پر تعاون کا حکم دیا ہے۔ ہمارا تعاون کام کی بنیاد پر ہونا چاہیے کہ جو کام اچھا ہے، اس میں تعاون کر دیں، چاہے وہ کسی بھی گروہ، مسلک اور جماعت کا کام ہو۔ اور جو کام اچھا نہیں ہے، اس میں تعاون نہ کریں، چاہے وہ ہمارے گروہ، مسلک اور جماعت کا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ [المائدة: 2]

”اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ عزوجل سخت سزا دینے والا ہے۔“

تفہیم میں اعتدال کا دامن

مسلم دنیا میں اس وقت افکار کا ایک جنگل آباد ہے کہ جس میں ایک عام مسلمان کفیوژن کا شکار ہے۔ مسلمانوں میں بھی کئی قسم کے طبقات ہیں۔ کچھ بنیاد پرست (fundamentalists) ہیں تو کچھ روایت پسند (traditionalists) ہیں۔ بعض جدت پسند (modernists) ہیں تو بعض آزاد خیال (liberalists) ہیں۔ ان طبقات کے باہمی اختلافات کے علاوہ خود ان میں بھی مزید تقسیم موجود ہے۔ بنیاد پرستوں میں انقلابی اور جہادی تحریکیں شامل کی جاتی ہیں۔ انقلابیوں میں کچھ

جمہوری ہیں اور کچھ غیر جمہوری۔ جمہوری جیسا کہ جماعت اسلامی والے ہیں جو انتخابات کے راستے انقلاب لانا چاہتے ہیں اور غیر جمہوری وہ ہیں جو احتجاج کے راستے انقلاب لانا چاہتے ہیں جیسا کہ تنظیم اسلامی کا موقف ہے۔ اسی طرح جہادیوں میں کچھ تکفیری ہیں اور کچھ غیر تکفیری۔ تکفیری وہ ہیں جو مسلمان حکمرانوں کو کافر کہتے ہیں اور غیر تکفیری وہ ہیں جو مسلمان حکمرانوں کو کافر نہیں کہتے ہیں۔ اسی طرح روایت پسندوں میں دینی مدارس بھی شامل ہیں اور وہ جماعتیں بھی جو دعوت، اصلاح اور تبلیغ کا کام کرتی ہیں۔

روایت پسند اہل تشیع میں بھی ہیں اور اہل سنت میں بھی ہیں۔ اہل تشیع میں کچھ اسماعیلی ہیں، بعض اثنا عشری ہیں اور بعض زیدی۔ اہل سنت میں اہل الحدیث، دیوبندی اور بریلوی تین بڑے مسالک ہیں۔ پھر اہل الحدیث میں کچھ جمہوری ہیں کچھ جہادی۔ جمہوری وہ ہیں جو انتخابات میں حصہ لیتے ہیں جیسا کہ مرکزی جمعیت الحدیث ہے اور جہادی وہ ہیں جو جمہوریت کو کفر قرار دیتے ہیں جیسا کہ جماعۃ الدعوة ہے۔ دیوبند میں کچھ تھانوی ہیں اور کچھ مدنی، بعض حیاتی ہیں اور بعض مماتی۔ تھانوی علمی اور اصلاحی کام میں ہیں جبکہ مدنی ملکی سیاست سے متعلق رہتے ہیں۔ حیاتی وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے قبر مبارک میں زندہ ہونے کے قائل ہیں جبکہ مماتی اس کے قائل نہیں ہیں۔ بریلویت میں کچھ مدنی ہیں اور کچھ قادری۔ مدنی جیسا کہ دعوت اسلامی والے ہیں کہ جو اپنے مسلک کی دعوتی اور تبلیغی جماعت شمار ہوتی ہے جبکہ قادری جیسا کہ منہاج القرآن اور پاکستان عوامی تحریک والے ہیں کہ اپنے مسلک کے مطابق انقلاب اور سیاسی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ کچھ تکفیری ہیں کہ دیگر مسالک کو کافر قرار دیتے ہیں اور کچھ تنزیہی ہیں کہ دیگر مسالک کو کافر نہیں کہتے۔

جدت پسندوں میں کچھ پرویزی ہیں اور کچھ غامدی۔ پرویزی وہ ہیں جو حدیث کا انکار کرتے ہیں اور غامدی وہ ہیں جو سنت اور حدیث میں فرق کرتے ہیں اور سنت کو مصدر دین مانتے ہیں جبکہ حدیث کو مستقل مصدر دین نہیں مانتے۔ آزاد خیالوں میں کچھ خدا بیزار ہیں، کچھ مذہب بیزار اور کچھ مسلمان بیزار وغیرہ۔ خدا بیزار وہ ہیں کہ جو خدا کے

موجود ہونے کے ہی قائل نہیں ہیں۔ اور مذہب بیزار وہ ہیں جو کہ خالق کو تو مانتے ہیں لیکن کسی مذہب کو بھی الہامی نہیں مانتے۔ اور مسلمان بیزار وہ ہیں کہ جو خالق اور مذہب دونوں کو مانتے ہیں لیکن مسلمان امت سے رد عمل میں ہیں اور ہر وقت امت پر تنقید کرنے میں یوں مصروف رہتے ہیں جیسے یہ ان کا بہت بڑا دینی فرض ہو۔

ہم متنوع طبقات نہیں بلکہ ایک ہی طبقے مثلاً روایت پسندوں کے مابین مکالمہ کی صورت حال کا جائزہ لے لیں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ بہت سی تنقید ایسی ہے جو مبنی بر اعتدال نہیں ہے۔ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے افکار سے مثبت یا منفی طور متاثر ہوتے ہیں۔ پاکستان ہی کی مثال لے لیں کہ بعض علماء مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ پر شدید نقد کرتے ہیں جبکہ بعض ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور بعض ان پر نقد بھی کرتے ہیں اور ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔

کسی بھی شخص کا کلام سو فی صد باطل نہیں ہوتا بلکہ اس میں صحیح اور غلط دونوں موجود ہوتے ہیں۔ پس سلفی ہو یا صوفی، حنفی ہو یا شافعی، وہابی ہو یا اخوانی، جہادی ہو یا تبلیغی، بریلوی ہو یا دیوبندی، سب کے کلام میں خیر اور شر دونوں موجود ہوتے ہیں۔ معصوم تو صرف نبی کی ذات ہے کہ جن کے کلام میں شر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ باقی سب عام انسان ہیں کہ کچھ کی بات زیادہ درست ہے اور کچھ کی کم۔ بعض کے دعوے میں 70 فی صد صداقت ہے اور بعض میں 30 فی صد سچ۔ پس سید قطب ہوں یا مولانا مودودی، ڈاکٹر ذاکر نانیک ہوں یا ڈاکٹر فرحت ہاشمی، علامہ محمد اقبال ہوں یا ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا اشرف علی تھانوی ہوں یا مولانا حسین احمد مدنی، شیخ المدخلی ہوں یا علامہ البانی، مولانا تقی عثمانی ہوں یا مولانا زاہد الراشدی، مولانا طارق جمیل ہوں یا مولانا احمد شاہ نورانی، ان سب کے کلام میں حق اور باطل، خیر اور شر دونوں موجود ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ عموماً قاری اور سامع پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ تعین کرے کہ کس کے کلام میں کون سا پہلو غالب ہے، خیر کا یا شر کا؟

کسی شخصیت کے بارے بعض اوقات اہل علم میں اس بارے اختلاف ہو جاتا ہے کہ

اس میں خیر کا پہلو غالب ہے یا شر کا پہلو۔ جو خیر کے پہلو کو غالب سمجھتے ہیں، وہ شر کے منکر نہیں ہوتے ہیں لیکن غالب پہلو کا اعتبار کرتے ہوئے اس شخصیت کے بارے مجموعی طور ایک اچھا حکم لگا دیتے ہیں اور جو شر کا پہلو غالب سمجھتے ہیں، وہ اس شخص میں خیر کے منکر نہیں ہوتے لیکن شر کے پہلو کو غالب سمجھنے کے سبب سے اس پر شر کا حکم لگا دیتے ہیں۔

کسی شخص، جماعت اور فکر پر حکم لگانے میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو محتاط طبیعت کے حامل ہوتے ہیں جبکہ اکثریت کا معاملہ تو ایسا ہی ہے کہ کافر کافراں کافر اور جو نہ مانے وہ بھی کافر۔ کیا اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی اور اہل تشیع چاروں مسالک سے وابستہ ایسے علماء موجود نہیں ہیں کہ جنہیں ان کے اپنے ہی مسلک کے علماء نے مسلک سے خارج کرنے کی سنجیدہ کوشش نہ کی ہو؟

پس اگر ایک عالم دین کے نزدیک ایک شخص گمراہ ہے تو اسے یہ نہیں کرنا چاہیے کہ جو دوسرا عالم دین اسی شخص کو گمراہ نہیں سمجھ رہا تو وہ اس عالم دین کو بھی گمراہ کہنا شروع کر دے۔ معاصر علماء اور دینی اسکالرز کی بہت سی دینی خدمات ہیں۔ ان کی جس رائے سے ہمیں اتفاق نہ ہو اس کا رد کریں اور اس سے عدم اتفاق کا اظہار کریں لیکن ان کی کسی رائے سے اختلاف کے سبب سے ان کو اسلام سے باہر یا اندر کرنے کی تحریک چلانا درست نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی امت کو ان فتنہ پرور رہنماؤں سے ڈرایا ہے جو انہیں گمراہی کے راستے پر ڈال دیں۔ اور یہ وہی لوگ ہیں کہ جنہیں اپنے علاوہ ہر کوئی گمراہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ خوارج تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّمَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي الْأَيْمَةَ الْمُضِلِّينَ»¹

”مجھے اپنی امت کے بارے جن لوگوں سے خطرہ ہے تو وہ گمراہ کرنے والے لیڈر ہیں۔“

مولانا طارق جمیل صاحب کا ایک جملہ سننے کو ملا کہ جس میں اپنے مکتبہ فکر کے

¹ سنن الترمذی، أَبَوَابُ الْفِتَنِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْأَيْمَةِ الْمُضِلِّينَ، 504/4

لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اللہ کی جنت بہت وسیع ہے، صرف دیوبندی اس میں جا کر کیا کریں گے! یہ وسعت ظرفی سب مکاتب فکر کے علما میں ہونی چاہیے کہ اہل حدیث کے علما کو سوچنا چاہیے کہ صرف اہل حدیث جنت میں جا کر کیا کریں گے کہ وہ امت کا کتنا فی صد ہیں۔ اور بریلوی علماء کو غور کرنا چاہیے کہ کیا دیوبندی اور اہل حدیث کے جنت میں جانے پر اللہ کے رسول ﷺ کو خوشی ہوگی یا جہنم میں جانے پر، آخر میں وہ بھی اللہ کے رسول ﷺ کی امت ہیں اور آپ ﷺ اپنی امت کے جنت میں جانے کے بارے غمگین اور دعا گورہتے تھے نہ کہ کسی خاص گروہ کے بارے۔ اللہ کی جنت بہت وسیع ہے اور وہ صرف آپ کے گروہ کے لیے نہیں بنائی گئی بلکہ اس میں اس امت میں سے بے شمار لوگ جائیں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«عُرِضَتْ عَلَيَّ الْأُمَمُ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ وَالنَّبِيُّانِ يَمُرُّونَ مَعَهُمُ الرِّهْطُ، وَالنَّبِيُّ لَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ، حَتَّى رَفَعَ لِي سَوَادًا عَظِيمًا، قُلْتُ: مَا هَذَا؟ أُمَّتِي هَذِهِ؟ قِيلَ: بَلْ هَذَا مُوسَى وَقَوْمُهُ، قِيلَ: أَنْظُرْ إِلَى الْأُفُقِ، فَإِذَا سَوَادٌ يَمْلَأُ الْأُفُقَ، ثُمَّ قِيلَ لِي: أَنْظُرْ هَاهُنَا وَهَاهُنَا فِي آفَاقِ السَّمَاءِ، فَإِذَا سَوَادٌ قَدْ مَلَأَ الْأُفُقَ، قِيلَ: هَذِهِ أُمَّتُكَ، وَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ هَؤُلَاءِ سَبْعُونَ أَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ»¹

”مجھ پر جنت میں جانے والی امتیں پیش کی گئیں تو کسی ایک یا دونوں کے ساتھ کچھ لوگ جنت میں جا رہے تھے اور کسی نبی کے ساتھ تو ان کی قوم میں سے ایک بھی جنت میں جانے والا نہیں تھا یہاں تک کہ مجھے ایک بہت بڑی جماعت نظر آئی تو میں نے کہا کہ کیا یہ میری امت ہے؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے۔ پھر مجھے کہا گیا کہ آپ سامنے افق پر دیکھیں تو ایک بہت بڑا ہجوم تھا کہ جس سے تمام افق بھرا ہوا تھا۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ یہاں اور وہاں آسمان کے کناروں میں دیکھیں تو ایک بہت بڑے ہجوم سے آسمان کے کنارے بھرے ہوئے تھے۔ تو مجھے کہا جائے گا کہ یہ آپ کی امت ہے۔ اور ان میں سے ستر ہزار ایسے ہیں جو بغیر حساب کتاب کے جنت میں

¹ صحیح بخاری، کتاب الطَّيِّبَاتِ، بَابُ مَنْ أَكْثَى أَوْ كَوَى غَيْرُهُ، 126/7

جائیں گے۔“

ایک اور روایت میں وضاحت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:
 «فَأَرَيْنَهُمْ، فَاعْجَبَنِي كَثْرَتُهُمْ وَهَيْئَتُهُمْ قَدْ مَلَأُوا السَّهْلَ وَالْجَبَلَ، -
 قَالَ حَسَنٌ: - فَقَالَ: أَرْضَيْتَ يَا مُحَمَّدٌ؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ»¹
 ”میں اپنی امت کو دیکھوں گا تو مجھے ان کی کثرت اور حالت پر تعجب ہو گا کہ کوئی
 پہاڑ اور میدان باقی نہ رہے گا کہ جہاں وہ موجود نہ ہوں۔ اور پھر مجھ سے کہا
 جائے گا کہ اے محمد ﷺ! کیا اب آپ اپنے رب سے راضی ہیں؟ تو میں کہوں
 گا: جی ہاں، میں راضی ہوں۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:
 «إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ تَكُونُوا نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ»²
 ”مجھے امید ہے کہ اہل جنت میں سے نصف میری امت کے لوگ ہوں گے۔“

جہاں معاشرے میں لوگوں کو گمراہ کرنے والے امام ہوں گے، وہاں ہر دور میں
 قیامت تک علما کا ایک ایسا گروہ بھی رہے گا کہ جو حق اور اعتدال پر ہوں گے۔ اور بعض
 لوگ اس گروہ کی مخالفت بھی کریں گے لیکن ان کی مخالفت انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا
 سکے گی۔ اس گروہ کے حق اور اعتدال پر ہونے کی نشانی یہ ہے کہ امت کے دل میں اس
 گروہ کی عزت اور مقام قیامت تک باقی رہے گا کہ حق کے متلاشیوں کے لیے حق تک
 پہنچنا آسان رہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ ایک گروہ کی بات ہو رہی ہے نہ کہ کسی فرد واحد
 کی۔ اور گروہ سے مراد بھی کوئی متعین گروہ نہیں ہے بلکہ بعض مخصوص صفات کے
 حامل علما کا گروہ ہے جو ہر دور میں رہے گا۔ اور ان صفات میں سے اہم تر صفت امت کے
 دلوں میں ان کا غلبہ اور عزت ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ يَخْذُلُهُمْ
 حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ»³

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 358/7

² سنن الترمذی، أبواب تفسیر القرآن، باب: وَمِنْ سُورَةِ الْحَجِّ، 322/5

³ سنن الترمذی، أبواب الفتن، باب مَا جَاءَ فِي الْأَيْمَةِ الْمُضِلِّينَ، 504/4

”میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر غالب رہے گا۔ جو انہیں رسوا کرنا چاہے گا تو وہ ان کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔“

جماعتی تعصب

آپ کسی اسلامی جماعت کے بانی ہیں، تصوف کے سلسلہ کے خلیفہ مجاز ہیں، و بلیغ ٹرسٹ کے چیرمین ہیں، دارالعلوم میں شیخ الحدیث ہیں، مذہبی چینل کے مالک ہیں، اصلاحی تحریک کے رہنما ہیں اور آپ کے مرید، شاگرد، کارکنان اور پیروکار ہزاروں بلکہ لاکھوں میں ہیں۔ یہ ارادت مند نہ صرف آپ کو جنتی سمجھتے ہیں بلکہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے اور آپ سے نسبت رکھنے والوں میں بھی جنت کا ٹکٹ تقسیم کرتے ہیں۔

اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو آپ کے لیے یہ واضح ہونا بہت ضروری ہے کہ آپ کو آخرت میں جہنم سے نجات کے لیے اللہ کی رحمت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ ایک سڑک پر روڑی کو ٹٹنے والے مزدور اور گھروں میں کام کاج کرنے والی ملازمہ کو۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے اعمال کی کثرت کی بدولت جنت میں جائے گا بلکہ ہر کسی نے اللہ کی رحمت سے جنت میں جانا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَنْ يُنَجِّيَ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ» قَالَ رَجُلٌ: وَلَا إِلَآكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ:

«وَلَا إِنِّي، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي اللَّهُ مِنْهُ بِرَحْمَةٍ، وَلَكِنْ سَدِّدُوا»¹

”تم میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو محض اپنے عمل کی بدولت نجات پائے

گا یہاں تک کہ اللہ کی رحمت اسے ڈھانپ لے۔ ایک شخص نے کہا: اے نبی

کریم ﷺ! کیا آپ بھی؟ آپ نے کہا: ہاں! میں بھی۔ اس لیے عمل میں میانہ

روی اختیار کرو۔“

اس حدیث پر غور کرنے سے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر مرید اور پیرو دونوں نے، اور استاذ اور شاگرد دونوں نے، اور کارکن اور امیر جماعت دونوں نے، اللہ کی رحمت

¹ صحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب لَنْ يَدْخُلَ أَحَدُ الْجَنَّةِ بِعَمَلِهِ، 2169/4

ہی سے جنت میں جانا ہے تو پیر، استاذ اور امیر میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو سکتا ہے؟

فریق مخالف کار دیا اس کے لیے دعا؟

کسی صاحب نے کہا کہ کل جب مغرب کی فرض نماز سے فارغ ہوا تو ذکر و اذکار کرتے ہوئے اچانک یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ محدث فورم مکالمہ کے لیے ایک دینی اور مذہبی فورم ہے کہ جہاں پر اکثر اراکین اہل الحدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور آج کل اس فورم پر ایک فاضل دیوبندی عالم دین جشید صاحب اور اہل حدیث علماء کے مابین کافی بحث مباحثے ہو رہے ہیں۔ مجھے یہ خیال آیا کہ کیا محدث فورم پر سرگرم کسی اہل حدیث عالم دین نے اخلاص، ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت صدق دل سے کبھی اپنے دینی بھائی مولانا جشید صاحب کے لیے تنہائی میں اللہ سے دعا بھی کی کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کو بھی اُس حق کی طرف پھیر دے کہ جسے میں نے پورے شعور سے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اور یہ دعا اس کیفیت کے ساتھ مانگی ہو کہ جس کیفیت کے ساتھ وہ اپنے کسی ذاتی اور دنیاوی مشکل میں اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔

پس جتنا وقت اور ذہن ہم سوشل میڈیا پر ایک دینی بھائی کی تردید (refutation) میں لگا دیتے ہیں، اگر ہم رد عمل کی نفسیات سے نکل کر اس کا نصف وقت بھی اسی بھائی کے لیے دعا پر لگا دیں تو شاید انہیں اپنے ساتھ متفق پائیں۔ ذہن میں یہ بھی بات آتی ہے کہ جب ہم کسی دوسرے کے لیے حق کی طرف ہدایت کی دعا کریں تو اس میں بھی دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حق مراد ہو جو اللہ عز و جل کی نظر میں حق ہے نہ کہ وہ جسے ہم حق سمجھتے ہوں۔ پس اپنے فریق مخالف کے لیے یوں دعا کریں کہ پروردگار! جو آپ کے نزدیک حق ہے، اس کی طرف میری بھی اور میرے بھائی کی بھی رہنمائی فرمائیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«دَعْوَةُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِأَخِيهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ مُسْتَجَابَةٌ، عِنْدَ رَأْسِهِ مَلَكٌ مُوَكَّلٌ كُلَّمَا دَعَا لِأَخِيهِ بِخَيْرٍ، قَالَ الْمَلَكُ الْمُوَكَّلُ بِهِ: آمِينَ وَلَكَ بِمِثْلِ»¹

¹ صحیح مسلم، کتاب الذِّكْرِ وَالْدَّعَاءِ وَالنُّوْبَةِ، بَابُ فَضْلِ الدَّعَاءِ لِلْمُسْلِمِينَ بِظَهْرِ الْغَيْبِ، 2094/4

”ایک مسلمان کی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے لیے دعا مقبول (accepted) ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنے بھائی کے لیے کسی خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے سر کے قریب ایک فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جو اس کی دعا پر آمین کہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے بھی وہ سب کچھ دے جو تو اپنے بھائی کے لیے مانگ رہا ہے۔“

رد عمل کی نفسیات

میں نے محدث اردو فورم پر ایک تحریر لکھی جو کہ درج ذیل تھی:

”ایک تبلیغی دوست کو دعا کرتے سنا تھا کہ اے اللہ! مجھ سے نبیوں والا کام لے۔ دعا پسند آئی لہذا اکثر یہ دعا مانگتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ نبیوں والا کام کیا ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نبی ہر خیر کا کام کرتے تھے، دعوت، تعلیم، تربیت، تزکیہ، جہاد، خدمت خلق وغیرہ۔ جب بھی یہ سوال پیدا ہوا تو ہمیشہ دل میں یہی آتا ہے کہ نبیوں والے کام سے مراد دعوت کا کام ہے کہ ان کی زندگی کا غالب حصہ دعوت و تبلیغ میں ہی گزرتا تھا، واللہ اعلم۔ پچھلے دنوں دل میں شدت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ عالم تیار کرنے کے لیے دارالعلوم اور مدارس ہیں، اصلاح نفس کے لیے خانقاہیں بنائی گئیں، مجاہدین کی تیاری کے لیے معسکرات وجود میں آئے، خدمت خلق کے لیے ویلفیئر ٹرسٹ بنے لیکن داعی تیار کرنے والے ادارے نظر نہیں آتے۔ ایک ایسا ادارہ قائم ہونا چاہیے کہ جس میں ایک سال، چھ ماہ، چار ماہ، تین ماہ، ماہانہ اور ہفتہ وار کورسز کی بنیاد پر داعی تیار کیے جائیں۔ دعوت دینے کا نہ صرف نبوی طریقہ سکھایا جائے بلکہ اس کی عملی مشق (practical) بھی کروائی جائے۔ دعوت دینے میں جو ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے، اسے تربیت کے ذریعے دور کیا جائے۔ زمانے کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک داعی میں دعوت کے ممکنہ جدید وسائل سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ مدعو (invitee) کی نفسیات، مخاطبین کی ذہنی استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے

گفتگو اور دعوت کے اسالیب میں تبدیلی وغیرہ جیسے علمی و فکری نکات کو زیر بحث لایا جائے۔ پس دعوت کو ایک منظم سائنس کے طور متعارف کروایا جائے۔“

اس پر محدث فورم کے ایک دوست نے یہ تبصرہ کیا کہ ”یہ تمام ادارے دعوت کا بھی کام کرتے ہیں۔“ ان کا کہنا تھا کہ مدارس اور خانقاہیں بھی تو دعوت ہی کا کام کر رہے ہیں لہذا کسی نئے ادارے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ تبصرہ پڑھ کر پہلے پہل تو دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کا جواب لکھوں اور ذہن میں یہ جواب تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں ہے کہ جس کی بنیاد دعوت کا کام کرنے کے لیے رکھی گئی ہو یعنی ان اداروں کے قائم کرنے کے مقاصد اگرچہ دینی تھے لیکن دعوت کے علاوہ کچھ اور تھے۔

بہر حال کسی وجہ سے یہ تحریر نہ کر سکا لیکن اس موضوع پر سوچ بچار جاری تھی۔ بعد ازاں یہ خیال آیا کہ یہ تمام ادارے بھی تو دعوت کا کام کرتے ہیں اگرچہ ان کا غالب کام دعوت نہیں ہے بلکہ ان کا جزوی کام دعوت ہے۔ اس اعتبار سے میری بات بھی درست تھی اور میرے دوست کی بات بھی درست تھی۔ میں ان اداروں کی کلی حیثیت کو دیکھ رہا تھا جبکہ وہ ان کے جزوی کام کو دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ ہر ادارہ کئی قسم کے کام کرتا ہے لیکن اس کا تشخص (identity) اس کا غالب کام ہی ہوتا ہے جیسا کہ مدارس اسلامیہ ہمارے ہاں بڑی سطح پر ویلفیئر کا کام بھی کرتے ہیں کہ مفت تعلیم، کھانا اور رہائش مہیا کرتے ہیں لیکن ان کا اصل تشخص اور اصل امتیاز علوم دینیہ کی درس و تدریس ہے۔ پس میری مراد بھی یہ تھی کہ دعوت کا ایک ایسا ادارہ ہو کہ جس کا امتیازی کام دعوت ہو اور میرے دوست کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے بھی دعوت کا کام کرتے ہیں اگرچہ کم ہی کیوں نہ ہو اور اس کا انکار نہیں ہونا چاہیے۔

پھر یہ بھی کسی وجہ سے تحریر نہ کر سکا لیکن سوچ بچار جاری رہی اور تیسرے مرحلے میں یہ خیال آیا کہ مجھے کسی قسم کی جوابی تحریر نہیں لکھنی چاہیے کہ کبھی کبھار انسان کے

پاس جواب ہو بھی تو انسان کو اپنی تربیت کے لیے جواب نہیں دینا چاہیے۔ میں نے سوچا مجھے بعض اوقات اپنے مخاطب کی بات میں ایسا مثبت پہلو تلاش کرنا چاہیے کہ مجھے اس کی بات مبنی بر حکمت نظر آنے لگے، چاہے ایسا وقتی طور ہی ہو کیونکہ یہ میری تربیت کے لیے بہت مفید ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ یہ غور و فکر اس بات پر منبج ہوا کہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے مخاطب کی بات درست تھی۔

میں نے اپنے اس سارے سوچ بچار کے عمل پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ ہم جواب عجلت میں دیتے ہیں اور مخاطب کے رد عمل میں سوچتے ہوئے دیتے ہیں۔ اگر ہم دو باتیں نکال دیں: ایک رد عمل اور دوسرا عجلت، تو ہمارا مکالمہ ایک بہترین مکالمہ بن جائے لیکن ہم سب کمزور ہیں۔ کسی مکالمے کو بہترین مکالمہ بنانے کے لیے فریقین کا علم، ذہن اور اخلاق میں بہترین ہونا ضروری ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسرے کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ وہ صالح سے زیادہ مصلح بننا چاہتا ہے۔ بحیثیت قوم ہماری یہ عادت بن چکی ہے کہ ہم مکالمے میں اپنی ٹینشن، فرسٹریشن اور ڈپریشن دوسروں پر نکالتے ہیں اور سوشل میڈیا مثلاً فیس بک اور ٹوئٹر وغیرہ پر تو مکالمے کا کم و بیش یہی حال ہے۔ بہترین مکالمہ وہ ہے کہ جس میں بہترین اخلاق اور رویوں کا اظہار ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ [فصلت: 34]

”برائی اور بھلائی برابر نہیں ہو سکتی۔ پس آپ سخت کلامی کا جواب اچھے طریقے سے دیں تو وہ جس کے اور آپ کے مابین دشمنی ہے، آپ کا گہرا دوست بن جائے گا۔“

انسان اور غلطی

انسان اور غلطی کا تعلق وہی ہے جو دریا اور پانی کا۔ ایک دوست نے کہا کہ مجھے لکھتے ہوئے تقریباً دس سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا۔ ایک سو بیس سے زائد تحقیقی، اصلاحی اور

فکری مضامین مختلف دینی مجلات میں اور چھ عدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے لوگوں پر بہت تنقید کی اور لوگوں نے مجھ پر کی۔ لیکن اب مجھ میں کچھ تبدیلی آچکی ہے۔ میں سوشل میڈیا پر جب اپنے بعض دوستوں کو اس قسم کی تنقید کرتے دیکھتا ہوں جو کہ میں خود ماضی میں کیا کرتا تھا، تو مجھے اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے۔ آج میں اس بات کو دل سے مانتا ہوں کہ میرے تنقید کرنے کے اسلوب میں غلطی تھی اور آج اپنے دوستوں سے بھی یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنی تنقید کے اسلوب کو مہذب بنائیں۔

انہوں نے کہا کہ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ذہنی سطح بہت گر گئی ہے۔ جسے یہ نہیں معلوم کہ تنقید کی تعریف کیا ہے؟ وہ بھی تنقید کر رہا ہے۔ میں خود ایسی حرکتیں کر آیا ہوں کہ اب ان پر افسوس ہوتا ہے۔ لوگ تنقید کے نام پر جو کچھ کرتے ہیں یا جس ذہنی سطح اور منفی جذبے سے کرتے ہیں، ان سب کیفیات اور احوال سے میں بہت پہلے گزر چکا ہوں۔ لیکن میں نے پڑھا، ہر کسی کو پڑھا جیسا کہ بعض دوست کہتے ہیں کہ الم غلم پڑھا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ الم غلم لیکن یہ کہ ادب، فلسفہ، نفسیات، مذہب جس میدان میں بھی اچھی تحریر پڑھنے کو ملی، اس کو پڑھا۔ آج کل ”مجموعہ حسن عسکری“ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

اس کے بعد غور کیا۔ اپنے رویوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ اور زبانی اور تحریری اقرار کیا کہ میں غلط تھا، میرا رویہ درست نہ تھا۔ میری تنقید کے مقاصد ٹھیک نہ تھے۔ اپنے رویوں کے محرکات پر اس قدر غور کیا کہ میں دوسرے انسانوں کے رویوں کو بہت قریب اور گہرائی میں سمجھنا شروع ہو گیا۔ یہ نہ چاہنے کے باوجود ہو گیا۔ میں ایسی ہی تنقید کیا کرتا تھا جیسا کہ میرے بعض دوست کر رہے ہیں اور اسی جذبے کے ساتھ۔ لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ میں غلط تھا، میں نے اصلاح کی کوشش کی۔

انہوں نے کہا کہ میرے دوستو! میں اس شر کو اس لیے پہچانتا ہوں کہ میں اس کی ساری وادیاں گھوم چکا ہوں۔ لہذا جو بات دوستوں کو سمجھ نہیں آتی، وہ مجھے سمجھ آ جاتی ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی، لاشعوری طور۔ دوستو! المیہ یہ ہے کہ جس پر واقعتاً رونا چاہیے

کہ ذہنی سطح بہت گر گئی ہے۔ ہم اس قابل بھی نہیں رہے کہ اگلے کا موقف سمجھ سکیں۔ ہم ذرا اپنے دڑبوں سے باہر نکل کر کسی کے ساتھ بیٹھیں تو ہمیں معلوم ہو کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے۔ ہم کسی ایک شخص کی فکر سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ساری زندگی اسی کے گن گانے میں گزار دیتے ہیں۔ اور اس کے گن بھی اس مقصد سے نہیں گاتے کہ وہ بڑا آدمی تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی بڑائی کا تذکرہ کر کے ہم اس سے اپنے تعلق کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی بڑائی ثابت کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہم لوگ کرتے ہیں، مذہبی لوگ، لکھنے والے، بولنے والے، علم کی طرف اپنی نسبت کرنے والے۔ یہ میں نے بھی کیا، لہذا جب لوگ کرتے ہیں تو مجھے سمجھ آتی ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ دوستو! مجھے اس کارنج ہونا چاہیے۔ مجھے احساس ہونا چاہیے کہ مجھے اللہ کے ہاں اپنی تحریر کا حساب بھی دینا ہے۔ مجھے سوچنا چاہیے کہ میں کسی عالم دین یا مذہبی اسکالر پر تنقید کر کے کہیں اپنا علمی قد تو اونچا کرنے کی کوشش نہیں کر رہا؟

انہوں نے کہا کہ میرے دوستو! کچھ دوستوں کی صحبت نے مجھ میں یہ فکر پیدا کر دی جب ہم کسی پر تنقید کریں تو تنہائی میں اپنے پر اس سے زیادہ تنقید کریں کہ اس تنقید میں ہمارے محرکات اور مقاصد کیا تھے؟ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا نفس دین کے راستے ہی سے ہمیں دھوکے میں ڈالے گا۔ ہمارے ہاں جب کسی نقاد کو کہا جاتا ہے کہ تم نے جس پر تنقید کی ہے، اسے سمجھا نہیں ہے تو وہ اس بات کو بالکل سنجیدہ نہیں لیتا کیونکہ اخلاق اور علم دونوں کا معیار بہت گر چکا ہے۔

مصلح ایسا ہونا چاہیے کہ جب بھی اسے اس کی کسی کوتاہی کی طرف متوجہ کیا جائے تو وہ فوراً اسے نہ صرف تسلیم کر لے بلکہ اپنی اصلاح کی کوشش بھی کرے۔ یہی مصلح وہ ہے کہ جو صالح بھی ہے۔ معاشرے میں تبدیلی صرف مصلحین سے نہیں آتی بلکہ صالح مصلحین سے آتی ہے۔ ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی صاحب ایک صالح مصلح کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”کچھ سال پہلے ہماری مقامی مسجد میں پاکستان سے آئی ایک تبلیغی جماعت نے

قیام کیا۔ اس جماعت میں سابقہ کرکٹر ثقلین مشتاق اور محمد یوسف بھی شامل تھے۔ نماز مغرب کے بعد بھائی ثقلین مشتاق نے ایک پُر اثر اور سادہ اسلوب میں درس دیا۔ جس میں انہوں نے اپنے دین کے سفر کے بارے میں بھی واقعات سنائے اور ساتھ ہی تفصیل سے نماز، روزہ، تسبیحات، صدقات، تلاوت، تبلیغ وغیرہ کے فضائل بھی بیان کئے۔ جب آپ کا بیان ختم ہوا تو مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ان سے گفتگو کا موقع حاصل ہوا۔ صدق دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے ان سے قدرے سپاٹ انداز میں کچھ یوں کہا کہ ثقلین بھائی آپ نے ماشاء اللہ! اتنی دیر خوبصورت گفتگو کی، جس میں آپ نے اپنے سننے والوں کو دعوت و تبلیغ سمیت تقریباً ہر عبادت و نیکی کی ترغیب دی۔ مگر مجھے افسوس ہوا کہ اس سارے وقت میں ایک بار بھی آپ نے مخاطبین کو قرآن حکیم سمجھنے کی رغبت نہیں دلائی جو بلاشبہ فہم دین کے لئے سب سے ضروری ہے۔ گو میں نے اپنا یہ اعتراض تہذیب کو ملحوظ رکھ کر ہی پیش کیا تھا مگر اس کی نوعیت خاصی ناقدانہ تھی۔ مجھے قوی توقع تھی کہ ایک عام سے انسان کی ایسی غیر متوقع تنقید پر ثقلین بھائی جیسے مشہور و معروف انسان غصہ میں کوئی سخت جواب دے سکتے ہیں، لیکن اس وقت مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب توقع کے برعکس ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ پوری ندامت سے بولے کہ آپ کی بات واقعی درست ہے۔ مجھے واقعی لوگوں کو قرآن حکیم سے جڑنے کی ترغیب دینی چاہیے تھی۔ پھر بولے کہ اب جو لندن میں دیگر مقامات پر مجھے گفتگو کرنی ہے، میں وہاں ضرور اسے شامل کروں گا۔ ان کے لہجے سے ان کا اخلاص اور سچائی پوری طرح سے چھلک رہے تھے۔ میں جو کچھ لمحہ پہلے ناقدانہ ذہن سے مخاطب تھا، اب دل کی گہرائی میں ان کے لئے محبت کا جذبہ محسوس کرنے لگا۔ مومن کا یہ خاصہ ہے کہ اسے جب خیر کی دعوت دی جائے یا دینی اعتبار سے اس کی کسی غلطی کی تصحیح کی جائے تو وہ کسی اناپرست کی طرح اپنی ہتک محسوس نہیں کرتا بلکہ فوری اپنی غلطی سے رجوع کرتا ہے اور

شکر گزار ہوتا ہے۔“¹

ہمیں ہر لحظہ لوگوں کی اصلاح کرنے کے ساتھ ان سے اصلاح لینے کے بھی تیار رہنا چاہیے۔ یہ احساس ہم میں سے ہر شخص کو رکھنا چاہیے کہ جس شخص میں یہ احساس بیدار نہ ہوا تو وہ علمی تکبر کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور جس میں یہ احساس بیدار ہوگا تو اللہ اسے علم کی عاجزی کا ذائقہ چکھادیں گے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنْ شِئْتُ لَأُحَدِّثَنَّكَ بِأَوَّلِ عِلْمٍ يُرْفَعُ مِنَ النَّاسِ؟ الْخُشُوعُ، يُوشِكُ أَنْ تَدْخُلَ مَسْجِدَ جَمَاعَةٍ فَلَا تَرَى فِيهِ رَجُلًا خَاشِعًا»²

”اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس علم کے بارے خبر دوں جو سب سے پہلے اس امت میں سے اٹھایا جائے گا۔ اور یہ خشوع کا علم ہے۔ قریب ہے کہ تم کسی ایسی مسجد میں داخل ہو گے کہ جس میں جماعت ہوتی ہے تو اس میں بھی تمہیں کوئی ایک شخص بھی خشوع والا نظر نہ آئے گا۔“

اور مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے والوں سے بڑھ کر کون دیندار ہوگا لیکن یہ بھی خشوع سے محروم ہوں گے لہذا خشوع کا حصول بہت ضروری ہے، خاص طور علمی معاملات میں۔

اہل حدیث کی اقسام

ہم میں ہر اس شخص کو جو اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے، اپنے اس مکتبہ فکر کی اصلاح کے بارے کچھ کہنا چاہیے کہ جس کی طرف وہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے یا لوگ اس کی نسبت اس مکتبہ فکر کی طرف کرتے ہیں۔ اصلاح میں درد دل شامل ہو تو ایک تو وہ اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے، اور دوسرا اگر اس میں اخلاص بھی ہو تو اپنے لوگ کبھی بھی اس سے محروم نہیں رہتے۔ جو شخص ساری زندگی دوسرے مسلک کی اصلاح میں لگا رہا تو اس کی اصلاح، اللہ کے لیے نہیں بلکہ اپنے نفس کے لیے ہے، اس پر اسے غور کرنا چاہیے۔ کسی بھی مسلک کے لوگ سو فی صد درست نہیں ہیں، آپ کے مسلک کے لوگ بھی،

¹ عظیم الرحمن عثمانی، عظیم نامہ، غیر مطبوع

² سنن الترمذی، أَبْوَابُ الْعِلْمِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي ذَهَابِ الْعِلْمِ، 31/5

کیونکہ سو فی صدر درست ہونا عصمت (infallibility) ہے اور عصمت انبیا کا خاصہ ہے نہ کہ مسالک اور جماعتوں کا۔

پس ہمارے معاشرے میں تین قسم کے اہل حدیث پائے جاتے ہیں۔ پہلی قسم عوامی اہل حدیث کہ جن کی اکثریت کے نزدیک اہلحدیثیت کا مفہوم احناف کے رد سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علما اور طلباء کی ہے کہ جو اہل حدیث کو ایک ایسے مسلک کی صورت پیش کرتے ہیں کہ جس کے کچھ امتیازی مسائل مثلاً فاتحہ خلف الامام، رفع الیدین، آمین بالجہر، سینے پر ہاتھ باندھنا، آٹھ تراویح، تقلید اور ایک مجلس کی تین طلاقیں وغیرہ ہیں۔ ان کی تحقیق کا سارا میدان یہی امتیازی مسائل ہیں۔ جو ان امتیازی مسائل کے قائل ہوں وہ ان کے نزدیک اہل حدیث ہیں اور جو قائل نہ ہوں تو وہ اہل حدیث نہیں ہیں۔ اس گروہ کا زیادہ تر تحقیقی کام تقلید کے رد میں ہے۔ یہ گروہ اپنے امتیازی مسائل میں حد درجے حساس ہے۔ اور ان امتیازی مسائل میں سے کسی مسئلہ سے اختلاف ہی ان کے نزدیک مسلک اہل حدیث میں داخل یا خارج ہونے کا واحد معیار (criteria) ہے۔

تیسری قسم ان اہل حدیث اہل علم کی ہے جو اہل حدیث کو محض ایک مسلک (school of jurisprudence) نہیں سمجھتے بلکہ اسے عالمی تناظر میں ایک منہج اور (methodology) اور انداز فکر (school of thought) قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی شخص کے اہل حدیث ہونے کی بنیاد اہل الحدیث کا منہج، انداز فکر اور اسلوب استدلال کا قائل ہونا ہے نہ کہ ان کے امتیازی مسائل کا۔ پس اگر کسی شخص کا منہج فکر اور اسلوب استنباط وہی ہے جو ائمہ ثلاثہ اور محدثین عظام کا تھا تو وہ اہل حدیث ہے، چاہے اس کے نتائج فکر مروجہ معاصر اہل حدیث کے امتیازی مسائل سے ملتے ہیں یا نہیں۔ اہل الحدیث اگرچہ ائمہ دین کا مقلد نہ بھی ہو لیکن کسی نہ کسی علمی روایت سے تمسک ضرور رکھتا ہے۔

دو معاصر اکابر اہل حدیث علماء مولانا اسماعیل سلفی اور مولانا سید داؤد غزنوی رحمہما اللہ

کے مابین ایک مکالمہ ہوا کہ جس کا موضوع یہ تھا کہ اہل حدیث کون ہے؟ ان میں سے ایک کا کہنا یہ تھا کہ اہل حدیث ہونا چند امتیازی مسائل کے ماننے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک فکر ہے اور جو بھی اس منہج فکر کا حامل ہے، چاہے اس کے نتائج اور فتاویٰ اہل حدیث کے امتیازی مسائل سے میل نہ بھی کھاتے ہوں، تو وہ اہل حدیث ہے جبکہ دوسرے کا کہنا تھا کہ اہل حدیث مخصوص امتیازی مسائل کے ماننے والا ہے اور جو ان کا قائل نہیں ہے تو وہ جماعت اہل حدیث میں سے نہیں ہے۔

ہمیں ذاتی طور تیسری قسم کے اہل الحدیث سے طبعی مناسبت ہے اور ہم اہل الحدیث کو ایک ایسا منہج فکر سمجھتے ہیں کہ جس میں علم و تحقیق کا میدان محض بیس تیس امتیازی مسائل نہیں ہیں اور نہ ہی فروعی اختلافات میں دوسرے مسالک کے پیروکاروں کو اپنی اجتہادی رائے کا قائل بنانے کے لیے زندگی وقف کر دینا دین کا کوئی تقاضا ہے بلکہ اصل مقصود، علم و تحقیق کے میدان میں استنباط و استدلال کے اس اسلوب کو رائج کرنا ہے جو اہل الرائے کے بالمقابل اہل الحدیث نے دوسری صدی ہجری میں ایک مستقل انداز فکر کی صورت میں پیش کیا تھا۔

اکابر اہل حدیث اہل علم شیخ الکل نذیر حسین دہلوی، محدث العصر عبد اللہ محدث روپڑی، استاذ الاساتذہ حافظ محمد گوندلوی، مناظر الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، سید داؤد غزنوی اور مولانا حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو پڑھیں، اور المیہ یہ ہے کہ لوگ ان کو پڑھتے نہیں ہیں، تو اہل حدیث کا جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ معاصر اہل حدیث سے بہت مختلف ہے۔ ہم ذرا ان اکابر اہل حدیث علماء کی زندگی کا تجزیہ کریں کہ ان کی زندگیوں میں روحانیت کتنے فی صد ہے اور جو ہے بھی تو اس کا اسلوب و طریق کار کیا ہے؟ اور آج کل کے نوجوان اہل حدیث محقق کو اس کے مقابلے میں دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا نوجوان اپنے ان اکابر کے منہج سے ہٹ چکا ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ کچھ ہی عرصے بعد نوجوان محققین کی یہ جماعت، احناف پر مناظرہ میں غالب آنے کے لیے اپنے ان اکابر اور محسن علماء کو بھی جماعت اہل حدیث سے خارج قرار دے دیں اور یہ سب کچھ ہونا شروع ہو چکا

ہے۔ اس مکالمہ سے کسی بھائی کی دل آزاری ہوئی ہو تو اس کے معذرت خواہ ہوں۔

غیر مقلد اور اہل الحدیث کا فرق

اہل حدیث کا منہج اعتصام بالکتاب والسنۃ کا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک باب باندھا ہے۔ اور صحیح بخاری میں یہ باب دراصل احادیث کی روشنی میں اہل الحدیث کے اصول فقہ کا بیان ہے۔ اب ایک جماعت کا منہج تو یہ ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں لیکن متجددین ہیں۔ قرون اولی (early ages) میں ان کی مثال معتزلہ وغیرہ جیسے گروہ تھے اور عصر حاضر میں منکرین حدیث اور اہل قرآن کے گروہ اسی فکر کے حاملین میں سے ہیں۔

متجددین وہ لوگ ہیں جو تقلید کے تو قائل نہیں ہیں لیکن کتاب وسنت کی چند ایک نصوص سے اپنا ایک نقطہ نظر بنا لیتے ہیں اور اب کتاب وسنت کی بقیہ نصوص کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق ثابت کرنے میں ہر قسم کی تاویل سے کام لیتے ہیں۔ یہ لوگ کتاب وسنت کی وہ تعبیر چاہتے ہیں جو ان کی سوچ کے موافق ہو۔ یہ اپنی سوچ کو کتاب وسنت کے تابع نہیں کرتے کہ وہ جہاں چاہیں ان کو لے جائیں بلکہ کتاب وسنت کو اپنی سوچ کے تابع کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی محدود سوچ، کتاب وسنت کے محدود مطالعہ کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ جس کے سبب وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اعتصام بالکتاب والسنۃ کے منہج پر قائم ہیں لیکن ان کا منہج اعتصام بالکتاب والسنۃ نہیں ہوتا۔

غیر مقلد ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ وہ اہل الحدیث بھی ہے۔ اہل الحدیث وہ ہیں کہ جو علمی روایت سے تمسک رکھتے ہیں کہ وہ اپنا شجرہ علمی مدینہ کے مکتبہ فکر اہل الاثر سے جوڑتے ہیں کہ جس کے بانی امام مالک رحمہ اللہ تھے جبکہ غیر مقلد وہ ہیں جو علمی روایت کا انکار کرتے ہیں اور ان کا شجرہ علمی خود ان کی اپنی ذات ہی سے شروع ہوتا ہے۔

اصحاب الحدیث اور تزکیہ نفس

سلف صالحین میں فقہی اختلاف کے سبب سے اہل الاثر اور اہل الرائے کے نام سے دو مکاتب فکر وجود میں آئے۔ پہلے مکتبہ فکر کامرکز مدینہ المنورۃ تھا اور اس کی ریاست امام

مالک رحمہ اللہ کے حصے میں آئی جبکہ دوسرے کامرکز کوفہ تھا اور اس کی مسند افتا پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ براجمان ہوئے۔

اہل الاثر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد فقہائے محدثین، اصحاب الحدیث اور ائمہ جرح و تعدیل کے نام سے مزید تین گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اہل الاثر میں فقہائے محدثین وہ تھے جنہوں نے بطور محدث حدیث کی خدمت کے علاوہ بطور مجتہد کے بھی اپنی فقہی آرا کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ امام مالک رحمہ اللہ، جو فقہائے محدثین کے پہلے امام بھی ہیں، سے حدیث و فقہ کی یہ امامت امام شافعی، ان سے امام احمد بن حنبل، اور ان سے امام بخاری رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی۔ اصحاب الحدیث وہ تھے کہ جن کا اوڑھنا بچھونا حدیث کو روایت اور نقل کرنا تھا اور ان کی شہرت امت میں بطور محدث تو موجود ہے لیکن بطور فقیہ نہیں ہے۔ اس گروہ کے ائمہ میں امام ابن شہاب الزہری، سفیان ثوری اور عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور جماعت ائمہ جرح و تعدیل کے نام سے وجود میں آئی جنہوں نے تحقیق حدیث میں اہم خدمات سر انجام دیں۔ اس طبقے کی امامت یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ تک پہنچی اور ان کے بعد ان کے تلامذہ میں یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی رحمہ اللہ نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔

اہل الاثر کی یہ جماعت نہ صرف علم میں امام تھی بلکہ تقویٰ اور ورع میں بھی امام تھے۔ ہمارا مقصود اس کتبہ فکر کی زندگی کے اس گوشے کو اجاگر کرنا ہے کہ جسے لوگ بھلا چکے ہیں۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کی ”سیر أعلام النبلاء“ کا تحقیق حدیث کی جہت سے مطالعہ کرنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن محض دو چار افراد ہی نے یہ کوشش کی ہے کہ اہل الاثر کے ائمہ کے اُن اقوال کو جمع کیا جائے کہ جن سے باطنی اصلاح اور روحانی زندگی کے احوال و کیفیات پر روشنی پڑتی ہو۔

اکثر اہل حدیث طلباء کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جرح و تعدیل کے ائمہ کے اقوال نقل کر کے دیگر مسالک کے علماء کو بری طرح رگید رہے ہوتے ہیں۔ سلف بھی ایک دوسرے پر نقد کرتے تھے لیکن ان کے نقد کرنے کا جذبہ اور اسلوب وہ نہیں تھا جو آج ہمارے بعض

حلقوں میں بد قسمتی سے رائج ہو چکا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ میں ائمہ جرح و تعدیل اور اسلاف کی نقد پڑھوں تو اس نقد سے بھی مجھے روحانیت حاصل ہو اور اصلاح کے پہلو ملیں۔ اور اگر میں ان کی نقد و جرح میں ہفتوں بھی غور کروں تو شاید اس اعتبار سے کم پڑ جائیں کہ وہ اپنی روحانی و باطنی کیفیات کی کن وسعتوں اور ایمانی احوال کی کیسی گہرائیوں کے ساتھ بات کرتے تھے۔

اپنے اسلاف کی اپنے مخالفین پر نقد پڑھتے ہوئے انداز ہوتا ہے کہ وہ ایک نقاد کا فرض سر انجام دیتے ہوئے بھی احسان کی کیفیت سے خالی نہ ہوتے تھے۔ جیسے ان کی نماز اس کیفیت کے ساتھ ہوتی تھی کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں، ویسے ہی ان کی نقد کی بھی یہی حالت ہوتی تھی کہ جیسے اپنے رب کے دربار میں کھڑے ہو کر اپنے مخالف کا رد کر رہے ہوں۔ ان کی نقد ایسی ہے کہ اس سے اپنے فریق مخالف کی خیر خواہی کا جذبہ اہل اہل کر سامنے آتا ہے۔ ان کی مثال اس مجاہد کی سی ہے جو اپنے دفاع میں حملہ آور پر ایک ہاتھ سے تلوار اٹھائے تو دوسرے سے اس کے حق میں دعا کرے۔ ان کے ہاں اپنے مخالفین کا شدید رد بھی ان کے لیے ہدایت کی خواہش پر کبھی غالب نہیں آتا تھا۔ وہ اس سوچ کے ساتھ کسی پر جرح کرتے تھے کہ اللہ کو اپنی مخلوق کے جہنم میں جانے سے زیادہ جنت میں جانا محبوب ہے۔ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کے لیے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب کسی سے مکالمہ ہو تو بحث کے بعد تنہائی میں اپنی ممکنہ زیادتی پر استغفار کریں۔

آج کل کی اکثر و بیشتر نقد کیا ہے؟ نری ظلمت ہی ظلمت ہے۔ آج بد قسمتی سے محققین کی ایسی جماعت وجود میں آ چکی ہے، جو اپنے باطن کی اصلاح نہ کر پائے لیکن دوسروں کے ظاہر کی اصلاح پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ دین کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر مناظرے کریں گے لیکن بڑی باتوں مثلاً انصاف، رحم، نرمی، شفقت، الفت، محبت، مودت، مواخات، تواضع، انکسار، صدق اور اخلاص وغیرہ کو چھوڑ دیں گے۔ اب تو تنقید یا تو اپنے غصے کی تسکین کے لیے ہے یا تکبر کے حصول کے لیے ہے۔ دین کے نام پر یہ

نقد خدا کے قریب کیا کرے گی، یہ تو خدا سے اور دور کر دے گی۔
 حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کی یہود پر جو نقد تھی وہ ان کی اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے
 ہے ورنہ تو وہ قانون اور ظاہر شریعت پر خوب عمل کرنے والے تھے۔ اللہ کے رسول
 ﷺ نے اپنی امت کو اس بات سے خبردار کیا ہے کہ جو اخلاقی گراوٹ اور عملی انحطاط
 یہود میں پیدا ہوا، وہ اس امت میں بھی پیدا ہو کر رہے گا۔ روایت کے الفاظ ہیں:
 «لَيَأْتِيَنَّ عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذُو النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حَتَّى
 إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتَى أُمَّهُ عِلَاقِيَّةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ»¹
 ”میری امت پر ہر وہ حال آئے گا جو یہود پر آیا جیسا کہ ایک جوتا دوسرے جوتے
 کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہود میں سے کسی نے اپنی ماں سے بد
 کاری کی تو میری امت میں بھی ایسا بد بخت پیدا ہو گا جو یہ کام کرے گا۔“

توحید کے بیان میں غلو

معتزلہ نے توحید کے بیان میں غلو کیا اور اس غلو کے نتیجے میں توحید اسما و صفات کا جو
 حشر کیا وہ اہل علم کے سامنے ہے۔ انہوں نے اللہ عز و جل کی جمیع صفات کا انکار کر دیا۔
 معتزلہ کی فکر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے پانچ اصولوں میں ان کے نزدیک
 سب سے اہم اصول ”توحید کا اصول“ ہے۔ جمیع اہل سنت والجماعت کے نزدیک توحید
 کے مسئلے میں معتزلہ کی جماعت گمراہی کے راستے پر تھی۔

پس صراطِ مستقیم سے منحرف جماعتیں جن خوبصورت نعروں کے ساتھ منحرف
 ہوتی چلی آئی ہیں، ان میں توحید، عدل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نعرے بھی
 شامل ہیں۔ موجودہ زمانے میں بھی جماعت المسلمین یا عثمانی گروپ کے نام سے کچھ
 لوگوں نے توحید کے بیان میں غلو سے کام لیا۔ غلو کرنے والوں نے امام ابو حنیفہ، امام
 بخاری اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کو بھی مشرک قرار دے دیا، معاذ اللہ۔ پروردگار ہمیں وہ
 توحید ماننے کی توفیق عطا فرمائیں جو کتاب و سنت سے ثابت شدہ ہے کہ جس میں ہم نص

¹ سنن الترمذی، أبواب الإیمان، مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هَذِهِ الْأُمَّةِ، 323/4

کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہوں، نہ کہ نص سے سمجھے جانے والے اپنے غلط مفہوم کے سامنے لوگوں کو سجدے میں گرجانے کا حکم دیں۔

اہل سنت کی عقیدے کی معروف کتاب ”عقیدہ طحاویہ“ میں اہل سنت کا یہ عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ موزوں پر مسح کرنے کے قائل ہیں حالانکہ یہ عملی مسئلہ ہے اور اس کا عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔¹ پس مسح کرنے کے جزوی مسئلہ ہونے کے باوجود وقت کے گمراہ فرقوں سے اہل سنت کو ممتاز قرار دینے کے لیے اسے اہل سنت میں شامل ہونے کا معیار قرار دیا گیا۔ پس یہی معاملہ عذاب قبر کے مسئلہ کا بھی ہے کہ یہ مسئلہ اہل سنت اور ان کے غیر کے مابین ایک امتیازی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے پر ایمان رکھنے اور نہ رکھنے سے یہ معلوم ہو گا کہ کوئی اہل سنت میں داخل ہے یا نہیں۔ آج کے دور میں اہل سنت کے عقیدے کی اگر کوئی جدید کتاب مرتب ہوگی تو اس میں آج کے تناظر میں ان عملی مسائل کو بھی بطور عقیدہ بیان کیا جائے گا کہ جن پر اہل سنت کے علماء کا اتفاق ہو۔

تقویٰ کی نفسیات میں بگاڑ

معاصر دعوتی، اصلاحی، انقلابی تحریکوں اور مدارس اسلامیہ نے مذہبی اور فلاحی میدانوں میں جو کام سرانجام دیے ہیں، وہ ایک بہت بڑی دینی خدمت ہے۔ ہمیں اسلامی تحریکوں اور مدارس کی ان خدمات کا معترف رہنا چاہیے لیکن چونکہ نبی ﷺ کے بعد کامل ذات کوئی نہیں لہذا اسلامی تحریکوں اور مدارس نے جہاں بہت سے فکری اور عملی خلا پر کرنے کی کوشش کی، وہاں ان کے تصور دین اور اس کے مطابق ذہن سازی اور تربیت سے تشکیل پانے والے مسلم فرد میں ایک ایسی سختی اور خشکی در آئی ہے جو اصلاً دین کا حصہ نہیں ہے۔

اس کی مثال اس دوا کی سی ہے کہ جس نے اصل بیماری کا علاج تو کسی قدر کیا، سو کیا لیکن اپنے ضمنی اثرات (side effects) بھی چھوڑ گئی۔ اسلامی تحریک سے وابستہ داعیان دین اور مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کی ایک جماعت نے ہمارے معاشرے

¹ عبد الرحمن بن ناصر البراک، شرح العقیدۃ الطحاویۃ، دار التدمریۃ، 2008 م، ص 279

میں تقویٰ کی ایک ایسی نفسیات پیدا کر دی ہے کہ جس میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے مخاطب سے اُس تقویٰ کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جو کارکنان اور طلباء کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔

چلیں! یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ مجھ میں تقویٰ زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے، لیکن یہ رویہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ میں دوسروں میں وہ تقویٰ دیکھنا چاہتا ہوں، جو آئیڈیل ہے۔ بعض اوقات اسلامی تحریک کے کارکن اور مدرسہ کے فارغ التحصیل طالب علم کا دعوتی اسلوب اور اصلاحی منہج اس بات کی واضح چغلی کھاتا نظر آتا ہے کہ وہ دین کو اپنی ذات سے زیادہ معاشرے میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ اپنے سے زیادہ اپنے مخاطب کو دیندار بنانے پر مصر ہے، وہ اپنے دینی آئیڈیلز کو اپنی ذات میں پورا کرنے کی سعی کرنے کی بجائے اپنے مدعو (invitee) میں پورا کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے۔ تقویٰ کی نفسیات میں ایک بگاڑ تو یہ ہوا کہ انسان آئیڈیل تقویٰ اپنی ذات میں پیدا کرنے کی بجائے دوسروں میں دیکھنے کو مقصد زندگی بنا لے۔

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ کیا افسوس کے لیے یہ کم ہے کہ آج ایک مذہبی شخص کی دوسرے مذہبی شخص سے ملاقات ہو تو اس کی سب سے پہلی نظر اس کی شلوار پر پڑتی ہے کہ اس کا محل و مقام کیا ہے؟ ٹخنوں سے کتنی اوپر یا نیچے ہے؟ اور بعض کا تو بس نہیں چلتا ورنہ تو دوسری ملاقات میں کسی بیانیے سے آپ کی ڈاڑھی بھی ماپ کر دیکھیں کہ پہلی ملاقات کی نسبت کتنی کم ہوئی ہے؟ کیا مخاطب کی شخصیت میں کل دین ہی رہ گیا ہے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ نفسیاتی رویے ہیں اور انسانی نفسیات کے تناظر میں مذہبی طبقات کو ان رویوں پر غور کرنا چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوَازِ النَّاسِ أَفْسَدَتْهُمْ، أَوْ كَدَتْ أَنْ تُفْسِدَهُمْ»¹

”اگر تمہاری نظریں لوگوں کے عیوب کا پیچھا کرنے لگ جائیں گی تو تم انہیں

بگاڑ دو گے یا گناہ کے قریب کر دو گے۔“

¹ سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في النهي عن التجشيس، 250/7

دوسرا بگاڑ یہ ہے کہ اصلاح معاشرہ اور بندگی رب کے نام پر دینی احکامات میں حلال و حرام کے متشددانہ مذہبی تصور کی تبلیغ کی جا رہی ہے۔ ایک بچی جو کہ اپنی عمر کے ساتویں سال میں ہے، اس کی حفظ ٹیچر نے ایک دن بچیوں کو کلاس میں کہا کہ بچیوں کو سات سال کی عمر کے بعد اپنے والد کے ساتھ گھر میں اکیلا نہیں رہنا چاہیے حالانکہ اسلام میں کوئی ایسی تعلیم نہیں ہے۔ اور اگر منطقی بات کرنی ہے تو ٹیچر کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ ماں بھی سات سال کے بعد بیٹے کے ساتھ گھر میں اکیلی نہ رہے۔ اور اسی طرح بہن بھائی بھی سات سال کی عمر کے بعد گھر میں اکیلے نہ رہیں۔ ایسے ہی متشددانہ دینی تصورات کے بارے اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا كُمْ وَالْعُلُوُّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ
الْعُلُوُّ فِي الدِّينِ»¹

”اے لوگو! دین میں غلو کرنے سے بچو۔ تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے دین میں غلو کیا۔“

غلو سے مراد دینی حکم میں سختی یا اضافہ کرنا ہے اور اس سے اللہ کے رسول ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ دین میں سختی اور غلو لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب تو بن سکتا ہے، دین کی طرف مائل کرنے کا نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نماز میں امامت کروانے والے ائمہ حضرات کو لمبی نماز پڑھانے سے منع کیا تاکہ لوگ دین سے بیزار نہ ہوں۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنِّي وَاللَّهِ لَأَتَأَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ أَجْلِ فُلَانٍ، مِمَّا يُطِيلُ بِنَا فِيهَا، قَالَ: فَمَا رَأَيْتَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطُّ أَشَدَّ غَضَبًا فِي مَوْعِظَةٍ مِنْهُ يَوْمِيذٍ، ثُمَّ قَالَ: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ مِنْكُمْ مُنْقَرِبِينَ، فَأَيُّكُمْ مَا صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُوجِزْ، فَإِنَّ فِيهِمْ الْكَبِيرَ، وَالضَّعِيفَ، وَذَا الْحَاجَةِ»²

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب المناہک باب قَدْرِ، خَصَى الزُّمِّي، 1008/2

² صحيح البخاري، کتاب الأحکام، باب هَلْ يَشْعِي الْقَاضِي أَوْ يُثْبِتِي وَهُوَ غَضْبَانٌ، 66-65/9

”حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں فلاں امام کی وجہ سے فجر کی نماز جماعت سے ادا نہیں کرتا کیونکہ وہ بہت لمبی نماز پڑھتا ہے۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح شدید غصے میں آ گئے کہ میں نے اس سے پہلے آپ کو اتنا غصے میں نہیں دیکھا۔ اور آپ نے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: تم میں سے بعض وہ ہیں جو لوگوں کو دین سے متنفر کرنے والے ہیں۔ تم میں سے جس نے بھی امامت کروانی ہو تو اپنی نماز کو مختصر رکھے کیونکہ اس کے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔“

اسلامی تہذیب کے دوستوں: دینی مدارس اور اسلامی تحریکیں

اسلامی تہذیب آج جن دوستوں پر قائم ہے، وہ دینی مدارس اور اسلامی تحریکیں ہیں۔ کوئی بھی تہذیب، علم اور طاقت (power and knowledge) کے بغیر دنیا میں اپنا تشخص تو کجا، وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اور جس شخص میں علم اور قوت کی دو صفات جمع ہو جائیں، وہ اسلامی تہذیب کا نمائندہ قرار پاتا ہے اور اسے اصطلاح میں خلیفہ بھی کہتے ہیں۔ حضرت طاووت علیہ السلام کو جب بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا گیا تو بنی اسرائیل نے ان کی بادشاہت پر یہ اعتراض کیا کہ ان کے پاس مال و دولت کی کثرت نہیں ہے۔ تو اس کا جواب اللہ عز و جل کی طرف سے یوں دیا گیا:

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكُهُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرة: 247]

”اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ خدا نے تم پر طاووت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ وہ بولے کہ اسے ہم پر بادشاہی کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟ بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں اور اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں۔ پیغمبر نے کہا کہ خدا نے اس کو تم پر فضیلت دی ہے اور (بادشاہی کے لئے) منتخب فرمایا ہے۔ اللہ نے اسے علم

بھی بہت سا بخشا ہے اور جسم بھی۔ اور اللہ جسے چاہے بادشاہی بخشے۔ وہ بڑا وسعت والا اور حکمت والا ہے۔“

معاصر اسلامی تہذیب کا علمی ستون مدارس دینیہ اور عملی ستون اسلامی تحریکیں ہیں۔ اگر ہم نے اپنے علمی ستون یعنی مدارس اسلامیہ کو برقرار رکھنے میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ کیا تو اس کا نتیجہ جدیدیت (modernism) یا مابعد جدیدیت (post-modernism) کی صورت میں نکلے گا۔ اور عملی ستون یعنی اسلامی تحریکوں کا انکار کرنے کی صورت میں اسلامی معاشرے لبرل ازم (liberalism) کی تصویر پیش کرنا شروع کر دیں گے۔ ہمیں دینی مدرسے کے طالب علم اور اسلامی تحریک کے کارکن پر فخر ہونا چاہیے۔ دین اسلام کا اعتدال علم و عمل کے اتفاق میں ہے اور یہ اسی صورت پیدا ہو گا جبکہ مدارس اور اسلامی تحریک کے مابین پیدا شدہ غلط فہمیاں دور ہوں گی۔

مدارس دینیہ سے ہماری مراد روایتی مدارس ہیں، جو ٹھوس دینی علوم کے محافظ اور امین ہیں۔ اور اسلامی تحریکوں سے ہماری مراد وہ اصلاحی، تبلیغی اور انقلابی جماعتیں ہیں جو اسلامی معاشروں میں پُر امن ذرائع سے تبدیلی کے حوالے سے اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ہم نے بعض دوستوں کو دیکھا ہو گا کہ وہ مدارس اسلامیہ اور دینی تحریکوں پر نقد میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ ان کے منفی کا ذکر چھوڑتے نہیں ہیں جبکہ ان کے مثبت کا ذکر کرتے نہیں ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کوئی معصوم تو ہے نہیں، اور یہ بھی کہ مدارس دینیہ اور اسلامی تحریکوں میں بھی بعض کمیاں کوتاہیاں ہیں کہ جن کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے اور ہم خود بھی اس کی طرف بعض اوقات توجہ دلاتے رہتے ہیں اور یہ دلانا ضروری بھی ہے۔ لیکن یہ بھی تو ذہن میں رہے کہ تنقید کا معنی کھوٹے سکوں کو کھروں سے علیحدہ کرنا ہے۔ اب اگر آپ کی تنقید میں مدارس دینیہ اور اسلامی تحریکوں کی برائی ہی برائی ہو تو وہ تنقیص تو ہے تنقید نہیں ہے۔ تنقید میں کھوٹے کی نشاندہی کریں لیکن ساتھ میں کھرا بھی تو بتلائیں۔ اور یہی تو اعتدال ہے۔

مدارس دینیہ اور اسلامی تحریکوں میں اگر کمی کو تاہی ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ شر محض بھی نہیں ہیں کہ سو فی صد شر ہی شر ہیں۔ تو اگر آپ کی تنقید کا انداز ایسا ہو کہ پہلے ان کی خدمات کی تحسین کریں اور پھر کسی کمی کو تاہی کی نشاندہی کریں گے تو لوگ اسے قبول بھی کریں گے۔ وگرنہ تو آپ رد عمل کی ایک ایسی فضا پیدا کر دیں گے جو اصلاح سے زیادہ فساد کی طرف لے جائے گی۔

میں اپنے اکثر دوستوں سے کہتا ہوں کہ میں جب کسی عالم دین، مذہبی اسکالر، تبلیغی جماعت اور اسلامی تحریک کی تعریف کرتا ہوں تو اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں اس سے سو فی صد متفق ہوں۔ سو فی صد اتفاق تو میاں بیوی، والدین اور بچوں میں بھی نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ میرے نزدیک ان کا غالب کام خیر کا ہے، ورنہ تو شر کے مواقع اور امکانات کس میں نہیں ہیں؟

پس اگر کسی کانوے فی صد کام خیر کا ہو اور آپ کو اس کے دس فی صد سے اختلاف ہو، اور آپ اس سے دس فی صد اختلاف کو بنیاد بنا کر اس کے خلاف تنقید کی مہم پر نکل کھڑے ہوں اور اس کے نوے فی صد کا ذکر اور قدر نہ کریں تو آپ کی نقد آپ کے مریدوں کے علاوہ کوئی قبول نہ کرے گا۔ اور صورت حال ایسی ہی ہوگی کہ آپ فرقوں کا رد کرتے کرتے خود ایک ایسا فرقہ بن جائیں گے کہ جس کے افکار کو پسند کرنے والے صرف آپ ہی کے مرید ہوں گے۔

مدرسہ اور تحریک کے زوال کے اسباب

اگرچہ مدرسہ اور تحریک کے زوال کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن اس وقت ہمیں دو بڑے اسباب پر بات کرنی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایسی شخصیت کہ جسے اللہ عزوجل نے علم اور مقام کی دولت سے نوازا ہو، کسی مدرسہ اور تحریک کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مدرسہ اور تحریک کے بانی کی علمی اور معاشرتی حیثیت تو ایسی ہوتی ہے کہ ان کا مدرسہ اور تحریک خوب پھلتی پھولتی ہے لیکن ان کے بعد جب یہ مدرسہ اور تحریک وراثت کے طور پر ان کی اولاد اور قریبی جانشینوں میں منتقل ہوتا ہے تو وہاں سے اس کا زوال شروع ہو

جاتا ہے۔

ہمیں اس وقت یہ بحث نہیں کرنی کہ کسی دارالعلوم یا دینی جماعت کا وارث اگر اولاد کو بنا دیا جائے تو اس میں شرعی رکاوٹ کیا ہے؟ ہمارے معاشرے کا جس قسم کا ماحول ہے کہ ہر دینی جماعت اور دارالعلوم میں وراثت جاری ہوتی ہے اور اس میں سوائے ایک آدھ کے کوئی استثناء نظر نہیں آتا۔ لہذا اتنے بڑے پیمانے پر جب امت میں اس پر عمل ہو رہا ہو تو اس سے اختلاف کرنے میں کچھ ایسی ہی شرمندگی محسوس ہوتی ہے جیسے اجماع کی مخالفت میں۔

ہمیں یہ کہنا ہے کہ اس طرح عموماً مدرسوں، جماعتوں اور تحریکوں میں زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تو مدرسہ، جماعت اور تحریک ایسی اولاد یا جانشینوں کو وراثت میں ملی ہے کہ جن سے زیادہ قابلیت اور صلاحیت والے افراد مدرسہ، جماعت اور تحریک میں موجود ہوں تو یہ اولاد یا جانشین ان قابل افراد سے ایک خوف کی فضا میں رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس خوف کی فضا سے ایسے رویے جنم لیتے ہیں جو اس مدرسہ، جماعت اور تحریک میں کسی باصلاحیت آدمی کو یا تو رہنے نہیں دیتے یا پھر آگے نہیں آنے دیتے۔ اور اس طرح وہ مدرسہ، جماعت اور تحریک متوسط درجہ کے کام کرتی رہ جاتی ہے۔ اس کی اٹھان اور نشوونما رک جاتی ہے۔ اب اس کا کمال یہی ہوتا ہے کہ جتنی نشوونما ہو چکی ہے، اسے برقرار رکھ لے یا چپوٹی کی رفتار سے اس میں اضافہ کر لے۔

اس کا حل کیا ہے؟ اس کا ایک حل تو فطری ہے جو کہ نکل رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب کوئی قابل استاذ یا باصلاحیت کارکن کے لیے مدرسہ یا جماعت میں نشوونما اور اٹھان کے راستے بند کر دیے جاتے ہیں تو وہ ایک علیحدہ مدرسہ یا جماعت کی بنیاد رکھ دیتے ہیں جو بعض اوقات پہلے مدرسہ یا جماعت کے مقابلے میں زیادہ بھی دین اور خیر کا کام کر جاتے ہیں۔ اور اس کا دوسرا حل یہ ہے کہ مدرسہ، جماعت اور تحریک کے جانشینوں کو ڈر کی نفسیات سے نکلنا چاہیے اور باصلاحیت لوگوں کو آگے آنے کے مواقع دینے چاہئیں۔ اس سے مدرسہ، جماعت اور تحریک کی بجائے دین کو فائدہ ہوگا۔

اور دوسرا یہ بھی اہم ہے کہ بعض اوقات یہی جانشین کام کے افراد کو کنارے لگا کر دین کے کام میں رکاوٹ بن رہے ہوں گے اور اپنے آپ کو معلوم نہیں کیسے کیسے بہانوں سے مطمئن کر رہے ہوتے ہیں۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ عز و جل کے ہاں کوئی عذر نہیں ہے جو اپنی دینی وراثت کو قائم رکھنے کے لیے ایسے افراد کو کھڈے لائن لگا دیں کہ جن سے انہیں ڈر ہو کہ وہ اپنی صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر مدرسہ، جماعت اور تحریک میں دین کا کام کر کے ان کا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے ناخلف جانشین دراصل دین کے کام میں رکاوٹ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَذْنَىٰ وَنَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا﴾ [الأعراف: 169]

”پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الہی کے وارث ہو کر اسی دنیا کے فائدے سمیٹتے ہیں۔ اور کہتے یہ تھے کہ توقع ہے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔“

اور دنیا صرف مال کا نام نہیں ہے بلکہ دنیاوی مقام اور مرتبہ بھی دنیا میں شامل ہے۔ اور دینداروں کی دنیا تو ہے ہی مقام اور مرتبے کا حصول کہ جسے حب جاہ بھی کہتے ہیں۔ مدرسہ، جماعت اور تحریک کے زوال کا دوسرا بڑا سبب دین کی بجائے مدرسہ، جماعت اور تحریک کا کام کرنا ہے۔ جب کسی مدرسہ، جماعت اور تحریک کا دینی کام صرف وہی کام کہلائے جو ان کا مدرسہ، جماعت یا تحریک کر رہی ہو تو یہ بھی ان کے زوال کا ایک بڑا سبب بن جاتا ہے۔ آپ ویسے دس مقامات پر قرآن مجید کا درس دے دیں لیکن جب تک آپ نے جماعت کے زیر انتظام حلقہ میں درس نہیں دیا، اس وقت تک آپ نے جماعت کے نزدیک دین کا کام نہیں کیا۔ یا آپ صبح شام صدقہ کرتے ہوں لیکن جب تک آپ نے مدرسہ کو چندہ نہ دیا، اس وقت تک آپ نے صدقہ نہ کیا۔ یا آپ نے بیسیوں لوگوں کو نماز پڑھا دی لیکن جب تک کسی ایک شخص کو تحریک کا رکن نہ بنایا ہو اس وقت تک آپ نے تبلیغ کا کام نہیں کیا۔ یہ جو دین کے کام کا تصور ہے تو یہ بگڑا ہوا اور مسخ شدہ تصور ہے۔ اور یہی تصور مدارس اور جماعتوں کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔

جنت میں داخل کرنے والے اعمال

عام طور کسی مسلک، گروہ اور جماعت سے وابستگی کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ہم اس نسبت کو جنت میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک عامی ہیں اور مسالک کی باہمی رد و قدح سے پریشان ہیں اور یہ سمجھ نہیں آرہی کہ ان میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط، تو ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ آپ ممکن حد تک تحقیق کریں۔ اور اگر امکان بھر تحقیق کے بعد بھی الجھن باقی رہے تو استخارہ کر کے اس رائے پر عمل کر لیں کہ جس پر دل و دماغ کو اطمینان حاصل ہو۔ اور زیادہ کوشش یہ کریں کہ دین کی ان ہدایات پر عمل ہو سکے کہ جو سب کے نزدیک متفق علیہ بھی ہیں اور جنت میں داخل ہونے کا یقینی راستہ بھی ہیں۔

ہمارے دین میں کچھ اعمال ایسے ہیں کہ جو ہر مسلک، گروہ اور جماعت کے نزدیک جنت میں داخل کرنے والے اعمال ہیں۔ اور یہ اعمال ایسے ہیں کہ جن کے بارے نبی کریم ﷺ نے یہ گواہی دی ہے کہ ان کے کرنے والے جنت میں داخل ہوں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ان نیکیوں کو اپنا معمول بنالیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی گواہی سے بڑھ کر کس کی گواہی ہوگی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«اجْتَمَعَ حَدِيثُهُ، وَأَبُو مَسْعُودٍ، فَقَالَ حَدِيثُهُ: رَجُلٌ لَقِيَ رَبَّهُ، فَقَالَ: مَا عَمِلْتُ؟ قَالَ: مَا عَمِلْتُ مِنَ الْخَيْرِ إِلَّا أَنِّي كُنْتُ رَجُلًا ذَا مَالٍ، فَكُنْتُ أَطَالِبُ بِهِ النَّاسَ فَكُنْتُ أَقْبَلُ الْمَيْسُورَ، وَأَتَجَاوَزُ عَنِ الْمَعْسُورِ، فَقَالَ: تَجَاوَزُوا عَنْ عَبْدِي، قَالَ أَبُو مَسْعُودٍ: هَكَذَا سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ»¹

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پچھلی قوموں میں ایک شخص کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتوں نے اس سے کہا کہ کوئی نیکی کا کام بھی کیا ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے۔ فرشتے پھر کہیں گے کہ یاد کرو۔ تو وہ جواب میں کہے گا کہ ایک نیکی یاد ہے کہ میں لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب قرض

¹ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب فضل إنظار المغیر، 1195/3

واپس لیے کا وقت ہوتا تھا تو اپنے غلاموں کو یہ حکم دیتا تھا کہ دیکھنا جو تنگ دست ہو، اس کو مزید مہلت دے دینا اور جو قرض ادا نہ کر سکتا ہو، اس کو معاف کر دینا۔ اللہ نے اس عمل پر اس کو جنت میں داخل کر دیا۔“

جنہیں اللہ عزوجل نے مال دیا ہے تو وہ اس ذریعے سے اپنی جنت کے راستے کو آسان بنا سکتے ہیں۔ اور جنہیں اللہ عزوجل نے خدمت خلق کا مادہ دیا ہے تو ان کے لیے بھی جنت کے راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي عَلَى طَرِيقٍ وَجَدَ غُصْنًا شَوْكًا، فَقَالَ: لَا زُفْعَنَ هَذَا لَعَلَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَغْفِرُ لِي بِهِ، فَرَفَعَهُ، فَغَفَرَ اللَّهُ لَهُ بِهِ، وَأَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ»¹

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص نے مسلمانوں کے راستے میں ایک کانٹے دار شاخ کو دیکھا تو اس نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں اسے مسلمانوں کے راستے سے صاف کر دوں گا تاکہ کسی مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو اللہ نے اس عمل پر اسے معاف کر دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔“

اور جن میں عبادت کا ذوق اچھا ہو تو وہ اپنی جنت کسی طرح بنا سکتے ہیں۔ اس بارے

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ الْجَنَّةِ إِلَّا أَنْ يَمُوتَ»²

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کو اپنا معمول بنالیا تو اس کے جنت میں داخل ہونے میں صرف ایک ہی رکاوٹ ہے، اور وہ اس کی موت ہے۔“

اور جن میں توبہ استغفار کی طرف رغبت زیادہ ہو تو ان کے لیے جنت کا راستہ کچھ یوں

تبجیز کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَيِّدُ الْإِسْتِغْفَارِ أَنْ تَقُولَ: اللَّهُمَّ

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 198/16

² الألبانی، محمد ناصر الدین، صحیح الجامع الصغیر و زیاداته، المکتب الاسلامی، مصر، 1103/2

أَنْتَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ. قَالَ: «وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوقِنًا بِهَا، فَمَاتَ مِنْ يَوْمِهِ قَبْلَ أَنْ يُمَسِّيَ، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ وَهُوَ مُوقِنٌ بِهَا، فَمَاتَ قَبْلَ أَنْ يُصْبِحَ، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ»¹

”آپ ﷺ سے مروی ہے کہ سید الاستغفار یہ ہے کہ تم یہ کہو: اے اللہ! آپ ہی میرے رب ہیں اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ ہی نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں آپ ہی کا غلام ہوں۔ اور میں اپنی استطاعت کے مطابق اُس عہد پر قائم ہو کہ جو میں نے آپ سے کیا ہے۔ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں، اُس گناہ اور برائی کے شر سے کہ جو میں نے پیدا کی ہے۔ میں اپنے وجود پر آپ کی نعمتوں کا احسان مند ہوں اور ساتھ ہی آپ کا گناہ گار ہونے پر شرمندہ بھی ہوں۔ اے مالک! مجھے معاف فرمادے۔ بے شک آپ کے علاوہ میرے گناہوں کو کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت یقین کے ساتھ ایک مرتبہ سید الاستغفار پڑھ لے اور اس دن میں اس کی وفات ہو جائے تو وہ جنتی ہے۔ اور اگر شام میں یقین کے ساتھ پڑھ لے اور اس رات میں اس کی وفات ہو جائے تو وہ جنتی ہے۔“

اور جن کے اخلاق اور رویے اچھے ہوں تو ان کے لیے اسی ذریعے سے جنت کے حصول کا طریقہ کچھ یوں بتلایا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«قَالَ رَسُولُ اللَّهِ -صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ-: أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رِجْلِ الْجَنَّةِ، لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ مُجْحَقًا، وَبَيْتٍ فِي وَسْطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكُذِبَ وَإِنْ كَانَ مَازِحًا، وَبَيْتٍ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ»²

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جنت کے کنارے گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو جھگڑا چھوڑ دے، چاہے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو۔ اور اس کو

¹ صحیح البخاری، کتاب اللِّغَوَاتِ، بَابُ أَفْضَلِ الْاِسْتِغْفَارِ، 67/8

² سنن أبي داود، کتاب الأدب، باب في حسن الخلق، 179-178/7

جنت کے وسط میں گھر کی بشارت دیتا ہوں جو جھوٹ کو چھوڑ دے، چاہے مزاح میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس شخص کو جنت کے اعلیٰ درجوں میں گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو اپنے اخلاق کو بلند کر لے۔“

اور جنہیں اپنے نفس پر ضبط اور کنٹرول حاصل ہو تو ان کے لیے جنت کے حصول کا رستہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ»¹
 ”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو مجھے اپنی شرم گاہ اور زبان، دو چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری دیتا ہے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔“

اور جن میں مال اور جان دونوں سے عبادت کرنے کا شوق ہو تو ان کے لیے جنت کا رستہ یوں بیان ہوا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمُبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ»²
 ”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک تمام گناہوں کا کفارہ ہے اور مقبول حج کی جزا تو جنت ہے۔“

اور جن میں انسانیت کا جذبہ زیادہ ہو تو ان کے لیے جنت کا رستہ یوں تجویز کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وَأَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا» وَأَشَارَ بِالسَّبَابَةِ وَالْوُسْطَى، وَفَرَجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا³
 ”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایک ساتھ ہوں گے۔ اور آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اس طرح اشارہ کر کے دکھایا کہ ان دونوں کے مابین کچھ فاصلہ تھا۔“

¹ صحیح البخاری، کتابُ الرِّقَاقِ، بَابُ حِفْظِ اللِّسَانِ، 100/8

² موطأ الإمام مالك، کتابُ الْحَجِّ، بَابُ جَامِعِ مَا جَاءَ فِي الْغَفَرَةِ، 346

³ صحیح البخاری، کتابُ الطَّلَاقِ، بَابُ اللِّغَانِ، 53/7

اور جنہیں ہمیشہ ذکر کرتے رہنے کی عادت ہو تو ان کے لیے جنت کا رستہ یوں کھلتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ»¹

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوگا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔“

اور جنہیں آزمائش کے بدلے صبر نصیب ہو جائے تو ان کے لیے جنت کا رستہ یوں آسان کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ: «إِذَا أَخَذْتُ كَرِيمَتِي عَبْدِي فِي الدُّنْيَا لَمْ يَكُنْ لَهُ جَزَاءٌ عِنْدِي إِلَّا الْجَنَّةُ»²

”اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں اپنے بندے کی دو آنکھیں لے لوں تو اس پر صبر کا بدلہ صرف جنت ہے۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى: مَا لِعَبْدِي الْمُؤْمِنِ عِنْدِي جَزَاءٌ، إِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ اخْتَسَبَهُ، إِلَّا الْجَنَّةُ»³

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے بندے کے جگر گوشے کی روح قبض کر لوں تو اس پر صبر کا بدلہ میرے پاس صرف جنت ہے۔“

جنت میں جانے کے بعد درجات کی بلندی کا ایک بڑا سبب انسان کی اولاد ہوتی ہے۔ اگر اولاد نیک ہو اور والدین کے لیے ان کی وفات کے بعد دعا کرے تو والدین کے درجات مرنے کے بعد بھی بلند ہوتے رہتے ہیں۔ ایک روایت

¹ سنن أبي داود، کتاب الجنائز، باب في التلقين، 190/3

² سنن الترمذي، أبواب الزهد، باب ما جاء في ذهاب البصر، 602/4

³ صحيح البخاري، كتاب الوفاي، باب العلي الذي يتنقى به وجه الله، 90/8

کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَنُزِعَ دَرَجَتُهُ فِي الْجَنَّةِ فَيَقُولُ: أَنَّى هَذَا؟ فَيَقَالُ:
بِاسْتِغْفَارٍ وَلَدِكَ لَكَ»¹

”جنت میں ایک شخص کا درجہ اچانک بلند کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ یہ پوچھتا ہے کہ
ایسا کیوں ہوا ہے؟ تو اسے جواب دیا جاتا ہے کہ تمہاری اولاد نے تمہارے لیے
مغفرت کی دعا کی ہے۔“

پس والدین جہاں اولاد کی دنیاوی تعلیم کو اتنی اہمیت دیتے ہیں، وہاں اگر اس کا بھی
اہتمام کر لیں کہ اپنی اولاد کو اپنے لیے دعا کرنے کی عادت ڈلوادیں مثلاً یہ کہ انہیں نماز
کے ساتھ ہی کچھ ایسی دعائیں سکھادیں کہ جنہیں وہ ہر نماز میں تشہد کی حالت میں پڑھ
سکیں تو یہ ان کے لیے ایک صدقہ جاریہ بن جائے گا۔ اسی طرح اولاد کا والدین کی طرف
سے نیکی کرنا مثلاً حج، عمرہ، صدقہ، خیرات، قربانی، تلاوت وغیرہ بھی ان کی مغفرت اور
ان کے درجات میں بلندی کا سبب بنتا ہے۔

تو اللہ عز و جل نے جہاں اولاد کو والدین کے درجات کی بلندی کا سبب بنایا ہے، وہاں
والدین کو بھی اولاد کے درجات کی بلندی کا سبب بنایا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ طور کی
آیت 21 میں یہ مضمون موجود ہے کہ اگر جنت میں والدین کے درجات بلند ہوں گے
اور ان کی اولاد ان کے جیسی نیک نہ ہوئی لہذا جنت کے نچلے درجات میں ہوئی تو اللہ
عز و جل والدین کی خواہش پر ان کی اولاد کو ان کے ساتھ جنت کے بلند درجات میں ملا
دیں گے اور یہ بھی جنت کی نعمتوں میں سے نعمت ہی کی ایک قسم ہوگی۔ اولاد کے علاوہ،
میاں بیوی کے بارے بھی یہ قاعدہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک جنت کے بلند
درجات میں پہنچ جائے گا اور وہ دوسرے سے ملنے کی خواہش کرے گا تو دوسرے کو نچلے
درجات میں ہونے کے باوجود اس کے درجہ میں پہنچا دیا جائے گا جیسا کہ سورۃ الرعد کی
آیت 23 کا مفہوم ہے۔



¹ سنن ابن ماجہ، کتابُ الْأَدَبِ، بابُ بِرِّ الْوَالِدَيْنِ، 1207/2

باب ہفتم اصلاح میڈیا

اس باب میں اصلاح میڈیا کے ضمن میں سوشل میڈیا، فیس بک اور
مووی انڈسٹری کی اصلاح پر گفتگو کی گئی ہے۔

سوشل میڈیا اور نیٹ فورمز کے جہادی

سوشل میڈیا پر کچھ ایسے نوجوان بھی دیکھنے سننے کو ملتے ہیں جو معاصر جہادی تحریکوں مثلاً داعش، حماس، طالبان پاکستان وغیرہ کی حمایت میں اس قدر لکھتے اور بولتے ہیں کہ اپنے جہادی بیانات کے ذریعے میدان جنگ کے مجاہدین کو بھی مات دے دیں۔ لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ فیس بک، ٹویٹر اور نیٹ فورمز کے ان جہادیوں کی اکثریت کی حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ حضرات عوام الناس کو جہاد نہ کرنے کا الزام اور مذہبی، اصلاحی، تبلیغی جماعتوں کو صرف دعاؤں پر اکتفا کرنے پر لعن طعن کر رہے ہوں گے یا پھر مسلمان علما پر بزدل اور مرجہ ہونے کے الزامات اور مسلمان حکمرانوں کو کافر قرار دینے کے دلائل دے رہے ہوں گے اور دوسری طرف ٹورنٹ (torrent) کے ذریعے ہالی وڈ (Hollywood) کی دو چار فلمیں ڈاؤن لوڈ پر لگائی ہوں گے۔ جیسے ہی ادھر سے مولانا فیس بک کے جہاد سے فارغ ہوئے تو دوسری طرف موویاں دیکھنا شروع کر دیں گے۔

ایک ایسے ہی مجاہد نوجوان کو جب رمضان میں روزے رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی تو اس کا جواب تھا کہ فلسطین میں یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے اور آپ لوگ ابھی نماز روزے سے ہی نہیں نکل رہے۔ اسی قسم کے ایک جہادی نوجوان تو فیس بک پر پوسٹیں (posts) لگاتے ہوئے یہ تاثر دے رہے تھے کہ شاید میدان جنگ میں بیٹھے ہوں۔ پہلے تو حیرانگی ہوئی کہ میدان جنگ میں فیس بک استعمال کر رہے ہیں؟ پھر کچھ عرصہ بعد ایک پوسٹ میں ایک غلطی کر بیٹھے تو ان کا معمہ کھلا کہ حضرت نے فیس بک کے میدان میں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک اور جہادی کے بارے میں معلوم ہوا جو کہ حکمرانوں کو کافر نہ کہنے پر دوسروں کو کوستے رہتے تھے اور عموماً اس جہاد کے بعد انڈین گانے اور غزلیں سننے کا شوق فرمایا کرتے تھے۔

یہ جہاد عموماً ایسی آئی ڈیز کے ساتھ ہوتا ہے جو مبہم ہوتی ہیں لہذا ایسے مجاہدین کے دعووں، تقویٰ، دینداری اور اخلاقی حالت وغیرہ معلوم کرنے کے لیے قارئین کے پاس

کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ حضرات اپنی شناخت چھپانے کے حق میں اپنی سیکورٹی کے گھسے پٹے دلائل پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کی شناخت چھپانے کی اصل وجہ سیکورٹی نہیں، ان کا معاشرے میں وہ دینی کیریئر ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اخلاقی طور اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی شناخت کے ساتھ کوئی بات کر سکیں۔

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو فرض نماز نہیں پڑھتے لیکن پوسٹوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صبح و شام دو مرتبہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہو رہے ہوں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟ جن مجہول (anonymous) آئی ڈیز کے ساتھ یہ لوگ گفتگو کرتے ہیں، اس جہالت کے ساتھ دین کی کوئی روایت قبول نہیں ہوتی۔¹ لہذا ایسے مجہول العین (anonymous) سوشل میڈیا کے جہادیوں سے دین لینا یا دین کی بات نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی مجہول راوی کی روایت پر مہر تصدیق ثبت کرنا۔ اب کیا مجاہدیل (anonymous) کی جماعت ہمیں یہ بتائے گی کہ ہمارا دین کیا ہے؟

سلف صالحین کے جہاد میں ہمیں وہ سختی، درشتگی اور بے رحمی نظر نہیں آتی جو سوشل میڈیا کے ان جہادیوں میں نظر آتی ہے۔ اور اس کی وجہ ان کی بے عملی اور بد عملی دونوں ہے جس نے ان کے دلوں کو دوسروں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت کر دیا ہے۔ اللہ عز و جل ہماری امت کو سوشل میڈیا کے ایسے جہادیوں سے محفوظ فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

خود کش حملوں میں کلمہ گو مسلمانوں کو مارنا تو جہاد نہیں، فساد ہے لیکن اگر کہیں کافروں کے ساتھ بھی جہاد ہو رہا ہو تو یہ سوشل میڈیا کے مجاہدین میدان جنگ میں جا کر مسلمانوں کی طرف سے نہ لڑتے کیونکہ یہ ایک ایسا کردار (character) ہے کہ جو

¹ ایک عمل ہے اپنی شناخت کو چھپانا ہے اور اس سے شناخت چھپانے والا مجہول بن جاتا ہے۔ اور ایک ہے اپنا غلط تعارف کروانا یعنی کسی۔ کا نام زید حامد ہے اور وہ اپنا نام علی عاصم بتلائے تو یہ جھوٹ ہے اور یہ عمل بھی کسی۔ شخص کی ذات کو مجروح کر دیتا ہے۔ اور ایک ہے کہ انسان اپنی شناخت چھپانے کی کوشش نہ کرے تو یہ معروف ہے، چاہے اسے کچھ لوگ نہ بھی جانتے ہوں۔ مجہول اسے کہتے تھے کہ جس کے حالات کے بارے جانکاری کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد بھی اس کے حالات واضح نہ ہوں۔

ایسے نفاق پر پلٹتا ہے کہ جسے شیطان خوبصورت ایمان کی صورت میں اُن پر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ یہ کردار اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں بھی موجود تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَكِنَّ اللَّهَ انبَعَثَهُمْ فَنَبِّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿46﴾ لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ﴾ [التوبة: 47]

”اور اگر ان کا اللہ کے راستے میں نکلنے کا ارادہ ہوتا تو وہ ضرور اس کی اچھی طرح تیاری کرتے لیکن اللہ نے ان کے جہاد میں نکلنے کو ناپسند جانا اور انہیں سستی میں ڈال دیا۔ اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھ رہو۔ اور اے مسلمانو! اگر وہ تمہارے ساتھ جہاد میں نکل بھی جاتے تو سوائے تمہارے مابین خرابی پیدا کرنے کے اور کچھ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے پھرتے تاکہ تمہیں فتنے میں مبتلا کر سکتے۔ اور اے مسلمانو! تم میں اب بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو ایسے لوگوں کی باتیں غور سے سنتے ہیں۔ اور دیکھو! اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں سے خوب واقف ہے۔“

فیس بک کانشہ

ماہرین نفسیات نے نشہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: کیمیائی اور غیر کیمیائی۔¹ پہلی قسم کو مادی اور دوسری کو کرداری نشہ² یا پہلی کو ادویاتی اور دوسری کو غیر ادویاتی نشہ³ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ کیمیائی نشہ میں ہیروئن، چرس، افیون، الکحل، شراب، نشہ آور ادویات، نشہ آور انجیکشن، شیشہ، گٹکا وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے جبکہ غیر کیمیائی نشہ میں انٹرنیٹ، گیمرز، موویز اور فیس بک کانشہ، کھانے پینے کا نشہ، سیکس اور کام کا نشہ، محبت اور عشق کا نشہ، اور جوئے کا نشہ وغیرہ شامل ہیں۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ حد سے زیادہ انٹرنیٹ، گیمرز، کام، کھیل، محبت، جو کھیلنے

¹ chemical and non-chemical addiction

² substance and behavioral addiction

³ drug non-drug addiction

کی صورت میں انسانی دماغ سے ایک مادہ خارج ہو سکتا ہے جسے وہیٹائینڈروفائن (beta-endorphins) کا نام دیتے ہیں۔ یہ مادہ انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ کچھ خاص ہے۔ اور اپنے کچھ خاص ہونے کا بھی احساس بڑھتے بڑھتے ایک جنون بن جاتا ہے اور انسان اپنے دماغ ہی کے پیدا کردہ مواد کے نشہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج ہمارے علم میں ہے کہ اپنے اسمارٹ فون سے مہم جوئی کرتے ہوئے اچھی سیلفی (selfie) لینے کے نشہ کے سبب ہر ماہ کتنے لوگ موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں؟

ہمارے بچے موبائل اور انٹرنیٹ پر جس طرح گیمز کے نشہ میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کا انداز صرف اس تجربے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب والدین انہیں اس حالت میں کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں تو ان کا کیار د عمل ہوتا ہے۔ اگر آپ باقاعدگی سے فیس بک پر بیٹھتے ہیں تو اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کریں کہ آپ ”فیس بک کے نشہ“ میں تو مبتلا نہیں ہیں۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب آپ فیس بک پر ہوتے ہیں اور کوئی آپ کو اپنی طرف متوجہ کرے تو آپ کا کیار د عمل ہوتا ہے؟

تو کیا فیس بک استعمال کرنا چھوڑ دیں؟ کچھ دوستوں کی یہی رائے ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سوشل میڈیا نے ہماری حقیقی سوشل لائف کو ختم کر دیا ہے کہ اب ہمارے گھروں میں خاندان کے افراد کے مابین باہمی تعلق ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کے فیس بک پر پانچ ہزار دوست ہیں، حقیقی زندگی میں پانچ بھی نہیں ہیں۔ شام کو گھر کا منظر یہ ہے کہ والد صاحب لیپ ٹاپ پر مصروف ہیں، والدہ اسمارٹ فون میں کھوئی ہیں اور بچے ٹیبلٹ، آئی فون اور ایل سی ڈی پر بیٹھے ہیں۔ اور تینوں ایک آدھ گھنٹے کے بعد ایک دوسرے کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں۔

پہلے کسی کے ہاں بطور مہمان جاتے تھے تو یہ معلوم کرتے تھے کہ بچوں کا کیا حال ہے؟ اور آج یہ معلوم کرتے ہیں کہ وائے فائے کا پاسورڈ کیا ہے؟ اور اگر کبھی نیٹ کی تار خراب ہو جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے زندگی ختم ہو گئی ہو۔ اور کسی کا فیس بک اکاؤنٹ چر الیا جائے، تو اس کی تو جیسے موت (virtual death) ہی ہو گئی ہو۔ جہاں

تک اس مذہبی ذہن کی بات ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ ہم سوشل میڈیا پر دین کی تبلیغ کے لیے موجود ہیں تو اس بارے میں خود بھی سوچتا ہوں کہ سوشل میڈیا پر دین کے نام پر تبلیغ کم اور مباحثہ زیادہ ہوتا ہے اور اس مباحثے کا کیا فائدہ کہ جس کی دلیلیں نماز میں سوچ رہی ہوں۔

بہر حال فیس بک کو استعمال کرنا یا نہ کرنا، اس بارے میں ہر شخص کو خود سے ہی کوئی فیصلہ کرنا ہے البتہ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو اس نشے کی لت اور اس کے مضر اثرات پر بہت حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ یہ فیصلہ کر لیں، کہ میں نے فیس بک طلوع آفتاب کے بعد اور غروب آفتاب سے پہلے استعمال کرنی ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میری رات میرے گھر والوں اور پروردگار کے لیے ہے اور دن دنیا والوں کے لیے ہے۔ شاید اسی سے ہم اپنی ذات، اپنے پروردگار، اپنی حقیقی سماجی زندگی اور ورچوئل سوشل لائف کے مابین توازن قائم کر سکتے ہیں۔

سیلفی کا نشہ

سیلفی (selfie) سے مراد وہ تصویر ہے جو کسی ڈیجیٹل کیمرہ کی مدد سے خود سے لی جائے۔ سمارٹ فونز میں سیلفی کی ایپ متعارف ہو جانے کے بعد معاشرے میں سیلفی لینے کا رجحان بیماری کی حد تک بڑھ گیا ہے۔ امریکن سائیکسٹریٹس ایسوسی ایشن (APA) کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص دن میں تین سیلفیز لیتا ہے تو یہ اس کے ذہنی خلل (mental disorder) کے لیے کافی ہے۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ سیلفی ذہنی بیماری (mental illness)، نرگسیت (narcissism)، نشہ اور خود کشی کا سبب بنتی ہے۔

مثلاً انیس سالہ برطانوی نوجوان ڈینی بوومن (Danny Bowman) کو روزانہ اپنے آئی فون پر دو سو سیلفیز لینے کی عادت تھی لیکن جیسی سیلفی اس کے ذہن میں تھی، وہ اسے چھ ماہ کے عرصے میں بھی حاصل نہ ہوئی تو اس نے خود کشی کی کوشش کی لیکن بر وقت طبی امداد سے اس کو بچا لیا گیا۔ اسی طرح ایک سترہ سالہ روسی اسٹوڈنٹ نے نو

منزل پر اخیر سیلفی (extreme selfie) لینے کے چکر میں اپنی جان گنوا دی۔ پھالیہ کے ایک تاجر نے زہریلے سانپ کے ساتھ سیلفی لینے کی خواہش میں جان گنوا دی۔ انڈیا میں سیلفی کی وجہ سے موت واقع ہونے کے دسیوں واقعات رپورٹ ہو چکے ہیں۔ فی الحال یورپ میں سیلفی ایڈکشن پر سائیکالوجی کے ڈسپلن میں کافی تحقیق ہو رہی ہے۔

ہمارے دین نے تو دین کے معاملے میں بھی غلو کو پسند نہیں کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ دین میں غلو سے بچو۔¹ پس مستحب اور نیک کے کاموں میں بھی ایک حد سے بڑھنے سے منع کیا گیا ہے اور مباح اور جائز امور میں غلو کی ممانعت تو اس سے بھی بڑھ کر ہوگی۔ کھانا کھانا مباح امور میں سے ہے لیکن اتنا کھا لینا کہ پیٹ ہی خراب کر لے تو یہ ہر گز مباح امور میں سے نہیں ہے۔

پس مباح اور جائز امور میں جو سمجھنے کی بات ہے، وہ یہ ہے کہ ایک تو ان میں غلو نہ ہو اور دوسرا یہ کہ وہ کسی حرام کا ذریعہ نہ بن رہے ہوں۔ پس ایسی جرات آمیز سیلفی لینا کہ جس سے آپ کی جان جانے کا اندیشہ ہو، بلاشبہ حرام ہو گا۔ اور سیلفی کا ایسا خمار کہ جو آپ میں نزگیت پیدا کر دے کہ آپ اپنے ہی عاشق اور دیوانے بن کر رہ جائیں، تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔ اور اگر آپ کو اس بات پر ٹینشن ہو جاتی ہے کہ آپ کی سیلفی کے لائکس کم آئے ہیں، تو آپ سیلفی کے خمار اور نشہ میں مبتلا ہیں۔

ہم بھی ایک عجیب دور میں زندگی گزار رہے ہیں کہ سوشل میڈیا پر آپ کی پوسٹوں میں سے سب سے زیادہ لائکس آپ کے فوٹو کو ملتے ہیں۔ یہاں اس کا نفسیاتی اثر زیادہ ہے کہ کیمرے کی آنکھ تمہیں دیکھ رہی ہے بنسبت اس کے کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ اسلام کا کوئی فوٹو ورژن ہی تیار کر دیا جائے! کیا یہ رویہ کسی معاشرے کے علم دوست ہونے کی عکاسی کرتا ہے؟ اور تو اور آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ کلاس میں طلبا کو ٹیچر ز براہ راست پڑھا رہے ہوں تو طلبا کی توجہ کم ہوگی اور اگر ویڈیو لگا دیں تو اسٹوڈنٹس کی سنجیدگی بڑھ جائے گی کہ یہ ڈیجیٹل تصویر کے کلچر ہی کی برکات ہیں

¹ سنن ابن ماجہ، کتابُ التَّعَايِلِ، بَابُ قَدْرِ حَضَى الرَّيِّ، 1008/2

کہ ہمارا الشعور تک تصویر کو سامنے کے انسان پر ترجیح دینے کا عادی ہو چکا ہے۔ انسان سے زیادہ اس کی تصویر سے مانوسیت رکھنا اور اسے اصل سے زیادہ توجہ دینا متوازن رویہ ہے کیا؟

فوٹو اور کامیڈی

فیس بک پر سب سے زیادہ پسندیدگیاں (likes) فوٹو کو ملتی ہیں اور سب سے زیادہ پھیلاؤ (shares) کامیڈی کو۔ اگر آپ فیس بک پر دین کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ چاہتے ہیں تو اسلام کا ایک فوٹو ورژن تیار کر لیں اور کامیڈین بننے کی پریکٹس شروع کر دیں۔ اور وہ وقت بھی جلد آنے والا ہے کہ جب لکھنے والے سب ہوں گے اور پڑھنے والا ڈھونڈنا پڑے گا۔ اور یوزر پوسٹ لکھنے کے بعد اس کا پہلا اور آخری ریڈر ہوا کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَذَكَّرَ بِهِ أَنْ تُبَسِّلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ﴾ [الأنعام: 70]

”اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور دنیوی زندگی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ البتہ یہ قرآن مجید سنا کر لوگوں کو نصیحت اور تنبیہ کرتے رہیں تاکہ کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے۔“

اب تو کتابیں پڑھنا بھی فخر کی ایک علامت بن گیا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو یہ باور کرانے میں لگا ہے کہ میں نے یہ کتاب بھی پڑھی ہے، وہ بھی پڑھی ہے، تم نے کیا پڑھا ہے؟ کہیں دوستوں کی محفل ہو تو اس کا ایک پسندیدہ موضوع ان کتابوں کی فہرست بتلانا ہوتا ہے جو آپ پچھلے کچھ عرصے میں پڑھ یاد رکھ چکے ہوں۔ اور قاری کو کتابوں کی یہ فہرست بتلانے کی بے چینی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ شاعر کو اپنا کلام سننے کی۔ اور عمل پر غور کریں تو وہ گم نہیں ہے۔ ایک دوست کہ جو کتابیں پڑھنے کے بہت شوقین ہیں، نے عمل کی نیت سے کتابیں پڑھنی شروع کیں تو یہ حالت ہو گئی کہ قرآن مجید اور حدیث

نبوی کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ لگانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔

شہرت کا نشہ

(Celebrity)

فیس بک اور واٹس ایپ پر لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہیں۔ واٹس ایپ کے گروپس پر تو غور کیا ہے کہ اگر کسی گروپ میں بیس ممبر ز ہیں تو ہر ایک کا زور پوسٹ کرنے پر ہے، نہ کہ پڑھنے پر۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہے کہ روزانہ کی پانچ پوسٹیں بھی ایک ممبر کرے تو سو پوسٹیں ہو جاتی ہیں۔ اب سو پوسٹیں پڑھنے کا وقت زیادہ ہے جبکہ پانچ پوسٹیں لکھنے کا کم۔ پس یوزر لکھنے کو پڑھنے پر اس لیے بھی ترجیح دیتا ہے کہ اس میں کم وقت صرف ہوتا ہے۔

پھر پڑھنے سے کوئی مشہور تھوڑا بنتا ہے، مشہور تو انسان اپنے اقوال زریں مرتب کرنے سے ہوتا ہے، اپنے اعلیٰ خیالات تقسیم کرنے سے ہوتا ہے۔ ہم میں ہر شخص کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی موٹی مشہور شخصیت (celebrity) بننا چاہتا ہے اور سوشل میڈیا نے اس کے مواقع پیدا کر دیے ہیں۔ کیا مشہور بننا گناہ کا کام ہے؟ کیا واہ واہ کی خواہش رکھنا حرام ہے؟ کیا تعریف کی امید کرنا ناجائز ہے؟ اس بارے صحیح رہنمائی تو امام وقت ہی فرما سکتے ہیں اگرچہ آج کل وہ خود اپنے مقتدیوں کی تلاش میں ہیں۔ اور تلاش کے اس سفر کو نہ صرف شرعی سمجھتے ہیں بلکہ دوران تلاش شرعی سفر کی تمام رخصتوں اور سہولتوں سے بھی خوب مستفید ہوتے ہیں۔

میں تو کسی کو نہیں کہتا کہ لکھنا بند کر دے۔ بس جو لکھ رہے ہیں، وہ لکھتے رہیں کہ اسی طرح بڑے لکھاری پیدا ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ایک کام ضرور کریں، اور وہ ہے سوچنا، اپنے بارے میں، تنہائی میں، اکیلے میں، دوسرے آپ کے بارے جو سوچتے ہیں، اس کی روشنی میں اپنے آپ کو سوچنا۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ امام (leader) نہ بنیں، امام بننے کی خواہش نہ پالیں جبکہ آپ سے چھوٹے لوگ امام بن چکے ہوں۔ امام بنیں، ضرور بنیں، کوئی حرج نہیں اگر امام کہلوانے کے لیے مقتدی بھی تلاش کرنے

پڑیں، لیکن کچھ عرصہ بعد اپنے آپ سے یہ درخواست ضرور کریں کہ اب امامت کافی ہو گئی ہے، اب بندے بن جاؤ۔ یاد رکھو کہ بڑے آدمی کو کہا جاتا ہے کہ امام بننے جیسی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرنے میں وقت ضائع نہ کرے۔ چھوٹے آدمی کو تو یہی سبق دیا جاسکتا ہے کہ اپنی خواہش پوری کر لو اور بعد میں توبہ کر لینا۔

بھئی! امام بننا منزل نہیں ہے، اسے راستے کا پتھر سمجھیں۔ ریاکاری سے گھبرا کر کام روک نہ دیں اور نہ ہی ریاکاری کے ساتھ ساری زندگی گزار دیں۔ اخلاص آپ کی منزل ہے، اس منزل کی طرف سفر ضرور جاری رکھیں، چاہے اس سفر میں ریاکاری کے پتھروں سے گزرنا پڑے۔ ایک چھوٹے ذہن کے شخص کو یہی نصیحت کی جاسکتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

”مَنْ سَمِعَ سَمَعَ اللَّهَ بِهِ، وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللَّهَ بِهِ“¹

”جس نے شہرت کے لیے کوئی نیک کام کیا تو اللہ عزوجل [قیامت والے دن] اس کی حقیقت کھول کر اس کو رسوا کر دیں گے۔ اور جس نے دکھلانے کے لیے کوئی نیکی کی تو اللہ عزوجل [قیامت والے دن] اس کی نیکی کی حقیقت پر لوگوں کو مطلع کر دیں گے۔“

ہالی وڈ انڈسٹری اور دہریت

(Hollywood and Atheism)

تہذیبوں اور قوموں کے مابین جنگیں میڈیا اور قلمی جنگ میں بھی داخل ہو چکی ہیں۔ الحاد اور دہریت (atheism) نے عرصہ دراز سے ہالی وڈ کی فلم انڈسٹری کو اپنے ردی افکار کی تبلیغ کا ایک ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ اب فلم صرف تفریح نہیں ہے بلکہ فکری جنگ ہے، پروپیگنڈا ہے، افکار کی تبلیغ کا ذریعہ ہے، معاشروں میں تشدد اور بے حیائی پیدا کرنے کا ہتھیار ہے، وغیرہ۔

مغرب میں فلم بنانے والے ڈائریکٹرز ذہین ترین لوگوں میں سے ہوتے ہیں۔ وہ فلم

¹ صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الزیاء والشمعة، 104/4

انڈسٹری کے ذریعے صرف کاروبار نہیں کر رہے، یالگوں کو محض تفریح نہیں مہیا کر رہے بلکہ وہ ذہنوں کو مسخر کر رہے ہیں، معاشروں کو تبدیل کر رہے ہیں اور ملکوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ فلم میں کہاں انہوں نے آپ کو گڑانا ہے، کہاں ہنسانا ہے اور کہاں اور کس منظر میں آپ کے ذہن میں کون سی بات اس طرح ڈالنی ہے کہ آپ کو احساس بھی نہ ہو کہ آپ کی ذہن سازی کی گئی ہے۔ وہ آپ کے ذہن میں میوزک کے پس منظر اور فلمی ڈائلاگ کے راستے اپنا پیغام چھوڑ جاتے ہیں کہ جو پھلتا پھولتا رہتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد وہ آپ کی پختہ فکر بن کر سامنے آتا ہے۔ فلم انڈسٹری کا کمال یہ ہے اس نے مذہب، سماج، معاشرتی اقدار اور اخلاقیات وغیرہ کے سارے ذہنی فلٹرز بے کار کر دیے ہیں کہ جن کے بے کار ہوجانے سے ہر گندگی اور نجاست انسانی خیالات اور تصورات میں شامل ہوتی چلی جا رہی ہے۔

یہ تو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ کوشش کے باوجود ہمارے بچے انگریزی نہیں سمجھتے، ورنہ کب کا ہمارا معاشرہ ہالی وڈ فلمز، ہینیمٹڈ موویز اور کارٹونز کے راستے خدا بیزار بن چکا ہوتا۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق کوئی پچاس کے قریب ہالی وڈ کی فلمیں ایسی ہیں جو خدا بیزاری (atheism) کی تبلیغ کرتی ہیں۔¹

اللہ ہمیں مویاں دیکھنے کے فتنے سے بچائے رکھے تو یہ اس کی خاص توفیق اور نعمت ہے۔ البتہ پرنٹ میڈیا کے تبصروں کے مطالعہ کے ذریعہ اس میدان کے فنکاروں سے جانکاری رکھنی چاہیے تاکہ لوگوں کو ان کے فتنے سے بچایا جاسکے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے شر کو پیدا کیا ہے اور یہ قیمت تک باقی رہے گا۔ ہماری محنت سے یہ ختم نہیں ہو سکتا البتہ کم ہو سکتا ہے۔ اور ہم سے ہمارے رب کا یہی مطالبہ ہے کہ ہم اسے کم کرنے کے لیے محنت اور کوشش کریں۔ اور شر کو کم کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ موویز دیکھنے والوں کو ان کے برے اثرات سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر مذہب بیزار نہ ہو جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

¹ http://www.rationalresponders.com/atheism_movies

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النور: 19]

”جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں بے حیائی پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

فلم بنانا

ایک دوست نے ایک دفعہ سوال کیا کہ کیا فلم یا مووی بنانا جائز ہے؟ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا: عورت اور گانے کے بغیر فلم بنالیں گے؟ اور پھر وہ بھی ہٹ ہو جائے؟ انہوں نے کہا: بعض ہٹ فلمیں ایسی ہیں کہ جن میں نہ عورت ہے نہ گانا۔ میں نے کہا: ایک آدھ کانام تو بتلائیں؟ انہوں نے کہا: ریسیوون۔ میں نے حیرانگی سے کہا کہ کیا اس فلم میں بالکل بھی عورت نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: دو منظر ایسے ہیں کہ جن میں عورت بس چلتے پھرتے میں موجود ہے، باقی اس فلم کے مرکزی یا ذیلی کردار کے طور عورت شامل نہیں ہے۔

انہوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ ایک فرانسیسی ڈرامہ کہ جسے فلمایا بھی گیا ہے، غودو کے انتظار میں (waiting for godot) کے نام سے ہے۔ اس میں لڑکی کا کردار نہیں ہے اور یہ مختلف زبانوں میں بیسیوں مرتبہ فلمایا جا چکا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں کراچی میں ضیاء الدین کی ہدایت میں فلمایا گیا ہے۔ روسی افسانہ نگار چیخوف کا سب سے معروف ترین افسانہ (the bet) کئی ملکوں میں فلمایا ہے اس میں بھی عورت کا کردار نہیں ہے۔ ایک اور فلم ہے کہ جس کا نام (twelve anger men) ہے اور اس فلم کو بی بی سی نے پچھلی صدی کی سو بہترین فلموں میں رکھا ہے جبکہ اس میں بھی عورت کا کردار نہیں ہے۔

انہوں نے کہا کہ اسی طرح امریکی ناول نگار ہیمنگ وے کا ناول بوڑھا آدمی اور سمندر (the old man and the sea) بھی ایک اور ایسی مثال ہے کہ جسے فلمایا گیا ہے۔ اور لارنس آف عربیہ (lawrence of arabia) بھی اس بارے

ایک عمدہ مثال ہے۔ چیخوف کے اس افسانے پر پی ٹی وی نے بھی ڈرامہ بنایا تھا اور اسے ایوارڈ ملا تھا۔ اس لیے ڈرامے اور فلم کا ہٹ ہونا مسئلہ نہیں، البتہ بس یہ ضروری ہے کہ وہ آرٹ ضرور ہو۔ اسی طرح ایک فلم ”باباعزیز“ کا بیان علامتی ہے اور آرٹ کو آرٹ رہنے دیا گیا ہے۔ حسن عسکری صاحب نے ڈرامہ کی جو پہلی شرط لگائی ہے کہ وہ بہترین تفریح ہونے چاہیے، نہ کہ اصلاح، آرٹ میں اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ جس طرح فٹبال کا بنیادی مقصد کھیل ہے، لیکن ہم اس سے اور مقاصد بھی وابستہ کر سکتے ہیں، صحت بہتر بنائی جائے تاکہ جہاد کی تیاری رہے وغیرہ۔ باقی اچھی تفریح بذاتِ خود ایک مقصد ہے، جس معاشرے میں تفریح کا رجحان ختم ہو جائے، اس معاشرے میں افسردگی (sadness) آ جاتا ہے۔ شعر سننا اور سننا ایک تفریح ہے لیکن یہ ایک ایسا عمل بھی ہے جو طبیعت اور ذہن دونوں کو بلند کرتا ہے۔

ایک اور دوست نے تبصرہ کیا کہ ایک مووی (The Objective) کے نام سے ہے کہ جس میں افغانستان میں غیر مرئی قوتوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے چھ امریکی میرینز کی سچی داستان فلمائی گئی ہے۔ اس میں صرف ایک منظر میں عورت ہے اور وہ بھی افغان جو افغانی برقعے میں مکمل طور پر چھپی ہوئی ہے۔ ایک اور دوست نے تبصرہ کیا کہ صرف ڈاکو مینٹری فلم بنانا جائز ہے جبکہ کسی اور قسم کی فلم بنانا بالکل بھی جائز نہیں ہے۔

ڈرامہ، فلم اور مووی وغیرہ میں جو چیز واضح طور ممنوع ہے، وہ فحش منظر نگاری، گانا بجانا، تشدد اور رومانس وغیرہ ہیں۔ اگر کسی ڈرامے، فلم اور مووی کا مقصد اچھا اور تعمیری ہو اور وہ کسی تاریخی، معاشرتی، معاشی، سیاسی یا مذہبی تصور کی اصلاح کے موضوع پر ہوں تو یہ اصلاح معاشرہ کا ایک اچھا ذریعہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بات تو واضح ہے ہی کہ جس فلم اور مووی کا بنانا جائز ہے، اسے دیکھنا بھی جائز ہے۔ بہر حال یہ کوئی فتویٰ نہیں ہے بلکہ ایک احساس ہے۔ علما اور مفتیان کو ایسے احساسات پر غور کرتے رہنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ بیس سال پہلے تصویر حرام تھی، اور اب ہر مفتی صاحب کی جیب میں موجود اسمارٹ فون

میں آٹھ میگا پکسل کا بہترین کیمرہ موجود ہو۔ ہمارے دارالافتا کو فتویٰ دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے اور کر دی ہے تو پھر اس پر صدیوں ڈٹے رہنا چاہیے۔ یہ درست نہیں ہے کہ مولانا صاحب پہلے اسپیکر کو گناہ سمجھ کر پکڑتے نہیں تھے اور اب ثواب سمجھ کر چھوڑتے نہیں ہیں۔ مفتی کو صاحب بصیرت (visionary) ہونا چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَائِشَةُ، قَالَتْ: «لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا عَلَى بَابِ حُجْرَتِي وَالْحَبَشَةُ يَلْعَبُونَ فِي الْمَسْجِدِ، وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَنْزِي بِرِدَائِهِ، أَنْظُرُ إِلَى لَعِبِهِمْ»¹

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے ایک دن اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑا دیکھا جبکہ کچھ حبشی مسجد نبوی میں کھیل رہے تھے۔ اور میں نے ان حبشیوں کا کھیل دیکھا جبکہ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے اپنی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔“

میڈیا چینلز کی رمضان کی دکان

کچھ سالوں سے الیکٹرانک میڈیا سے دور ہوں۔ موویز، ڈرامے تو کجا، اب تو نیوز چینلز، ٹاک شوز اور رمضان ٹرانسمیشن پر بھی کبھی بھولے سے نظر پڑ جائے تو سر درد شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اہل فکر کو شر سے واقف ہونا چاہیے کیونکہ وہ شر سے واقف نہ ہوں گے تو لوگوں کی رہنمائی کیسے کریں گے؟ ہمارے ہاں علما میں بس اسی چیز کی کمی ہے کہ ان کے پاس شر کا علم نہیں ہے لہذا بڑے خلوص سے ایک دوسرے کو ٹی وی چینلز پر جا کر اسلام کی تبلیغ کا فرض سرانجام دینے کے فضائل و مناقب بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ پس اسی سوچ سے رمضان کی کچھ ٹرانسمیشن دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف چینلز رمضان میں اپنی اپنی دکان پر کیا کیا پراڈکٹس بیچ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو لچر اور واہیات پروگرام ہیں کہ جو رمضان کے تقدس کو بری طرح پامال کرنے والے ہیں۔ سارا

¹ صحیح البخاری، کتاب الصلوة، باب أصحاب الجراب في المسجد، 98/1

سال گانے بجانے والے، رمضان میں آپ کو دین سکھا رہے ہوتے ہیں۔ کوئی سنجیدگی اور وقار نام کی شے ہی نہیں۔ کوئی زبردستی آم کھلا رہا ہے، کوئی کپڑے پھڑا کر کہہ رہا ہے کہ پاگل بن کر دکھاؤ، کوئی میاں بیوی کو کہہ رہا ہے کہ اسٹیج پر آ کر ایک دوسرے کو بوسہ (kiss) دیں، کوئی ڈانس کروا رہا ہے، کوئی موٹر سائیکلیں انعام پر لگائے لڑکیوں کو جگتیں مار رہا ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ رمضان مغرب تک ہوتا ہے، اس کے بعد ہیر و بن کر انڈین فلموں کے گانے گارہا ہے۔

عمر لیاقت ہوں یا فہد مصطفیٰ، یہ اینکر کم اور جو کر اور مسخرے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان تمام رمضان جو کروں کے امام بلاشبہ ڈاکٹر عامر لیاقت ہی ہیں۔ وہی پاکستان میں رمضان ٹرانسمیشن کے نہ صرف بانی ہیں بلکہ یہ سب مداری اینکرز آج بھی انہی کی حرکتوں کو کاپی بھی کرتے ہیں اور انہیں سیلوٹ بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ اینکرز رمضان کے نام پر اپنے شو میں بہت کم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو یاد کرتے ہیں۔ اور وقار ڈکا، تو اس کا پروگرام تو دجال کا پروگرام معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں خوب بے حیائی پھیل رہا ہے کہ ہر دوسرے مہمان سے، چاہے لڑکی ہو یا بچہ، ڈیٹ مارنے اور محبت کرنے کا طریقہ بتلانے اور ڈانس کر کے دکھانے کا مطالبہ ضرور کرتا ہے۔ اور اپنے سیٹ پر خوب شیطانی علامات (symbols) سجا کر دجالیت کو فروغ دے رہا ہے۔

دوسری طرف بظاہر کچھ سنجیدہ پروگرام کرنے والے ہیں جیسے بلال قطب وغیرہ تو یہ بھی دین سے ایک قسم کا مذاق ہی ہے کہ فل میک اپ میں خواتین بٹھا کر ان کے ساتھ مفتی صاحبان کو بٹھادیں۔ اور ڈرائیونگ سیٹ پر جناب اینکر صاحب ہیں کہ جس طرف مفتی صاحبان کی گاڑی لے کر جانا چاہیں، لے جائیں، ان کی حیثیت سے سوار یوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسے رمضان ٹاک شو میں بعض مفتی صاحبان انگریزی بولنے کی بھی کوشش کرتے ہیں تاکہ عوام کو معلوم ہو کہ مفتی صاحبان اتنے جاہل بھی نہیں ہیں، انہیں انگریزی بھی آتی ہے اور دلہن بنی بیٹی میزبان واہ واہ، کیا کہنے، جیسے الفاظ سے داد کے ٹوکے برسا رہی ہوتی ہے۔

ہر مکتبہ فکر سے ایک مہمان عالم دین بلوایا جاتا ہے کہ جس کا مقصد اپنے ناظرین کی تعداد بڑھانا ہے کہ ہر مسلک کے لوگوں نے اپنے عالم دین کی بات ہی تو سننی ہے۔ اور ہر ٹی وی چینل پر اپنی ریٹنگ بڑھانے کا ایک جنون سوار ہے بلکہ ان پر بھی جو ریٹنگ کے اس جنون پر کھلم کھلا تنقید کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ہر مہمان عالم دین کچھ بولنے کے لیے یوں بے تاب اور بے چین بیٹھا ہوتا ہے کہ جیسے اینکر صاحب کے اشارے کا منتظر ہو۔ ایسے پروگراموں سے کسی قسم کی اصلاح یا تربیت کی توقع رکھنا بے کار ہے۔ البتہ یہ ہے کہ شر کسی قدر کم کیا جاسکتا ہے کہ یہ پروگرام صریح ہلڑ بازی والے پروگراموں کی نسبت سنجیدہ پروگرام کہلانے جانے کے مستحق نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد مسعود جو کہ معروف اینکر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ رمضان ٹرانسمیشن میں شریک ہونے کا گناہ کیا تھا، بعد میں اس کی معافی مانگ لی اگرچہ مفتی صاحب اس شرکت کو جہاد قرار دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد مسعود کا کہنا ہے کہ کینسر کے ایک بچے کو ایک اشتہار میں مصنوعی طور رونے کو کہا گیا لیکن اسے رونا نہ آیا تو دوسرے روتے بچے کو دکھا دیا گیا۔ بہر حال رمضان ٹرانسمیشن میں کیا کچھ دکھایا جا رہا ہے، اس پر کافی ویڈیوز موجود ہیں۔ کاش! کہ لوگ رمضان میں اپنا زیادہ وقت ان ٹرانسمیشنز کے دیکھنے میں ضائع کرنے کی بجائے، نوافل، تلاوت قرآن مجید، تسبیح و تہلیل اور دیگر عبادات میں گزاریں۔

سائنسی حق

فیس بک پر بعض دوستوں کا مطالبہ ہے کہ ان کا دینی حق تسلیم کیا جائے اور وہ دینی حق یہ ہے کہ ائمہ دین چونکہ معصوم نہیں ہیں لہذا انہیں ان ائمہ پر تحقیق کا حق حاصل ہے۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ ان کی تنقید کو ”فیس بکی عالم“ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ اس مطالبے سے مجھے اپنا سائنسی حق یاد آ گیا جو آج تک میں استعمال نہ کر سکا۔ وہ یہ کہ چونکہ میں سائنسی دور کی پیدائش ہوں لہذا یہ میرا سائنسی حق ہے کہ میں ائمہ سائنس نیوٹن، آئن سٹائن اور اسٹیون ہاکنگ پر تنقید کروں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ ”فیس بکی سائنسدان“

ہی کہہ دیں گے ناں؟

یہ بات کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہر میدان میں، چاہے وہ مذہب ہو یا سائنس، سماجی علوم ہوں یا انتظامی علوم، اگر اہل لوگ (experts) مکالمہ کریں گے تو فائدہ ہوگا، ورنہ ایسے ہی طعنے سننے کو ملیں گے۔ ہمارے ہاں ہر میدان مثلاً فزکس، میڈیکل سائنس، ریاضی اور انجینئرنگ وغیرہ میں علمی نقد کرنے کے لیے ایک معیار مقرر ہے لیکن مذہب میں تو ہر شخص، چاہے اس کا کوئی معیار ہو یا نہ ہو، تنقید کرنا پناہ دینی حق سمجھتا ہے۔ اگر ائمہ دین پر تنقید کا دینی حق ایک یونیورسٹی گریجویٹ کو ہونا چاہیے تو ایک مدرسہ فارغ التحصیل کو بھی ائمہ سائنس پر تنقید کا برابر حق حاصل ہونا چاہیے۔

اور اگر اہل مدرسہ مذہب کی روشنی میں سائنس پر نقد کرتے ہیں تو اس پر اعتراض نہیں بنتا کہ اہل سائنس بھی تو سائنس کے اصولوں کی روشنی میں مذہب کو پرکھ رہے ہوتے ہیں۔ فقہ کی کتاب سے فزکس کے کسی نظریہ پر تنقید کرنا اتنا ہی بامعنی ہے جتنا کہ مذہب کو سائنسی اصول کی روشنی میں پرکھنا۔ یہ اصول کی بات ہے، گر سمجھ میں آئے تو۔ اور دینی معاملات میں بغیر علم کے کوئی رائے دینے کو قیامت کی نشانی قرار دیا گیا ہے کہ علما اٹھالیے جائیں گے اور جہلا فتوے جاری کریں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِذَا لَمْ يَثْرُكْ عَالِمًا، اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهْلًا، فَسَنَلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا»¹

”جب دنیا میں علما باقی نہ رہیں گے تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے۔ ان جہلا سے سوال پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔“

بچوں کے لیے اسلامی ویڈیوز کی ضرورت

میرا چھوٹا بیٹا دو سال کا ہے، کوئی سال بھر کا تھا کہ اس کی اماں جان اسے نرسری رانمز لگا دیتی تھیں تاکہ اس دوران گھر کے کچھ کام کاج سمیٹ لیں۔ میرے لیے یہ

¹ صحیح مسلم، کتاب العلم، باب رَفْعِ الْعِلْمِ وَقَبْضِهِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ وَالْفِتَنِ فِي آخِرِ الزَّمَانِ، 2058/4

مشاہدہ حیران کن تھا کہ بعض نرسری رائنمز ایسی بھی تھیں کہ جنہیں کروڑوں میں کلکس ملے ہوئے تھے۔ اور یہ عام سی نرسری رائنمز تھیں اگرچہ لیر کس (lyrics) اور گرافکس اچھے تھے۔ پھر یہ بھی مشاہدے میں آیا کہ بچوں کی نرسری رائنمز پر اگر کسی نے کام کیا ہے، تو وہ انگریز ہیں یا انڈین یعنی یہ سب رائنمز انگریزی میں ہیں یا ہندی میں۔ اور اردو میں ایسا کوئی قابل ذکر مواد موجود نہیں ہے۔

اس مسئلے میں اہم نکتہ ہمارا لائف اسٹائل ہیں جو کہ تقریباً گلوبل بن چکا ہے۔ ہر دوسری ماں اپنی بچے کو یوٹیوب پر نظمیں اور رائنمز لگا کر بٹھا دیتی ہے تاکہ اس دوران اپنے گھر کے کام کاج سمیٹ لے۔ دنیا بھر کے یہ کروڑوں بچے ہیں کہ جن تک آپ اسلام کا پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ بابا بلیک شپ، ٹوٹکل ٹوٹکل لٹل اسٹار، جونی جونی بس پاپا اور نہ جانے کتنی رائنمز ایسی ہیں جن سے ہر دوسرا مسلمان بچہ نہ صرف واقف ہے بلکہ اسے زبانی یاد ہیں۔ کیا مسلمان ایسی نظمیں اور رائنمز ترتیب نہیں دے سکتے کہ جو بچوں کی فطرت، منہج، ماحول، تربیت اور نفسیات سے متعلق اور قریب ہوں۔

مجھے انگریزی میں بچوں کے لیے دو قابل ذکر نظمیں ملی ہیں: ایک ”بسم اللہ“ اور دوسری ”اللہ میڈا پوری تھنگ“¹ لیکن اس کی پوری انڈسٹری ہونی چاہیے جیسا کہ انڈین نے بنادی ہے۔ ہمارے شاعر اور نہ سہی ”بلبل کا بچہ“ ہی لکھ دیں، لیکن ہماری اردو شاعری اب تو اس قدر بامقصد ہو گئی ہے کہ اس میں بچوں کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ اردو میں جتنی رائنمز آپ کو اپنے بچوں کی زبان پر ملیں گی، ان میں سے اکثر ہندی ہیں۔ اب اس طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی معروف زبانوں مثلاً انگریزی، فرنچ، جرمن، چائنیز، رشین وغیرہ میں بچوں کے لیے ایسی نظمیں تیار کریں کہ جن میں قرآن حدیث نہ سہی کم از کم ایک مہربان خالق اور بنیادی اخلاقیات کا تصور تو موجود ہو۔

¹ Zain Bhikha, Allah made every thing, Retrieved on 01-08-2017, from <https://www.youtube.com/watch?v=klZJcX9YtnQ>

جب میں نے یہ سوچا کہ مجھے اپنے بچے کو انگریزی یا ہندی رانمز نہیں دکھانی تو میں نے ہوم میڈ ویڈیوز کی طرف توجہ دی مثلاً دو سال کے بچوں کی فنی ویڈیوز کہ یہ اپنے بچے کو لگا دوں تو معلوم ہوا کہ اس میں میدان بالکل خالی ہے۔ گھسی پٹی ویڈیوز ہیں لیکن ان کے لیے کلکس لاکھوں میں ہیں۔ اور وجہ سمجھ میں بھی آتی ہے کہ آج والدین کے پاس اپنے اور اپنے بچوں کے لیے انٹرٹینمنٹ کی اعلیٰ ترین صورت جو موجود ہے، وہ ان کا اسمارٹ فون، آئی فون، ٹیبلیٹ، لیپ ٹاپ اور یوٹیوب وغیرہ ہیں۔ اگر مسلمان اتنا ہی کر لیں کہ اپنے اسمارٹ فون سے اپنے ایک یا دو سال کے بچے کی معصوم حرکتوں کی فنی ویڈیوز اپ لوڈ کر دیں تو یہی دعوت کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔

مثلاً اہل مغرب جب اپنے بچوں کی ویڈیوز اپ لوڈ کرتے ہیں تو ان کے والدین کی ڈریسنگ اور وضع قطع ایک خاموش تبلیغ بن جاتی ہے اور اسی طرح آپ کی ڈریسنگ اور حلیہ دنیا کے لیے ایک خاموش تبلیغ ہوگی کہ جسے اصطلاح میں سبلیمیمینل میسیجز کہتے ہیں۔ آپ اپنے بچے کو اللہ کہلاتے ہوئے اس سے غبارہ پھڑوانے کی ایکٹوٹی کروائیں گے، اسے نماز کے لیے سجدے میں گرتے ہوئے دکھائیں گے۔ اور نہ سہی اسے روتا ہی دکھادیں لیکن ساتھ میں اس کا اسلامی نام پکار لیں جیسے عبد اللہ اور اسے اپ لوڈ کر دیں تو یہ بھی دوسروں کو ایک پیغام ہی جا رہا ہے۔ تبلیغ صرف درس و تدریس کا نام نہیں ہے بلکہ کسی مسلمان کا حلیہ اور نام، اس کی حرکات، پہننا اوڑھنا اور اس کا بولنا بھی تبلیغ ہی ہے۔

اسلامک کارٹونز اور اسلامک رانمز

بچوں کے لیے اسلامک ویڈیوز پر ایک پوسٹ لگائی تھی کہ جس پر بہت سے دوستوں کا فیدبیک ملا۔ اگرچہ میرے علم میں بھی ہے کہ کہیں کہیں اس پر کچھ کام ہوا ہے لیکن ابھی بہت کام کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو بچوں کی عمر کے تعین کے اعتبار سے کام کی ضرورت ہے کہ ڈیڑھ دو سال کے بچے کی ضرورت ”عبدالباری“ جیسے کارٹونز نہیں ہیں، بلکہ نرسری رانمز ہیں۔ اسی طرح چھ سات کی عمر کے بچوں کی ضرورت اور دس بارہ سال کے بچوں کی ضرورت میں بھی فرق ہے۔ چھ سات سال کا

بچہ ”عبدالباری“ دیکھ لے گا لیکن بارہ تیرہ سال کا بچہ نہیں دیکھے گا کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب وہ بڑا ہونے کے قریب ہے۔

پھر بچوں کی نفسیات ہر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے یعنی چائلڈ سائیکالوجی پر اور اس کے مطابق کارٹونز کی نہ سہی کم از کم زسری رائٹمز کی انڈسٹری تو ہم تخلیق کر سکتے ہیں۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں زسری رائٹمز تخلیق کرنی ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسی رائٹمز جو کہ گلوبل بن جائیں کہ ہر مذہب اور کلچر کے بچے کی زبان پر ہوں جیسا کہ اہل مغرب نے یہ کر دکھایا ہے مثلاً ٹوٹل ٹوٹل لٹل اسٹار یا بابا بلیک شیپ۔ اور ہمارے ہاں کے او۔ لیول یا اے۔ لیول کے بچے اور بچیاں اتنی انگریزی جانتے ہیں کہ ایسی نظمیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ اب ٹوٹل ٹوٹل لٹل اسٹار میں بچہ اس بات پر تو حیران ہے کہ ستارے کیا چیز ہیں لیکن اس کی یہ حیرانی ان ستاروں کے بنانے والے کے حوالے سے بھی نظم میں دکھائی جاسکتی تھی، جو کہ بالکل فطری ہے۔ لیکن یہ کام وہی کر سکتا ہے کہ جس کا ذہن اور سوچ دینی ہو۔ ایک فرنج مسلم میڈیا گروپ نے کچھ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی ایک نظم ”بسم اللہ“ کو انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے¹ اور اس نظم کی گرافکس اور لیر کس اس قابل ہیں کہ یہ گلوبل زسری رائٹمز بن جائے۔ جن اسکولوں میں یہ لگائی جاتی ہے، وہاں بچے فرمائش کر کر کے یہ گلو اتے ہیں۔ یوٹیوب پر اس کی آفیشل ویڈیو کو تین سالوں میں چار کروڑ اور ساٹھ لاکھ کلکس مل چکے ہیں۔

جہاں تک کارٹونز کی بات ہے تو ”عبدالباری“ بہت اچھے کارٹونز ہیں لیکن ہم غلامیں نہیں ہیں۔ یہاں ایسے کارٹونز بننے ہیں جو گلوبل انڈسٹری رکھتے ہیں اور دنیا کے ہر مذہب اور کلچر کے بچے وہ دیکھتے ہیں مثلاً ٹوائے اسٹوری، کنگ فو پیڈا، آئس اتج اور ڈغاسکر وغیرہ۔ اب اگر آپ کے بچے نے یہ دیکھ رکھے ہیں تو اسے ”عبدالباری“ پر مطمئن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ بے چارہ ابھی حفظ کی کلاس سے چھٹی لے کر آیا ہے اور ”عبدال

¹ Famille Musulmane, Bismillah Bismillah, Retrieved on 08-01-2017, from <https://www.youtube.com/watch?v=cHqfk5lMw-E>

الباری“ اسے کارٹون میں ”سورہ الفلق“ یاد کروا رہا ہے۔ عبدالباری کے کارٹون بھی بہت اچھے ہیں لیکن ہمیں اس کے علاوہ ایسے آپشنز پر بھی کام کرنا ہے کہ ہمارے کارٹونز ہر مذہب اور کلمچر کے لوگ دیکھ سکیں۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جبکہ ان میں اسلام نہیں بلکہ اسلامی سوچ اور فکر موجود ہو۔ ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔

بلاشبہ آنیڈیل تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ماں سب کچھ چھوڑ کر اپنے بچے کو وقت دے لیکن کیا ہمارے معاشرے میں بڑے بیٹے پر یہ ممکن ہے؟ چند ایک مذہبی گھر تو شاید کر لیں لیکن ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں کہ جس نے کچھ چیزیں ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی ہم پر لا دی ہیں۔ ایسی صورت حال میں قابل عمل کیا ہے؟ ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا۔ یعنی بچے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ فارغ ہے، اسے اکیٹوٹی چاہیے۔ ماں کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس وقت تو ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ ہماری اماں کے پاس تھا۔ اسی طرح نہ ہی آج کی ماں بچے کو گلی میں نکالنا چاہتی ہے کہ خود ہی کھیل کود کر بڑا ہو جائے تو اب مسئلہ کا حل کیا ہے؟

کوئی مناسب جواب اسی وقت مناسب کہلا سکتا ہے جبکہ آپ اس مسئلے کو اس میں ایڈریس کریں گے اور مسئلہ بچے کی مصروفیت کا ہے؟ اس کے پاس انرجی ہے، وہ کہیں تو لگنی ہے۔ ہمارے پاس کوئی اور رستہ بچا نہیں ہے، اس انرجی کو کھپانے کا۔ ہم اپنے بچے کو گلی میں نکالنے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم نے ایک لائف اسٹائل طوعاً یا کرہاً قبول کر لیا ہے۔ اسے ماحول کا جبر ہی سمجھ لیں لیکن اس مسئلے کو سامنے رکھ کر تبصرہ کریں کہ اگر کارٹونز اور رائٹمز نہیں تو متبادل کیا ہے؟ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ یہی بہترین متبادل ہے، بلکہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ فی الحال قابل عمل متبادل ہے۔ حضرت ربیع بنت معوذ بنی النضر فرماتی ہیں:

«وَنُصَوِّمُ صَبِيَانَنَا، وَنَجْعَلُ لَهُمُ اللَّعْبَةَ مِنَ الْعِهْنِ، فَإِذَا بَكَى أَحَدُهُمْ

عَلَى الطَّعَامِ أَعْطَيْنَاهُ ذَلِكَ حَتَّى يَكُونَ عِنْدَ الْإِفْطَارِ»¹

”ہم انصاری عورتیں اپنے بچوں کو عاشورا کا روزہ رکھواتی تھیں اور جب ان میں

¹ صحیح البخاری، کتاب الصَّوْم، بَابُ صَوْمِ الصَّبِيَّانِ، 37/3

سے کوئی بھوک سے روتا تو ہم اسے روٹی کے کھلونے بنا کر دے دیتی تھیں یہاں تک کہ افطار کا وقت ہو جاتا۔“

مرغیاں

ایک دفعہ ملحدوں اور دہریوں (atheists) کے ایک فیس بک پیج پر آنا جانا ہوا تو احساس ہوا کہ یہ میرے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ جیسے اُن کی مرغیاں چرا کر لے جاؤں گا۔¹ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بھی کوئی نیا ملحد کسی بحث میں کنارے لگنے لگتا ہے تو پرانے ملحد اُس کے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں میں اُن کی مرغی بھگانے لے جاؤں۔

خوف کا یہ احساس ہر طبقے، جماعت اور مسلک کے لوگوں میں موجود ہوتا ہے کہ کوئی اُن کے ڈبے کی مرغی اپنے ڈبے میں نہ لے جائے۔ جہاں چور اُچکوں سے اپنی مرغیوں کی حفاظت بہت ضروری ہے وہاں اپنی مرغیوں کے بارے میں زیادہ غیرت کھانا بھی مناسب نہیں ہے کہ تھی تو ہماری تو فلاں کی دیوار (wall) پر کیوں چلی گئی؟

آپ کی مرغیوں کے بارے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر تو آپ روایت پسند (traditionalist) ہیں تو میں ہر گز آپ کی مرغی نہیں چرانے والا اور اگر وہ غلطی سے میری وال پر آگئی اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ یہ واپس آپ کے گھر نہیں جائے گی تو آپ مجھے ایک میج کرے گا، میں اسے آپ کی وال پر باعزت طریقے سے پہنچا دوں گا۔

اور اگر آپ روایت پسند نہیں ہیں، لبرل اور سیکولر ہیں، تو پھر آپ کی مرغی میری مرغی۔ پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی وال سے بھاگے اور میری وال میں پناہ لے۔ اور پھر اسے خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کر کے آپ کی وال پر مرغا بنا کر واپس بھیجوں گا کہ تہجد اور اشراق کے وقت بھی باقاعدگی سے آپ کی وال پر بانگیں دے گا۔



¹ یہاں مرغی سے مراد نثری ملحد (atheist) ہیں اور پرانے ملحدین ان نوجوانوں کی مذہبی مبلغین سے ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں جیسا کہ مرغی کا مالک اپنی مرغیوں کی حفاظت کرتا ہے۔

باب ہشتم اصلاح تصوف

اس باب میں اصلاح تصوف کے ضمن میں تصوف کی تاریخ، وحدت الوجود، وحدت الشہود، کتب تصوف کی اصلاح اور تجدید تصوف پر گفتگو کی گئی ہے۔

تصوف اور چار ادوار

تصوف کی ایک پوری تاریخ ہے جیسا کہ فقہ اسلامی کی ہے اور اس کا ہم چار ادوار کے اعتبار سے جائزہ لے سکتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جو خیر القرون (best ages) کا زمانہ ہے۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی شرح اور امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں کہا ہے کہ خیر القرون سے مراد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ ہے۔¹ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور بعثت نبوت سے لے کر 120 ہجری تک کا ہے کہ اور اس سن میں آخری صحابی کی وفات ہوئی۔ اور تابعین عظام رحمہم کا دور تقریباً 100-170ھ تک کا ہے۔ اور تبع تابعین رحمہم کا دور تقریباً 220ھ تک کا ہے۔²

یہ وہ دور ہے کہ جس میں تصوف کی اصطلاح وضع نہیں ہوئی تھی بلکہ آسان الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کی جماعت میں نیکی اور نیک بننے کا حد درجہ شوق کرنے والے کچھ لوگ تھے جو زہاد، صلحا اور عباد کہلاتے تھے۔ محدثین میں سے امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے اس بارے ”کتاب الزهد والرفاق“، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ”کتاب الزهد“، امام وکیع بن جراح رحمہ اللہ نے ”کتاب الزهد“، امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے ”کتاب الزهد“، اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے ”الزهد الكبير“ مرتب کیں۔³

ہماری یہ کتاب خیر القرون اور سلف صالحین کے تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے منہج پر مرتب کی گئی ہے کہ جس دور میں نہ کوئی خانقاہ تھی اور نہ ہی گدی نشین، نہ کوئی سلسلہ تھا اور نہ ہی خلیفہ مجاز، نہ کوئی مرشد تھا اور نہ ہی بیعت کا نظام لیکن اس کے باوجود

¹ ابن حجر، أحمد بن علي أبو الفضل العسقلاني الشافعي، فتح الباري شرح صحيح البخاري، دار المعرفة، بيروت، 1379ء، 6/7؛ النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف، المهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، دار إحياء التراث العربي، بيروت، 1392ء، 85-84/16
² علي بن محمد، الملا القاري، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، دار الفكر، بيروت، 2002م، 3878/9

³ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ان کتب میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی کتاب سب سے بہتر ہے جبکہ امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی کتاب میں کچھ منکر روایات بھی نقل ہو گئی ہیں۔ [مجموع الفتاوی: 580/11]

ان لوگوں کا تزکیہ نفس ہوا اور ایسا ہوا کہ انہیں اللہ کے نبی ﷺ نے رہتی دنیا تک بہترین لوگ قرار دیا۔ آپ کا ارشاد ہے:

«خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ يَجِيءُ أَقْوَامٌ تَسْبِقُ شَهَادَةَ أَحَدِهِمْ يَمِينُهُ، وَيَمِينُهُ شَهَادَتُهُ»¹

”بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے کے لوگ ہیں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ اس کے بعد وہ لوگ بہترین ہیں جو میرے بعد کے زمانے میں ہوں گے یعنی تابعین عظام رضی اللہ عنہم۔ اور اس کے بعد وہ لوگ بہترین ہیں جو ان کے بعد کے زمانے میں ہوں گے یعنی تبع تابعین رضی اللہ عنہم۔ اور اس کے بعد تو وہ لوگ ہوں گے کہ جن کی قسم ان کی گواہی سے پہلے اور ان کی گواہی ان کی قسم سے پہلے زبان پر ہوگی۔“

تصوف کا دوسرا دور وہ ہے کہ جس میں اصلاح نفس کے لیے خیر القرون کے منہج کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ اس دور میں عمومی اعتبار سے خیر کا پہلو غالب نظر آتا ہے اور اس دور کے صوفیوں میں سب سے بڑا خیر یہ ہے کہ انہوں نے شریعت اور سنت پر عمل ہی کو اپنا اصل مقصود قرار دیا۔ اس دور کے بڑے صوفیوں میں ابراہیم بن ادھم متوفی 160ھ، فضیل بن عیاض متوفی 187ھ، معروف کرخی متوفی 200ھ، ابو سلیمان دارانی متوفی 215ھ، ذوالنون مصری متوفی 245ھ، سہل تستری متوفی 283ھ، جنید بغدادی متوفی 297ھ، ابو طالب مکی متوفی 386ھ، ابو عبد الرحمن سلمی متوفی 412ھ، علی ہجویری متوفی 465ھ، ابو حامد غزالی متوفی 505ھ، عبد القادر جیلانی متوفی 561ھ رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اس دور میں غالب خیر کے باوجود زہد و تقویٰ کے نام پر تصوف کے ادارے میں کچھ ایسے نظریات اور اعمال و افعال کی آمیزش ہوئی کہ جو خیر القرون اور سلف صالحین میں نہیں تھے بلکہ یہ ائمہ اربعہ اور فقہائے محدثین کے مذاہب سے بھی انحراف پر مبنی تھے جیسا کہ سماع اور رقص کو تزکیہ کا ذریعہ قرار دینا۔ اس دور میں خیر القرون کے منہج کے سب سے زیادہ قریب سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ ہیں

¹ صحیح البخاری، کتاب الشهادات، باب لَا يَشْهَدُ عَلَى شَهَادَةِ جُورٍ إِذَا أُشْهِدَ، 171/3

کہ جنہوں نے ایک طرف حسین بن منصور الحلاج متوفی 309ھ کی شطیحات سے بیزاری کا اعلان کیا ہے اور دوسری طرح تزکیہ نفس کے لیے سماع اور رقص کو غیر مسنون طریق کار قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ توحید کے باب میں جو صوفیا حضرت شیخ جنید بغدادی رحمہ اللہ کے مسلک پر ہیں تو وہ ہدایت پر ہیں اور جو شیخ ابن عربی کے مسلک پر ہیں تو وہ گمراہی میں ہیں۔¹

تیسرا دور وہ ہے کہ جس میں تصوف کے نام پر کفریہ نظریات کو یونانی اور ایرانی فلسفہ سے کشید کر کے اسلامی عقیدہ کے طور متعارف کروانے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔ اس دور میں وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا گیا کہ جس کے بانی شیخ ابن عربی متوفی 638ھ ہیں۔ علاوہ ازیں جلال الدین رومی متوفی 672ھ، شیخ مصلح الدین سعدی متوفی 694ھ، حافظ شمس الدین شیرازی متوفی 792ھ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے کہ جن کے فارسی کلام سے یونانی افکار اور ایرانی مزاج تصوف کے نام پر بر صغیر میں عام ہوئے۔ اس دور میں تصوف عمل سے زیادہ ایک نظریہ بن گیا اور صوفی کے ہاں اصلاح نفس سے زیادہ خاتم ولایت، غوث اعظم، قطب عالم بننا زیادہ اہم مسئلہ ٹھہرا۔ شیخ ابن عربی سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تک ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ صوفی اپنا روحانی مقام متعین کرنے اور اسے لوگوں سے منوانے کا جیسے بہت زیادہ خواہش مند ہے۔

چوتھا دور درباروں اور گدی نشینوں کا دور ہے جہاں تصوف کا ادارہ جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی میں خوب ترقی کر رہا ہے۔ اور تصوف حب جاہ، ریاکاری، مذہبی استحصال، شرعی احکام کی پامالی، اذیت نفس، شعبہ بازیوں، سیاسی مفادات کے حصول، جنت کے ٹکٹ بانٹنے اور مریدوں کی تعداد میں اضافے وغیرہ کا دوسرا نام بن کر رہ گیا ہے۔ پاکستان میں

¹ وَلِهَذَا كَانَ الْجُنَيْدُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَيِّدَ الطَّائِفَةِ إِمَامَ هُدًى فَكَانَ قَدْ عَرَفَ مَا يَغْرُسُ لِبَعْضِ السَّالِكِينَ فَلَمَّا سَمِعَ عَنْ التَّوْحِيدِ قَالَ: التَّوْحِيدُ إِفْرَادُ الْخُذُوثِ عَنْ الْقِدَمِ. فَبَيَّنَ أَنَّهُ يَمْتَرُ الْمُخَدَّثُ عَنْ الْقَدِيمِ تَحْذِيرًا عَنْ الْخُلُولِ وَالْإِتِّحَادِ. فَجَاءَتْ الْمَلَا جِدَّةُ كَابِنِ عَزَبِي وَخَوَّه فَأَنكَرُوا هَذَا الْكَلَامَ عَلَى الْجُنَيْدِ؛ لِأَنَّهُ يُبْطِلُ مَذْهَبَهُمُ الْقَائِدَ. وَالْجُنَيْدُ وَأَمَنَّا لَهُ أَنَّهُ هُدًى وَمَنْ خَالَفَهُ فِي ذَلِكَ فَهُوَ ضَالٌّ. [ابن تیمیہ، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416ھ/1995م، 491/5]

بڑے بڑے گدی نشین یا تو سیاست دان ہیں، یا جاگیر دار، یا بزنس مین۔ اس بارے جناب امیر حمزہ صاحب کی چشم کشار و نیداد ”مذہبی اور سیاسی باوے“ ایک عمدہ کتاب ہے کہ جس میں پاکستان کی تمام بڑے بڑے مزاروں اور گدیوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ تصوف کی اصطلاح استعمال کرنے میں اگرچہ کوئی ممانعت نہیں تھی کیونکہ ”لا مشاحۃ فی الاصطلاح“، کہ اصطلاح کے استعمال میں کوئی بخل نہیں ہے لیکن مذکورہ بالا تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس اصطلاح کے ساتھ جو لوازمات ملحق ہو چکے ہیں، ان کی وجہ سے اسے استعمال نہ کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور تصوف کا جو مقصود ہے یعنی اصلاح نفس تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہے اور اس کے لیے قرآن مجید کی بہترین اصطلاح ”تزکیہ نفس“ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ [الشمس: 9]

”تحقیق اس نے فلاح پائی کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔“

یہ واضح رہے کہ جب سلفی حضرات، تصوف کی مخالفت کرتے ہیں تو ان کا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ وہ زہد، تقویٰ، للہیت، خشیت، اصلاح نفس، اصلاح احوال، اصلاح باطن کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی تردید کا مقصود وہ جملہ شرکیہ عقائد اور بدعی اعمال و افعال ہوتے ہیں جو تصوف کے ادارے کا بد قسمتی سے ایک جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ ”مثنوی معنوی“، ”سماع“ اور ”وجد“ سے جب تلاوت قرآن مجید کی نسبت زیادہ احوال پیدا ہوں گے تو رد عمل تو ضرور ہوگا۔

البتہ صوفیاء کو اپنے ناقدین سے یہ شکایت رہتی ہے کہ انہوں نے تصوف کے متبادل کے طور کتاب و سنت کا تصور تزکیہ نفس کسی جامع نظام کی صورت متعارف نہیں کروایا۔ ہماری رائے میں یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ سلف صالحین کے منہج پر کتاب و سنت کے تصور تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے پروگرام کو ایک مکمل نظام کی صورت پیش کیا جائے تاکہ طبعیتوں اور مزاج میں وہ تقویٰ، خشیت اور للہیت پیدا ہو جو

صحابہ و تابعین کے ہاں تھی۔ اور ہماری یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے کہ جس کی ابتدا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ہوئی یہاں تک کہ حال ہی میں الشیخ محمد بن ابراہیم التوہجری نے اس منہج پر چار جلدوں میں دلوں کے احوال پر ایک انسائیکلو پیڈیا ”موسوعة فقه القلوب“ کے نام سے مرتب کیا ہے۔

وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ

تصوف کی تاریخ میں دو شخصیات ایسی ہو گزری ہیں کہ جنہیں تصوف کے میدان میں مجدد کا مقام حاصل ہے۔ ان میں سے ایک شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ متوفی 1034ھ ہیں اور دوسرے مولانا شرف علی تھانوی رحمہ اللہ متوفی 1943ء ہیں۔ شیخ ابن عربی متوفی 638ھ کی شطحیات (ecstatic utterance) سے تصوف کے ادارے میں وحدت الوجود کا جو نظریہ عام ہو گیا تھا، اس کی اصلاح کا کام شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ سے لیا گیا جبکہ عملی تصوف میں جن غیر اسلامی اعمال کی آمیزش ہو گئی تو ان کی بہت حد تک اصلاح مولانا شرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے فرمائی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام، تبع تابعین، فقہاء، محدثین، متکلمین اور متقدمین صوفیاء میں سے کوئی بھی نظریہ وحدت الوجود کا قائل نہیں رہا تھا بلکہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو جب حسین بن منصور الحلاج کی بعض شطحیات کا علم ہوا تو انہوں نے توحید کی تعریف ”إِفْرَادُ الْخُذُوْثِ عَنْ الْقِدَمِ“ کے الفاظ سے بیان فرمائی اور شیخ ابن عربی توحید کی اس تعریف کا انکار کرتے رہے کہ یہ ان کے نظریہ وحدت الوجود کے خلاف تھی۔¹

شیخ ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کا حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی، سلفی، اشعری اور ماتریدی علما کی ایک جماعت نے سختی سے رد فرمایا اور اسے کفر قرار دیا۔ شیخ ابن عربی کے ابتدائی ناقدین میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ متوفی 728ھ اور علامہ سعد الدین التفتازانی رحمہ اللہ متوفی 792ھ کی نقد کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے کہ انہوں نے شرع کے علاوہ

¹ مجموع الفتاوی: 491/5

عقل و منطق کی روشنی میں بھی اس نظریے کا خوب رد کیا ہے۔ ان دونوں ائمہ کے علاوہ چالیس کے قریب فقہاء اور متکلمین نے اس نظریہ کی مخالفت میں مستقل کتب تصنیف کیں لیکن شیخ محمد الف ثانی رحمہ اللہ وہ پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے تصوف کی روایت میں معروف ذریعہ علم یعنی مراقبہ اور مکاشفہ کے ذریعے اس نظریے کے باطل ہونے پر مہر ثبت فرمائی۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اور جس شخص نے مسئلہ وحدت وجود کو ابواب و فصول میں لکھا ہے اور صرف ونحو کی مانند اس کو تالیف کیا ہے وہ شیخ محی الدین ہی ہیں، اور اس مسئلہ کے بعض دقیق معارف کو اپنی طرف منسوب کیا ہے حتیٰ کہ انہوں نے کہا کہ خاتم النبوت بعض علوم و معارف کو خاتم الاولیاء سے اخذ کرتا ہے۔ اور خاتم ولایت محمدی اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ ان کے شارحین نے اس کی توجیہ میں کہا ہے کہ اگر بادشاہ اپنے خزانچی سے کوئی چیز لے لے تو کیا نقصان ہے۔“¹

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

”فقیر کے نزدیک ممکنات کے آئینوں میں حق جلا و علا کا وہ شہود جس کو صوفیہ کی ایک جماعت کمال جانتی ہے اور تشبیہ و تنزیہ کے درمیان جمع ہونا خیال کرتی ہے وہ درحقیقت حق جلا و علا کا شہود نہیں ہے۔ ان آئینوں میں اس کا مشہود ان کے خیالی اور من گھڑت تصور کے سوا کچھ نہیں ہے... ہر گزہر گز صوفیہ کی اس قسم کی ترہات یعنی باطل خلاف شرع باتوں پر فریقہ نہ ہونا چاہیے اور حق جل سلطانہ کے غیر کو حق نہ جاننا چاہیے۔ اگرچہ یہ لوگ غلبہ حال کی وجہ سے معذور ہیں، اور خطا کار مجتہد کی طرح مواخذہ سے بری ہیں لیکن ان کے مقلدوں کے ساتھ قیامت کے روز معلوم نہیں کس طرح معاملہ کریں۔“²

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے وحدت الوجود کے بالمقابل وحدت الشہود کا نظریہ پیش

¹ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، حصہ دوم، مولانا سید زوار حسین شاہ، مکتبہ

مجددیہ، کراچی، مکتوب 272، ص 310

² ایضاً: ص 314

کیا کہ جس کے بارے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں حالانکہ دونوں میں جوہری فرق موجود ہے۔ شیخ ابن عربی کا کہنا ہے کہ مخلوق کی حقیقت علم الہی میں موجود ”اعیان ثابتہ“ ہیں جبکہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ مخلوق کی حقیقت اسمائے الہیہ کے ”اعدام متقابلہ“ ہیں کہ اس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مخلوق کے وجود کو اللہ کی صفت علم کے رستے اللہ ہی کا وجود قرار دینے کی بحث سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا۔

شیخ ابن عربی اور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ میں اس لحاظ سے موافقت ہے کہ وجود ایک ہے لیکن مخلوق کے وجود کی حقیقت کیا ہے تو اس بارے ان کا اختلاف زمین و آسمان کا اختلاف ہے۔ شیخ ابن عربی کے ہاں مخلوق کا وجود اور خالق کا وجود ایک ہی وجود ہے جبکہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں وجود خالق کا ہی ہے اور مخلوق کے وجود کی حقیقت، عدم ہے۔ شیخ ابن عربی کے ہاں حقائق موجودات، اعیان ہیں جبکہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حقائق موجودات، اعدام ہیں۔¹

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے جو ابحاث ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نقطہ نظر میں اس بارے کافی ارتقا ہوا تھا اور اس بارے ایک مستقل تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے کہ جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ شروع میں وہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں نظریات کو درست سمجھتے تھے۔ بعد میں صرف وحدت الشہود ہی کو درست سمجھتے رہے۔ اور آخر وقت میں تو علما اور فقہاء کے موقف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

ہماری رائے یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے وحدت الشہود کا جو نظریہ پیش فرمایا تو یہ اہل تصوف کو وحدت الوجود کے کفریہ نظریہ کے غلبے سے باہر نکالنے کی ایک مؤثر تدبیر تھی نہ کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر وحدت الوجود کی جگہ

¹ وجود باری تعالیٰ کے بارے فلاسفہ، متکلمین، صوفیاء، فقہاء اور محدثین کے کیا کیا موقف ہیں اور ان میں کیا باہمی اختلاف ہے، اس بارے چار اقساط میں ہمارا تفصیلی مقالہ سہ ماہی حکمت قرآن اکتوبر تا دسمبر 2015ء اور بعد کے شمارہ جات میں ملاحظہ فرمائیں۔

وحدت الشہود کے نظریے کو رواج دینا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ عقیدے میں اشعری المسلک ہیں اور اشاعرہ کا توحید اسما و صفات میں جو موقف ہے، وہ وحدت الوجود کے تو خلاف ہے ہی جبکہ وحدت الشہود سے بھی میل نہیں کھاتا۔ وجود کے بارے سلفی، ماتریدی اور اشعری موقف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ وجود دو قسم پر ہے: واجب الوجود اور ممکن الوجود۔ پہلا خالق کا وجود ہے اور دوسرا مخلوق کا ہے۔ اور وجود کے بارے یہی موقف جمیع فقہاء، محدثین، متکلمین، اور متقدمین صوفیاء کا ہے۔

فتاویٰ عزیزی، از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، صفحہ 125 پر کسی سائل نے سوال پوچھا: مسئلہ وحدت وجود میں علما کرام کیا فرماتے ہیں۔ جو مسلمان عاقل بالغ وحدت وجود کا اعتقاد رکھے اور یہ کہے کہ ہمہ اُوست یعنی سب وہی اللہ تعالیٰ ہے تو اس کلام سے وہ مسلمان کافر ہو جائے گا۔ یا نہیں؟ آپ علما کرام اس مسئلہ کا جواب فرمائیں۔

جواب: وحدت وجود اور ہمہ اُوست کا ظاہر معنی خلاف شرع ہے۔ جو شخص اس کا قائل ہوا گراس کا اعتقاد ہو کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں میں حلول فرمایا ہے۔ یا اس شخص کا عقیدہ ہو کہ تمام اشیاء ذات مقدس کے ساتھ متحد ہے تو اس کلام سے کفر لازم آتا ہے... مسئلہ وحدت وجود کا ذکر شرع میں صراحتہ نہیں، مسئلہ وحدت وجود کی تصریح نہ قرآن شریف میں ہے، نہ حدیث شریف میں ہے۔ مسئلہ وحدت وجود کی بنا حضرات صوفیاء کے صرف کشف و شہود پر ہے۔ صفحہ 148 پر لکھتے ہیں، عوام کو اس مسئلہ کی تلقین کرنا گویا الحاد کا دروازہ کھولنا ہے۔

تجدید تصوف اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

تصوف کے ہزار سالہ لٹریچر کے مطالعہ کے بعد جب کوئی شخص مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ان تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے جو تصوف کی اصلاح میں لکھی گئی ہیں تو فکر صالح اور علم راسخ ہو تو بلاشبہ اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ اگر تصوف کے ادارے کو دو چار اور حکیم الامت رحمہ اللہ مل جاتے تو یہ تصوف خیر القرون کے منہجر پر استوار ہو جاتا لیکن افسوس کہ ان کے خلفاء میں سے کسی میں وہ شجاعت نہیں ہے کہ وہ ان کی اصلاح تصوف

کی تحریک کو دو چار قدم ہی آگے لے جائے۔

تصوف کے ادارے کی تاریخ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑی شخصیت ہیں اور شیخ ابن عربی وغیرہ توان کے آگے کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ وہ توشاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بڑے آدمی ہیں۔ مثلاً جو عاجزی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں نظر آتی ہے، وہ شیخ ابن عربی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اور یہ وہی عاجزی ہے جو ہمیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ ماثورہ میں نظر آتی ہے۔ اپنے آپ کو خاتم اولیا کہنا اور قطب عالم ہونے کا دعویٰ کرنا، نبوی مزاج تھوڑا ہے؟

جہاں تک علوم دینیہ کی بات ہے تو بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت بڑی شخصیت ہیں جبکہ تزکیہ اور اخلاق ایک دوسرا میدان ہے۔ اس میدان میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات اور مقام حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات اور مقام سے بہت بڑھ کر ہے۔ اگر موازنہ کرنا چاہیں تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ”فیوض الحرمین“ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ”شریعت اور طریقت“ پڑھ کر دیکھ لیں۔ پس فقہی مسائل میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے اور اصلاح نفس کے ذرائع میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔

بعض دوستوں نے اس تحریر پر تبصرہ کیا کہ آپ نے یہ کیا ظلم کیا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر ترجیح دے دی۔ اس بارے ہمیں یہی کہنا ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کے ذہنوں میں علما اور اولیا کے مقام اور مرتبے کی ایک درجہ بندی (hierarchy) قائم ہے اور اس درجہ بندی پر لوگ اسی طرح ایمان رکھتے ہیں کہ جس طرح نیویں پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ معلوم نہیں آخرت میں کس کا کیا مقام ہو؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے ہاں کسی دیہاتی ان پڑھ متقی شخص کا مقام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر ہو؟

تصوف کے بارے ایک غلط بحث

ایک صاحب علم دوست نے اپنی ایک تحریر میں مروجہ تصوف میں تزکیہ کے طریقوں اور مشقوں کو علوم دینیہ کے حصول کے ذرائع سے تشبیہ دے کر یہ سوال پیدا کیا ہے کہ بتلائیں تو سہی دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک جائز اور دوسرا ناجائز؟

عرض یہ ہے کہ بدعت دین میں اس اضافے کو کہتے ہیں کہ جس کا مقصود تقرب الی اللہ ہو۔ اور ضرب یضرب کی گردان کسی عالم دین نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ نہ تو بتلائی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لیے سکھائی جاتی ہے جبکہ مراقبہ اور لطائف کا صریح مقصد تقرب الی اللہ ہی بتلایا جاتا ہے اور اسی مقصد سے ان کی مشق کروائی جاتی ہے۔

تقرب الی اللہ کے ذرائع وہی ہیں جو خود اللہ کے دین نے متعین کر دیے ہیں نہ کہ وہ جنہیں انسان متعین کرے۔ اگر تقرب الی اللہ کے ذرائع انسانوں پر چھوڑ دیے جائیں تو ہر مذہب، چاہے وہ سماوی ہو یا غیر سماوی، کا مقدمہ ثابت ہو جائے گا۔ سماوی مذاہب، چاہے یہودیت ہو یا عیسائیت، کا بنیادی دعویٰ تقرب الی اللہ ہی کا ہے۔ آسمانی مذاہب میں فرق تو سارا ذرائع ہی سے پڑا ہے کہ اللہ عز و جل تک پہنچانے والے رستے اور طریقے کون سے ہیں، اس میں اختلاف ہے، ورنہ مقصود تو سب کے ہاں ایک ہی ہے۔

علم اصول فقہ اور مصطلحات تصوف

ایک دوست کا کہنا ہے کہ جس طرح علما نے اصول فقہ کی اصطلاحات مرتب کیں، اسی طرح صوفیاء نے تصوف کی اصطلاحات وضع کیں۔ ہماری رائے میں علما اور صوفیاء کے کام میں ایک بڑا فرق ہے کہ اصولیین نہ صرف بڑا دماغ تھے بلکہ کتاب و سنت میں رسوخ بھی رکھتے تھے اور ان دو بنیادوں پر انہوں نے اپنے مدون کردہ علم کو کتاب و سنت کے دلائل سے آخری درجے میں ثابت کر کے دکھا دیا۔ مثال کے طور پر علامہ آمدی رحمہ اللہ کی ”الإحکام“ اور امام زرکشی رحمہ اللہ کی ”البحر المحیط“ میں سے چند مباحث کا مطالعہ کر لیں۔

دوسری طرف اہل تصوف نے تصوف کی مصطلحات کی ایک ڈکشنری تو بنادی لیکن

ان اصطلاحات کو کتاب و سنت سے ثابت کرنا تو کجا اشارتاً جوڑنے میں بھی نہ صرف بری طرح ناکام ہیں بلکہ ہر دور میں یہ تسلیم کرتے نظر آتے ہیں کہ ہماری مصطلحات کا ماخذ کشف و وجدان ہے نہ کہ کتاب و سنت۔ مثال کے طور محمد شاہ ذوقی صاحب کی ”سر دلبراں“ کو دیکھ جاسکتا ہے۔ عصر حاضر میں تصوف کا مجدد ہے وہ شخص جو تصوف کی کوئی ایسی لغت مرتب کر دے کہ جس میں تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے ضمن میں کتاب و سنت کی اصطلاحات کو بنیاد بنایا گیا ہو۔

مثال کے طور اللہ عزوجل نے اپنے نیک بندوں کے لیے قرآن مجید میں جو اصطلاحات استعمال کی ہیں، وہ صدیقین، شہداء، مسلمین، مومنین، محسنین، صالحین، مصلحین، متقین، صادقین، خاشعین، قانتین، مقربین، ربانین، مہتدین، عابدین، مفلحین، اولیاء اللہ، عباد الرحمن وغیرہ جیسی اصطلاحات ہیں۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ان اصطلاحات میں ”اہل اللہ“ اور ”أصحاب القرآن“ جیسی اصطلاحات کا اضافہ کیا ہے۔ اور صوفیاء کے ہاں معروف غوث، قطب، ابدال، اوتاد اور قلندر وغیرہ کی اصطلاحات نہ تو قرآن مجید میں موجود ہیں اور نہ ہی ان کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نقل ہوا ہے اور نہ ہی ان کے مقام اور مرتبے کے بارے کوئی مستند شیعہ روایت کی گئی ہے لہذا ان اصطلاحات کی حیثیت چند ناموں سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔

تزکیہ نفس کے سلفی منہج میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا اصطلاحات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا اہل بننے کے لیے مجاہدہ کیا جائے گا۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ان اصطلاحات کا استعمال کرتے ہوئے ان کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں جیسا کہ عباد الرحمن ان بندوں کو کہا گیا ہے کہ جن میں دس صفات پائی جاتی ہوں۔ اور ان لوگوں کا مقام اور مرتبہ بھی قرآن مجید ہی میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جن میں یہ صفات ہوں۔ سلفی منہج پر اخلاق و رذائل اور تزکیہ و اصلاح کی ڈکشنری دیکھنی ہو تو وہ بارہ جلدوں میں ”نضرۃ النعمیم فی مکارم أخلاق الرسول الکریم“ ہے۔

کتاب تصوف کی اصلاح اور تہذیب

تصوف کی کتابوں میں، اگرچہ ان میں سے بعض کے مصنفین بہت بڑا نام رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان میں ایسی بیہودہ حکایتیں، بے سرو پا کہانیاں اور الف لیلوٰی داستانیں نقل ہو گئی ہیں کہ جنہیں پڑھ کر خود اس کے ماننے والوں کے ہاں تصوف کے بارے کسی فخر کی بجائے شرمندگی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تصوف سے محبت رکھنے والوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تصوف کے خلاف معاصر سلفی تحریک بے بنیاد نہیں ہے کہ عالم عرب میں تصوف مخالف کتابوں کا ایک سیلاب ہے، جو دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس تحریک سے اہل تصوف کا مکمل اتفاق نہ سہی لیکن اس کی بعض باتیں ان کے ہاں بھی بہت وزن رکھتی ہیں کہ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کتب تصوف فحش مواد، الف لیلوٰی داستانوں اور بے سرو پا ساطیر سے بھری پڑی ہیں۔

ہر روایت کو اصلاح کی ضرورت رہتی ہے اور تصوف کی روایت کو تو بہت زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ان کا میدان اور تخصص ہی یہی ہے۔ اہل تصوف کو چاہیے کہ تصوف کے لٹریچر کی تہذیب اور تنقیح کر کے اس کو از سر نو اس طرح مرتب کریں کہ اخلاق اور رذائل کی بحثیں اس کا اصل موضوع قرار پائیں۔ اور اہل تصوف میں سے جو شخص یہ کام کرے گا، وہی اس میدان کا مجدد قرار پائے گا۔

ہم نے جب بعض صوفیاء کے حق میں کلمہ خیر کہا تو انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایک طالب نے ہمیں کتاب ”ارواحِ ثلاثہ“ سے ایک انتہائی گھٹیا اور فحش حکایت کو اسکین شدہ صفحہ پر بھیج کر یہ سوال کیا کہ کیا آپ اس قسم کے تصوف کی اصلاح میں وقت ضائع کر رہے ہیں؟ ایسی حکایتوں کا تو کسی شریف آدمی کے لیے پڑھنا بھی مشکل ہے کہ جنہیں اولیاء اللہ کے کارناموں کے طور نقل کر دیا گیا ہے۔ اس حکایت کے مطابق ایک نابینا صوفی سید شاہ صاحب اپنے ایک مرید کے ساتھ بازار سے گزر رہے تھے کہ کہیں شور کی آواز سنی اور اپنے مرید سے کہا کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کہ کیا معاملہ ہے؟ مرید گیا اور واپس آ کر عرض کی:

”حضرت ایک فقیر بیٹھا ہوا ہے اور اپنے عضو تناسل کو تانے ہوئے اور اس میں ڈورا باندھے ہوئے ہے۔ اور یہ کہہ رہا ہے کہ نعوذ باللہ یہ الف ہے اللہ کا شاہ صاحب نے فرمایا کہ جاؤ اور اس کی کمر میں اتنی زور سے لات مارو کہ وہ گر پڑے۔ اور کہو اب بے وحدت خود منڈے، کیا بکتا ہے۔ الف خالی ہوتا ہے اور اس کے نیچے دو کتے ہیں... غرض ان حکمتوں سے شاہ صاحب نے باطل کو شکست دی۔“¹

یہ بات درست ہے کہ بعض کتب تصوف کی اصلاح ممکن نہیں ہے کہ ان میں غالب طور شر موجود ہے لہذا ایسی کتابوں کی اشاعت منکرات میں سے ہے۔ اور ”ارواحِ ثلاثہ“ تو اس بارے کچھ بھی نہیں ہے، اگر ”تذکرہ غوثیہ“ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ ہمارے اولیاء نے اپنی کرامات میں یونان کے دیوتاؤں اور ہندوؤں کے خداؤں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ شاہ گل حسن قادری صاحب لکھتے ہیں کہ

”ایک باباجی میں یہ کمال تھا کہ جو بات منہ سے نکالتا، وہی ہو جاتی۔ راجہ نے اس سے پوچھا کہ مہاراج آپ کو یہ کمال کیونکر حاصل ہوا۔ اُس نے جواب دیا کہ میں بارہ برس سے اپنا پیشاب پاخانہ کھاتا پیتا ہوں۔ اُسی کی بدولت میری زبان کو یہ تاثیر ہے کہ ایک فقیر کو بادشاہ یا راجہ کہہ دوں تو فوراً ہو جاوے۔“²

ہمارے ایک تبلیغی دوست کا کہنا ہے کہ عجیب بات ہے جب سے ہوائی جہاز بنا ہے، ہمارے اولیاء نے ہوائیں اڑنا چھوڑ دیا ہے۔ بھئی! اولیاء اللہ کسی زمانے میں ہوا میں نہیں اڑتے تھے، یہ جھوٹی کہانیاں ہیں جو اولیاء اللہ کے مقام اور مرتبے میں مبالغہ کرنے کے لیے گھڑ کر پھیلا دی گئی ہیں، ورنہ تو آج اُن کے اڑنے میں کیا رکاوٹ قائم ہے؟ اور جو اڑتے تھے، وہ بھی شعبہ باز تھے، نہ کہ اولیاء اللہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر کوئی اللہ کا ولی ہو سکتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی ہوا میں نہیں اڑتا تھا۔

اور عرض یہ ہے کہ ہم ”ارواحِ ثلاثہ“ جیسی کتابوں کے پڑھنے کے نہ خود قائل ہیں

¹ اشرف علی تھانوی، مولانا، ارواحِ ثلاثہ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص 37

² شاہ گل حسن قادری، مولوی، تذکرہ غوثیہ، ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور، ص 349

اور نہ ہی کسی کو اس کی ترغیب دیتے ہیں اور اگر آپ نے صوفیا کی کتابیں پڑھنی ہی ہیں تو ان کتابوں کو پڑھیں کہ جن کا موضوع اخلاق اور رذائل ہیں۔ آپ ”شریعت و طریقت“ جیسی کتابوں کا مطالعہ کر لیا کریں۔¹ ”ارواحِ ثلاثہ“ اور ”نذکرہ غوثیہ“ جیسی کتابیں اصلاحِ نفس کی بجائے اساطیر (Mythology) کی کتابیں ہیں۔ صوفیا کی اساطیر پر ہندوانہ اور یونانی اساطیر (Greek Mythology) کا کیسے اور کتنا اثر رہا ہے، اس بارے تحقیق کرنی ہو تو ان کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک حنفی صوفی سے مکالمہ

صوفیا کی مجالس میں شرکت کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ایک دفعہ ایک دوست کی وساطت سے ایک حنفی المسلک صوفی صاحب سے ملاقات ہوئی جو کہ بیعت لیتے تھے۔ دوران ملاقات انہوں نے کہا کہ تزکیہ نفس کے لیے بیعت کرنا فرض ہے۔ اور بیعت کے بغیر زکیہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے عرض کی کہ کیا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تزکیہ ہوا تھا؟ جناب خاموش ہو گئے، مرتے کیانہ کرتے، جواب دیا کہ ہوا تھا۔ میں نے کہا ان کی بیعت کس سے تھی؟ وجد میں آگئے اور اسی وجد کی کیفیت میں مجھے مسجد کے دروازے تک پہنچانے آئے۔ میں نے جاتے جاتے عرض کیا کہ میں اسی طرح اپنا تزکیہ چاہتا ہوں جیسا کہ امام صاحب اور ان کے شاگردوں قاضی ابویوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا۔

¹ شریعت و طریقت کے نام سے دو کتابیں معروف ہیں اور دونوں کا مطالعہ ضروری ہے کہ دونوں بڑے علماء کی ہیں اور دونوں کتابیں تصوف کا ایک رخ پیش کر رہی ہیں۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اس نام سے ایک کتاب مولانا عبد الرحمن کیلانی رحمہ اللہ کی ہے جبکہ دوسری مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ہے۔ کیلانی صاحب کی کتاب میں تصوف میں غالب پہلو شر کو قرار دیا گیا ہے جبکہ تھانوی صاحب کی کتاب میں تصوف میں غالب پہلو خیر کو قرار دیا گیا ہے۔ سلفیوں نے شر کے پہلو کی بنا پر اس کا رد کیا جبکہ صوفیوں نے خیر کے پہلو کی بنا پر اس کا دفاع کیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کے نام سے جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے، اس میں خبر بھی ہے اور شر بھی۔ تصوف میں احسان، اخلاق و رذائل اور افعال القلوب کے بارے جو ابحاث موجود ہیں، وہ اس کا خیر کا پہلو ہے اور وحدت الوجود، صوفیاء کی شطحیات اور حکایات اولیاء کے حوالے سے اس میں جو بحثیں موجود ہیں تو وہ شر کا پہلو ہیں۔

اللہ کے دین میں کسی شے کو فرض اور حرام قرار دینے کے لیے ایسی دلیل چاہیے کہ جو واضح اور دو ٹوک ہو۔ بہت سے علماء اور بہت سے صوفیا بہت سی ایسی چیزوں کو فرض یا حرام قرار دے دیتے ہیں کہ جس کے فرض یا حرام ہونے کی کوئی صریح دلیل شریعت میں موجود نہیں ہوتی ہے۔ اللہ عز و جل نے اسے اپنے اوپر بہتان قرار دیا ہے کہ اللہ کے دین میں کسی ایسی شے کو فرض یا حرام قرار دے دیا جائے کہ جس کی فرضیت اور حرمت کے بارے اللہ نے کوئی واضح حکم نازل نہ کیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَقْتُلُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾ [النحل: 116]

”اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے بہتان باندھتے ہیں وہ ہر گز فلاح نہیں پائیں گے۔“

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”إعلام الموقعين عن رب العالمين“ کے نام سے مرتب کی ہے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے تنبیہ کہ جو رب العالمین کی طرف سے دستخط کرنے والے ہیں۔ علماء اور مفتیان کرام جب کوئی فتویٰ جاری کرتے ہیں تو وہ یہ دعویٰ کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارے فتویٰ میں جو بات ہے، وہ رب العالمین کا دین ہے لہذا انہیں فتویٰ دیتے ہوئے بہت زیادہ ڈرنا چاہیے کہ فتویٰ دراصل رب العالمین کی طرف سے دستخط کرنے کے مترادف ہے اور یہ دستخط اسی صورت ہونے چاہئیں جبکہ قیامت والے دن انسان ان دستخطوں کی توجیہ بیان (justify) کر سکنے کے قابل ہو۔

تصوف کا وکیل

جب بھی اپنے معزز اور قابل احترام دوستوں سے تصوف کے کسی پہلو پر گفتگو ہوتی ہے تو وہ یوں کہتے ہیں کہ یہ لطائف اور مراقبہ پر آپ نے اعتراض کیا تو بھائی یہ تو صوفیا کے نزدیک ذریعہ ہیں، مقصود ہر گز نہیں ہیں۔ اور رہی بیعت تو بھائی یہ لازم نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی تزکیہ ہو جاتا ہے۔ رہا وحدت الوجود اور وحدت الشہود! اے میرے بھائی! یہ

تصوف کی بحثیں کہاں ہیں؟ ان کو کہاں تصوف میں گھسیڑ لائے ہو؟۔ اور سماع؟ بھائی! اس میں تو خود صوفیوں میں اختلاف ہے۔ اچھا تو یہ تصور شیخ کیا ہے؟ بھی! یہ تو ذہنی یکسوئی کا ایک ذریعہ ہے، بس!، اور صوفیا کی شطیحات؟ تو ان کا رد تو خود صوفیا بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور صوفیا کے بارے یہ دیومالائی حکایتیں اور کہانیاں؟ اوہو، یہ تو مریدوں کی محبت ہے، اور تھوڑا بہت غلو ہے، بس! وغیرہ وغیرہ

بھائی! اگر آپ ایسے تصوف کے داعی ہیں کہ جس میں مراقبہ، لطائف، بیعت، وحدت الوجود، وحدت الشہود، ذکر جہری، پاس انفاس، تصور شیخ، شطیحات، حکایات، وجد اور سماع وغیرہ کے بغیر بھی تزکیہ ہو جاتا ہے تو آپ ان کے بغیر تزکیہ نفس کے لیے تصوف کی مہم چلائیں، میں آپ کے ایسے تصوف کا زبردست وکیل ہوں....

کیا ایسا تصوف موجود ہے؟ تو ہماری رائے میں تو تصوف کا یہ ورژن بھی موجود ہے اور یہ تبلیغی جماعت میں ہے۔ اگر تبلیغی جماعت کے نصاب میں سے کچھ حکایات نکال دی جائیں، تو یہ وہی تصوف ہے کہ جو مطلوب ہو سکتا ہے کہ نیکی کا شوق کرنے والے لوگ ہیں جو دوسروں کو بھی نیکی کی ترغیب دے رہے ہیں۔

تصوف اور تاریخ اسلام

ایک صاحب علم دوست نے سوال کیا کہ اگر تصوف کو اسلام کی تاریخ سے نکال دیا جائے تو کتنا اسلام باقی رہ جائے گا؟ ہمیں یہ کہنا ہے کہ اس قسم کے سوالات سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے جمیع فقہاء، محدثین اور اصولیین صوفی تھے حالانکہ خیر القرون میں تصوف کی اصطلاح ہی موجود نہیں تھی۔

پس اس سوال کے جواب میں عرض یہی ہے کہ اگر ہم تصوف کے حاملین کو تاریخ اسلام سے نکال دیں تو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام رضی اللہ عنہم، تابعین تابعین رضی اللہ عنہم، امام ابو حنیفہ، قاضی ابویوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابن جریر طبری، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام ابوالحسن الاشعری، امام ابو منصور ماتریدی، امام ابن حزم ظاہری رضی اللہ عنہم.... بہت لمبی فہرست ہے جو

باقی بچ جاتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ بیان کر دیا جائے جو نکل جاتا ہے۔
 کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تصوف کی حمایت کا یہ انداز سطحی ہے۔ متوازن رویہ یہ ہے کہ
 آپ اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتے ہوئے یہ کہنے کی جرات کر سکیں کہ اصل تصوف،
 عبادت میں احسان، اخلاق و رذائل اور افعال القلوب کی بخشش ہیں اور باقی سب تماشا یا
 دکانداری ہے۔



باب نہم اصلاح علماء

اس باب میں اصلاح علماء کے ضمن میں فتویٰ سے اصلاح معاشرہ،
فقاہت کی تعریف، غیر نافع علم، فقہی جمود، فقہی حیلے اور علم
کی فضیلت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اہل فتویٰ کی خدمت میں

فتویٰ کا لفظ فتوة سے نکلا ہے کہ جس کے عربی زبان میں معانی نوجوانی کے ہیں۔¹ فتویٰ کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی غلط سوچ یا عملی بگاڑ کی وجہ سے مسلم معاشرہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے کمزور ہو رہا ہے تو کسی قانونی اور فقہی رائے کے بیان کے ذریعے معاشرے کو دوبارہ سے جوان اور توانا کر دیا جائے۔ سلف صالحین اور متاخرین کے فتویٰ کے اسلوب میں یہ نمایاں فرق نظر آتا ہے کہ سلف کے ہاں قانونی بحث میں بھی تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ کے پہلو (aspects) کو ملحوظ رکھا جاتا تھا جبکہ متاخرین میں یہ خشک قانونی بحثیں ہیں کہ جن کا مقصد یا تو دوسرے مسلک کے علما پر لعن طعن کرنا ہے یا لوگوں کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مشکل حل تجویز کرنا ہے کہ جس سے وہ شریعت کی رخصتوں کو انجوائے کرنے کے بجائے اس کے بارے وحشت میں مبتلا رہیں۔ مطر وراق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس بارے جو مناسب سمجھا، جواب دے دیا۔ میں نے کہا:

يَا أَبَا سَعِيدٍ يَا بَنِي عَلَيْنِكَ الْفَقَهَاءُ وَيَخَالِفُونَكَ ، فَقَالَ: «تَكِلْنِكَ أُمُّكَ مَطَرٌ ، وَهَلْ رَأَيْتَ فَقِيهًا قَطُّ؟ وَهَلْ تَدْرِي مَا الْفَقِيهَةُ؟ الْفَقِيهَةُ الْوَرَعُ الرَّاهِدُ الَّذِي لَا يَسْخَرُ مِمَّنْ أَسْفَلَ مِنْهُ ، وَلَا يَهْمُزُ مَنْ فَوْقَهُ ، وَلَا يَأْخُذُ عَلَى عِلْمٍ عَلَّمَهُ اللَّهُ حُطَاءً»²

”اے ابوسعید! فقہا تو اس مسئلے میں آپ کا رد اور مخالفت کرتے ہیں۔ تو حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: اے مطر! تیری ماں تجھے گم پائے، کیا تم کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ اور تجھے معلوم ہے کہ فقیہ کسے کہتے ہیں؟ فقیہ تو وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا اور دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا ہے۔ جو اپنے سے کم علم رکھنے والوں کا مذاق نہیں اڑاتا اور اپنے سے بڑے علما کو لعن طعن نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس علم کے

¹ الزَّيْدِي، مُحَمَّد بن مُحَمَّد بن عبد الرزاق الحسيني، تاج العروس من جواهر القاموس، دار الهداية، 39:

213-212

² الأَجَرِيُّ، أبو بكر محمد بن الحسين بن عبد الله البغدادی، أخلاق العلماء، رئاسة إدارات البحوث

العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، السعودية، ص 74-75

ذریعے کہ جو اللہ نے اسے عطا کیا ہے، وہ لوگوں کو رکھتا ہے۔“

معاصر مفتی حضرات کے فتاویٰ پڑھ کر ایک چیز کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ اصلاح معاشرہ ہے۔ گویا کہ فتاویٰ کے مقاصد میں اصلاح معاشرہ غائب ہے اور محض قانونی اور فقہی نکتے باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً طلاق کے مسئلہ کو لے لیں۔ حنفی فقہ میں ایک مجلس کی تین طلاقیں بدعت ہیں لیکن واقع ہو جاتی ہیں۔ واقع ہو جانا تو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے لیکن جہاں تک بدعت ہونے کی بات ہے تو شاذ و نادر ہی آپ کی نظر سے کوئی ایسا فتویٰ گزرے کہ جس میں بیک وقت دی گئی تین طلاق کے واقع ہو جانے سے پہلے اس عمل کے بدعت ہونے، اس کے حرام ہونے، اس کی شناعت و برائی اور یا اس کے بارے میں تحذیر اور نکیر موجود ہو تا کہ سوسائٹی کی اصلاح ہو سکے۔

اب مفتی صاحب یہ فتویٰ تو جاری کر دیتے ہیں کہ طلاق ہو گئی ہے لیکن یہ نہیں بتلاتے کہ یہ کام بدعت تھا، ناجائز تھا، یا جو بھی حنفی فقہ میں مقام ہے وہ تبادیل جائے۔ فتویٰ جو کہ اصلاح معاشرہ کا ایک ذریعہ تھا، آج بد قسمتی سے معاشرے میں دین سے وحشت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ اور پھر جو کام شریعت میں ناجائز ہوتے ہیں، ان کے بتلانے میں بھی نبوی شفقت، نرمی اور حکمت کا پہلو مد نظر نہیں رکھا جاتا بلکہ فتاویٰ کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے جیسے لوگوں کی گردنوں پر تلوار لٹکا دی گئی ہو۔ کئی لوگ کسی دینی مسئلے میں رہنمائی کے لیے جب مجھ سے رابطہ کرتے ہیں تو میں انہیں کسی دارالعلوم کی طرف بھیجتا چاہتا ہوں تو ان پر خوف کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم وہاں ہمارے ساتھ کیسا سلوک ہو۔ عام آدمی کا خیال یہی ہے کہ اگر میں اپنے کسی گناہ کا کفارہ معلوم کرنے کے لیے کسی دارالافتاء سے رہنمائی لینا چاہوں گا تو کم از کم جو فتویٰ مجھے ملے گا، وہ جہنمی ہونے کا ہے اور زیادہ تر میں تو کچھ بھی داخل ہو سکتا ہے۔

اس طرح ہمارے علمائے یہ جو نکتے اٹھائے ہیں کہ کیا ایک چور جو چوری کرنے کے لیے سفر پر نکلا ہے، وہ نماز میں قصر کر سکتا ہے یا نہیں، ان میں توازن موجود نہیں ہے۔

ہمارے علما کو ایسے سوالات کو سنجیدہ ہی لینا چاہیے۔ اب اگر ہم چور کے بارے یہ بحث تو کتاب و سنت کی روشنی میں کریں کہ وہ شرعاً مسافر ہے یا نہیں اور اس کے لیے نماز قصر ہوگی یا نہیں؟ اور متعلقہ فتویٰ میں اس کی چوری کی برائی کے بارے کوئی لفظ موجود نہ ہو تو یہ ایک غیر متوازن رویہ کھلائے گا۔ اس قسم کے مسائل میں اگر مفتی کو جواب دینا ہو تو سب سے پہلے نرمی، حکمت اور دوستی کے لب و لہجے میں شرعی حکم کی خلاف ورزی پر متنبہ کرے اور پھر دو چار لائنوں میں جو جواب متعلقہ مسئلے کا اس کی رائے میں بنتا ہے، وہ دے دے۔

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ مزدوری کرنے والی عورتوں کے لیے پردے کے احکامات میں رخصت کا پہلو موجود ہے۔ پردہ یا حجاب تو بعد کی بات ہے، پہلے یہ واضح کریں کہ عورتوں کا کھیتوں میں کام کرنا یا بھٹے پر مزدوری کرنا یا سڑکوں پر روڑی کوٹنا ان پر ظلم ہے اور یہ ان کے مرد، ولی، سرپرست، معاشرے اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سے اس ظلم کو دور کرے اور انہیں ان کے بنیادی حقوق فراہم کرے۔ اب مفتی صاحب اس تمہید کے بعد اگر ایک دو لائنوں میں متعلقہ مسئلہ میں کوئی رائے دے دیں کہ بھئی اب وہ بیچاری مجبور ہے تو کوئی حرج نہیں کہ ایسا کر لے یا ویسا کر لے تو یہ رویہ متوازن کھلائے گا۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ ہم علم اخلاق اور اصلاح نفس کی روشنی میں ایک فتاویٰ مرتب کریں کہ یہ شرعی احکام کو دیکھنے کی پانچویں جہت (fifth dimension) ہے کہ جسے عرصہ دراز سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ پہلی تین جہتیں، کتاب اللہ، سنت رسول، اصول فقہ اور مقاصد شریعت کی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حنفیہ میں مفتی بہ قول یہی ہے کہ لڑکی کا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کفو اور برابر میں جائز اور غیر کفو میں ناجائز ہے لیکن عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مفتی صاحب کورٹ میرج، کہ جس سے ہماری مراد ولی کے بغیر نکاح ہے، سے متعلق مسائل میں جواز کے بارے فتویٰ جاری کرتے ہوئے معاشرتی اقدار اور

اصلاح معاشرہ کے پہلو کو بالکل بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ اگر کسی لڑکی نے اپنے گھر سے بھاگ کر کفو اور برابری میں کسی لڑکے سے نکاح کر لیا ہے تو فقہی طور تو مفتی صاحب یہی کہیں گے کہ فقہ حنفی میں جائز ہے یا اس کے جواز کے یہ دلائل ہیں لیکن اس فتویٰ میں کہیں یہ موجود نہ ہو گا کہ متعلقہ لڑکے اور لڑکی کی جن حرکتوں (activities) کا نتیجہ کورٹ میرج کی صورت میں نکلا ہے، وہ فقہ حنفی میں بھی قانونی طور حرام ہیں۔ لڑکا اور لڑکی کسی اتفاق (by chance) سے تو کورٹ میں یہ بیان دینے نہیں پہنچ جاتے کہ انہوں نے اپنی آزاد مرضی سے نکاح کیا ہے بلکہ لڑکی کے گھر سے بھاگنے سے پہلے اس کی لڑکے سے موبائل فون وغیرہ پر گھنٹوں بات چیت ہوتی ہے، تنہائی میں ملاقاتیں ہوتی ہیں، پارکوں میں تاریخیں طے (dates) ہوتی ہیں، ہوٹلوں میں اکٹھے کھانا کھایا جاتا ہے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے سے لے کر بوس و کنار تک معلوم نہیں اس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ کون کون سی حدود کو توڑا اور پامال نہیں کیا جاتا؟ پھر کسی لڑکے میں اگر کچھ شرم حیا ہو تو وہ لڑکی سے شادی پر رضامند ہو جاتا ہے ورنہ تو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے اگلی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے معاشروں کا واہیات کلچر ہے کہ جس سے مفتی صاحب بھی واقف ہیں۔ اس پس منظر کے نتیجے میں کہیں لڑکی گھر سے بھاگتی ہے اور کسی یار سے نکاح کر لیتی ہے۔ اب اگر اس کا نکاح فقہ حنفی میں جائز ہے تو کم از کم فتویٰ میں مفتی صاحب کی طرف سے اس پر توتنبیہ ہونی چاہیے کہ نکاح کے انعقاد سے پہلے جو کچھ اس جوڑے نے کیا ہے، وہ ناجائز اور حرام ہے۔

فقیہ کون ہے؟

أَخْبَرَنَا أَبُو بَكْرٍ، أَخْبَرَنَا أَبُو بَكْرٍ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ، أَخْبَرَنَا هَارُونُ الْحَمَّالُ، أَخْبَرَنَا سَيَّارٌ، أَخْبَرَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَانَ، أَخْبَرَنَا مَطَرُ الْوَرَّاقُ قَالَ: سَأَلْتُ الْحَسَنَ عَنْ مَسْأَلَةٍ، فَقَالَ فِيهَا، فَقُلْتُ: يَا أَبَا سَعِيدٍ يَا أَبِي عَلِيٍّ الْفَقْهَاءُ وَيُخَالِفُونَكَ، فَقَالَ: «ثَلَاثُكَ أُمُّكَ مَطَرٌ، وَهَلْ رَأَيْتَ فَقِيهًا قَطُّ؟ وَهَلْ تَدْرِي مَا الْفَقِيهَةُ؟ الْفَقِيهَةُ الْوَرَعُ

الرَّاهِدُ الَّذِي لَا يَسْخَرُ مِمَّنْ أَسْفَلَ مِنْهُ، وَلَا يَهْمُزُ مَنْ فَوْقَهُ، وَلَا يَأْخُذُ عَلَى عِلْمٍ عَلَّمَهُ اللَّهُ حُطَامًا»¹

”ہمیں ابو بکر محمد بن الحسین نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں عبداللہ بن عبدالحمید واسطی نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں ہارون حمال نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں سیار نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں جعفر بن سلیمان نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں مطر وراق نے خبر دی اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس بارے جو مناسب سمجھا، جواب دے دیا۔ میں نے کہا: اے ابو سعید! فقہا تو اس مسئلے میں آپ کا رد اور مخالفت کرتے ہیں۔ تو حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: اے مطر! تیری ماں تجھے گم پائے، کیا تم نے کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ اور تجھے معلوم ہے کہ فقیہ کسے کہتے ہیں؟ فقیہ تو وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا اور دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا ہے۔ جو اپنے سے کم علم رکھنے والوں کا مذاق نہیں اڑاتا اور اپنے سے بڑے علما کو لعن طعن نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس علم کے ذریعے کہ جو اللہ نے اسے عطا کیا ہے، وہ لوگوں کو رگیدتا ہے۔“

سلف صالحین اور آج کی کتابوں میں فرق یہ ہے کہ وہ ہر بات سند سے نقل کرتے تھے یہاں تک کہ اگر انہوں نے کسی صحابی، تابعی، تبع تابعی اور امام کا قول اپنی کسی کتاب میں بیان کرنا ہوتا تھا تو اپنے سے لے کر اس تک مکمل سند بیان کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ محدثین عظام کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں یا متقدمین صلیحی، دونوں نے اقوال کے بیان میں سند کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ جب سند کے بیان کا رواج ختم ہوتا چلا گیا تو مصنفین نے اپنی کتابوں میں اقوال تو کجا احادیث کو بھی بغیر حوالہ درج کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ زمانہ بھی آگیا کہ اپنے من گھڑت نظریات ثابت کرنے کے لیے سلف صالحین، ائمہ دین، متقدمین صلیحی بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی جھوٹی باتیں منسوب کر کے مسلم معاشروں میں رائج کی گئیں۔ معاصر مؤلفین کو قرآن، حدیث اور

¹ أخلاق العلماء: ص 74-75

سلف صالحین کی بات کرتے ہوئے سند نہ سہی کم از کم حوالہ بیان کرنے کا تو اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بہت ہی خوبصورت ہے کہ جس میں انہوں نے فقہات اور علم کے جوہر کو بیان کر دیا ہے اور وہ تقویٰ اور زہد ہے کہ تقویٰ اور زہد کے بغیر تو یہ علم کسی کام کا نہیں، نرا کتابوں کا بوجھ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا الثَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ [الجمعة: 5]

”مثال ان لوگوں کی کہ جنہیں تورات دی گئی اور پھر انہوں نے اسے اٹھانے کا حق ادا نہ کیا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے کہ جس پر کتابوں کا بوجھ لاد لایا گیا ہو۔“

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا یہ ہے کہ ایک فقیہ اور عالم کی فقہت اور علم کا اس وقت پتہ چلتا ہے، جب وہ دوسروں پر نقد کرتا ہے۔ جن پر وہ نقد کرتا ہے، یا تو وہ اس سے علم میں بہتر ہوں گے تو وہ ان کی بے ادبی نہیں کرتا یا وہ اس سے علم میں کم ہوں گے تو وہ ان کا مذاق نہیں اڑاتا۔ چونکہ وہ اپنے علم کو اللہ کی نعمت سمجھتا ہے لہذا اس علم کو دوسروں کی تنقیص اور عیب جوئی کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ کسی فقیہ یا عالم کو یہ صفت اسی صورت حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ متقی اور زہد ہو۔ وہ اپنے علم کے معاملے میں اللہ سے ڈرتا ہو اور اپنے علم کے حوالے سے دنیا سے بے رغبت ہو کہ اس علم کو خود نمائی کا ذریعہ نہ بننے دے۔ کیا خوب فرمایا!

«وَهَلْ رَأَيْتَ فَقِيهًا قَطُّ؟»

”کیا تم نے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟“

غیر نافع علم

پنجاب یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے ایک مشفق استاذ پروفیسر خورشید رضوی صاحب تھے جو صرف و نحو (Arabic Grammar) کی تدوین اور تالیف (compilation) کے بارے ایک خوبصورت مثال پیش کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا

کہ بڑھئی جب خام لکڑی کی تراش خراش سے میز بناتا ہے تو اس میں سے ایک تو میز لکڑی ہے اور دوسرا برادہ (sawdust)۔ اصلاً مقصود تو میز ہی ہوتا ہے لیکن برادہ ساتھ میں مفت حاصل ہو جاتا ہے۔

جب علوم عالیہ یعنی کتاب و سنت کی خدمت کے لیے علوم آلیہ یعنی لغت و منطق، صرف و نحو، بلاغت و کلام وغیرہ کی تدوین کا دور شروع ہوا تو جہاں یہ علوم مدون ہوئے وہاں کتابوں میں کچھ برادہ بھی اکٹھا ہو گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے اس برادے کو ہی اصل علم سمجھ لیا۔

عربی زبان و ادب اور صرف و نحو کی جو کتب مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، ان کی بہت سی اسحاث ایسی ہیں کہ جن کا تعلق کتاب و سنت کے سمجھنے سمجھانے سے نہیں ہے یا عربی سمجھنے سمجھانے سے بھی نہیں ہے جیسا کہ نحو میں توجیہات کا ایک پورا میدان ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مدارس میں درس نظامی کی تدریس میں علوم آلیہ نے علوم عالیہ کی جگہ لے لی۔ پس جتنی منطق اور صرف و نحو پڑھائی جاتی ہے، اُس تناسب سے قرآن اور حدیث نہیں پڑھایا جاتا۔

یہ متوازن رویہ نہیں ہے، اس کو تبدیل ہونا چاہیے کہ جن علوم کو سمجھنے کے لیے صرف نحو، منطق اور بلاغت پڑھتے ہیں، اُن پر سے تو خیر میل کی رفتار سے گزر جائیں اور جو علوم اصلاً مقصود نہ ہوں تو اُن پر آٹھ سال حالت اعتکاف میں گزار دیں۔ ہمیں یونانی منطق اور اختلافی فقہی مسائل سے زیادہ قرآن مجید کی تعلیم کے لیے طلباء کو تیار کرنا چاہیے کہ معاشرے میں جا کر قرآنی بنیادوں پر اصلاح اور دعوت کا کام کریں۔ مدارس سے فارغ ہونے والے اکثر طلباء کو قرآن مجید کا ترجمہ نہیں آتا اگرچہ اختلافی فقہی مسائل کے دلائل خوب اُبز ہوں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ، وَمِنْ

نَفْسٌ لَا تَشْبَعُ، وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا»¹
 ”اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے کہ جس کا کوئی فائدہ نہ ہو، اور
 ایسے دل سے کہ جس میں خشوع نہ ہو، اور ایسے نفس سے کہ جو کبھی سیر نہ ہو،
 اور ایسی دعا سے کہ جو کبھی قبول نہ ہو۔“

فقہی جمود

جامعہ بنوریہ کراچی کی ویب سائٹ پر جامعہ کے دارالافتا سے جاری کردہ ایک فتویٰ دیکھنے کو ملا کہ جس کے مطابق ولی کے بغیر نکاح فقہ حنفی میں جائز لیکن بے غیرتی ہے۔ معلوم نہیں ان مفتی حضرات کو کیا ہو گیا ہے کہ فتویٰ جاری کرتے وقت سوچتے بھی نہیں کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ کیا اس فتویٰ کے ذریعے مفتی صاحب سائل کو یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ فقہ حنفی بے غیرتی کی تعلیم دیتی ہے؟ مفتی حضرات کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ تقلیدی جمود کا شکار ہیں کہ وہ فتاویٰ جو فقہانے ایک خاص ماحول اور وقت میں دیے تھے، وہ آج انہی فتاویٰ کو بعینہ لاگو کیے جا رہے ہیں حالانکہ آج عرف، ماحول اور معاشرہ تبدیل ہو چکا ہے اور بعض کلاسیکل فقہاء کی بعض آرا کو بعینہ جاری کرنے سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ پس مفتی حضرات کی یہ جماعت تقلیدی جمود کی وجہ سے فقہاء کے قول سے بھی باہر نہیں نکل پاتی اور مفتی بہ قول کے مطابق فتویٰ جاری کرنے سے پیدا ہونے والے معاشرتی بگاڑ کا بھی انکار نہیں کر سکتے۔

یہ واضح رہے کہ شریعت اور فقہ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ شریعت کو دوام حاصل ہے جبکہ فہم شریعت یعنی فقہ کو دوام حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ منزل من اللہ نہیں ہے۔ فقہ، شریعت ہی کی سوجھ بوجھ کا نام ہے جو افراد اور حالات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے لہذا کسی خاص فرد اور حالات کے شریعت کے فہم کو قیامت تک کے لیے واجب العمل سمجھنا تقلیدی جمود کی علامت ہے۔

اور اس بارے اصولیین کی رائے کو فقہاء کی رائے پر ترجیح حاصل ہے کہ حکم شرعی

¹ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة، باب التَّوَضُّعِ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلَ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ يَفْعَلْ، 2088/4

نص کا فہم نہیں بلکہ نص کی عبارت ہے کیونکہ نص کے فہم میں تو فقہاء کا اختلاف ہو جاتا ہے لہذا شریعت ایک سے زائد ہو جائے گی جو کہ درست نہیں ہے۔ پس ”أَقِيمُوا الصَّلَاةَ“ حکم شرعی ہے یعنی شریعت ہے اور یہ دائمی ہے اور ان قرآنی الفاظ سے فقہاء کو جو سمجھ آئی ہے، وہ فقہ ہے اور اس میں زمان و مکان کی تبدیلی کی صورت میں اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ یہ فہم شریعت ہے نہ کہ شریعت۔

ان مفتی حضرات کی ایک بڑی غلطی یہ بھی ہے کہ یہ اپنی فقہ کے بنیادی مصادر کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنی فقہ کے ابتدائی مآخذ کا مطالعہ کر لیں تو انہیں وہاں ہی اتنی وسعت مل جائے کہ وہ تقلیدی جمود کے نتیجے میں اس قسم کی شطیحات جاری کرنے کی بجائے اصحاب ترجیح کی طرح فقہی ذخیرے میں سے اُن اقوال کا انتخاب کر کے فتویٰ جاری کریں کہ جن میں معاشرے کی اصلاح کا پہلو نکلتا ہو۔

لڑکی کا نکاح ولی کے بغیر ہوتا ہے یا نہیں، اس بارے فقہ حنفی میں سات اقوال مروی ہیں جیسا کہ شرح ہدایہ فتح القدیر میں یہ ساتوں روایات موجود ہیں۔ دو امام ابو حنیفہ سے ہیں۔ دو امام محمد سے اور تین قاضی ابو یوسف رحمہم اللہ سے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کا موقف یہ ہے کہ باکرہ کا اپنے ولی کے بغیر نکاح کرنا مطلقاً جائز ہے اور یہ ظاہر الروایہ ہے۔ امام صاحب سے مروی دوسری روایت کے مطابق کفو اور برابری میں جائز ہے جبکہ غیر کفو میں نہیں۔ امام محمد رحمہم اللہ سے ایک روایت ہے کہ ولی کی اجازت پر نکاح موقوف ہو جائے گا یعنی ولی کی اجازت دے گا تو منعقد ہو جائے گا اور اگر نہیں دے گا تو باطل رہے گا۔ انہی سے مروی دوسری روایت ہے کہ انہوں نے ظاہر الروایہ کی طرف رجوع کر لیا تھا یعنی ولی کے بغیر نکاح مطلقاً جائز ہے۔ قاضی ابو یوسف رحمہم اللہ کے ایک قول کے مطابق ولی کے بغیر نکاح بہر صورت باطل ہے۔ دوسری روایت ہے کہ کفو اور برابری میں جائز ہے اور غیر کفو میں نہیں۔ تیسری روایت ہے کہ مطلقاً جائز ہے۔ اب یہ ساتوں روایات امام صاحب اور صاحبین سے کتب فقہ میں منقول ہیں۔

اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ امام صاحب اور صاحبین کے متعدد اقوال میں سے پہلا کون سا ہے اور بعد والا کون سا ہے۔ اب اس کے لیے ”اصحاب ترجیح“ کی طرف رجوع کیا گیا۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوا کہ یہ تقرری کون کرے گا کہ فلاں ”اصحاب ترجیح“ میں سے ہے اور فلاں نہیں ہے؟ تو جس نے یہ طے کیا تو اصل تقلید اس کے قول کی ہوئی حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایک صاحب جو حنفی مدرسہ سے دس سال لگا کر مفتی کی ڈگری حاصل کرتے ہیں، آپ انہیں تلفیق کی نہ سہی کم از کم اتنی اجازت تو دیں کہ وہ اپنے مذہب یعنی فقہ حنفی ہی میں موجود مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دے کر سائل کو مسئلہ حل کر سکیں نہ کہ آپ اپنے فقہی ذخیرے میں موجود متنوع اقوال میں سے بھی ایک ہی قول کا پابند بنا کر مفتیوں کو بھی تقلید جامد پر لگا دیں۔ اگر مفتی صاحب نے دس سال لگانے کے بعد بھی اپنے مذہب میں ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کی اہلیت نہیں ہے اور انہوں نے ”فتاویٰ شامی“ دیکھ کر ہی فتویٰ بتلانا ہے تو بہتر یہی تھا کہ فتاویٰ شامی کا آسان فہم اردو ترجمہ اور شرح شائع کر دی جاتی کہ عوام براہ راست استفادہ کر لیتے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ جن مسائل میں ”اصحاب ترجیح“ کوئی ترجیح قائم کر چکے ہیں وہاں اس ترجیح کا ریواز کرنا بھی ممنوع ہے۔ بہر حال اس مسئلے میں اہل ترجیح کا اختلاف ہو گیا کہ متقدم قول کون سا ہے اور متاخر کون سا ہے۔ مثلاً قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے معاملہ میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ متقدم ترین قول ولی کے بغیر مطلقاً نکاح کے جواز کا ہے جبکہ متاخر ترین قول ولی کے بغیر نکاح بہر صورت نہ ہونے کا ہے یعنی امام طحاوی رحمہ اللہ کی ترجیح کے مطابق قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا موقف وہی ہے جو ائمہ ثلاثہ اور اہل الحدیث کا ہے۔ امام سرخسی رحمہ اللہ نے کہا کہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا متقدم قول ولی کہ بغیر بہر صورت نکاح نہ ہونے کا ہے جبکہ متاخر ترین قول ولی کے بغیر مطلقاً نکاح کے جائز ہونے کا ہے۔ پس ان دونوں ”اصحاب ترجیح“ میں اختلاف ہو گیا اور یہ ترجیح قائم کرنے کے لیے دلائل دونوں کے پاس نہیں ہیں۔

اب بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی، اب ایک اور صاحب ترجیح آتے ہیں جو یہ بتلاتے ہیں کہ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی اقوال میں طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی ترجیح میں سے سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی ترجیح کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کچھ معلوم نہیں۔ اب سرخسی کی ترجیح کو ترجیح قرار دینے والے کی بات کو بنیاد بناتے ہوئے قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا موقف متعین ہوتا ہے۔

اس سارے میکازم میں اصل کون ہے؟ وہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ متوفی 1252ھ ہیں جو بلاشبہ بہت راسخ عالم دین ہیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بہر حال نہیں ہیں کہ ان سے اختلاف نہ کیا جاسکے۔ اور معاصر مفتی حضرات ”فتاویٰ شامی“ اور ”فتاویٰ عالمگیری“ سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہی وہ تقلیدی جمود ہے کہ جس کے رد عمل میں برصغیر میں اہل حدیث کی تحریک پیدا ہوئی۔ اور مفتی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں ایک دڑبے سے دوسرے دڑبے میں شامل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں کہ وہ فقہ حنفی چھوڑ کر اہل حدیث ہو جائیں بلکہ ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اہل حدیث کو حنفی فقہاء کے فقہی ذخیرے سے استفادہ کرنا چاہیے اور حنفی علما کو اہل الحدیث اور دیگر فقہی مذاہب کے علمی ذخیرہ سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ کسی مسئلے میں تقابلی فقہی مطالعہ سے اس کے جمیع پہلو کھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ایک معتدل رائے اختیار کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور محدثین کی فقہ، سب اسلامی فقہ ہے اور ہمارے علما کو بغیر کسی تعصب کے اس اسلامی فقہی ذخیرے سے یکساں طور استفادہ کرنا چاہیے۔ اور اس عظیم اسلامی فقہی ذخیرے سے عصر حاضر کے مسائل کا جواب دیا جائے گا تو فتویٰ بہت حد تک معتدل ہو گا۔ اور اگر آپ اس اسلامی فقہی ذخیرے کی کسی ایک شاخ میں اپنے آپ کو محدود کر لیں گے تو پھر اسی قسم کے فتاویٰ سامنے آئیں گے کہ جس کی مثال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

فقہی حیلے

حیلہ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہاں اس سے مراد قانونی چالاکي ہے۔ قوموں کی تاریخ

میں یہ عادت بہت پرانی چلی آرہی ہے کہ اللہ عزوجل کے احکامات کو پس پشت ڈالنے کے لیے چالاکی اور فریب سے کام لیا جائے۔ مسلمان امتوں میں حیلوں کا رواج سب سے پہلے یہود میں ملتا ہے کہ انہوں نے اللہ عزوجل کے احکامات کو اپنی قانونی چالاکیوں کے ذریعے مذاق بنانے کی کوشش کی۔ ایک دوست نے ایک دفعہ رابطہ کیا اور کہا کہ میرے پاس بینک میں کچھ رقم پڑی تھی جبکہ آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لہذا اس کی زکوٰۃ نکالنے میں کچھ ہچکچاہٹ تھی۔ انہوں نے لاہور کی ایک بہت بڑی جامعہ کے مفتی صاحب سے رابطہ کیا تو مفتی صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ زکوٰۃ توادا کریں گے کہ یہ ان پر فرض ہے البتہ یہ کر لیں کہ کسی ایسے شخص کو زکوٰۃ ادا کر دیں کہ جو ان کو بعد میں وہی رقم واپس ہبہ کر دے۔ اس میں مفتی صاحب کی دلیل یہ تھی کہ جب زکوٰۃ ادا کرنے والے نے اپنی زکوٰۃ کسی مستحق کو پکڑادی تو اب مستحق اس زکوٰۃ کی رقم کا مالک ہے، وہ جہاں چاہے اسے خرچ کر سکتا ہے، اور اگر زکوٰۃ لینے والا وہ رقم مالک بن جانے کے بعد زکوٰۃ دینے والے ہی کو واپس ہبہ کر دے تو یہ بھی کر سکتا ہے۔ اب میرے دوست کا دل مفتی صاحب کے اس حل پر مطمئن نہیں ہو رہا تھا لہذا مجھ سے پوچھ لیا تو میں نے تو کہا کہ یہ تو سیدھی سادھی اللہ عزوجل سے چالاکی کرنے والی بات ہے لہذا اس سے بچنا ہی چاہیے۔ اس طرح کے حیلے کے نتیجے میں زکوٰۃ کے حکم کا جو شرعی مقصد تھا یعنی غرباء، مساکین اور محتاجوں کی امداد یا صاحب مال کا تزکیہ نفس وغیرہ، تو وہ فوت ہو جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی یہ سنت ہے کہ زکوٰۃ کسی بستی کے امرا سے وصول کی جائے اور غریبوں کی طرف لوٹادی جائے۔¹ اگر کوئی عالم دین ایسے حیلے اختیار کرے کہ جن سے وہ زکوٰۃ دوبارہ امر کی طرف واپس لوٹ جائے تو یہ حیلے شرعاً ناجائز ہوں گے۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک دوست نے حج کے ایک مسئلے کے بارے دریافت فرمایا کہ اس کا شرعی حکم جامعہ کے دارالافتاء سے پوچھ کر آنا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص کی کمائی

¹ «تَوَخَّذْ مِنْ أَعْيَانِهِمْ فَتَرُدَّ عَلَىٰ فَقَرَائِهِمْ» [صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، بَابُ أَخْذِ الصَّدَقَةِ مِنَ الْأَعْيَانِ وَتَرُدُّ فِي الْفُقَرَاءِ حَيْثُ كَانُوا، 128/2]

صریحاً حرام سے تھی اور وہ شخص اپنے اس حرام مال سے اپنے والد صاحب کو حج پر بھیجنا چاہتا تھا جبکہ والد صاحب اس پر راضی نہ تھے۔ راقم الحروف نے دارالافتا میں موجود مفتی صاحب سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فوراً فقہ کی کتابیں کھنگالیں اور کہا کہ حرام کی کمائی سے حج نہیں ہوتا لہذا اس کے والد کے لیے حج پر جانا جائز نہیں ہے۔ یہ جواب حاصل کر کے ابھی کھڑا ہی ہوا تھا کہ مفتی صاحب کہنے لگے کہ ایک حیلہ بھی بتا دوں۔ تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا ہے تو ایسے میں ہی کہا کہ وہ بھی بتادیں۔ تو مفتی صاحب نے کہا کہ ان کے والد صاحب سے کہیں کہ کسی سے قرض لے کر حج پر چلیں جائیں اور اس قرض کی ادائیگی ان کا بیٹا کر دے۔

قرآن کے بیان کے مطابق ساحل سمندر پر واقع یہود کی ایک بستی پر ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار منع تھا تاکہ وہ اس دن میں اللہ کی عبادت کریں۔ دوسری طرف اللہ عزوجل نے انہیں آزمائش میں اس طرح ڈالا کہ ہفتے والے دن تو مچھلیاں پانی کی سطح پر آ جاتی تھیں اور بستی والوں کو شکار کی دعوت دیتی تھیں جبکہ باقی دنوں میں گہرے پانی میں چلی جاتی تھیں۔ یہود کا ایک گروہ اس آزمائش میں پورا نہ اتر اور اس نے ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایک حیلہ ایجاد کیا۔ انہوں نے سمندر کے ساحل کے نزدیک چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود ڈالے اور ان گڑھوں کو پانی کی نالیوں کے ذریعے سمندر سے ملادیا۔ جب ہفتے کا دن ہوتا تھا تو یہ لوگ مچھلیوں کو سمندر سے ان گڑھوں کی طرف ہانک دیتے تھے اور اتوار والے دن جا کر پکڑ لیتے تھے۔ اس طرح بظاہر وہ اللہ کے حکم کی پابندی کر رہے تھے کہ انہوں نے ہفتے والے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کیا لیکن اللہ کے اس حکم کا جو مقصود تھا یعنی ہفتے والے دن کو اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کرنا، وہ یہاں پورا نہ ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے گروہ نے اس پہلے گروہ کو حیلہ کرنے سے منع کیا اور انہیں اس معاملے میں اللہ سے ڈرایا لیکن پہلا گروہ نہ مانا۔ ایک تیسرا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو دوسرے گروہ کو کہتے تھے کہ پہلے گروہ کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ تو پہلے گروہ والوں کی طرح حیلے سے مچھلیاں پکڑتے تھے اور نہ ہی ان کو اس فعلِ بد سے

منع کرتے تھے۔ اللہ عزوجل نے شرعی حکم سے بچنے کے لیے کیے جانے والے اس حیل کے سبب پہلے گروہ پر عذاب نازل کیا کہ جس کا تذکرہ قرآن میں ان الفاظ میں موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَسْأَلُهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَكَاَ وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ ﴿163﴾ وَإِذْ قَالَتْ أُمَةٌ مِّنْهُمْ لَمَن تَعْظُمُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعَذِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿164﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَّيْسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ [الأعراف: 165]

”اور آپ ان یہود سے اس بستی والوں کا حال پوچھیں جو سمندر کے کنارے آباد تھے جبکہ وہ لوگ ہفتے کے دن ظلم کرتے تھے۔ ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتے والے دن پانی کی سطح پر آجاتی تھیں اور جس دن ہفتہ نہ ہوتا تھا تو وہ ان کے سامنے نہ آتی تھیں۔ اسی طرح ہم ان کی آزمائش کر رہے تھے اس وجہ سے کہ وہ نافرمان تھے۔ جب اس بستی کے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا کہ تم اس جماعت کو کیوں نصیحت کرتے ہو کہ جس کو اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے تو انہوں نے کہا: تاکہ تمہارے رب کے ہاں معذرت پیش کر سکیں [کہ ہم نے تو انہیں سمجھایا تھا] اور شاید ان میں سے کچھ لوگ ڈر جائیں [اور اس قسم کے حیلوں سے باز آجائیں]۔ پس جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا کہ جس کی ان کو نصیحت کرائی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو کہ برائی سے منع کرتے تھے اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ہم نے ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سخت عذاب میں پکڑ لیا۔“

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: لَمَّا حُرِّمَتِ الْخَمْرُ قَالَ: إِنِّي يَوْمَئِذٍ لَّأَسْقِيَهُمْ لَأَسْقِي أَحَدَ عَشَرَ رَجُلًا، فَأَمْرُونِي، فَكَفَّاتُهَا، وَكَفَّ النَّاسُ أَنِيتَهُمْ بِمَا فِيهَا حَتَّى كَادَتْ السِّكِّكُ أَنْ تُمْتَنَعَ مِنْ رِيحِهَا، قَالَ أَنَسٌ: وَمَا حَمَرُهُمْ

يَوْمَئِذٍ إِلَّا الْبُسرُ وَالْتَمَرُ مَخْلُوطَيْنِ. قَالَ: فَجَاءَ رَجُلًا إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنَّهُ كَانَ عِنْدِي مَالٌ يَتِيمٍ فَأَشْرَيْتُ بِهِ خَمْرًا، أَفَتَأْذَنُ لِي أَنْ أُبِيعَهُ، فَأَرَدْتُ عَلَى الْيَتِيمِ مَالَهُ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «قَاتَلَ اللَّهُ الْيَهُودَ حَرَمْتُ عَلَيْهِمُ الْكُزُوبَ فَبَاعَوْهَا، وَآكَلُوا أَثْمَانَهَا، وَلَمْ يَأْذَن لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْعِ الْخَمْرِ»¹

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جن دنوں شراب حرام ہوئی، ان دنوں میری شراب پلانے کی ذمہ داری تھی اور میں گیارہ گیارہ لوگوں کو شراب پلایا کرتا تھا۔ پس میں اپنے برتن کی شراب بہادی اور لوگوں نے بھی اپنے برتنوں کی شراب انڈیل دی یہاں تک کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب کی بدبو کے سبب گزرنا مشکل ہو گیا۔ ان دنوں شراب کچی اور پکی کھجور سے تیار ہوتی تھی۔ پس ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے پاس یتیم کا مال تھا اور میں نے اس کی شراب خرید لی تھی [یعنی یتیم کے مال کو شراب کی تجارت میں لگایا تھا کہ یتیم کو فائدہ ہو اور خریداری کے وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی]۔ کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں وہ شراب بیچ کر یتیم کا مال سے واپس کر دوں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے کہ ان پر حلال جانوروں کے معدہ اور آنتوں سے لگی ہوئی چربی کا کھانا حرام کیا گیا تو انہوں نے اس کو پگھلا کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت کھانے لگ گئے۔ پس آپ ﷺ نے اس شخص کو شراب بیچنے کی اجازت نہ دی۔“

فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسے تمام حیلوں کو اختیار کرنا کہ جن سے شرعی احکام باطل ہو جاتے ہوں یا حرام کو حلال بنایا جاتا ہو، ناجائز ہے لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ جن میں ایسے سینکڑوں حیلے بھجائے گئے کہ جن کے ذریعے شرعی احکام سے جان چھڑائی جاسکتی ہے۔² مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے پاس دس

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 8/21

² احمد حسن، ڈاکٹر، جامع الأصول ترجمہ و اضافہ الوجیز، مطبع مجتہبی، لاہور، ص 421

لاکھ روپیہ گیارہ ماہ سے پڑا ہے اور وہ شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لیے سال گزرنے سے ایک دو ہفتے پہلے وہی مال اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتا ہے تو اب اس پر زکوٰۃ نہ ہوگی کیونکہ اس رقم پر ایک مکمل سال نہیں گزرا۔ اسی طرح اگلے سال اس کی بیوی سال گزرنے سے پہلے یہی رقم اپنے شوہر کو ہبہ کر دیتی ہے اور اس طرح وہ مال پھر زکوٰۃ سے بچ جاتا ہے۔ حال ہی میں بعض علما نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ مروجہ اسلامی بینکاری میں بھی بڑی تعداد میں حیلوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ علمائے احناف کے ایک متفقہ فتویٰ کے الفاظ ہیں:

”مروجہ اسلامی بینکاری کی غیر اصلی اور عارضی بنیادیں چونکہ مراہمہ و اجارہ ہیں۔ ان عارضی بنیادوں پر بینکاری کرنے کو اور ان عارضی حیلوں کو مستقل ذریعہ تمویل بنانے کو اسلامی بینکاری کہنا اور سمجھنا شرعاً و اخلاقاً ناجائز کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی چند وجوہات یہ ہیں: ۱۔ غیر اصلی بنیادیں (مراہمہ و اجارہ) محض حیلے ہیں اور حیلوں کو مستقل نظام بنانا ناجائز ہے، ایسے حیلوں کے ذریعے انجام پانے والا معاملہ بھی ناجائز ہی کہلاتا ہے۔ جیسے امام محمدؒ کے ہاں بیع عینہ کا حیلہ ناجائز ہے اسی طرح مراہمہ و اجارہ کے حیلے اور ان کو ذریعہ تمویل بنانا بھی ناجائز ہے... ۲۔ یہ حیلے صرف مخصوص حالات اور وقتی عبوری دور کے لیے علماء نے بتائے تھے۔ ۳۔ یہ بہت ہی نازک اور خطرناک حیلے ہیں، ذرا سی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملا دیتی ہے۔ ۴۔ ان حیلوں کو دائمی نظام کے طور پر استعمال کرنا نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ ناجائز بھی ہے۔ ۵۔ اسلامی بینکاری میں مراہمہ اور اجارہ کا ختم ہونا ضروری ہے، ورنہ کوئی اسلامی بینک ”اسلامی بینک“ کہلانے کا حقدار نہیں ہوگا۔ بلکہ ”حیلہ بینک“ کہلانے کا سجاوہ طور پر حقدار ہوگا۔“¹

¹ مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ: ص 3-4۔ آٹھ صفحات پر مشتمل اس فتوے کی بعد میں پریس ریلیز جاری کی گئی جبکہ فتویٰ ایک پمفلٹ کی صورت میں عام کیا گیا۔ یہ فتویٰ معروف انگریزی روزنامہ اخبار ڈیلی نیوز کے 29 اگست 2008ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے اور اس کا خلاصہ جامعہ بنوری ٹاؤن کی ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ اس اجلاس میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے حضرت مفتی حمید اللہ جان صاحب، جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی سے حضرت مولانا مفتی عبد المجید دین پوری صاحب، حضرت مولانا مفتی رفیق احمد

محقق کے اوصاف

محقق کے علمی، ذہنی، اخلاقی اور ادبی اوصاف پر مفصل گفتگو کی جاسکتی ہے کہ ایک محقق جس موضوع پر ریسرچ کر رہا ہو، اس پر گہرا اور وسیع مطالعہ رکھتا ہو۔ مادری زبان کے علاوہ معروف بین الاقوامی زبانوں میں سے دو چار سے واقف ہو۔ تحقیق کے معاصر اسالیب اور نتائج کا عالم ہو۔ انسانی اور سماجی علوم میں درک رکھتا ہو۔ جدید تکنیکی آلات کے استعمال سے واقف ہو۔ کسی بات کو بلا تحقیق قبول نہ کرتا ہو۔ ضعیف الاعتقاد نہ ہو۔ تحقیقی مواد کو منظم اور مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اچھے ذہن کا مالک ہو۔ تحقیق کا مقصد خالق کی رضا ہو۔ سرقہ اور فریب سے پاک ہو۔ تکبر اور ریا نہ ہو۔ عجلت پسند اور جلد باز نہ ہو۔ حقیقت پسند اور منکسر المزاج ہو۔ محنتی اور نڈر ہو۔ غیر جانبدار ہو، متعصب نہ ہو۔ تحریر کے فن سے واقف ہو۔ متعلقہ زبان کا ادبی مطالعہ رکھتا ہو وغیرہ

لیکن اس وقت ہمیں محقق کے ایک ایسے وصف پر بات کرنی ہے جو محققین میں عام طور دیکھنے کو نہیں ملتا اور وہ یہ ہے کہ محقق معتدل المزاج ہو۔ ہمارے ہاں تحقیق کا کام بہت ہو رہا ہے لیکن اکثر و بیشتر تحقیقات ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں اعتدال نام کا نہیں ہوتا۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ محقق کے موقف میں اعتدال ہو بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے مزاج میں اعتدال ہو۔ اگر مزاج میں اعتدال ہو گا تو اس کا اظہار موقف میں بھی لازمًا ہو گا اور اگر مزاج میں اعتدال نہ ہو گا تو موقف میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے محقق کو اپنے اوپر جبر کرنا پڑے گا اور اس طرح وہ بے اعتدالی کے راستے اعتدال کو حاصل

صاحب اور حضرت مولانا مفتی شعیب عالم صاحب، جامعہ فاروقیہ سے حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینکل صاحب، حضرت مولانا مفتی سمیع اللہ صاحب، حضرت مولانا مفتی احمد خان صاحب، جامعہ اسلامیہ کلفٹن سے حضرت مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب، خیر المدارس ملتان سے مفتی مولانا عبد اللہ صاحب، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے حضرت مفتی غلام قادر صاحب، جامعہ خلفائے راشدین کراچی سے حضرت مفتی احمد ممتاز صاحب، جامعہ أحسن العلوم کراچی سے حضرت مفتی زر ولی خان صاحب، جامعہ رشیدیہ بلوچستان سے حضرت مولانا مفتی احتشام الحق آسیا آبادی صاحب وغیرہ نے شرکت کی ہے۔ حیلوں کے جواز کے بارے شبہات پر ہم نے مفصل گفتگو اپنی ایک علیحدہ تحریر بعنوان اسلامی بینکاری: ایک تجزیاتی مطالعہ میں کی ہے جو ششماہی رشد جنوری 2015ء میں شائع ہوئی ہے۔

کرنے کی کوشش کرے گا۔ تحقیق میں معتدل نہ رہنے کی وجہ تعصب ہوتا ہے۔ یہ تعصب اپنی تحریک کا بھی ہو سکتا ہے اور جماعت کا بھی، اپنے مسلک کا بھی ہو سکتا ہے اور مدرسے کا بھی، اپنے شیخ کا بھی ہو سکتا ہے اور اپنی رائے کا بھی۔

مثال کے طور پر کسی نے اسلامی بینکاری کے موضوع پر تحقیق کرنی ہے تو اس وقت اسلامی بینکاری پر کوئی تیس چالیس کتب مارکیٹ میں موجود ہیں۔ کوئی پندرہ بیس اس کے حق میں ہیں اور پندرہ بیس اس کے خلاف ہیں۔ ایک ہی مسلک یعنی دیوبند میں بھی دو مکاتب فکر وجود میں آگئے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد پر کھڑے ہیں۔ ایک مکتب فکر کے مطابق اسلامی بینکاری حلال ہے اور دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔ اب ایک محقق اس موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتا ہے تو اسے اجتہادی مسائل کہ جن میں علما کا اختلاف ہو جائے، کے نتائج میں اتنا حتمی نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کہہ دیں کہ اسلامی بینکاری سو فی صد حلال ہے یا یہ کہہ دیں کہ اسلامی بینکاری سو فی صد حرام ہے۔ بعض اوقات حلال اور حرام کے درمیان میں بھی کوئی مقام ہو سکتا ہے جیسا کہ مشتبہ امور کا مقام (gray area) ہے۔ پس اگر معتدل المزاج محقق کو اسلامی بینکاری سے اختلاف ہو گا تو اس کا انداز یہ ہو گا کہ اسلامی بینکاری جائز نہیں ہے۔ وہ حرام کی بجائے ناجائز کے الفاظ پر اکتفا کرے گا۔ اور اگر کسی معتدل المزاج محقق کو اسلامی بینکاری سے اتفاق ہو تو وہ اسے جائز کہے گا۔ وہ حلال کی بجائے جائز کے الفاظ پر اکتفا کرے گا۔

کسی شے کو حلال یا حرام کہنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ جب کوئی مفتی اپنے فتویٰ میں کسی شے کو حلال یا حرام کہہ رہا ہوتا ہے اور اس کے نیچے دستخط کر کے وہ فتویٰ جاری کر رہا ہوتا ہے تو وہ دراصل اللہ عز و جل کی طرف سے دستخط کر رہا ہوتا ہے، یہ احساس اس میں غالب ہونا چاہیے جو کہ عموماً فتاویٰ میں دیکھنے میں نہیں ملتا۔ اگر یہ احساس اس میں غالب ہو گا تو فتویٰ دیتے وقت احسان کی کیفیت میں ہو گا اور جب فتویٰ دیتے وقت احسان کی کیفیت میں ہو گا تو اجتہادی اور جدید مسائل میں حلال اور حرام کے الفاظ اس کی زبان سے پھسلیں گے نہیں بلکہ حلق سے اٹک اٹک کر نکلیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ اللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾ [الأنعام: 59]

”اے نبی ﷺ! ان سے کہہ دیں کہ تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا، تو اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرا لیا! ان سے پوچھیں، اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو؟“

اس آیت مبارکہ میں کسی شے کو حلال یا حرام قرار دینے کو ایک بہت بڑی ذمہ داری کہا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ کسی شے کو حلال یا حرام کہنا اس کی حلت اور حرمت کی نسبت اللہ کی طرف کرنا ہے اور اگر وہ اللہ کے ہاں حلال یا حرام نہ ہوئی تو یہ اللہ پر بہتان ہوگا۔ امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے اپنی ایک کتاب کا نام ”إعلام الموقعین عن رب العالمین“ رکھا ہے کہ جس کا معنی ہے کہ رب العالمین کی طرف سے دستخط کر کے دینے والوں کے لیے تنبیہ۔ اور مفتی اپنے فتویٰ پر رب العالمین کی طرف سے دستخط کر کے دے رہا ہوتا ہے لہذا مفتی صاحبان کو اپنے فتاویٰ میں دو باتوں میں خوب احتیاط کرنی چاہیے جو کہ نہیں ہو رہی۔ ایک کسی شے کو حلال یا حرام کہنے میں اور دوسرا کسی شخصیت پر فتویٰ لگانے میں۔ جب تک کسی شخص کے بارے کوئی ایسی برہان موجود نہ ہو کہ جو سورج کی طرح روشن ہو، اس کی ذات پر کوئی سخت حکم لگانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾ [النحل: 116]

”اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے۔“

امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ایک ساتھ دو

بہنوں کو لونڈی بنانے کے بارے کہا ہے کہ میں اسے ناپسند سمجھتا ہوں لیکن اصل میں امام صاحب کے نزدیک ایسا کرنا حرام ہے جیسا کہ دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اور حرام کی جگہ ناپسندیدہ کے لفظ امام صاحب نے تقویٰ اور ورع کی وجہ سے استعمال کیے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ اور صاحبین رحمہم جب یہ کہتے ہیں کہ بچوں کے لیے سونا اور ریشمی لباس پہننا ناپسندیدہ ہے تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ حرام ہے لیکن چونکہ حرمت کی دلیل قطعی الثبوت نہیں ہے لہذا وہ تقویٰ اور احتیاط کے پہلو سے اسے حرام کہنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ بعض چیزوں کے بارے کہتے تھے کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں لیکن وہ چیز ان کے نزدیک حرام ہوتی تھی جیسا کہ امام صاحب نے شطرنج کے بارے کہا کہ میں اس کا کھیل ناپسند سمجھتا ہوں جبکہ مالکیہ کی ایک جماعت نے امام صاحب کے ان الفاظ کی تشریح میں کہا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک یہ کھیل حرام ہے۔ اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ سے جب یہ سوال ہوا کہ اگر کوئی شخص زنا کرے اور اس سے کوئی بچی پیدا ہو تو کیا وہ اس سے نکاح کر سکتا ہے؟ تو امام صاحب نے جواب دیا کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں لیکن امام صاحب کے نزدیک یہ حرام ہے لیکن تقویٰ اور ورع کی وجہ سے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔¹

ہر عالم دین کے علم کا ایک مزاج ہوتا ہے اور جس علم کا مزاج سخت ہو تو وہ ہمیشہ ایک انتہا پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی رائے یا تو قطب شمالی میں ہوگی یا قطب جنوبی میں۔ اگر علمی مزاج کی سختی معلوم کرنی ہو تو اس کی آسان علامت تو یہ ہے کہ جب ایک ہی مسلک کے علما کو ایک دوسرے پر گمراہی اور ضلالت کے فتوے لگاتے دیکھیں تو جان لیں کہ ان میں مزاج کی سختی ہے۔ ایسے علما کی علمی رائے کبھی بھی معتدل نہ ہوگی۔ اور مزاج کی یہ سختی پہلے دوسرے مسلک کے علما پر سخت نقد کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر

¹ ابن قیم الجوزیة، إعلام الموقعین عن رب العالمین، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولى، 1411ھ

اپنے ہی ہم مشرب کے بارے میں بھی وہی فتاویٰ جاری ہونے لگتے ہیں جو دوسروں کے بارے میں جاری ہو رہے تھے۔ اگر اسلام کی جدید تعبیر چاہنے والا ماڈرن طبقہ ہر چیز کو حلال قرار دینے میں متساہل ہے تو دین کی روایتی تعبیر کا حامل طبقہ ہر شے کو حرام قرار دینے میں اتنا ہی روادار ہے حالانکہ دونوں ان چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف کر رہے ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے دونوں سے تقویٰ اور احتیاط برابر کی سطح پر مطلوب ہے۔

خطبا اور واعظین کی خدمت میں

خطبا اور واعظین کو عام دنوں میں بھی لوگوں کو لمبے لمبے وعظ کہنے کا بہت شوق ہوتا ہے اور رمضان میں تو گویا ان کی چاندی ہی لگ جاتی ہے۔ ہم وعظ و نصیحت کے حق میں ہیں بلکہ اسے اصلاح معاشرہ کے لیے واجب سمجھتے ہیں لیکن لمبے لمبے وعظ کرنا اور خطبے پڑھنا ہر گز حکمت کی بات نہیں ہے کہ اس سے لوگوں میں دین سے بیزاری اور تنفر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ، وَقَصَرَ خُطْبَتِهِ، مَنَّةٌ مِنْ فَضْلِهِ، فَأَطِيلُوا الصَّلَاةَ، وَاقْصُرُوا الْخُطْبَةَ»¹

”کسی امام کی نماز لمبی ہو اور خطبہ مختصر ہو تو یہ اس کے سمجھدار ہونے کی علامت ہے، پس تم نماز کو لمبا کرو اور خطبے کو مختصر رکھو۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ کا خطبہ اور نماز انتہائی معتدل ہوا کرتے تھے۔² اور یہ تو خطبہ جمعہ کی بات ہو رہی ہے کہ اسے جمعہ کی نماز سے مختصر ہونا چاہیے یا اس کے برابر ہونا چاہیے تو عام خطبات کو تو اس سے بھی مختصر ہونا چاہیے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی جمعہ کی نماز، آج کل کے حساب سے پندرہ سے بیس منٹ میں ادا ہو جاتی تھی کہ عام طور جمعہ کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ العاشیہ کی تلاوت فرماتے تھے۔ پس خطبہ جمعہ اور عام خطبات کا مناسب دورانیہ بھی اتنا ہی ہونا چاہیے۔ اور ایک ایک گھنٹے کے خطبات جمعہ یاد و گھنٹوں کے وعظ تو اس سے معاشرے میں تبدیلی

¹ صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، 594/2

² أيضاً: 591/2

تو کوئی نہیں آتی لیکن اگر خطیب اور واعظ کی آواز سریلی اور شیریں ہو تو لوگوں کو سماع اور کانوں کی لذت کا موقع میسر آ جاتا ہے اور اگر خطیب اور واعظ کی آواز بھی بھری اور پھٹی ہوئی ہو تو لوگ موقع ملے تو مسجد سے بھاگ جاتے ہیں یا پھر خطیب اور واعظ کے خاموش ہو جانے کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

رمضان میں فجر کی نماز کے بعد روزانہ دس منٹ کا درس دیتا ہوں اور اس میں بھی دس سے نو منٹس تو ہو سکتے ہیں لیکن کوشش کرتا ہوں کہ گیارہ نہ ہوں۔ تو بھری مسجد میں کوئی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ نمازیوں میں سے دو چار ہی درس میں نہیں بیٹھتے کیونکہ لوگوں کو معلوم ہے کہ حافظ صاحب نے دس منٹس سے زیادہ نہیں لگانے۔ اور یہ بات ان کے لیے بہت اطمینان کا باعث ہے۔

اسی طرح یونیورسٹی میں میرا جمعہ کا خطبہ آدھے گھنٹے پر مشتمل ہوتا ہے، اگرچہ اسے بھی زیادہ سمجھتا ہوں لیکن جہاں عرف ایک سے دو گھنٹوں کے خطبوں کا بن چکا ہو، وہاں آپ پندرہ منٹ کا خطبہ دیں گے تو لوگ شک میں پڑ جائیں گے کہ جمعہ کا حق ادا بھی ہوا ہے یا نہیں۔ پس آدھ گھنٹے تک خطبہ دیتا ہوں یا اس سے کچھ کم کر لیتا ہوں لیکن اس کا اثر یہ ہے کہ نمازیوں کی ایک تعداد خطبہ سے پہلے مسجد کے ہال میں موجود ہوتی ہے۔

یہ باتیں اس لیے بیان کر دیں کہ واعظ اور خطیب یہ سمجھتے ہیں کہ شاید لمبے وعظ اور خطبے سے لوگوں کی اصلاح زیادہ ہوتی ہے حالانکہ اس سے لوگوں میں بگاڑ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر لمبا وعظ اور خطبہ کہنا تو سنت کے مطابق بھی نہیں ہے۔ خطیبوں اور واعظوں سے گزارش ہے کہ اپنے وعظ اور خطبے کے دورانیے کو کم کریں اور لوگوں کے لیے دین کے معاملے میں آسانی پیدا کریں اور ان پر دین کے نام پر وہ بوجھ نہ لادیں کہ جسے اتار پھینکنے کی انہیں تعلیم دی گئی ہے۔

البتہ تعلیم و تعلم اور وعظ و نصیحت میں فرق ہے۔ اگر آپ کہیں مدرسہ، اسلامک انسٹی ٹیوٹ، یونیورسٹی وغیرہ میں ترجمہ یا حدیث کی کلاس لے رہے ہیں تو اس کا دورانیہ فرق ہو سکتا ہے۔

علم کی فضیلت

اللہ عزوجل نے دینی علم کے حصول کی بہت فضیلت بیان کی ہے لہذا ہم میں سے ہر شخص کو دین کا کچھ نہ کچھ علم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ ایک روایت میں اس شخص کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے جو صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے دین کا علم حاصل کرتا ہے۔ دین کا علم حاصل کرنے سے اس کا مقصود دنیا کمانا نہیں ہوتا اور نہ ہی بطور عالم دین شہرت اس کو مطلوب ہوتی ہے۔ قیس بن کثیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَدِمَ رَجُلٌ مِنَ الْمَدِينَةِ عَلَى أَبِي الدَّرْدَاءِ، وَهُوَ بِدِمَشْقَ فَقَالَ: مَا أَقْدَمَكَ يَا أَخِي؟ فَقَالَ: حَدِيثٌ بَلَغَنِي أَنَّكَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. قَالَ: أَمَا جِئْتَ لِحَاجَةٍ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: أَمَا قَدِمْتَ لِتَجَاوِزَ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: مَا جِئْتَ إِلَّا فِي طَلَبِ هَذَا الْحَدِيثِ؟ قَالَ: فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَبْتَغِي فِيهِ عِلْمًا سَلَكَ اللَّهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضَاءً لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَإِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ حَتَّى الْحَيَاتُ فِي الْمَاءِ، وَفَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ، كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحِطِّ وَافِرٍ»¹

”قیس بن کثیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ سے دمشق میں آیا۔ تو حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ کس وجہ سے تو نے مدینہ سے دمشق تک کا سفر کیا ہے؟ اس شخص نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اور میں وہ جاننے آیا ہوں۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے پھر سوال کیا کہ کیا اس کے علاوہ بھی تمہیں یہاں کوئی کام ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ کیا تو یہاں تجارت کے لیے تو نہیں آیا؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ اور کہا کہ میں

¹ سنن الترمذی، أبواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، 48/5

صرف اور صرف حدیث معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص بھی علم حاصل کرنے کے لیے کسی راستے پر چلا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمادیں گے۔ اور فرشتے طالب علم کو خوش کرنے کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اور عالم دین کے لیے زمین اور آسمان کی ہر مخلوق مغفرت کی دعا مانگتی ہے یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں عالم دین کے دعا کرتی ہیں۔ اور عالم کی عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ چاند کی تمام ستاروں پر ہے۔ یقیناً علما ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء اپنی وراثت میں درہم اور دینار نہیں چھوڑتے بلکہ علم چھوڑتے ہیں۔ پس جو کوئی انبیاء کی وراثت سے لینا چاہے تو خوب بڑا حصہ لے۔“

یہ علم دین ہی ہے جو انسان کے دل میں اللہ کی معرفت کے راستے خشیت پیدا کرتا ہے۔ علم کی حقیقت، تقدیر ہے جبکہ اس کا حال، خشیت ہے۔ اگر علم پڑھنے سے خشیت حاصل نہ ہو تو یقیناً طور جان لے کہ اس نے یا تو علم حاصل نہیں کیا یا علم تو حاصل کیا ہے لیکن اس کے حصول کی نیت اور ارادہ درست نہ تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ [الفاطر: 28]

”اللہ کے بندوں میں سے علما ہی اللہ عزوجل کی خشیت اختیار کرتے ہیں۔“

اور اگر دین کا علم شہرت اور دنیا کے لیے حاصل کیا جائے تو یہ اتنا ہی بڑا وبال ہے کہ

جتنا اس کا ثواب ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

ابْنُ كَعْبٍ بْنُ مَالِكٍ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللَّهُ النَّارَ»¹

”کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو علم اس لیے حاصل کرے کہ اس علم کے ذریعے علما سے مقابلہ کرے اور جاہلوں پر رعب جمائے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرے

¹ سنن الترمذی، أبواب العلم، باب ما جاء فيمن يطلب بعلمه الدنيا، 32/5

تو اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں داخل کریں گے۔“

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں دنیا عالم سمجھتی ہے لیکن حقیقت میں وہ جہلا ہیں۔ اور انہی کے بارے ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ لوگ ان کو اپنا مذہبی پیشوا بنالیں گے اور یہ ان کو خوب گمراہ کریں گے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَبْدَ اللَّهِ بْنُ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: «إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتَّى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمًا، اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا»¹

”حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں میں سے ایک ساتھ نہیں اٹھائیں گے بلکہ علم کو اس طرح اٹھائیں گے کہ علما کو اٹھالیں گے۔ یہاں تک کوئی عالم دین باقی نہ بچے گا اور لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے۔ اور ان سے سوال کریں گے اور وہ بغیر علم کے جواب دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔“



¹ صحیح مسلم، کتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان، 2058/4

باب دہم تزکیہ اور تصوف

اس باب میں مراقبہ، لطائف نفس، فناء اور بقاء، قوائے ثلاثہ، سماع اور وجد، مبشرات، پیری مریدی، کرامت اور شطحیات کے بارے سلفی اور صوفی فکر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

مراقبہ اور صوفیا

دو چار دنوں سے مراقبہ (meditation) سے متعلق مباحث کے مطالعہ میں تقریباً مراقبہ کی سی کیفیت رہی ہے۔ مراقبہ کا ایک تصور سلف صالحین کا ہے اور ایک صوفیوں کا اور دونوں میں کافی فرق ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”مدارج السالکین“ میں ایک فصل ”المراقبۃ“ کے نام سے قائم کی ہے۔ یہ فصل سلف صالحین کے تصور مراقبہ کو بیان کر رہی ہے اور یہی وہ مراقبہ ہے کہ جس کی صدائے بازگشت آج بھی خطبات حرمین میں بھی ملے گی۔ اس مراقبہ کے جواز میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مراقبہ کا ذکر ہندو ویدوں (Vedas) میں ملتا ہے اور دنیا کی معلوم تاریخ میں ہندومت ہی وہ پہلا مذہب ہے جہاں مراقبہ کو مذہبی شعائر کی حیثیت سے شروع کیا گیا۔ اس کے بعد بدھ مت میں اس کو بہت اہمیت دی گئی۔ سنسکرت زبان میں مراقبہ کے لیے ”بھوانا“ اور تبت کی زبان میں ”گوم“ کا لفظ مستعمل ہے۔ سب سے پہلے ہندو مذہبی ادب ”پیشند“ میں ہمیں مراقبہ کا ذکر ملتا ہے۔¹ بدھ مت میں مراقبہ بہت زیادہ ہے بلکہ ان کے ہاں تو اصل عبادت ہی یہی ہے کہ ہفتوں بارہ بارہ گھنٹے مراقبہ ہوتا ہے۔²

متقدمین صوفیاء میں مراقبہ رائج نہیں تھا جبکہ متاخرین نے اسے ایک پوری سائنس بنا دیا ہے کہ جس سے بیماریوں کا علاج تک کیا جاتا ہے۔ اس مراقبہ کے لیے درجات، قسمیں، اوقات اور ہدایات کی لمبی چوڑی تفصیلات ہیں۔ مثال کے طور وہ کہتے ہیں کہ مراقبہ کا بہترین وقت طلوع آفتاب سے پہلے ہے یا غروب آفتاب کے بعد اور اس کی ایک معقول وجہ ان کے پاس یہ ہے کہ لاشعوری حواس (unconsciousness) اس وقت میں متحرک ہوتے ہیں یا ہونا شروع کر دیتے ہیں اور شعور سکون میں چلا جاتا ہے یا جانا شروع کر دیتا ہے۔ مراقبہ کے جدید تصور کو جاننے کے لیے سلسلہ چشتیہ عظیمیہ کے روحانی پیشوا خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی کتاب ”مراقبہ“ ایک عمدہ تحریر ہے

¹ Alexander Berzin, Meditation Methods, Moscow: The Berzinarchives, 2005

² موسیٰ بھٹو، محمد، مراقبہ، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدر آباد، ص 29

کہ جس میں انہوں نے روشنیوں کے مراقبے کا تصور دیا ہے۔

صوفیاء کے نزدیک مراقبہ کا اوسط وقت 20 تا 45 منٹ ہوتا ہے اور اس وقت میں آپ نے ایک کم روشنی والی جگہ میں سکون و اطمینان سے بیٹھ جانا ہے اور اپنے حواس معطل کر دینے ہیں۔ آنکھیں، کان اور سوچ کو بند کرتے ہوئے خالی الذہن ہو جائیں۔ اور خالی الذہن ہونے سے مراد تمام سوچوں کو معطل کر کے ایک نقطے پر مرکوز کرنا ہے۔ اوسط مراقبہ چار مہینے تک جاری رہتے ہیں لیکن اس طرح کے مراقبوں میں پہلے مہینے میں ہی انسان کو عجیب و غریب مشاہدات کا سامنا ہوتا ہے۔ صوفیاء مراقبوں کے ذریعے عالم مثال، عالم برزخ اور عالم امر کی سیر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جسے ہماری سیر کا یقین نہ آئے وہ خود سے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ ظاہری حواس معطل کر دینے سے اور ذہن کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دینے سے لاشعوری طاقتیں (five senses of the soul) نفس میں بیدار ہو جاتی ہیں اور ان کے ذریعے انسان باطنی دنیا کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے یعنی وہ دنیا جو وہ موت کے بعد دیکھے گا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تک بڑے بڑے نام ملتے ہیں جو اس تصور مراقبہ کی کسی نہ کسی درجے میں نہ صرف حمایت کرتے نظر آتے ہیں بلکہ عملاً اس کی مشق بھی کرتے رہے ہیں اور بعض تو باطنی آنکھ کے کھلنے پر قسم کھاتے بھی نظر آتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فجر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ کر پندرہ بیس منٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنے حواس معطل کر دے اور ذہن صرف اسی نقطہ پر مرکوز کر دے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے تو کیا یہ شرعاً جائز ہوگا؟ اور دلیل اس میں حدیث جبریل کو بنائے کہ میں وہ کیفیت حاصل کرنے کے لیے مشق کر رہا ہوں کہ اللہ کی ایسے عبادت کروں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہوں، اور اگر اس سوال میں ایک اضافہ یہ بھی کر لیا جائے کہ اگر اس مشق سے واقعتاً اس کو بہت فائدہ ہوتا ہو جیسا کہ صوفیاء نے دعویٰ کیا ہے کہ مراقبہ سے احسان کی کیفیات قطعی طور حاصل ہوتی ہیں تو کیا مقصد شرعی کے

حصول کے لیے ایسا کرنا جائز ہوگا؟

ہماری رائے میں اس قسم کے مراقبہ کا ثبوت سنت، صحابہ و تابعین، ائمہ دین، خیر القرون، سلف صالحین اور متقدمین صوفیاء سے نہیں ملتا لہذا ایک بات تو یقینی ہے کہ اس مراقبہ میں کوئی ایسی خیر نہیں ہے جو اس کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی ہو۔ اس لیے اس طریقہ کار سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس امت کے متقدمین کو جو خیر حاصل تھا، متاخرین اس کو کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور وہ خیر متقدمین کو مراقبہ کے بغیر ہی حاصل ہوا تھا۔ دین نے نہ صرف خیر کے بارے بتلایا ہے کہ وہ کیا ہے بلکہ خیر کے حصول کے ذرائع بھی دین ہی کا موضوع ہیں اور دین نے اُن ذرائع کو بھی تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ جن سے وہ خیر حاصل ہوگا، جو آخرت میں نجات کے لیے ضروری ہے۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غار حرا میں مراقبہ کیا تھا لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے غار حرا میں دین ابراہیمی کی پچی کھچی روایات کے مطابق اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبوت ملنے کے بعد آپ نے کبھی غار حرا کا رخ کیا ہو لہذا آپ کا نبوت کے ملنے کے بعد کا عمل اصلاً حجت ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام، سلف صالحین اور متقدمین صوفیاء نے مراقبہ کو تقرب الی اللہ کا نہ تو خود ذریعہ بنایا ہے اور نہ ہی اس کی تعلیم دی ہے۔

صوفیاء مراقبہ کے ذریعے سیر الی اللہ، فنا فی اللہ، سیر من اللہ، بقا باللہ کے مراتب سے گزرتے ہیں۔ ان کے بقول وہ مقام اعراف کو دیکھتے ہیں، اپنے رب کا دیدار کرتے ہیں، موت کے بعد کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور فوت شدگان سے ملاقات کرتے ہیں وغیرہ۔ اور اس سب کچھ کے مشاہدے پر قسمیں کھاتے ہیں۔ یہ دعویٰ ہزار سال سے بہت لوگ کر رہے ہیں۔ بعض سلاسل میں تو کشف قبور بھی ان کے امتیازات میں شامل ہے جیسا کہ سلسلہ نقشبندیہ اولیسیہ کے سالکین کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قبر میں مردے کو ہونے والی جزا و سزا کے بارے بھی بتلا سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک وہ جمع موضوعات کہ جن کا تعلق مشاہدات اور مکاشفات سے ہے، علم نفسیات کے تحت داخل ہیں اور انہیں دین کا موضوع نہیں سمجھنا چاہیے لہذا مراقبہ دین کا نہیں بلکہ سائیکالوجی کا موضوع ہے۔ اگر یہ دین کا موضوع ہوتا تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین نے اس پر کچھ نہ کچھ تو گفتگو کی ہوتی جبکہ سائیکالوجی میں مراقبہ (meditation) ایک پورا میدان ہے اور مغرب میں تو اب پیراسائیکالوجی، یوگا، ٹیلی پتھی اور میڈی ٹیشن وغیرہ ایک پوری سائنس بن چکا ہے۔

البتہ نبی اور رسول کے مشاہدات اور مکاشفات پر جب بات ہوگی تو اس وقت یہ دین کا موضوع ہوں گے اور ان پر ایمان لانا واجب ہوگا کیونکہ نبی اور رسول ان مشاہدات اور مکاشفات کے لیے مراقبہ کے راستے تکلف اور تصنع کام نہیں لیتے تھے۔ اور جہاں تک صوفیاء کے مشاہدات اور مکاشفات کی بات ہے تو ہمیں جدید علم نفسیات (modern psychology) کی روشنی میں بھی ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی کہ خود صوفیاء کا ان مشاہدات اور مکاشفات میں اتفاق نہیں اور وہ اس بارے ایک دوسرے کا رد بھی کرتے ہیں کہ جس کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

جہاں تک کشف قبور کی بات ہے تو اسے صوفیاء کے بعض حلقوں کی جانب سے ایسے پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی بہت بڑا روحانی مقام ہو حالانکہ محققین صوفیاء نے کشف اور کرامت کو صوفی کا حیض اور نقص قرار دیا ہے۔¹ شیخ احمد الرفاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الولي لا يظهر الكرامة ولا ترغب للكرامات وخوارق العادات فإن الأولياء يستترون من الكرامات كما تستتر المرأة من الحيض.²
”ولی کبھی بھی اپنی کرامت ظاہر نہیں کرتا اور نہ ہی اسے کرامات اور خوارق عادت (supernatural) کے اظہار میں کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ تو اپنی کرامات کو یوں چھپاتے پھرتے ہیں جیسے کہ عورت اپنے حیض کو۔“

¹ الألوسی، شہاب الدین محمود بن عبد اللہ الحسینی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، 1415ھ، 167/6

² أحمد بن علی بن ثابت الرفاعی، البرہان المؤید، دار الکتب النفیس، بیروت 1408ھ، ص 128

حیض کی دو تعبیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جیسے عورت اپنے حیض کو چھپاتی ہے، ایسے ہی صوفی بھی اپنے کشف اور کرامت کو چھپاتا ہے۔ دوسری تعبیر جو نسبتاً زیادہ بہتر ہے، یہ ہے کہ جیسے حیض کے جاری ہونے پر عورت کا اختیار نہیں ہے اور اس کا جاری ہونا اس کے لیے تکلیف، اذیت اور ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے تو اسی طرح صوفی کو کشف اور کرامت کے جاری ہونے سے کراہت ہوتی ہے۔ پس وہ کوئی بھی ایسا راستہ اختیار نہیں کرتا کہ جو اس کی ذات سے کسی کشف یا کرامت کے صدور کا ذریعہ بنے۔

اصولی بات یہی ہے کہ کرامت تو کجانی کا معجزہ بھی اختیاری نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جب اللہ چاہتے ہیں، معجزے کا صدور ہوتا ہے۔ اسی طرح نبی کی برکت بھی اختیاری نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے اذن سے جاری ہوتی ہے کہ ایک بندے کا کھانا ایک جماعت کو کفایت کر جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نبی اور ولی اپنے ارادے سے جب چاہیں، معجزہ اور کرامت دکھادیں یا برکت جاری کر دیں بلکہ یہ اسی وقت ہوگا جبکہ اللہ کا اذن اور حکم جاری ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ كَانَ كَذِبٌ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَلْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بَأْتِيَةٌ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ [الأنعام: 35]

”اور اگر ان کی روگردانی آپ پر گراں گزرتی ہے تو اگر آپ کر سکیں تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالیں یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کریں)، پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لائیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا پس آپ ہر گزند انوں میں نہ ہو جائیں۔“

چلیں! مان لیا کہ آپ کو کشف قبور ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟ ایک صوفی سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اگر مجھے آپ کے سلسلہ میں شامل ہو جانے کے بعد کشف قبور ہونا شروع ہو گیا تو اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا؟ تو صوفی کا جواب یہی تھا کہ شریعت پر عمل کرنا۔ اور یہ جواب بالکل صحیح ہے لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس کی دعوت تو دوسرے لوگ کشف قبور کے مقام پر پہنچنے سے پہلے سے ہی دے رہے ہیں۔

اگر وہاں پہنچنے کے بعد بھی یہی کام کرنا ہے تو اس مشق (exercise) کا فائدہ؟ اسی طرح مراقبہ کے ذریعے صوفیا کو جو مشاہدات ہوتے ہیں، ان میں ایک مشاہدہ ”مشاہدہ حق“ یا ”مشاہدہ وجود“ بھی ہے۔ صوفیا کی ایک بڑی جماعت کا دعویٰ ہے کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ عزوجل کو یا صفت وجود حق سبحانہ و تعالیٰ کو اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے روح کی پرواز کی مشق کرنی پڑے گی اور وہ مراقبہ سے ہوگی۔ اس کا دعویٰ بھی کافی صوفیوں نے کیا ہے۔ اس سے اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ وہ کچھ دیکھتے ضرور ہیں، لیکن کیا دیکھتے ہیں؟ اس میں بحث ہو سکتی ہے؟ مثلاً آپ ابھی اگر اپنا سر جھکا کر اپنی آنکھیں کچھ دیر کے لیے بند کر لیں تو کچھ نہ کچھ تو نظر آنا شروع ہو ہی جائے گا کیونکہ انسانی ذہن کی بنیادی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ تصور (imagination) کرتا رہے، چاہے نیند میں ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ مشاہدات میں اختلاف نہیں ہے کہ وہ ہوتے ہیں کیونکہ انسان اور اس کا دماغ بہت ہی پراسرار شے ہے جس کا کسی قدر اندازہ سائیکالوجی کے طالب علموں کو ہے۔

اس بارے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح ظاہری حواس (senses) خطا کرتے ہیں جسے خطائے حس (hallucination) کہتے ہیں، اسی طرح باطنی حواس بھی خطا کر جاتے ہیں۔ یہ بات رجال تصوف میں سے بھی بعض محققین نے کی ہے جیسا کہ حضرت شیخ محمد دالף ثانی رحمہ اللہ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”عجب کار و بار ہے کہ ان لوگوں میں سے بہت سے اس راہ کے مدعی اس شہود و مشاہدہ پر بھی قناعت نہیں کرتے بلکہ اس شہود کو تنزل خیال کر کے اس جہاں میں رویت بصری کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم واجب الوجود جل سلطانہ کی ذات پیچون کو دیکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دولت جو ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شب معراج میں ایک دفعہ حاصل ہوئی تھی ہم کو ہر روز میسر ہے اور وہ نور جو ان کے دیکھنے میں آتا ہے اس کو صبح کی سفیدی سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس نور کو مرتبہ بے کیفی خیال کرتے ہیں، اور مراتب عروج کی نہایت اس نور کے ظہور تک تصور کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ اس

بات سے جو ظالم کہتے ہیں، بہت بڑا ہے۔ اور نیز حضرت حق جل شانہ کے ساتھ اپنا کلام و مکالمہ کرنا ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ایسا ایسا فرمایا ہے، کبھی اپنے دشمنوں کے حق میں حضرت عز سجانہ کی طرف سے کئی قسم کی وعیدیں یعنی بہت سے عذاب نفل کرتے ہیں، اور کبھی اپنے دوستوں کو بشارتیں دیتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض اس طرح کہتے ہیں کہ رات کے بقیہ تہائی یا چوتھائی حصہ سے لیکر صبح کی نماز تک میں حق سجانہ و تعالیٰ کے ساتھ کلام کرتا رہا اور ہر طرح کی باتیں پوچھتا رہا اور جواب لیتا رہا، ان لوگوں نے اپنے آپ میں تکبر کیا اور بڑی سرکشی کی۔ ان لوگوں کی باتوں سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس نور مرئی کو عین جل سلطانہ سمجھتے ہیں اور اس نور کو حق تعالیٰ کی ذات تصور کرتے ہیں، نہ یہ کہ اس کے ظہورات میں سے کوئی ظہور یا اس کے ظلال میں سے کوئی ظل جانتے ہوں۔ اس میں کوئی کچھ شک نہیں کہ اس نور کو حق جل سلطانہ کی ذات کہنا محض افتراء، صرف الحاد اور خالص زندقہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کا نہایت ہی حلم و تحمل ہے کہ اس قسم کے مفتریوں کے لیے طرح طرح کے عذابوں میں جلدی نہیں کرتا اور ان کی بیخ کنی نہیں فرماتا۔¹

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

”اور حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی قوم صرف رویت کی طلب ہی کی وجہ سے ہلاک ہو گئی اور حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے طلب رویت کے بعد لن ترانی کا زخم کھایا اور بیہوش ہو کر گر پڑے اور اس طلب سے تائب ہوئے۔ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کو محبوب رب العالمین اور تمام اولین و آخرین موجودات میں سے بہترین ہیں باوجودیکہ معراج بدنی سے مشرف ہوئے اور عرش و کرسی سے گذر کر مکان

¹ مکتوبات حضرت مجدد آلف ثانی، دفتر دوم، مکتوب نمبر 1، مترجم مولانا سید زوار حسین شاہ،

مکتبہ مجددیہ، کراچی، ص 315-316

وزمان سے بھی بالا چلے گئے، باوجود قرآنی اشاروں کے آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام کی رویت میں بھی علما کا اختلاف ہے اور اکثر علما آنحضرت علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والسلام کی عدم رویت کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح یہی ہے کہ آنحضرت علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والسلام نے معراج کی شب میں اپنے رب کو نہیں دیکھا۔ لیکن یہ بے سرو سامان اپنے خیال باطل میں ہر روز خدائے جل شانہ کو دیکھتے ہیں جبکہ حال یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ وسلم کے ایک مرتبہ دیدار میں بھی علما قیل و قال کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو خوار کرے، کس قدر جاہل ہیں۔¹

ماہرین نفسیات کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تجربات میں سالک، حالت مراقبہ میں اپنے ہونے کی شعوری کیفیت عارضی طور کھودیتا ہے۔ اور یہی ہماری رائے میں اس کیفیت کا صحیح تجزیہ ہے۔ صوفیا میں عام طور اس کیفیت کو فنا (annihilation) اور سائیکالوجی میں نفسیاتی موت (psychic death) کہہ دیتے ہیں۔ اس بارے جدید علم نفسیات میں شعور کی تبدیل شدہ کیفیات اور حالتوں میں سے خود دگر بینی (depersonalization)، وجد (religious ecstasy)، تجربہ بیرون جسم (out of body experience) اور تخلیہ روح (astral projection) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

مراقبہ اور ارتکاز ذہنی

مراقبہ میں ایک چیز اہم ہے اور وہ حواس ظاہری (five senses) کے تعطل کی مشق کرنا کہ اس سے مقصود یہ ہو کہ عبادت میں توجہ اللہ عزوجل ہی کی طرف مبذول رہے۔ باقی رہے اس کے اوقات یا ہیئت تو یہ درست نہیں ہے۔ مثال کے طور ہیئت کے بارے صوفیا کا کہنا ہے کہ مراقبہ میں آنکھیں بند ہونی چاہئیں۔ ہماری رائے میں اس کا تعلق مراقبہ سے نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حواس کا تعطل کھلی آنکھوں بھی حاصل ہو جاتا

¹ ایضاً: ص 316

ہے۔ بعض لوگوں کی سوتے میں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر ہم سٹرک پر سفر کر رہے ہوں تو راستے میں سینکڑوں چیزیں دیکھتے ہیں اور جن چیزوں میں ہماری دلچسپی نہیں ہوتی، انہیں دیکھنا یا نہ دیکھنا ہمارے لیے برابر ہوتا ہے۔ پس اصل مقصود توجہ کو مرکوز (concentrate) کرنا ہے نہ کہ آنکھیں بند کرنا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ، صحابہ و تابعین یا ائمہ و محدثین ایسے مراقبہ نہیں کرتے تھے جیسا کہ معاصر صوفیا کرتے ہیں لہذا تزکیہ نفس کے لیے اس طرح کے مراقبہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سلف صالحین کا تزکیہ اس قسم کی مشقوں کے بغیر ہوا ہے۔ البتہ صوفیا کی بعض باتیں قابل توجہ معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ ان کا یہ کہنا ہے کہ اللہ کی طرف کامل توجہ کے لیے حواس ظاہری کو معطل کر دینے کی مشق کرنا۔ اس بنیاد کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم مراقبہ کی بہترین صورت متعین کرنا چاہیں تو وہ تہجد کی نماز ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو سورۃ المزمل میں تہجد کی نماز پڑھنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا:

﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا﴾ ﴿7﴾ ﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا﴾ ﴿8﴾ وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴿المزمل: 9﴾
”یقیناً رات کا قیام نفس کو کچلنے میں سب سے زیادہ معاون اور بات کہنے میں سب سے زیادہ سیدھا ہے۔ بے شک دن میں آپ کے بہت سے کام ہیں۔ [پس رات کے قیام میں] آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کریں اور سب کچھ سے کٹ کر صرف اسی کے ہو رہیں۔“

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ”تبتل“ کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قُلْتُ: التَّبَتُّلُ يَجْمَعُ أَمْرَيْنِ اتِّصَالًا وَانْفِصَالًا. لَا يَصِحُّ إِلَّا بِهِمَا. فَإِلْفَصَالُ: انْقِطَاعُ قَلْبِهِ عَنْ حُطُوطِ النَّفْسِ الْمُزَاجِمَةِ لِمُرَادِ الرَّبِّ مِنْهُ. وَعَنِ التَّفَاتِ قَلْبِهِ إِلَى مَا سِوَى اللَّهِ، خَوْفًا مِنْهُ، أَوْ رَغْبَةً فِيهِ، أَوْ مُبَالَاهُ بِهِ، أَوْ فِكْرًا فِيهِ، بِحَيْثُ يُشْغَلُ قَلْبُهُ عَنِ اللَّهِ. وَالِاتِّصَالُ: لَا يَصِحُّ إِلَّا بَعْدَ هَذَا الْإِنْفِصَالِ. وَهُوَ اتِّصَالُ الْقَلْبِ بِاللَّهِ، وَإِقْبَالُهُ

عَلَيْهِ، وَإِقَامَةُ وَجْهِهِ لَهُ، حُبًّا وَخَوْفًا وَرَجَاءً، وَإِنَابَةً وَتَوَكُّلاً¹

”میری رائے میں تبتل میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک انقطاع (detachment) ہے اور دوسرا اتصال (attachment)۔ ان دونوں کے بغیر تبتل ممکن نہیں ہے۔ انقطاع سے مراد یہ ہے کہ سالک اور عابد کا دل اپنے رب کی مراد تک پہنچنے میں حائل ہونے والے نفس سے اس طرح کٹ جائے کہ اس کا دل اللہ کے ماسوا کی طرف مشغول نہ ہو اور اللہ کے علاوہ کی طرف اس کے دل کی توجہ بھی ختم ہو جائے، چاہے اللہ کے غیر میں یہ توجہ کسی خوف کے سبب سے ہو یا رغبت کی قبیل سے ہو، پرواہ کی غرض سے ہو یا غور فکر کی وجہ سے ہو۔ اور اتصال اُسی وقت ممکن ہے جبکہ پہلے انقطاع ہو۔ اور اتصال سے مراد دل کو اللہ کی طرف لگانا، اپنے دل اور چہرے کو اس کی طرف متوجہ کرنا، اس کی محبت، اس کے خوف، اس سے امید، اس کی طرف رجوع اور اس پر توکل کرتے ہوئے۔“

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”تبتل“ سے مراد دنیا و مافیہا سے ایسا کامل انقطاع (total detachment) ہے جو اللہ کی طرف توجہ کامل (complete devotion) کا سبب بنے گا۔ یہ وہی بات ہے جسے نبی کریم ﷺ نے «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ» کے الفاظ میں بیان کیا ہے یعنی اللہ کی ایسے عبادت کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یا کم از کم ایسے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔²

مراقبہ کا مقام نماز ہے۔ اور نماز میں بھی خاص طور تہجد کی نماز جبکہ مکمل خاموشی ہوتی ہے کیونکہ فرض نمازوں میں کامل توجہ کی کیفیت حاصل ہونا مشکل ہے۔ فرض نمازوں میں اللہ کے رسول ﷺ بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز ہلکی کر دیتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرائض میں

¹ مدارج السالکین: 32/2

² صحیح البخاری، کتاب الإيمان باب سُؤَالِ جَبْرِيلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْإِيمَانِ، 19/1

استغراق مطلوب نہیں ہے۔¹

مراقبہ کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ انسان تہجد کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کرے اور تلاوت، قیام، رکوع، سجود اور ان میں پڑھی جانے والی تسبیحات میں مبتدل اور انقطاع یعنی دنیا اور مافیہا سے کٹ جانے کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر انقطاع حاصل نہ ہو رہی ہو تو آنکھیں بھی بند کی جاسکتی ہیں جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نماز میں خشوع و خضوع کے حصول لیے آنکھیں بند کرنا جائز ہے² کیونکہ خشوع و خضوع کا حصول نماز کے فرائض میں شامل ہے لیکن مستحب اور پسندیدہ امر یہی ہے کہ نماز میں آنکھیں کھولے رکھے۔ توجہ الی اللہ کا پہلا قدم دنیا اور مافیہا سے انقطاع ہے۔ دنیا و مافیہا سے انقطاع ہو گا تو توجہ کے حصول کا آغاز ہو گا۔ انقطاع کے بعد توجہ میں بہتری کے لیے قرآن مجید کی آیات اور تسبیحات کے معنی و مفہوم پر غور کرے۔ اگر انقطاع نہیں ہو گا تو نماز میں توجہ بھی قائم نہ ہوگی۔

ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ مراقبہ میں تو کسی ایک تصور پر غور کیا جاتا ہے تاکہ ارتکاز ذہنی (concentration) حاصل ہو تو قرآن مجید کی آیات کے معانی و مفہیم میں غور کرنے کی صورت میں سالک متنوع مضامین پر غور کرے گا تو مرکزیت کیسے قائم ہو گی؟ ذہن تو ادھر ادھر منتقل ہوتا رہے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کی صفت ہے۔ اور صفت الہی ہونے کے اعتبار سے وہ ایک ہے، اگرچہ مضامین کے اعتبار سے تنوع ہے۔ قرآن مجید میں غور و فکر ایک اعتبار سے صفت کلام میں غور کرنا ہے۔

اس دنیا میں اللہ کی ذات کے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی صفات ہی ہیں کہ جسے ہم توحید اسماء و صفات کا نام دیتے ہیں اور اس کے قرب کا ذریعہ بھی اس کی صفات ہی ہیں۔ اور ان جمیع صفات میں اللہ اور انسان کے مابین تعلق قائم کرنے کے لیے جو اہم ترین صفت ہے، وہ صفت کلام ہے یعنی قرآن مجید۔ پس تہجد کی نماز میں لمبے قیام کے

¹ شریعت و طریقت: ص 314

² زاد المعاد: 285/1

ساتھ قرآن مجید کی آیات میں غور و فکر ہی مراقبہ کی بہترین صورت ہے۔

مشارطہ، مراقبہ اور محاسبہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مراقبہ نماز کا اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے مراقبہ کے ساتھ مشارطہ اور محاسبہ دو اور اصطلاحات بھی نقل کی ہیں۔ ان سے پہلے علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ اصطلاحات بیان کی ہیں۔¹

مشارطہ، شرط سے باب مفاعلہ ہے۔ صبح اٹھ کر اپنے نفس کو یہ تلقین کرے کہ آج کے دن میں یہ خیر کا کام کرنا ہے اور اس شر سے بچنا ہے تو یہ مشارطہ ہے۔ اور مراقبہ سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو کی گئی اس تلقین کی دن بھر نگہداشت اور نگرانی کرے۔ محاسبہ یہ ہے کہ رات کو یہ معلوم کرنے کے لیے بیٹھے کہ جس خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے مقصد سے صبح مشارطہ کیا تھا، وہ مقصد حاصل ہوا یا نہیں۔² حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صوفیاء کے مراقبہ کو سنت کے قریب کر دیا ہے۔ مراقبہ کے اس تصور میں اختلاف نہیں ہے۔

اندر کا سکون

ایک دوست نے مذکورہ بالا تحریر پر سوال کیا کہ اگر جم جوائن کرنا جائز ہے تو مراقبہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ فریقین عموماً ایک دوسرے کی تحریر غور سے پڑھتے نہیں اور سرسری طور نظر ڈال کر ایسے اعتراض وارد کر دیتے ہیں، جو بنتے نہیں ہیں۔ ہمیں آپ کے مراقبہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، روزانہ کریں، صبح و شام کریں۔

ہم بار بار یہ نکتہ پیش کر رہے ہیں کہ ایک ذہن ہے کہ مراقبہ کو ذہنی سکون کے لیے اختیار کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اور دوسرا ذہن ہے کہ مراقبہ تقرب الی اللہ کے

¹ ابن جوزی، عبد الرحمن علامہ، منہاج القاصدین، تلخیص ابن قدامہ مقدسی احمد بن محمد بن عبد الرحمن، مترجم محمد سلیمان کیلانی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، 1985، ص 523-524

² شریعت و طریقت: ص 278

ذرائع میں سے ہے، تو بہت حرج ہے۔ اگر آپ یوگا اپنی صحت کے لیے کریں گے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ میں یوگا اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہوں، تو بہت حرج ہے۔ اسی طرح آپ اپنی جسمانی صحت کے لیے جم جو اُن کریں تو کوئی حرج نہیں لیکن آپ اس لیے جم جو اُن کریں کہ یہ تقرب الی اللہ کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، تو بہت حرج ہے۔

تقرب الی اللہ کے ذرائع ہمارے دین نے طے کر دیے ہیں، اور وہ ایمان، نماز، قرآن مجید، سجدہ، دعا، صدقہ، صلہ رحمی اور اخلاق وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ کسی ذریعے کو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا درست نہیں ہے۔ اور اگر آپ کو باطنی اطمینان اور ذہنی سکون کے لیے مراقبہ کرنا ہی ہے، تو پھر صوفیاء سے زیادہ بہتر ہندو جوگی اور بدھ بھکشو ہیں کہ جن کا یہ خاص میدان ہے۔ اگر آپ مراقبے کے تصور پر تصوف، ہندومت اور بدھ مت کا تقابلی مطالعہ کریں تو احساس پیدا ہوگا کہ ہمارے صوفیاء اس سائنس میں غیر مسلموں سے کافی پیچھے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کسی سلسلے کے معاصر پیر طریقت کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھ جائیں اور اس کے بعد کسی ہندو جوگی کی باتیں سنیں، اور جوگی تو خیر بہت آگے ہوگا، آپ ایک ہندو نوجوان سندھپ مہیش واری کے بیانات ہی سن لیں جو کہ آپ کو یوٹیوب پر مل جائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا، کہ مراقبے کی لذات، کیفیات اور ثمرات جو ان کے ہاں ہیں، وہ یہاں کہاں؟¹

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تہجد کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت اور لمبے سجود میں لمبی دعاؤں میں جو ایمانی کیفیات اور اثرات ہے، وہ مراقبہ میں کہاں؟ اور اس پر قسم کھائی جا سکتی ہے کہ ہندومت اور بدھ مت کے طریقوں سے وہی متاثر ہوگا جو اسلام کے

¹ آجکل بابا رام دیو اور سری سری راوی شنکر مراقبہ کروانے کے حوالے سے کافی معروف ہندو گرو ہیں۔ دونوں کے ایسے پیروکار لاکھوں میں ہیں کہ جنہیں مراقبہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جمعیت علیٰ ہند کے اتر پردیش میں 2009ء کے سالانہ اجلاس میں بابا رام دیو کی مراقبہ، پاس انفاس اور لطائف پر تقریر سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ طریقہ ہندومت سے آئے ہیں۔ خبر یہ دونوں گرو تو پھر میڈیا کے لوگ ہیں جبکہ جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے کنارے سیاسی اور بھکشو تو اس کے علاوہ ہیں کہ جن کے عجیب و غریب مکاشفات بھی منقول ہیں۔

طریقوں سے محروم رہا۔ ایک دوست نے بائبل پڑھی تو بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ بائبل کا کورس کرنے کا ارادہ ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے؟ میں نے کہا کہ قرآن مجید پڑھا ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں! میں نے کہا کہ پہلے قرآن مجید اچھی طرح پڑھ لیں۔ اور اگر آپ نے قرآن مجید پڑھا ہی نہیں تو آپ کو بائبل ہی سب کچھ معلوم ہوگی۔ تو ہندو جو گیوں اور بدھ بھکشوؤں کا تو یہ عذر ہے کہ وہ اصلاح نفس کے اسلام کے طریقوں سے واقف نہیں ہیں لیکن مسلمان تو واقف ہیں اور ان کو پرمیکٹس میں نہیں لاتے اور دوسرے طریقوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

اور اگر آپ کو زندگی میں ایک بار بھی تہجد میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو مکمل قرآن مجید سنانے کا موقع نہیں ملا تو آپ مراقبہ کی کیفیات کو بہت بڑا جائیں گے کہ جس نے دیسی گھی کی لذت نہ لی ہو تو اسے تو ذالذہا ہی میں سب ذائقے معلوم ہوں گے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ جس طرح عام افراد قرآن مجید سے احوال پیدا کرنے سے محروم ہیں، اسی طرح صوفیاء بھی قرآن مجید سے احوال پیدا کرنے میں اتنے ہی محروم ہیں۔ اگر صوفیاء کو قرآن مجید سے احوال پیدا ہوتے تو انہیں مراقبہ، تصور شیخ، ذکر جہری، پاس انفاس، سماع، رقص اور وجد وغیرہ کی طرف جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اہل تصوف کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ قرآن مجید سے وہ تعلق قائم کرنے میں ناکام رہیں ہیں جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ اور اس کا حل اب یہی ہے کہ اصحاب قرآن اور اہل قرآن کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزار جائے۔

اللہ کے رسول ﷺ یہ کہیں کہ بندہ سجدے کی حالت میں جتنا اپنے رب کے قریب ہوتا ہے، اتنا کسی اور حالت میں نہیں ہوتا اور ہم مراقبہ کی حالت میں تقرب کی منازل طے کر رہے ہوں تو اس سے بڑی محرومی اور کیا ہوگی؟ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ، وَهُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثَرُوا الدُّعَاءَ»¹

¹ صحیح مسلم، کتاب الصلوة، باب مَا يَقَالُ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، 350/1

”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس اس حالت میں بہت زیادہ دعائیں کیا کرو۔“

اور اللہ کے رسول ﷺ نے تقرب الی اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ فرائض پر عمل کو قرار دیا ہے۔ اور فرائض کے بعد اللہ کا قرب حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ نوافل ہیں۔ اور تیسرا کوئی ذریعہ ہمارے دین نے بیان نہیں کیا لہذا مراقبہ، لطائف، پاس انفس، تصور شیخ، سماع اور وجد ”بزرگ“ بننے کے ذرائع تو ہو سکتے ہیں لیکن ”بندہ“ بننے کے نہیں۔ جسے بزرگی چاہیے، وہ تصوف کے ذرائع پر عمل کر لے، بزرگ بن جائے گا۔ اور جسے بندگی چاہیے، وہ دین کے ذرائع پر عمل کر لے، اللہ عزوجل ”عباد الرحمن“ میں شامل فرمائیں گے، ان شاء اللہ!۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ اللَّهَ قَالَ: مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أَحْبَبْتُهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لِأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي لِأُعَيْدَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدَّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ»¹

”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میرا اس کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور میرے بندے کے پاس، تقرب کے اُن ذرائع میں سے کہ جو مجھے محبوب ہیں، فرائض سے بڑھ کر کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس وہ میرا تقرب حاصل کر سکے۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب بن جاتا ہے۔ اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ سنتا ہے۔ اور میں اس کی بصارت بن جاتا

¹ صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب النوافل، 105/8

ہوں کہ جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر مجھ سے سوال کرے تو ضرور اس کا سوال پورا کرتا ہوں۔ اور مجھ سے پناہ مانگے تو ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں۔ مجھے اپنے کسی کام میں تردد نہیں ہوتا لیکن مومن کی جان قبض کرنے میں تردد ہوتا ہے کہ مومن موت کو ناپسند جانتا ہے اور مجھے مومن کی ناپسندیدگی گراں گزرتی ہے۔“

اس حدیث میں اولیاء اللہ انہی کو قرار دیا گیا ہے جو فرائض اور نوافل کے راستے اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کی ایک علامت ان کا مستجاب الدعوات ہونا اور دوسری موت کو ناپسند جانا ہے۔ اگر موت پسند ہو تو پھر بزرگی کے راستے پر ہے، بندگی پر نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ میں غور کیا جائے تو بہت بلیغ ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ، أَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ، كَرِهَ اللَّهُ لِقَاءَهُ» فَقُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللَّهِ أَكْرَاهِيَهُ الْمَوْتُ؟ فَكُلُّنَا نَكْرَهُ الْمَوْتَ، فَقَالَ: «لَيْسَ كَذَلِكَ، وَلَكِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا بُشِّرَ بِرَحْمَةِ اللَّهِ وَرِضْوَانِهِ وَجَنَّتِهِ، أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ، فَأَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ، وَإِنَّ الْكَافِرَ إِذَا بُشِّرَ بِعَذَابِ اللَّهِ وَسَخَطِهِ، كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ، وَكَرِهَ اللَّهُ لِقَاءَهُ»¹

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جسے اللہ سے ملنا محبوب ہو تو اللہ کو بھی اس سے ملنا پسند ہے۔ اور جسے اللہ سے ملاقات ناپسند ہو تو اللہ کو بھی اس سے ملاقات ناپسند ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: اے نبی ﷺ! کیا اللہ سے ملاقات کو ناپسند جانے سے مراد موت کو ناپسند جانا ہے تو ہم تو موت کو ناپسند جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ بندہ مومن کو آخر وقت میں جب اللہ کی رحمت، اس کی رضا اور جنت کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا اللہ سے ملاقات کا شوق بڑھ جاتا

¹ صحیح مسلم، کتاب الذِّكْرِ وَالْذَّعَاءِ وَالنُّفُوتِ، بَابُ مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللَّهِ أَحَبَّ اللَّهُ لِقَاءَهُ، 2065/4

ہے اور اللہ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں۔ اور کافر کو جب اللہ کے عذاب اور غضب کی بشارت دی جاتی ہے تو وہ اللہ سے ملاقات کو ناپسند جانتا ہے اور اللہ عز و جل بھی اس سے ملاقات کو پسند نہیں کرتے ہیں۔“

اندر کا سکون کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہندو، عیسائی اور بدھ بھی حاصل کر لیتے ہیں اور شاید مسلمان صوفیاء سے زیادہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل شئیء یہ ہے کہ کس حالت میں یا کیا کام کرنے کے نتیجے میں آپ کو وہ سکون حاصل ہوا ہے؟ اگر تو وہ کام ایسا ہے کہ جس کے ذریعے اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سکون حاصل کیا تو اس سے حاصل شدہ سکون بلاشبہ اللہ ہی کی طرف سے ہے جیسا کہ روایات میں ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت سے سکینت نازل ہوتی ہے تو ایسا سکون تو قطعی طور اللہ ہی کی طرف سے ہے لیکن وہ سکون جو دیگر طریقوں سے حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی نسبت قطعی طور اللہ کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”چھپلی نوکری میں میرا بیخبر ایک ایسا مخلص عیسائی تھا جو سنجیدگی سے نوکری چھوڑ کر اپنے علاقائی گرجا گھر کا سربراہ بننے کا متمنی تھا۔ جب اسے میرے مذہبی رجحان سے آگاہی ہوئی تو اکثر مجھ سے بہانے بہانے گفتگو کرتا تا کہ مجھ پر عیسائیت کی حقانیت کو ثابت کر سکے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ معاذ اللہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں اور ساتھ ہی خدا کے بیٹے بھی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ مجھے پورے اعتماد سے بتاتا کہ خدا روز مجھ پر وحی کرتا ہے اور مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ دھیان رہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں بلاشبہ ایک ذہین، فطین اور نفیس انسان تسلیم کیا جاتا تھا۔ میں نے اس سے اس کی اس وحی کی کیفیت پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ باقاعدہ ایک آواز سنتا ہے جو اس کے جسمانی کان میں نہیں بلکہ دماغ میں گونجتی ہے۔ یہ آواز اسے بتاتی ہے کہ اسے آج کیا کیا اچھے کام کرنے ہیں؟ اکثر اسے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اسے معلوم ہونا ناممکن تھیں۔ مثال کے طور پر یہ آواز اسے حکم دیتی کہ فلاں شخص کے پاس جاؤ اور اسے تسلی دو کہ اس

کا باپ اس سے ناراض نہیں ہے۔ جب اس نے جا کر یہ پیغام مطلوبہ انسان تک پہنچایا تو وہ شخص روہنسا ہو گیا اور اس نے بتایا کہ ابھی چند روز پہلے ہی اس کے باپ کا انتقال ہوا ہے جسے وہ بہت یاد کرتا ہے۔ اسی طرح ایک بار اس نے مجھے میری بیوی کی دیرینہ بیماری کا نہایت پیچیدہ نام بتایا جو کہ ان ہی دنوں میڈیکل رپورٹس میں مجھے معلوم ہوئی تھی اور اسے میرے سوا کوئی دوسرا آفس میں نہیں جانتا تھا۔ یہ بات بتا کر اسے ایسا لگا کہ شاید میں اس سے مرعوب ہو جاؤں گا اور شاید مجھے کسی حد تک مرعوب ہو بھی جانا چاہیے تھا لیکن میں اپنے مرحوم شیخ کی بدولت یہ جانتا تھا کہ نفسی علوم کے ذریعے یا قرین (جن) کا استعمال کر کے کچھ ایسی باتیں جان لینا جو سامنے والے کے ذہن میں پہلے سے موجود ہو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں نے اس میٹر کو یورے سکون سے سمجھایا کہ اس طرح کی شعبہ بازیوں یا کرامات تو ہر مذہب کا فرد کر لیتا ہے۔ اس سے حق کے حق ہونے کا تعین قطعی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا فیصلہ تو صرف وحی اور فطرت سلیمہ مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے اسے کچھ ذاتی اور کچھ دیگر مسلمانوں کے سچے مافوق الفطرت واقعات سنائے جسے سن کر اس کے چہرے پر فکر کے سائے منڈلانے لگے۔ میرا یہ میٹر ایک نہایت پرسکون نظر آنے والا انسان تھا۔ جس کے سکون کا یہ عالم تھا کہ روز سب کو ای میل کر کے بتاتا کہ آج کا دن رب کی کتنی نعمتوں سے مزین نظر آ رہا ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ بات پریشان کن تھی کہ اسے میرا وجود بھی یوری طرح پرسکون نظر آتا۔ اسے یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کوئی شخص عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نہ مانے اور پھر بھی پرسکون رہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ دوسری طرف مجھے اعتراف ہے کہ چونکہ میں بھی سکون کو ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ مانتا ہوں لہذا میں بھی تعجب میں تھا کہ یا اللہ ایک شخص بدترین شرک میں مبتلا ہو کر بھی اس درجہ پرسکون کیسے ہے؟ یہ دو طرفہ حیرت ایک زمانے جاری رہی۔ جب بے تکلفی بڑھی تو میں نے کھل کر اس سے عقائد کے متعلق بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز

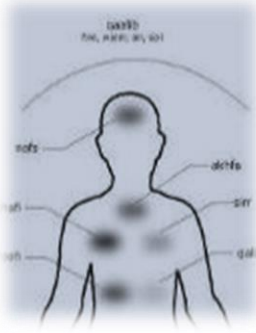
ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ صوفی پر بیٹھ کر اسی بارے میں بات کریں گے۔ چنانچہ وہ دن آگیا۔ میں نے اس سے کہا کہ کیونکہ تم قرآن حکیم کو اللہ کا کلام نہیں مانتے، اس لئے آج میں تم سے صرف اس کتاب کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں جسے تم اللہ کا کلام مانتے ہو یعنی بائبل۔ یہ سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی حیرت میں اضافے کے لئے میں نے اسے بتایا کہ میں بائبل سمیت دیگر نمائندہ مذاہب کے کئی صحائف کو پڑھ چکا ہوں۔ اب میں نے اسے سمجھایا کہ کتنے زیادہ حوالوں سے قرآن اور بائبل کے ماننے والے ملتے جلتے عقائد کو مانتے ہیں۔ اصل مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں بلکہ ایک بہت برگزیدہ پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا کہ اب تم مجھے کوئی ایک بھی آیت بائبل سے ایسی پیش کر دو جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے خدائی کا دعویٰ کر کے اپنی عبادت کا حکم دیا ہو۔ یہ سن کر اس نے وہ آیات یکے بعد دیگرے سنائی شروع کیں جو دراصل کوئی دوسری بات بیان کر رہی تھیں۔ میں ایک ایک کر کے اس کی پیش کردہ آیات کو واضح کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی کوئی آیت براہ راست موجود نہیں۔ میں نے مسکرا کر اسے سمجھایا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ کہ اتنا بڑا عقیدہ واضح الفاظ میں موجود ہی نہ ہو۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اب ہچکلی سی تھی۔ میں نے اب ان حوالوں کو بائبل سے بیان کرنا شروع کیا جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک ہی آسمانی باب یعنی خدا کی جانب بلاتے رہے اور اسی کو خود بھی سجدہ کرتے رہے۔ اس نے اقرار کیا کہ ابھی اس کے پاس اس کا جواب نہیں اور وہ اس بارے میں تحقیق کر کے بتائے گا۔ یوں ہماری نشست ختم ہوئی۔ اس کے بعد کے چند روز میں نے اسے نہایت بے سکونی کی حالت میں دیکھا۔ اس کا وہ سکون اب کہیں غائب ہو گیا تھا جو اس کا خاصہ تھا۔ یہ عقدہ مجھ پر اب کھل چکا تھا کہ جس سکون کو اس پیغمبر نے اختیار کیا تھا وہ ایک نقلی نقاب سے زیادہ نہ تھا جو دلائل سے یکدم منہدم ہو گیا تھا۔ چند

دن بعد اس نے خود مجھ سے بات کی اور کہا کہ ان باتوں کے جواب نہیں ہیں مگر وہ بنا دلیل اس بات کو مانے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں کیونکہ وہ اسے وحی کرتے ہیں۔ میں نے جواب میں اسے پھر ان گنت ایسے ہی واقعات سنائے جو مختلف عقائد کے لوگوں کے ساتھ ہوتے آئے ہیں۔ ساتھ ہی ان ذہنی مریضوں کی کہانیاں بھی یاد کروائی جنہوں نے اپنی اولاد کو یا کسی عزیز کو اس لئے قتل کر دیا کہ ان کے بقول خدا نے انہیں ایسا کرنے کی وحی کی تھی۔ اس سب سے گھبرا کر اس نے مجھے ڈرتے ڈرتے اپنے چرچ آنے کی دعوت دی تاکہ میں وہاں کسی سے مل سکوں۔ میں نے دعوت قبول کی اور اللہ سے دعا کر کے مقررہ اتوار کو اس بہت بڑے چرچ میں جا پہنچا۔ وہاں ہوتی ہوئی ہر عبادت کا مشاہدہ کیا اور خیال رکھا کہ کسی شرکیہ عبادت کا حصہ نہ بنوں۔ عبادت کے اختتام پر میرے پیچھے نے مجھے اپنے بڑے سے ملوایا۔ اس سے بھی شائستہ مکالمہ ہوا اور زیادہ دیر نہ لگی جب اس کے پاس بھی کہنے کو اس کے سوا کچھ نہ بچا کہ بنا دلیل عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت تسلیم کی جائے معاذ اللہ!۔ اس کے بعد کھانے کی میز پر اس کی بیوی مجھ سے برزخی زندگی کے اسلامی نکتہ نظر کو سمجھتی رہی اور اپنے دیرینہ سوالات کے جوابات پاکر خوشگوار حیرت میں مبتلا رہی۔ جب تک میں وہاں نوکری کرتا رہا وہ اپنے عیسائی دوستوں کے ساتھ مل کر میرے عیسائی ہو جانے کی دعا مانگتا رہا اور میں اللہ سے اس کی ہدایت کا طلب گار رہا۔ الحمد للہ! مجھے اطمینان ہے کہ اس تک دین کا پیغام الہامی دلائل اور ثبوتوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ اب ماننا نہ ماننا اس کا اپنا عمل ہو گا۔“

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ماننے والے صوفیا حضرات اسی قسم کی غلطی میں مبتلا ہیں کہ جس میں یہ عیسائی مبلغ مبتلا ہے۔ اگر یہ اتنی ہی بڑی حقیقت تھی تو اس بارے قرآن مجید کی کوئی ایک تو صریح آیت موجود ہوتی۔ اور اگر اس بارے قرآن مجید کی کوئی ایک بھی صریح آیت موجود ہوتی تو یہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ دین اور محدثین عظام رحمہم اللہ کا سرفہرست عقیدہ ہوتا۔

تزکیہ نفس اور لطائف

صوفیا کے نزدیک اصلاح نفس میں لطائف کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں لطائف سے مراد روح انسانی کے اعضاءِ رئیسہ (major parts) ہیں۔ اور آسان الفاظ میں ان کے نزدیک انسانی بدن میں کچھ مقامات ایسے ہیں کہ جو انوار کا محل اور مقام ہیں اور انہیں اذکار کے ذریعے روشن کیا جاتا ہے۔ نقشبندیہ میں عموماً چھ لطائف معروف ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور نفس¹۔ بعض نے سلطان الاذکار کو بھی شامل کرتے ہوئے سات بیان کیے ہیں۔²



بعض نے ان کی تعداد پانچ یا دس بھی بیان کی ہے جبکہ بعضوں کے نزدیک ان کی تعداد تیس سے اوپر ہے۔

نقشبندیہ میں لطائف ستہ میں سے ایک کا مقام دل، دوسرا دل سے کچھ اوپر، تیسرا دل کے سامنے دائیں جانب، چوتھا دل کے سامنے سے

کچھ اوپر، اور پانچواں ان دونوں کے اوپر درمیان میں اور چھٹا پیشانی میں ہے۔ درج ذیل تصویر نقشبندیہ کے نزدیک انسانی بدن میں لطائف ستہ کے مقامات کو بیان کر رہی ہے۔ چشتیہ نے بھی ان کی تعداد چھ ہی بیان کی ہے لیکن تین لطائف کے مقامات میں اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے معدے، ناف اور دماغ کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔

کیا اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لطائف پر توجہ کروائی یا ان کے لطائف روشن کروائے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ صرف صحابہ ہی نہیں بلکہ تابعین، تبع تابعین اور فقہائے محدثین کے زمانے میں بھی لطائف کا کوئی تصور موجود نہیں تھا بلکہ صوفیا میں معروف رائے کے مطابق حضرت بہاؤ الدین نقشبند رحمہ اللہ متوفی

¹ ذوق، سید محمد شاہ، سر دلبران، الفیصل ناشران، لاہور، 2005، ص 356

² محمد اکرم اعوان، لطائف اور تزکیہ نفس، دار العرفان، چکوال، ص 2

791ھ سے پہلے تصوف کی تاریخ میں لطائف کا تصور موجود نہیں تھا۔

صوفیاء کے اس تصور لطائف میں ایک چیز قابل توجہ ہے اور وہ لطیفہ قلب ہے۔ بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ کی بیسیوں روایات ایسی ہیں جو اس مقام یا عضو کی اصلاح اور اس پر توجہ کے بارے میں مروی ہیں جیسا کہ ایک روایت میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب دل صالح ہو جاتا ہے تو انسان کا سارا جسم صالح ہو جاتا ہے اور اگر اس میں فساد ہو جائے تو سارا جسم فساد والا ہو جاتا ہے۔¹ لہذا قلب کو توجہ کا مرکز بنانا اور اسے اللہ کی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کرنا، یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

لطائف کو روشن کرنے کا ایک طریقہ تو صوفیاء نے متعارف کروایا کہ جس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ جس میں مراقبہ، ذکر جہری، پاس انفاس، ذکر خفی اور ضرب قلب جیسے ذرائع سے لطائف روشن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ سب ذرائع اس معنی میں غیر مسنون ہیں کہ خیر القرون میں ان پر عمل نہیں تھا، لیکن اس کے برعکس ان سات لطائف یعنی قلب، ذہن، زبان، آنکھیں، کان، معدہ اور ناف کو ہم فرائض کی پابندی اور نوافل پر دوام کی صورت میں روشن کرنے کی بات کریں تو یہ مسنون ذریعہ ہے۔ لطیفہ قلب کی روشنی تو یاد الہی میں ہے اور لطیفہ زبان کے روشن کرنے سے مراد آفات سے اس کی حفاظت اور ذکر الہی سے رطب اللسان رکھنا ہے۔ لطیفہ دماغ اس وقت روشن ہوگا جبکہ خالص توحید کا حامل ہو اور ہر قسم کے شرکیہ اور کفریہ افکار و نظریات سے پاک ہو۔ لطیفہ سماعت اور بصارت کا روشن ہونا بھی ان کے شریعت کے مطابق استعمال کے بقدر ہے۔ لطیفہ معدہ کی روشنی حرام سے اجتناب اور لطیفہ ناف کی روشنی ہر قسم کی شہوات سے اجتناب سے حاصل ہوتی ہے۔ من جملہ اگر انسان شریعت اسلامیہ پر عمل کرے اور دل کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنے کے لیے، زبان و دماغ کے ساتھ، دوام ذکر و فکر الہی کی عادت ڈالے تو اس کے جمیع لطائف روشن ہو جائیں گے۔

¹ «أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ» [صحیح البخاری، کتاب الإيمان، باب فَضْلِ مَنْ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ، 20/1]

شیخ اکل فی اکل علامہ نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ صلوات خمسہ یعنی پانچ نمازیں ہی لطائف خمسہ ہیں اور قرآن مجید سلطان الاذکار ہے۔ بعض صوفیاء چونکہ سلطان الاذکار کو الگ سے لطیفہ شمار نہیں کرتے لہذا شیخ اکل نے بھی لطائف کی تعداد پانچ بیان کرتے ہوئے چھٹے لطیفے یا سلطان الاذکار سے مراد قرآن مجید لی ہے۔ یہ لطائف کی سلفی تعبیر ہے یعنی جس نے اپنے پانچ لطائف روشن کرنے ہوں وہ اپنی نمازوں کو بہتر سے بہتر بنائے یہاں تک کہ انہیں درجہ احسان تک لے آئے اور جس نے سلطان الاذکار کو روشن کرنا ہو تو وہ قرآن مجید کی تلاوت کو بہتر کرے یہاں تک کہ حدیث کے الفاظ کے مطابق ”اہل اللہ“ میں اور ”أصحاب القرآن“ میں شامل ہو جائے۔¹ نمازوں کے لطائف سے انسان کا باطن اس قدر روشن ہو گا کہ اس کا یہ نور قیامت والے دن بھی باقی رہے گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَنْ بُرَيْدَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «تَبَشِّرِ الْمُشَاقِينَ فِي الظُّلُمِ إِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّورِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»²
 ”حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لوگ اندھیروں میں کثرت سے مسجد کا رخ کرتے ہیں، انہیں قیامت والے دن میں مکمل نور کی خوش خبری دے دو۔“

حدیث کی روشنی میں لطائف آٹھ ہیں کہ جن میں چار انسانی جسم میں ہیں اور چار اس کے جسم سے باہر ہیں۔ اور یہ دو کاموں سے روشن ہوتے ہیں، ایک فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے سے اور دوسرا ان کے روشن ہونے کی دعائیں گننے سے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے یا فجر کی نماز میں یہ دعائیں گنا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي لِسَانِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي سَمْعِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي بَصَرِي نُورًا، وَاجْعَلْ خَلْفِي نُورًا، وَأَمَامِي نُورًا،

¹ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لِرَأْيِ اللَّهِ أَهْلِيْنَ مِنَ النَّاسِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَنْ هُمْ؟ قَالَ: «هُمْ أَهْلُ الْقُرْآنِ، أَهْلُ اللَّهِ وَخَاصَّتُهُ» [سنن ابن ماجه، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب فضلي من تعلم القرآن وعلمه، 78/1]

² سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب ما جاء في المشي إلى الصلاة في الظلام، 154/1

وَأَجْعَلْ مِنْ فَوْقِي نُورًا، وَمِنْ تَحْتِي نُورًا اللَّهُمَّ، وَأَعْظِمْ لِي نُورًا»¹
 ”اے اللہ! میرے دل کو نور سے بھر دے اور میری زبان میں نور رکھ دے۔
 اور میری سماعت میں نور فرما دے اور میری بصارت کو نور بنا دے۔ اے اللہ!
 میرے آگے نور فرما دے، پیچھے نور فرما دے، اوپر نور فرما دے اور نیچے نور فرما
 دے۔ اے اللہ! میرے نور کو بڑھا دے۔“

قوائے ثلاثہ

علماء کا کہنا ہے کہ اللہ عز و جل نے ہر انسان میں تین قوتیں رکھی ہیں: عقل کی قوت،
 غضب کی قوت اور شہوت کی قوت۔ ان تینوں قوتوں میں افراط و تفریط یعنی زیادتی اور
 کمی (extremes) ظلم ہے جبکہ اعتدال یعنی میانہ روی مطلوب ہے۔
 عقل کی قوت ایسی قوت ہے کہ جس کے ذریعے انسان غور و فکر کرتا ہے۔ عقل کی
 قوت میں تفریط اور کمی یہ ہے کہ جہاں اسے استعمال کرنا چاہیے وہاں ہم اسے استعمال نہ
 کریں۔ اور اس سے کند ذہنی اور حماقت (stupidity) جنم لیتی ہے۔ اور عقل کی قوت
 میں افراط اور زیادتی یہ ہے کہ ہم اس کا وہاں بھی استعمال کریں جہاں اس کا استعمال کرنا
 بے معنی اور لاف یعنی ہوا اور اسے سوفسطائیت (sophistry) کہتے ہیں۔ اور اگر عقل کی
 قوت میں اعتدال ہو تو اسے حکمت (wisdom) کہتے ہیں جو کہ مطلوب ہے۔ ارشاد
 باری تعالیٰ ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا
 يَذْكُرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ [البقرة: 269]

”اللہ عز و جل جس کو چاہتے ہیں، حکمت عطا فرماتے ہیں۔ اور جسے حکمت جیسی
 نعمت دی گئی تو اسے تو بہت زیادہ خیر دے دیا گیا۔ اور اس بات سے صرف وہی
 نصیحت حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔“

غضب کی قوت میں اگر تفریط اور کمی ہو تو اسے بزدلی کہتے ہیں اور اگر افراط اور زیادتی
 ہو تو اسے رعونت کہتے ہیں اور اگر اعتدال ہو تو اسے شجاعت کہتے ہیں جو کہ مطلوب ہے۔

¹ سنن أبي داود، أبواب قيام الليل، باب في صلاة الليل، 44/2

بس اگر کسی کو غصہ نہ آئے تو وہ بزدل ہے بلکہ بے غیرت ہے اور غصہ کا نہ آنا کوئی شریعت کا مطالبہ نہیں ہے۔ اور جسے بلا وجہ غصہ آئے اور ایسی جگہ غصہ کھائے جہاں غصہ نہیں کھانا چاہیے تھا تو یہ رعونت ہے۔ اور جو اللہ کے دین کے لیے غصہ کرتا ہے اور اپنے نفس کے لیے غصہ پی جاتا ہے تو یہ اعتدال ہے اور اسی کا نام شجاعت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«وَاللَّهِ مَا انْتَقَمَ لِنَفْسِهِ فِي سَيِّئٍ يُؤْتَى إِلَيْهِ قَطُّ، حَتَّى تُنْتَهَكَ حُرْمَاتُ اللَّهِ، فَيَنْتَقِمَ لِلَّهِ»¹

”اللہ کی قسم! اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ البتہ اگر اللہ کی حدود میں سے کسی حد کی حرمت پامال کی جاتی تو آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔“

بعض اوقات انسان غصہ اپنے نفس کے لیے کر رہا ہوتا ہے لیکن نام دین کا لیتا ہے، یہ بھی غلط ہے بلکہ زیادہ خطرناک ہے۔ غضب کی قوت سے صرف غصہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ بغض، نفرت، عداوت اور رعونت وغیرہ جیسے کئی قسم کے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔

شہوت کی قوت میں اگر تفریط اور کمی ہو تو یہ سستی ہے بلکہ مردانگی کے خلاف ہے۔ اور اگر شہوت کی قوت میں افراط اور زیادتی ہو تو ہوس ہے اور اگر اس میں اعتدال ہو تو یہ عفت ہے اور یہی دین میں مطلوب ہے۔ یعنی ہمارا دین نہ تو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی شہوت کی قوت کو دبا دیں اور نہ یہ کہ اسے جڑ سے ہی ختم کر دیں۔ ان دونوں صورتوں کا نتیجہ نسل انسانی کا خاتمہ ہے جو کہ فطرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح ہمارے دین کا یہ بھی تقاضا نہیں ہے کہ ہم اپنی شہوت کو بے لگام چھوڑ دیں کہ حلال و حرام کی پرواہ نہ رہے۔ اور اگر شہوت کی قوت کو حلال میں استعمال کیا جائے جیسا کہ نکاح وغیرہ میں اور حرام سے بچایا جائے تو اسے عفت کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمُ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنَّ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِيهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

¹ صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب إقامة الحدود والإتيان لحرمات اللہ، 160/8

﴿32﴾ وَلْيَسْتَغْفِبِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ [النور: 33]

”اور تم میں سے جو مرد اور عورتیں بغیر نکاح کے ہیں، ان کے نکاح کروادو۔ اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے نیکو کاروں کا بھی نکاح کروادو۔ اور اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے مالدار کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ فراخی دینے والا اور جاننے والا ہے۔ اور جو لوگ نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو انہیں چاہیے کہ وہ عفت اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ عز و جل انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔“

شہوت کی قوت سے بھی صرف شہوت ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ لالچ، حرص، طمع اور ہوس وغیرہ جیسے کئی قسم کے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ پس اسلام کا مقصود اُن قوتوں کا خاتمہ نہیں ہے کہ جن کی افراط و تفریط سے نفس میں رذائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان قوتوں کو قابو کرنا اور اعتدال کے ساتھ ان کا استعمال ہمارے دین کی تعلیم ہے۔ جسم انسانی میں ان تین قوتوں اور جبلتوں کی مثال تین جزیروں (generators) کی سی ہے۔ اگر تو تزکیہ نفس کے عمل میں ان تین جبلتوں (inborn characters) کو کمزور کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے تفریط پیدا ہوگی جو اسلام میں مطلوب نہیں ہے۔ اور دوسری صورت لاپرواہی اور غفلت سے ان جبلتوں کو قوی کرنا یعنی افراط ہے اور یہ بھی مطلوب نہیں ہے۔ پس اخلاق حسنہ ہوں یا رذائل (vices) دونوں انہی جبلتوں اور قوتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ جبلتیں یعنی عقل، غضب اور شہوت اعتدال میں ہوں تو اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں اور اگر یہ افراط و تفریط میں ہوں تو رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ پس یہ قوتیں اخلاق اور رذائل کی جزیئر ہیں لہذا ان کی تربیت ضروری ہے اور ان کی تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتدال میں رہیں۔ واللہ اعلم

ایک اور بات یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ ہمیں وہ اسباب بھی اختیار نہیں کرنے چاہئیں جو ان جبلتوں میں افراط و تفریط کا باعث بنیں۔ مثلاً ضرورت سے کم کھانا انسان میں شہوت کی جبلت کو تفریط میں لے جانے کا سبب بنتا ہے اور ضرورت سے زائد کھانا

انسان میں شہوت کی قوت میں افراط کا باعث ہے لہذا نہ تو ضرورت سے کم کھانا تقویٰ ہے اور نہ ہی ضرورت سے زائد کھانا نیکی ہے بلکہ کھانے میں اعتدال ہونا چاہیے تاکہ شہوت کی قوت میں بھی اعتدال رہے۔ واللہ اعلم

بعض علما کا کہنا ہے کہ شہوت کی قوت اس لیے رکھی گئی کہ انسان اس کے ذریعے اپنے نفس کے واسطے نفع بخش چیزیں حاصل کرے۔ اور غضب کی قوت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے اپنی ذات سے ضرر رساں چیزوں کو دور کرے۔ اور عقل کی قوت کا مقصد یہ ہے کہ وہ نفس کے لیے نفع بخش اور ضرر رساں چیزوں میں فرق کرے۔ پس یہ تینوں قوتیں دراصل انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ پس اس قول کے درست ہونے کی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نفس انسانی کی وہ تین جہات ہیں کہ جن سے جمیع اخلاق اور رذائل پیدا ہوتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر انسان میں دنیا، مال اور جاہ کی طلب (desire) پیدا ہو تو یہ شہوت کی قوت کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ طلب اعتدال میں رہے تو یہی مطلوب ہے اور اگر شدید ہو جائے تو اسے حرص، لالچ اور طمع کہتے ہیں جو آزمائش بن جاتی ہے۔ اگر انسان شدید طلب کے بعد دنیا، مال اور جاہ حاصل کر لے تو اس سے بخل اور کنجوسی پیدا ہوتی ہے اور اگر معتدل طلب کے بعد یہ چیزیں حاصل ہوں گی تو بخل اور کنجوسی پیدا نہ ہوگی۔ اور اگر ایسا ہو کہ طلب تو شدید ہو لیکن انسان کو دنیا، مال اور جاہ حاصل کرنا مشکل ہو یہاں تک کہ اسے ان کے حصول کے لیے اپنی قوت غضب استعمال کرنی پڑے تو اس سے فخر، تکبر، ظلم اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

اور اگر انسان اپنے آپ سے کسی ضرر رساں چیز کو دور کرنا چاہے تو اس کے لیے قوت غضب کو استعمال کرتا ہے مثلاً کسی نے اسے گالم گلوچ کی اور اب وہ اس لعن طعن کو اپنے سے دور کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے غضب کی قوت کو استعمال کرے گا۔ اگر وہ اس ضرر رساں چیز کو اپنے سے دور نہ کر سکے تو اس سے بغض پیدا ہوتا ہے اور اگر انسان کسی اور کو دیکھے کہ وہ تو اپنے نفس سے ضرر کو دور کرنے اور فائدہ پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے

لیکن وہ خود اس اہل نہیں ہے تو اس سے حسد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ جذبہ انتقام بھی قوت غضب کے افراط سے پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

فنا اور بقا

صوفیائے تزکیہ نفس میں فنا اور بقا کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ متقدمین صوفیاء کا تصور فنا و بقا سادہ تھا۔ فنا سے ان کی مراد ذائل نفس سے اپنی ذات کو پاک کرنا اور بقا سے مراد اخلاق حمیدہ سے اپنے نفس کو متصف کرنا تھا۔ فنا کی اصطلاح ذائل کے لیے تھی اور بقا کی اخلاق عالیہ کے لیے۔ شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے گفتگو کرتے ہوئے اپنے زمانے کے ان صوفیوں کو جاہل قرار دیا ہے کہ جو ”فنائے کلی“ کا مدعی تصور رکھتے ہیں۔¹ متاخرین صوفیاء میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی کہ جنہوں نے تصوف کو عمل سے زیادہ نظریہ بنا دیا۔ انہوں نے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کو سالک کی منازل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک فنا فی اللہ عروج ہے اور بقا باللہ زوال ہے۔ پس سالک اپنے تزکیہ نفس میں اپنے قلب و ذہن کو اللہ کے غیر سے اس طرح پاک کر لے کہ اللہ کا غیر، سالک کے ہاں درجہ علم میں نہ رہے۔ اور سالک کو خالق کے علاوہ کچھ محسوس نہ ہو۔ ایسا سالک اپنے آپ کو اللہ کی ذات میں فنا کر دیتا ہے یاں معنی کہ اس پر اللہ کے تصور اور محبت کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ غیر کا وجود اس کے دل و دماغ میں باقی نہیں رہتا۔ فنا فی اللہ کے بعد بعض سالکین کو بقا باللہ کا مرتبہ دیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سالک اپنے دل و دماغ کو جب اللہ کی ذات میں فنا کر دیتا تو مخلوق اس کے لیے ایک اعتبار سے معدوم ہو گئی ہے۔ اب اللہ کی طرف سے تبلیغ و دعوت یا کسی دوسری مصلحت کے سبب سے سالک کو دوبارہ مخلوق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور وہ اللہ کے تصور کے ساتھ غیر کا تصور اپنے ذہن میں اور اللہ کی محبت کے ساتھ مخلوق کی محبت بھی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اس طرح مخلوق جو کہ فنا فی اللہ میں سالک کے لیے معدوم ہو چکی تھی، اگرچہ حقیقت میں وہ موجود تھی، تو

¹ علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الغزنوی الہجویری، کشف المحجوب، مترجم فضل دین گوہر،

مزدور پرنٹنگ پریس، لاہور، 1972ء، ص 227-230

بقا باللہ میں وہ مخلوق دوبارہ سالک کے قلب و ذہن میں آ موجود ہوتی ہے۔¹ ہمیں فنا و بقا کی ان دونوں تعبیرات سے دلچسپی نہیں ہے۔ پہلی تعبیر اگرچہ اپنے مقصود میں تو شرعی ہے یعنی رذائل کا خاتمہ اور اخلاق عالیہ سے متصف ہونا لیکن یہ تعبیر فنا و بقا کے الفاظ کا دور کا معنی معلوم ہوتا ہے۔ اور فنا و بقا کی دوسری تعبیر تو شرعی اعتبار سے بھی مطلوب نہیں ہے کیونکہ اس تعبیر کو مان لینے کی صورت میں فنا فی اللہ کا عروج استغراق (self-absorption) اور سکر (senselessness) قرار پاتا ہے جو شرعی اعتبار سے مطلوب صفات نہیں ہیں۔ استغراق اگر مطلوب ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ جماعت کی نماز میں بچے کی رونے کی آواز سن کر نماز مختصر نہ کرتے۔ عین نماز کی حالت میں بھی نبی کریم ﷺ اللہ کی طرف بھی کامل درجے میں متوجہ رہتے تھے اور اپنی امت سے بھی غافل نہ تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنِّي لَأَقُومُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِيهَا، فَأَسْمَعَ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي كَرَاهِيَةً أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمِّهِ»²

”میں نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی نماز لمبی کروں۔ پس اسی دوران مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں تاکہ اُس کی ماں زیادہ دیر تکلیف میں نہ رہے۔“

اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے درست کہا کہ اس تعبیر کو مان لینے کی صورت میں مقام فنا میں جب سالک ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی تلاوت نماز میں کرے گا تو کس ذہنی شعور کے ساتھ اپنی عبدیت کا اقرار کر پائے گا؟³

اگر ہم کتاب و سنت سے فنا و بقا کا تصور لیں تو وہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ فنا و بقا سے مراد اللہ کے قرب کے شوق میں اپنی جان کو قربان کر دینا ہے۔ اللہ کے راستے میں جان دے دینا، جسے ہم شہادت کہتے ہیں، سے بڑھ کر انسان کیا مرتبہ حاصل کرے گا؟

¹ شریعت و طریقت: ص 307

² صحیح البخاری، کتاب الاذان، بَابُ مَنْ أَخَفَّ الصَّلَاةَ عِنْدَ بُكَاءِ الصَّبِيِّ، 143/1

³ مدارج السالکین: 171/1

اور اس فنا یا شہادت کے بعد اللہ کے عرش کے نیچے قندیلوں میں رات گزارنے سے بڑھ کر بقا باللہ کا کیا تصور ہمارے قلب و ذہن میں آسکتا ہے کہ جسے کتاب و سنت کی تصدیق بھی حاصل ہو۔ شہید دراصل مقام فنا سے گزر کر بقا کا ایسا مقام حاصل کر لیتا ہے کہ جس کو پھر زوال نہیں ہے۔ اور یہاں فنا زوال ہے اور بقا عروج ہے۔ اللہ عز و جل کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ [آل عمران: 169]

”اور تم ان لوگوں کو مردہ خیال مت کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔“

جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَرْوَاحُ الشُّهَدَاءِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضِرَ، لَهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ فِي أَيِّ الْجَنَّةِ شَاءُوا، ثُمَّ تَرْجِعُ إِلَى قَنَادِيلِهَا فَيُشْرِفُ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ فَيَقُولُ: أَلَكُمُ حَاجَةٌ؟ تُرِيدُونَ شَيْئًا؟ فَيَقُولُونَ: لَا، إِلَّا أَنْ نَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا فَتُقْتَلَ مَرَّةً أُخْرَى»¹

”شہداء کی ارواح قیامت کے دن تک اللہ کے پاس رہتی ہیں اور انہیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اُن کی رہائش کے لیے عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی قندیلیں ہیں۔ یہ ارواح جنت میں جہاں چاہتی ہیں، چرتی چلتی ہیں اور پھر شام کو عرش کے نیچے اپنی قندیلوں میں واپس آ جاتی ہیں۔ پس اُن کا رب اُنہیں جہانک کر دیکھتا ہے اور اُن سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے، کچھ چاہیے؟ تو وہ کہتی ہیں: نہیں، کچھ نہیں چاہیے سوائے اس کے کہ ہم دنیا میں ایک بار دوبارہ بھیجی جائیں اور ہمیں دوبارہ اُسی طرح قتل کیا جائے۔“

فنا و بقا کا یہ تصور انسان کے وجود میں سرمستی و سرشاری، امید و حیات اور اپنے رب پر بار بار نثار ہونے کی جو احوال اور کیفیات پیدا کر دیتا ہے، وہ کسی اور تصور سے پیدا ہونی ممکن ہیں کیا؟

¹ الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمن بن الفضل بن بہرام بن عبد الصمد، مسند الدارمی دار المغنی للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، 2000ء، 3/1560

سماع اور وجد

صوفیا کے نزدیک سماع سے مراد غنائیہ اشعار کو آلات اور رقص کے ساتھ خوبصورت آواز کی صورت میں پیش کرنا ہے۔¹ مروجہ قوالی اور دھمال، سماع اور وجد ہی کی ارتقائی صورتیں ہیں۔ بعض صوفیا کا کہنا ہے کہ سماع سے انسان کے دل میں چھپا ہوا شوق، وجد، ہیجان، رقت اور قلق بیدار ہو جاتا ہے اور اس طرح گویا سماع سے دل میں ایسی حرکت پیدا ہوتی ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ سلاسل میں سے نقشبندیہ سماع سے اجتناب جبکہ چشتیہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔²

ائمہ اربعہ اور محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آلات موسیقی حرام ہیں۔³ اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سماع، وجد اور رقص کو تقرب اور تزکیہ کا ذریعہ بنایا؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیا ہم نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ وہ قوالی سنتے اور دھمال ڈالتے ہوں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، قاضی ابوالطیب الشافعی، امام قرطبی المالکی، امام طرطوشی المالکی، امام الشاطبی المالکی، امام ابن الصلاح الشافعی، امام ابن تیمیہ الحنبلی، امام ابن القیم الحنبلی رحمہم اللہ نے صوفیا کے سماع اور رقص کو بدعت قرار دیا ہے۔ حنفی فقیہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - يَكْرَهُونَ الصَّوْتِ عِنْدَ ثَلَاثٍ: الْجَنَائِزِ، وَالْقِتَالِ، وَالذِّكْرِ، وَالْمُرَادُ بِالذِّكْرِ الْوَعْظُ وَقَالَ الْإِمَامُ شَمْسُ الْأَيْمَةِ السَّرْحِي قُضِيَ هَذَا الْحَدِيثُ بَيَانُ كَرَاهَةِ رَفْعِ الصَّوْتِ عِنْدَ السَّمَاعِ الْفُرَّانِ، وَالْوَعْظُ فَتَيَّنَ بِهِ أَنَّ مَا يَفْعَلُهُ الَّذِينَ يَدْعُونَ الْوَجْدَ، وَالْمَحَبَّةَ مَكْرُوهٌ وَلَا أَصْلَ لَهُ فِي الدِّينِ وَتَبَيَّنَ بِهِ أَنَّهُ يُمْنَعُ الْمُتَقَشِّقَةُ وَحَمَقَى أَهْلُ

¹ الغزالي، أبو حامد محمد بن محمد، إحياء علوم الدين، دار المعرفة، بيروت، 2/ 268-306

² شريعت اور طريقت: ص 295-296

³ الألباني، محمد ناصر الدين، تحريم آلات الطرب، مؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الثالثة،

1426ھ/2005ء، 98-105

التَّصَوُّفُ مِمَّا يَعْتَادُونَهُ مِنْ رَفْعِ الصَّوْتِ وَتَمْزِيقِ الثِّيَابِ عِنْدَ السَّمَاعِ؛ لِأَنَّ ذَلِكَ مَكْرُوهٌ فِي الدِّينِ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ، وَالْوَعْظِ فَمَا ظَنُّكَ عِنْدَ سَمَاعِ الْغِنَاءِ.¹

”قیس بن عبادہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ تین مقامات پر آواز بلند کرنے کو ناپسند جانتے تھے: جنازے کے وقت، لڑائی کے وقت اور ذکر کے وقت کہ جس سے مراد وعظ ہے۔ شمس الائمہ امام سرخسی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اور وعظ سنتے وقت بلند آواز نکالنا مکروہ ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جسے یہ [صوفیا] وجد اور محبت کا نام دے کر کرتے ہیں، وہ بھی مکروہ ہے۔ اور دین میں اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ اہل تصوف میں موجود اس قسم کے زاہدوں اور احمقوں کو سماع کے وقت آوازیں بلند کرنے اور کپڑے پھاڑنے سے منع کیا جائے کیونکہ یہ تو قرآن اور وعظ کے سماع کے وقت جائز نہیں ہے تو غنا کے سماع کے وقت کیسے جائز ہوگا؟“

احادیث میں آلات موسیقی سے اجتناب کا حکم اس لیے بھی ہے کہ یہ انسان کو بے خودی اور مدہوشی کی ایسی کیفیت میں لے جاتے ہیں کہ اگر سماع کا رخ مخلوق کی طرف ہو تو شراب اور زنا جیسی منکرات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اگر خالق کا قصد ہو تو وجد اور سکر میں مبتلا ہو کر شطیحات میں پڑ جاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّيِّ أَقْوَامٍ، يَسْتَحِلُّونَ الْجَرَ وَالْحَرِيرَ، وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ»²

”میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور آلات موسیقی کو حلال کر لیں گے۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

¹ ابن نجيم المصري، البحر الرائق شرح كنز الدقائق، دار الكتاب الإسلامي، 82/5
² صحيح البخاري، كتاب الأشرية، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر ويستحيه بغير شيه، 106/7، تحريم

عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: سَمِعَ ابْنَ عُمَرَ، مَرْمَرًا قَالَ: فَوَضَعَ إصْبَعَيْهِ عَلَى أُذُنَيْهِ، وَتَأَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَقَالَ لِي: يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا؟ قَالَ: فَقُلْتُ: لَا، قَالَ: فَارْفَعَ إصْبَعَيْهِ مِنْ أُذُنَيْهِ، وَقَالَ: «كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ مِثْلَ هَذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هَذَا»¹

”حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مزار کی آواز سنی تو اپنے دونوں کانوں میں اپنی انگلیاں ڈال لیں اور دوسرا دستہ اختیار کر لیا۔ اور مجھ سے پوچھا: کیا اب آواز آرہی ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں سے باہر نکال لیں اور کہا: میں اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ کو ایسی ہی آواز سنائی دی تو آپ نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں نے کیا ہے۔“

رہی صوفیا کی نیت، زمان، مکان اور اخوان کی شروط کے ساتھ سماع کے جواز کی بات تو ان شروط کے عدم جواز کے بارے عبد الرحمن بن عبد الرحیم القرشی کے مقالہ ”السماع عند الصوفية: عرض ونقد على ضوء عقيدة أهل السنة والجماعة“ کا مطالعہ مفید رہے گا۔

پس جائز سماع وہی ہے جو قرآن مجید کا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ قَالَ: «يَا أَبَا مُوسَى لَقَدْ أُعْطِيََتْ مَرْمَرًا مِنْ مَرَامِيرِ آلِ دَاوُدَ»²

”اللہ کے نبی ﷺ نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا: تجھے آل داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار (sweet melodious voice) دیا گیا ہے۔“

یہی قرآن کا سماع ہے جو انسان کے دل میں وہ کیفیات اور احوال پیدا کرتا ہے جو تزکیہ اور تقرب کا ذریعہ بنتی ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا تَلَّيْتُمْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾

[الأنفال: 2]

¹ سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب كراهية الغناء والزمر، المكتبة العصرية، بيروت، 281/4

² سنن الترمذي، أبواب المتأقب، باب متأقب أبي موسى الأشعري رضي الله عنه، 693/5

”اور جب اُن پر قرآن مجید کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ آیات اُن کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔“

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا﴾ [مریم: 58]
 ”اور جب اُن پر رحمن کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں۔“

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ﴾ [السجدة: 15]
 ”ہماری آیات پر ایمان لانے والے لوگ تو صرف وہی ہیں کہ جنہیں اللہ کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جائے تو سجدے میں گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔“

صوفیا کو سماع سے جو احوال نصیب ہوتے ہیں، ان میں سے ”وجد“ ان کے ہاں قیمتی ترین حال شمار ہوتا ہے۔ ”وجد“ سے مراد بے خودی اور مدہوشی کی وہ کیفیت ہے کہ جس میں انسان کو اپنے نفس پر قابو نہ رہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بے خودی اور مستی کی یہ کیفیات اگر قرآن مجید سن کر طاری ہوں تو پھر بھی ہمارے دین میں مطلوب نہیں ہیں چہ جائیکہ سماع کے ناجائز ذریعے سے یہ احوال پیدا کیے جائیں۔ اللہ عزوجل کو اپنے بندوں سے جو احوال مطلوب ہیں، وہ وہی ہیں جو قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ جو احوال اللہ کے رسول ﷺ پر طاری نہ ہوئے ہوں تو وہ رحمان کے نہیں شیطان کے احوال ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تَفْشَعُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ [الزمر: 23]

”اور قرآن مجید کو سن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ پھر اُن کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔“

معروف تابعی حضرت قتادہؓ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هَذَا نَعْتُ أَوْلِيَاءِ اللَّهِ، نَعَتْهُمْ اللَّهُ بِأَنْ تَقْشَعِرَّ جُلُودُهُمْ، وَتَبْكِي أَعْيُنُهُمْ، وَتَطْمَنِينَ قُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ، وَلَمْ يَنْعَتْهُمْ بِدَهَابِ عُقُولِهِمْ وَالْغَشْيَانِ عَلَيْهِمْ، إِنَّمَا هَذَا فِي أَهْلِ الْبِدْعِ، وَهَذَا مِنَ الشَّيْطَانِ¹

”یہ اولیاء اللہ کی صفت ہے۔ اللہ نے اپنے اولیاء کی یہ صفت بیان کی ہے کہ اللہ کی یاد میں اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اُن کی آنکھیں سے آنسو بہہ پڑتے ہیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ عزوجل نے اپنے اولیاء کی یہ صفت بیان نہیں کی کہ اللہ کی یاد میں ان کی عقل رخصت ہو جاتی ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تو اہل بدعت کے احوال ہیں اور یہ شیطان کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔“

اسی طرح حضرت انس بن مالکؓ سے سوال کیا گیا:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْقَوْمِ يُقْرَأُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ فَيَصْنَعُونَ، فَقَالَ: «ذَلِكَ فِعْلُ الْخَوَارِجِ»²

”کچھ لوگ جب قرآن مجید سنتے ہیں تو بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ خوارج کی صفت ہے۔“

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ایک عراقی سے گزر ہوا جو کہ زمین پر گرا پڑا تھا اور لوگ اُس کے ارد گرد جمع تھے تو انہوں نے پوچھا:

مَرَّ ابْنُ عُمَرَ بِرَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ سَاقِطًا، وَالنَّاسُ حَوْلَهُ، فَقَالَ: «مَا هَذَا؟» فَقَالُوا: إِذَا قُرِئَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ أَوْ سَمِعَ اللَّهُ يُذَكَّرُ خَرَّ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: «وَاللَّهِ إِنَّا لَنَخْشَى اللَّهَ وَمَا نَسْقُطُ»³

”اسے کیا ہوا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ جب اس پر قرآن مجید کی تلاوت کی

¹ ابن کثیر، إسماعیل بن عمر القرشي، تفسير القرآن العظيم، دار طيبة للنشر، والتوزيع، الطبعة الثانية، 1420ھ-1999ء، 95/7

² القاسم بن سلام بن عبد الله الهروي البغدادي، أبو غنيد، (المتوفى: 224ھ)، فضائل القرآن، دار ابن

کثیر، بیروت، الطبعة الأولى، 1415ھ-1995ء، ص 215

³ أيضاً: ص 214

جاتی ہے یا وہ اللہ کا ذکر سنتا ہے تو خشیت الہی سے زمین پر گر پڑتا ہے تو ابن عمر رضی اللہ عنہما: اللہ کی قسم، خشیت تو ہم پر بھی طاری ہوتی ہے لیکن ہم اس طرح زمین پر نہیں گرتے۔“

اسی طرح معروف تابعی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ عِكْرِمَةَ، قَالَ: سُئِلْتُ أَسْمَاءَ هَلْ كَانَ أَحَدٌ مِنَ السَّلَفِ يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْخَوْفِ؟ فَقَالَتْ: «لَا، وَلَكِنَّهُمْ كَانُوا يَبْكُونَ»¹

”حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ پوچھا گیا کہ کیا سلف [صحابہ] میں سے کوئی ایسا تھا کہ جسے خوف خدا کی وجہ سے غشی کے دورے پڑتے ہوں تو انہوں نے کہا: نہیں، لیکن اُن کا خوف تور و ناتھا۔“

حضرت ہشام بن حسان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا:

عَنْ هِشَامِ بْنِ حَسَّانٍ، قَالَ: قِيلَ لِعَائِشَةَ: إِنْ قَوْمًا إِذَا سَمِعُوا الْقُرْآنَ صَعِقُوا. فَقَالَتْ: الْقُرْآنُ أَكْرَمُ أَنْ تَنْزِفَ عَنْهُ عَقُولُ الرِّجَالِ، وَلَكِنَّهُ كَمَا قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ {تَفْشَعُرُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ}.²

”کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن مجید سنتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا: قرآن مجید اس سے پاک ہے کہ اُسے سن کر لوگوں کی عقل جاتی رہی [یعنی عقل کا جاتے رہنا تو نقص ہے نہ کہ خوبی اور قرآن مجید کے استماع سے نقص تو پیدا ہونے سے رہا] لیکن جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں تو قرآن مجید سن کر اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

پس قرآن مجید کو خوبصورت آواز میں پڑھنا اور سننا یہی سماع ہے جو اہل ایمان سے مطلوب ہے۔ اور اس سماع سے پیدا ہونے والے احوال قرآنی احوال کہلاتے ہیں کہ جو عباد الرحمن کے احوال ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

¹ اَيْضاً: ص 214

² اَيْضاً: ص 214-215

الْبَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ، يُحَدِّثُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ»¹

”حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے رسول ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید کو اپنی آوازوں سے خوبصورت کرو۔“

اور قرآن مجید کو خوبصورت طور پڑھنے سے مراد اس کو پڑھتے ہوئے منہ کے زاویے بنانے میں تکلف کرنا نہیں بلکہ لب و لہجے میں خشوع اور للہیت کا ہونا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ صَوْتًا بِالْقُرْآنِ، الَّذِي إِذَا سَمِعْتُمُوهُ يَفْرَأُ، حَسِبْتُمُوهُ يَخْشَى اللَّهَ»²

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: بہترین آواز میں قرآن پڑھنے والا وہ ہے کہ جب تم اسے قرآن پڑھتے سنو تو یہ محسوس کرو کہ وہ قرآن پڑھتے ہوئے اللہ سے ڈر رہا ہے۔“

اور عصر حاضر میں اللہ عزوجل نے بعض عرب قراء کو جن خوبصورت الحان میں قرآن مجید پڑھنے کی توفیق دی ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ انہیں سن کر انسان میں بندگی کے احوال تازہ ہو جاتے ہیں۔ ماہر المعقلی، سعد الغامدی، ادريس ابكر، الشريم، السديس، مشاری راشد، صدیق المنشاوی، عبد الباسط وغیرہ جیسے کتنے نامور قاری ہیں کہ جن کی تلاوت انسانی روح میں نشاط کی عجب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔³

کبھی آپ تنہائی میں، اکیلے کمرے میں، ہلکی روشنی میں، مکمل خاموشی میں، اونچی آواز سے ماہر المعقلی کی آواز میں قرآن مجید کا کچھ حصہ سن کر دیکھیں اور پھر اپنے آپ سے سوال کریں کہ کیا قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی ذریعہ ایسا ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب في حسن الصوت بالقرآن، 426/1

² سنن ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب في حسن الصوت بالقرآن، 425/1

³ ان قراء کی تلاوت درج ذیل ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔

<http://www.tvquran.com/en>

ﷺ والی بندگی کے احوال زندہ کر دے؟ اور اگر آپ وہ دو چار رکوع کہ جن کی تلاوت آپ نے سننی ہو، ان کا ترجمہ بھی جانتے ہوں یا سننے سے پہلے ان کا لفظی ترجمہ ایک بار دیکھ لیں تو پھر آپ کو اصلاح نفس کے لیے قرآن مجید کے علاوہ کسی ذریعے کی طرف دیکھنے کی خواہش بھی محسوس نہ ہوگی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ لِلَّهِ أَهْلِينَ مِنَ النَّاسِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَنْ هُمْ؟ قَالَ: «هُمْ أَهْلُ الْقُرْآنِ، أَهْلُ اللَّهِ وَخَاصَّتُهُ»¹

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے لیے گھر والے ہیں۔ صحابہ نے پوچھا: اللہ کے گھر والے کون ہو سکتے ہیں؟ تو آپ نے کہا: قرآن سننے اور سنانے والے، اللہ کے گھر والے اور اس کے خاص لوگ ہیں۔“

علاقہ دنیا

اہل تصوف میں فکر و عمل کی جو بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے انسانوں سے محبت کو اللہ سے محبت کے منافی سمجھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا کی محبت کا معنی دنیا کی کسی شے سے محبت ہو جانا ہے، چاہے وہ بیوی بچوں اور والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ لہذا ان میں سے بعض نے اولاد سے محبت کو پسند نہیں کیا کہ یہ دنیا کی محبت ہے اور اللہ کی محبت میں رکاوٹ ہے۔ اس قسم کے خیالات عیسائی راہبوں اور بدھ بھکشوؤں میں بھی ملتے ہیں اور ان کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اے عزیز سنو، مخدوم شیخ فرید شکر گنج سے نقل کیا گیا ہے کہ جب ان کے لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا اور اس کی موت کی خبر آپ کو پہنچائی گئی تو آپ پر رنج و غم سے متعلق کچھ تغیر نہ ہوا اور فرمایا سگ بچہ مر گیا ہے، اس کو باہر پھینک دو۔ اور جب حضرت سید البشر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کے

¹ سنن ابن ماجہ، الكتاب في الإيمان وفوائد الصحابة والعلم، باب فضل من تعلم القرآن وعلمه، 78/1

صاحبزادے حضرت ابراہیم ؑ کا انتقال ہوا تو حضرت پیغمبر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام اس قدر غمگین ہوئے کہ آنسو نکل آئے اور فرمایا: اے ابراہیم، ہم تیری جدائی کی وجہ سے بہت غمگین ہیں اور بڑے مبالغہ اور تاکید کے ساتھ غم و اندوہ کا اظہار فرمایا۔ فرمائیں کہ حضرت شکر گنج رحمۃ اللہ بہتر ہیں یا حضرت سید البشر ﷺ؟ عوام کا لانا عام کے نزدیک پہلا معاملہ بہتر ہے اور اس کو بے تعلق جاننے میں اور دوسرے کو عین تعلق اور اولاد سے لگاؤ خیال کرتے ہیں۔¹

گو اتم بدھا متوفی 400 قبل مسیح نے اپنے غور و فکر کے نتیجے میں جو صد اقتیں معلوم کیں اور ان کی روشنی میں اپنے مذہب بدھ مت کی بنیاد رکھی، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے۔ دوسری یہ تھی کہ دنیا کے دکھوں کا سبب دنیاوی اشیا تعلق اور اس کی خواہش ہے کہ جب انسان کا کوئی دنیاوی تعلق ٹوٹ جاتا ہے یا اس کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو اسے دکھ پہنچتا ہے۔ اور تیسری صداقت اس نے یہ معلوم کی کہ انسان اگر اپنے دکھ کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ دنیا کی چیزوں سے ہر قسم کا تعلق ختم کر لے اور اپنی خواہشات کو مار دے۔ پس جب نہ تعلق (attachment) رہے گا اور نہ ہی خواہش (desire) تو تعلق کے ٹوٹنے اور کسی خواہش کے پورا نہ ہونے پر جو دکھ پہنچتا ہے، تو وہ کبھی نہ پہنچے گا۔

دین اسلام میں تعلقات اور خواہشات کو ختم کرنے کی بجائے، انسانی تعلقات کو اللہ کے تعلق کے تابع رکھنے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کا حکم ہے۔ مال و دولت، بیوی بچوں اور مقام و عہدے کی محبت تو خود اللہ تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہے اور مطالبہ یہ نہیں کیا کہ انہیں اپنے دل سے نکال باہر کرو بلکہ یہ کہا ہے کہ انہیں اللہ کی محبت کے تابع رکھو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ

¹ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، حصہ دوم، مکتوب 272، ص 320

اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٤﴾ [التوبة: 24]

”اے نبی ﷺ کہہ دیں کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔“

مبشرات

اللہ کے رسول ﷺ نے خواب میں بشارت کو نبوت کا چھیلیسواں حصہ قرار دیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «إِنَّ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: مِنْهَا أَهْوِيلُ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ بِهَا ابْنُ آدَمَ، وَمِنْهَا مَا يَهْمُ بِهِ الرَّجُلُ فِي يَقَظَتِهِ، فَيَرَاهُ فِي مَنَامِهِ، وَمِنْهَا جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النَّبُوءَةِ»¹

”حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جو شیطان کی طرف سے ڈراوا ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے انسان کو پریشان رکھے۔ دوسرا وہ خواب ہیں کہ جو کچھ ہم بیداری میں دیکھتے ہیں تو وہ خواب میں نظر آتا ہے۔ اور تیسرا وہ خواب ہیں جو نبوت کا چھیلیسواں حصہ ہیں۔“

پس کچھ خواب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور سچے خواب ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر خواب، اللہ ہی کی طرف سے ہو۔ بعض خواب شیطان کی طرف سے بھی ہوتے ہیں اور بعض خواب انسان کی دن بھر کی سوچیں ہوتی ہیں جو نیند میں خواب کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جب بھی کوئی خواب دیکھے تو پہلے اس بات کا تعین کرے کہ

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب تَعْيِيرِ الرُّؤْيَا، بَابُ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ، 1285/2

اس کا مصدر کیا ہے؟ دن بھر کے خیالات، شیطان کا وسوسہ یا اللہ عزوجل کی طرف سے الہام۔ اس کے بعد اس کی کوئی مناسب تعبیر کر لے۔

اگر کوئی خواب اللہ کی طرف سے ہو تو وہ مبشرات میں سے ہے اور اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ مبشرات کا معنی یہ ہے کہ اس خواب میں بندہ مومن کے لیے کوئی خوش خبری ہے جیسا کہ خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت کا نصیب ہونا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے نبوت کا چھیلیسواں حصہ قرار دیا ہے کہ نبوت کے علم کا جو ماخذ (source) ہے، وہ اور اچھے خواب کا ماخذ ایک ہی ہے کہ بعض خواب ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں انسان کو مستقبل کے کسی واقعے کی خبر خواب میں ہو جاتی ہے، تو یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعہ خوشگوار ہے تو انسان اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر ناگوار ہے تو اس سے اللہ کی پناہ مانگے اور صدقہ کرے تاکہ اس کی آزمائش ٹل جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَمْ يَنْبَقِ مِنَ النَّبْوَةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ» قَالُوا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: «الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ»¹

”نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا سوائے مبشرات کے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ مبشرات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: اچھے خواب۔“

مبشرات بھی کسی شخص کے صراط مستقیم پر ہونے کی نشانی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جنتی بھی ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ جس وقت میں اسے یہ خواب آیا ہے، اس وقت میں وہ صراط مستقیم پر ہے یا اس کی جستجو میں ہے لہذا اس حال پر استقامت اختیار کرے۔

اب تو شر اس قدر پھیل گیا ہے کہ مرید اپنے سلسلے کی ایڈورٹمنٹ کے لیے اپنے پیر صاحب کے بارے نہ صرف خواب گھڑتے ہیں بلکہ کرامتیں بھی وضع کی جاتی ہیں۔ اللہ کے جنتی بندے تو وہ ہیں جو اپنے مبشرات کو چھپاتے ہیں اور لوگوں میں بیان کر کے جھوٹا

¹ صحیح البخاری، کتاب التَّغْيِيرِ، بَابُ الْمُبَشِّرَاتِ 31/9

مقام حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ وہ تو اپنے مبشرات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں شیطان کی طرف سے نہ ہوں اور ہمیں شیطان نے کسی دھوکے میں ڈالنے کی کوشش نہ کی ہو۔

بعض لوگوں کو اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے تو اس بارے آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

»مَنْ رَأَانِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَانِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي«¹
 ”جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی خواب میں دیکھا کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا ہے۔“

البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے کوئی خواب نہ دیکھا ہو لیکن وہ لوگوں میں شہرت حاصل کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولے کہ اسے اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ لہذا ہمارے پاس تصدیق کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کسی شخص کو واقعتاً خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت ہوئی ہے یا نہیں؟ مبشرات انسان کی اپنی ذات کی حد تک تو ایک خوش خبری ہو سکتے ہیں لیکن دوسروں نے جب کسی کے بارے رائے قائم کرنی ہے تو اس کا ایک ہی معیار ہے اور وہ اس کا ظاہر شریعت پر عمل پیرا ہونا ہے۔

اب اگر کسی شخص کو اللہ کے رسول ﷺ خواب میں آئیں اور اسے شک ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہی تھے یا اسے کوئی وہم لاحق ہوا ہے تو اس بارے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ کے خواب میں نظر آنے پر خشوع کی کیفیات حاصل ہوں تو اس نے واقعتاً اللہ کے رسول ﷺ ہی کو خواب میں دیکھا ہے۔ مثال کے طور کسی صاحب نے اللہ کے رسول ﷺ کو خواب میں دیکھا تو ایک دو دن تک اس زیارت کے نتیجے میں ان پر مسلسل گریہ کی کیفیت طاری رہی کہ جس میں ہر وقت آنکھوں سے آنسو جاری

¹ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا باب قول النبی ﷺ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مَنْ رَأَانِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَانِي، 1775/4

رہتے تھے اور سینہ جیسے نور سے بھر دیا گیا ہو۔

اس قسم کے مبشرات بعض اوقات کسی جماعت کے ساتھ وابستہ لوگوں کو بھی ہوتے ہیں۔ اگر تو کسی مذہبی جماعت کے کارکنان جھوٹے خوابوں کے بیان کے ذریعے اپنی جماعت کی ایڈورٹیزمنٹ نہیں چاہ رہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ عز و جل اپنے کمزور بندوں کے بارے میں یہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے جماعتی مبشرات کے نتیجے میں وہ کسی ایسی دینی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو جائیں کہ جس میں خیر کا پہلو غالب ہو اور اس وابستگی کے نتیجے میں زمانے کے فتنوں سے بچ جائیں۔ ان مبشرات کا ہر گز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اکیلی ہی ایسی جماعت ہے جو اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اس قسم کا خیال بھی اللہ کی پناہ کو واجب کر دیتا ہے۔ اور شیاطین کے اس قسم کے وسوسوں سے پناہ مانگنے کے بہترین نبوی الفاظ یہ ہیں کہ جن کے ساتھ صبح و شام تین مرتبہ اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے:

«أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ، مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ، وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَخْضَرُون»¹

”میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں پورے ہو کر رہنے والے کلمات کے ساتھ، اس کے غضب اور عذاب سے، اس کے بدترین بندوں سے، اور شیاطین کے وسوسوں سے، اور اس بات سے کہ وہ شیاطین میرے پاس آئیں۔“

کرامت اور عقیدت

مجھے حضرت حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ انہی کی زبانی پڑھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ ہم نے جو واقعہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت کے طور پر کئی بار سنا تھا کہ انہوں نے مالٹا کی اسیری کے زمانے میں رمضان شریف میں ایک ماہ میں قرآن مجید یاد کر لیا تھا، خود انہوں نے اپنی ایک تحریر میں اس واقعے کا انکار کیا ہوا تھا۔ اُن کی زندگی میں ہی اُن کی یہ کرامت اس قدر معروف ہو گئی تھی کہ انہیں اس کا انکار کرنا پڑا کہ ایسی ویسی کوئی کرامت مجھ میں نہیں ہے۔²

¹ الموطأ، باب مَا يُؤْمَرُ بِالتَّعَوُّذِ، 1386/5

² عبد القيوم حقانی، مولانا، سوانح شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، القاسم اکیڈمی، نوشہرہ،

اسی طرح حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی جو کتابت مولانا دریابادی رحمہ اللہ سے ہوئی ہے تو اس میں مولانا دریابادی رحمہ اللہ نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے اصرار کیا کہ آپ صاحب کشف ہیں اور مجھے بتادیں کہ آپ صاحب کشف ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا کہ لوگوں نے عام کر دیا، میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ میں صاحب کشف نہیں ہوں، میں اس پر قسم کھانے کو بھی تیار ہوں لیکن آپ یقین نہیں کریں گے کیونکہ اس وقت آپ میرے بارے میں یہی سمجھنے کے موڈ میں ہیں۔

دو بزرگ علما کے یہ واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ کرامات کیسے وجود میں آتی ہیں؟ امر واقعہ یہ ہے کہ حکایات اولیا کے نام سے جس قدر دیومالائی کرامات تصوف کی کتابوں میں نقل ہو گئی ہیں، انبیاء کے معجزات ان کے سامنے حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کرامات دراصل پیروں کی نہیں بلکہ مریدوں کی ہیں کہ انہوں نے اپنے پیر کی زندگی میں ہی اس کے نام سے وہ باتیں عام کر دیں کہ خود پیر صاحب بھی ان کا انکار کرنا چاہیں گے تو لوگ یقین نہ کریں گے۔

اس کا تعلق انسان کی نفسیات سے بھی ہے۔ انسان جس سے متاثر ہونا چاہتا ہے، اسے مافوق الفطرت انسان (superman) کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ مغرب کی فلم انڈسٹری بھی اسی انسانی کمزوری کی بنیاد پر سپر مین، اسپائیڈر مین، بیٹ مین، آئرن مین اور معلوم نہیں کیسے کیسے مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعے بلین ڈالرز کا کاروبار کر رہی ہے۔ اولیاء اللہ کی مافوق الفطرت قسم کی کرامات اور حکایات بھی دراصل مذہبی کاروبار ہی ہے جو کسی صالح شخص کی وفات کے بعد اس کی ناخلف اولاد اس کا مزار بنا کر اور اس کی گدی سنبھال کر کرتی ہے۔ اور اب اس ناخلف جانشین اور خلیفہ مجاز میں وہ اخلاق اور کردار تو ہوتا نہیں کہ جس کی وجہ سے کوئی نذر اور نذرانے آئیں تو پھر اس گدی سے متعلق اکابر اولیا کے بارے میں ایسی حکایات گھڑی جاتی ہیں کہ جن سے ان کے سپر مین ہونے کے یقین میں اضافہ ہو اور سلسلے کے مریدوں زیادہ سے زیادہ ہوں تاکہ گدی

نشین پیر صاحب کا کاروبار خوب ترقی کرے۔

پاکستان کی بڑی بڑی گدی نشین کون سے ہیں؟ سارے سیاست دان ہیں۔ ایک طرف مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنے پیچھے لگایا ہوا ہے کہ ان کا مذہبی استحصال کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف سیاست کے راستے ان کی دنیا بھی اپنے قدموں میں ہے۔ شاہ محمود قریشی، مخدوم امین فہیم، یوسف رضا گیلانی اور پیر پگڑا وغیرہ کون لوگ ہیں؟ ان کا دینداری سے کیا اور کتنا تعلق ہے؟ لیکن جن درباروں کے یہ گدی نشین ہیں، ان سے وابستہ مریدوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ یہی لوگ ہیں کہ عوام کی دنیا بھی خراب کر رہے ہیں اور ان کی آخرت بھی تباہ کر چکے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ﴾ (66) ﴿وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلًا﴾ (67) ﴿رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا﴾ [الأحزاب: 68]

”اور اہل جہنم کہیں گے: اے رب ہمارے، ہم نے اپنے پیشواؤں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔ اے ہمارے رب، ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔“

صوفیاء کی شطیحات

شطیحات (ecstatic utterance) سے مراد صوفیاء کی وہ گنجگ باتیں ہیں کہ جو ان سے بے خودی اور مدہوشی کے عالم میں صادر ہوں اور خود ان کی اپنی سمجھ سے بھی بالاتر ہوں۔ صوفیاء کی ان باتوں کا خود صوفیاء کے حلقوں میں اعتبار نہیں کیا جاتا اور ان باتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصدر شیطان ہوتا ہے یعنی یہ شیطان کی طرف سے صوفی کے دل میں اس وقت القا کی جاتی ہیں جبکہ اسے اپنے نفس پر قابو حاصل نہیں ہوتا اور وہ وجد اور سکر کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ صوفیاء کی ایسی باتوں کی ہر گز تاویل نہیں کرنی چاہیے کہ ان کی تاویل کرنا بھی ایمان کے منافی ہے بلکہ ان باتوں پر شدید نکیر کرنی چاہیے کہ یہ نہی عن المنکر کا مقام ہے۔

شیخ ابن عربی نے اپنی کتاب فصوص الحکم میں ”خاتم الاولیاء“ کو ”خاتم الانبیاء“ سے افضل قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ تمام انبیاء اور رسول خاتم الاولیاء سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ کی عبارت یوں ہے:

ولیس هذا العلم [أي علم التوحيد الوجودي] إلا لخاتم الرسل وخاتم الأولياء، وما يراه أحد من الأنبياء والرسل إلا من مشكاة الرسول الخاتم، ولا يراه أحد من الأولياء إلا من مشكاة الولي الخاتم، حتى أن الرسل لا يرونه - متى رأوه - إلا من مشكاة خاتم الأولياء.¹

”توحید وجودی کا علم صرف خاتم الرسل اور خاتم الاولیاء کے پاس ہے۔ اور تمام انبیاء اور رسول یہ علم خاتم الرسل کے سینے سے حاصل کرتے ہیں اور تمام ولی یہ علم خاتم الاولیاء کے سینے سے حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ رسول بھی جب اس توحید کا مشاہدہ کرتے ہیں تو خاتم الاولیاء کے سینے سے کرتے ہیں۔“

خاتم الاولیاء سے ابن عربی کی کیا مراد ہے۔ تو اس بارے ابن عربی کا ذہن تو واضح ہے کہ ان کی اس سے مراد وہ خود ہیں۔ وہ اپنی کتاب ”فتوحات مکیہ“ میں لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ہی خاتم الاولیاء ہوں۔²

البتہ ان کے شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ نبی کی ولایت کی جہت، نبی کی رسالت کی جہت سے افضل ہے۔ اگرچہ یہ شیخ ابن عربی کی بات نہیں ہے، لیکن ایک مزعومہ علمی نکتے کے طور اس بات کا بھی تجزیہ کریں تو انتہائی سطحی بات معلوم ہوتی ہے۔ نبی اپنی ولایت کی جہت میں بھی رسول ہی ہوتا ہے۔ رسول کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں اس کی رسالت منقطع ہو جائے یا وہ مانند پڑ جائے یا وہ دیگر جہات سے مغلوب ہو جائے۔

رسول کی زندگی میں ہر لمحہ رسالت کی جہت، ان کی دیگر تمام جہات پر غالب رہتی

¹ ابن عربی، محی الدین محمد بن علی الأندلسی، فصوص الحکم، دار الکتاب العربی، بیروت، ص 62

² أنا ختم الولاية دون شك لورثي الهاشمي مع المسيح [ابن عربی، محی الدین محمد بن علی الأندلسی،

الفتوحات المکیة، الهيئة المصرية العامة، مصر، 1975ء، 71/4]

ہے، چاہے وہ بشریت کی جہت ہو یا ولایت کی یا کوئی اور۔ رسول جب مصلے پر کھڑا ہو کر خالق کی طرف یکسو ہوتے ہوئے تقرب الی اللہ کی منازل طے کر رہا ہو تو اس وقت بھی رسول ہوتا ہے اور جب وہ بازاروں میں لوگوں کو اللہ سے قریب کرنے کے لیے مخلوق کی طرف متوجہ ہو تو وہ اس وقت بھی رسول ہوتا ہے۔

رسول کی ولایت کا اس کی رسالت سے کیا تقابل؟ رسول کو یہ مقام اور مرتبہ رسالت کی وجہ سے ملا ہے نہ کہ ولایت کے سبب سے۔ اللہ عزوجل نے رسول ﷺ کو ”یأیہا الرسول“ اور ”یأیہا النبی“ کہہ کر کے قرآن مجید میں خطاب فرمایا ہے نہ کہ ”یأیہا الولی“۔

صوفی اور سلفی

اکثر صوفیوں کو دیکھا ہے کہ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، مثلاً ایک پیر طریقت مدظلہ تعالیٰ نے سلفیوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے ہزاروں متقی اور پرہیزگار پیدا کیے تم نے کیا پیدا کیا ہے؟

اللہ معاف فرمائے! یہ اس زعم کے ساتھ بات کرتے ہیں جیسے اللہ سے متقی اور صالح ہونے کا سرٹیفکیٹ جیب میں لیے بیٹھے ہوں۔ بھئی! ان معاملات میں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو وہ ایسے سپر مین نہیں تھے جیسے اولیاء اللہ کی حکایات میں دکھائے جاتے ہیں، وہ عام انسانوں جیسے معلوم ہوتے ہیں کہ جو تقویٰ اور اصلاح کا شوق رکھنے والے تھے۔

متقی کون ہے؟ کل حشر میں کس کا کیا مقام ہے؟ صوفی آگے ہو گا یا سلفی؟ تصوف کی تائید کرنے والے اللہ کے مقربین میں سے ہوں گے یا اس کی مخالفت کرنے والے۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے، اس بارے اس دنیا میں یقین سے بات کرنا مشکل ہے۔ بلکہ قیامت والے دن تو بڑے بڑے برج الٹ جائیں گے۔

تصوف کے پر نقد کرنے والے سلفی علما بھی ایسے ہو سکتے ہیں کہ مجلس میں نقد کرنے کے بعد تنہائی میں اپنی نقد پر رونے والے ہیں اور اللہ سے اس بارے آہ وزاری کرنے

والے ہیں کہ پروردگار! ہمیں کیا معلوم کہ جن پر ہم نقد کر رہے ہیں، وہ قیامت والے دن، ہم سے زیادہ مقرب ہوں لیکن ہمیں تو بس جو منکر معلوم ہوتا ہے، ہم اس پر تنبیہ کرتے ہیں اور رد کرتے ہیں۔

صوفیوں کو اپنی نیکی اور تقویٰ کا زعم ہو سو ہو کہ یہ ان کا خاص میدان ہے لیکن کم از کم غیر صوفیوں کو تقویٰ اور نیکی میں حقیر تو نہ سمجھیں۔ حال ہی کے سلفیوں میں بھی ایسے علما موجود ہیں کہ جن کی ساٹھ سال سے تہجد قضا نہیں ہوئی۔ وہ سلفی اہل علم بھی ہیں کہ جن سے پوچھا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ جس ہفتہ زیارت نہ ہو تو دل مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے۔ ان میں سے وہ سلفی اہل علم بھی ہیں کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو پورے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ اور وہ بھی سلفی اہل علم ہی تھے کہ جن کی نماز دیکھنے کے لیے خلق خدا سفر کرتی تھی۔ اور وہ بھی سلفی اہل علم میں سے ہیں کہ جنہوں نے مسجد کے صحن میں نماز کی نیت باندھی اور طوفانی بارش کی وجہ سے سوائے دو مقتدیوں کے سارے بھاگ گئے اور انہوں نے سلام پھیرنے کے بعد پہلا جملہ کہا کہ بارش ہوئی ہے اور عبد اللہ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ اگر صوفیا میں غوث، قطب اور ابدال موجود ہیں تو سلفی میں بھی بہت سے لوگ ہیں کہ جنہیں قرآن مجید اور حدیث کی اصطلاح میں ”عباد الرحمن“ اور ”اہل القرآن“ کہا جاسکتا ہے۔

صوفیا کو دنیا میں شیخ اکبر کے رتبے پر فخر کرنے سے کیا حاصل کہ قیامت کے دن اگر ایک مخلص سلفی ان سے آگے کھڑا ہو۔ اور اس کے برعکس سلفیوں کو شیخ الاسلام کے مقام پر اترنے کا کیا فائدہ کہ اگر کوئی مخلص زاہد قیامت والے دن ان سے آگے ہو۔ ہماری رائے میں صوفیوں اور سلفیوں میں نظریات پر بحث ہونی چاہیے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط ہے؟ باقی رہے یہ دعوے کہ ہم نے تو تزکیہ کر لیا ہے، اور تم نے کیا ہے؟ اور اپنے بارے سارے مبشرات اور دوسروں کے بارے ساری وعیدیں جمع کر لیں ہیں، تو یہ درست نہیں ہے۔ امید واثق تو یہی ہے کہ قیامت والے بہتے سادہ لوح، ان پڑھ،

دیہاتی مرید کہ جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا، پیر طریقت، قطب عالم اور خاتم الاولیاء سے زیادہ مقررین کی فہرست میں ہوں گے۔

قرآن مجید نے تزکیہ نفس کا حکم دیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ فرمایا ہے لیکن معلوم نہیں لوگوں نے تزکیہ کو کیا پہاڑ سمجھ رکھا ہے کہ جب تک بندہ ہوا میں اڑنا نہ شروع کر دے، اس وقت تک اس کا تزکیہ مشکوک رہتا ہے۔ بھئی! اگر آپ فرائض پر عمل پیرا ہیں، حرام سے بچتے ہیں، نوافل کا اہتمام کرتے ہیں، اخلاق حسنہ سے متصف ہونے اور رذائل سے اجتناب کی کوشش کرتے ہیں تو اور آپ کو کیسا تزکیہ چاہیے؟ تزکیہ کا مقصود احسان کی کیفیات کے ساتھ کتاب و سنت پر عمل کرنا ہے۔ کسی کی احسان کی کیفیات مانپنے کے معیارات کیا بیعت، سامع، مراقبہ، لطائف اور وجد کی کیفیات ہیں یا فرائض اور نوافل پر عمل اور حرام و مکروہ سے اجتناب کرنے سے پیدا ہونے والے احوال؟

تصوف اور ادب

کل دوبارہ ممتاز مفتی کی کتاب ”لبیک“ پڑھ بیٹھا تو اب جب تک اس بارے کچھ لکھ نہ بیٹھوں گا، چین نہیں آئے گا۔ پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہے، فلسفہ، سائیکالوجی، مذاہب، ادب، لسانیات، تصوف بلکہ ہر قسم کے فن کی کتابیں پڑھتا ہوں، اور ان کے بارے اپنی رائے بھی رکھتا ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ طبعاً کتابی کیڑا بھی ہوں اور نقاد بھی۔ سائیکالوجی اور لسانیات میں طبعاً دلچسپی ہے۔

شاعروں اور ادیبوں نے جس نظر سے تصوف کو دیکھا ہے، وہ بہت ہی سطحی نظر ہے۔ ابھی ہم شعرا کی بات نہیں کر رہے بلکہ قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی وغیرہ کی بات کرتے ہیں۔ اب اس سے پہلے کہ کوئی صوفی مجھ سے یہ لغو سوال کرے کہ ان کو پڑھا بھی ہے یا ایسے ہی تبصرہ کر رہے ہو، تو بتانا چلوں کہ ”شہاب نامہ“، ”من چلے کا سودا“ اور ”لبیک“ وغیرہ جیسی کتابیں سب پڑھی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی تینوں دین کو تصوف کا مترادف قرار

دیتے ہیں اور تصوف ان کے نزدیک کچھ مابعد الطبیعیاتی (metaphysical) امور کے وقوع کا نام ہے۔ پس دین کا جو تصور انہوں نے اپنے ڈراموں، سوانح اور سفر ناموں سے عام کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کراماتی اور راہبانہ تصور دین ہے۔ ”شہاب نامہ“ اور ”لبیک“ کو دیکھ لیں کہ سوانح اور سفر نامے سے زیادہ کرامات کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اور سلوک کے مقامات طے کرنے کا فیصلہ گویا کہ کرامات سے ہو رہا ہے۔

اور اشفاق احمد نے تو ”من چلے کا سودا“ کا آغاز ہی اس بات سے کیا ہے کہ والدین، چودہ سال بعد اپنے بیٹے سے ملنے سے اس لیے انکار کر دیتے ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں ایک بار دے دی تو اب ہمارا اس سے کیا تعلق۔ یہ وہی رویہ ہے کہ جس کا ذکر مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے بافرید گنج شکر رحمہ اللہ کے حوالے سے کیا ہے کہ جب انہیں ان کے بچے کی وفات کی خبر ملی تو کہا کہ سگ بچہ مر گیا ہے۔

دوسری طرف علماء کے حلقے میں تصوف کے میدان کے جو معتدل لوگ ہیں، وہ کرامات کو لکھ حیثیت نہیں دیتے جیسا کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو پڑھ لیں۔ بلکہ بعض صوفیوں نے تو لکھا ہے کہ کرامت اور مافوق الفطرت امور تو صوفی کا حیض ہیں لیکن بد قسمتی سے لوگوں کی ساری دلچسپی تصوف کے نام پر ایسی ہی چیزوں میں ہے۔ اور صوفی ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا کچھ فائدہ بھی ہوا ہے مثلاً یہ کہ جاوید چوہدری جیسے لوگ دین سے جڑے رہتے ہیں لیکن نقصان زیادہ ہوا ہے ہر شخص ”بندہ“ کی بجائے ”بابا“ بننے کے چکر میں ہے۔ ہمارے دین کا خلاصہ بندہ بنانا ہے نہ کہ بابا۔ کیا یہ المیہ کم ہے کہ ہمارے ہاں اللہ سے تعلق کی گہرائی اس پوزیشن سے طے ہو رہی ہے کہ ہم نے بلندی کی کتنی منازل طے کر لی ہیں؟ اسی فکر میں لگے ہیں کہ قطب کے درجے پر پہنچنا ہے یا غوث بننا ہے۔ ساتویں آسمان تک پہنچ چکے اور عرش پر پہنچنا ہے۔ ہم اللہ عز و جل سے بندگی کے تعلق کو بھی اپنی بلندیوں کے معیارات سے پرکھنے سے باز نہیں آئے۔

ان ادیبوں کے ساتھ ہونے والے واقعات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسے واقعات ہیں جو ہم میں سے ہر کسی کو پیش آتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم آپ میں وہ قوت تخلیق نہیں ہے

کہ اپنی زندگی کے واقعات کو افسانوی رنگ دے کر ”بابا“ کہلوا سکیں لہذا آپ اس روحانی مقام پر فائز ہونے سے اس وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ بھائی! مجھے بھی بہت الہام ہوتے ہیں، میرے ساتھ بھی بہت مابعد الطبعی واقعات پیش آتے ہیں، مجھے بھی بہت سی روحانی وارداتیں حاصل ہیں، میں ذرا سا اپنا سر جھکا لوں تو اپنا قلب جاری کر سکتا ہوں وغیرہ وغیرہ لیکن مجھے شہاب نامہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معمول کی چیزیں ہیں، ہر شخص کو پیش آتی ہے۔ انہیں ادب بنانے کی ضرورت نہیں ہے، بے کار کام ہے بلکہ ادب کے نام پر بے ادبی ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ صوفیاء کے بعض حلقے ان ادیبوں کے تصوف سے نالاں ہیں، اس کی وجہ نفسانی ہے کہ انہوں نے ان کا کاروبار خراب کر دیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اپنے اندر کے روحانی خلا کو پر کرنے کے لیے ایسے ادیبوں ہی کا رخ کریں گے کہ جس سے روایتی تصوف کے پیروں کی دکان متاثر ہوگی کہ ان کے مرید کم ہوں گے، لیکن ہماری تنقید تو دونوں طبقوں پر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں طبقے دین کے اصل تصور اصلاح نفس کو پیش نہیں کر رہے۔

بھئی! اپنے تزکیے پر جتنا مرضی زور لگاؤ، رہو گے تو انسان کے انسان ہی۔ بس اگر اسیں ایک جملے میں ہی غور کرو تو مروجہ تصوف اور اس کی حقیقت جان جاؤ گے۔

اسلام اور پیری مریدی

اسلام میں جس پیری مریدی کی گنجائش ہے، وہ یہ ہے کہ پیر، مرید کی اصلاح کرے اور مرید، پیر کی اصلاح کرے۔ پیر، مرید کی بیعت کرے اور مرید، پیر کی بیعت کرے۔ پیر، مرید بھی ہو اور مرید، پیر بھی ہو۔ مرید، مرید بھی ہو اور پیر بھی، اور پیر، پیر بھی ہو اور مرید بھی۔ ایک طرف وحدت الوجود پر ایمان اور دوسری پیر اور مرید کے فرق پر اصرار چہ معنی دارد۔

یہی سورۃ العصر کا خلاصہ ہے کہ اہل ایمان ایک دوسرے کی اصلاح کریں گے۔ یہاں کوئی معصوم نہیں ہے، سب غیر معصوم ہیں۔ معصوم صرف نبی اور رسول کی

ذات تھی۔ لہذا اب ایک غیر معصوم دوسرے کی اور دوسرا پہلے کی اصلاح کرے گا۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ﴿١﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ﴿٢﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَّصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر: 1-3]

”قسم ہے زمانے کی کہ تمام انسان خسارے اور نقصان میں ہیں مگر وہ لوگ دنیا اور آخرت کے نقصان سے امن میں ہیں جو ایمان لائے، انہوں نے نیک اعمال کیے، ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔“

اور اسی سورۃ العصر کے بارے امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن مجید میں اس کے علاوہ کچھ نازل نہ بھی ہوتا تو انسانوں کی ہدایت کے لیے یہ اکیلی سورت ہی کافی تھی۔¹ پس تزکیہ نفس ہو یا اصلاح احوال، یہ دو طرفہ معاملہ ہے، اصلاح کا ایک طرفہ تعلق تو صرف نبی اور رسول کی ذات سے ہوتا ہے۔ البتہ یہ بھی نہ کرے کہ پیر ہی کی اصلاح کرتا رہے، کبھی کبھی اپنی بھی اصلاح کروالے۔



¹ تفسیر ابن کثیر: 203/1

باب یازدہم اخلاق اور رذائل

اس باب میں اخلاق اور رذائل کے ضمن میں تزکیہ و طہارت، اخلاص و ریاء، تکبر و تواضع، حسد و محبت، عجلت و قناعت، شکر و صبر، حیاء، شجاعت، خوش مزاجی اور اللہ سے محبت کے مضامین کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تزکیہ نفس میں قلب کا کردار

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تزکیہ نفس میں انسان کے دل کی بجائے اس کے دماغ کا کردار بہت اہم ہے۔ مولانا وحید الدین خان صاحب لکھتے ہیں:

”دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کا تزکیہ مبنی بر عقل تزکیہ ہے، نہ کہ مبنی بر قلب تزکیہ۔ اس سلسلے میں ”قلب“ کا لفظ قرآن اور حدیث میں لٹیری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، نہ کہ سائنسی معنوں میں۔ بعد کے زمانے میں، صوفیاء کے اثر سے مسلمانوں میں مبنی بر قلب تزکیہ کا تصور رائج ہو گیا۔ اس تصور کے تحت یہ سمجھ لیا گیا کہ انسان کا قلب تمام ربانی حقیقتوں کا خزانہ ہے۔ مراقبہ کے ذریعے اس خزانہ تک پہنچو، اور پھر تم کو وہ چیز حاصل ہو جائے گی جس کو اسلام میں تزکیہ کہا گیا ہے۔ مگر مبنی بر قلب تزکیہ کا یہ تصور قرآن سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ اس کا ماخذ تاریخ تھا۔ قدیم زمانے سے چوں کہ مبنی بر قلب روحانیت کا تصور لوگوں کے درمیان چلا آ رہا تھا، اس کے زیر اثر مضامبات کے طور پر لوگوں نے اس کو اسلام میں داخل کر دیا۔ جدید سائنس نے وہ علمی بنیاد فراہم کر دی ہے جس کے تحت اسلامی تزکیہ کو دوبارہ مبنی بر دماغ تزکیہ کے طور پر زندہ کیا جائے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان کا قلب خون کی گردش کے لیے صرف ایک پمپ کا کام کرتا ہے، قلب کے اندر سوچنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ سوچنے کی صلاحیت تمام تر صرف دماغ میں ہے۔ انسان کی زندگی کے تمام افعال سوچنے کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ تزکیہ کا معاملہ کوئی مستثنیٰ (exception) معاملہ نہیں۔ تزکیہ کا مقصد بھی دماغ کی سطح پر سوچنے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ قلب پر مفروضہ توجہ دینے سے۔ قلب پر توجہ دینا، اتنا ہی زیادہ بے بنیاد ہے، جتنا کہ حصول تزکیہ کے لیے ناخن یا بال پر توجہ دینا۔“¹

خان صاحب کا یہ دعویٰ کہ کتاب و سنت کے تزکیہ نفس کے تصور کی بنیاد قلب

¹ وحید الدین خان، مولانا، ماہنامہ الرسالہ، فروری 2011ء، اسلامی مرکز، نیو دہلی، ص 13

(Heart) نہیں ہے، خود کتاب وسنت کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً، إِذَا صَلَحَتْ، صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ، فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ))¹

”خبردار! اور جسم انسانی میں ایک عضو ہے۔ جب وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ جان رکھو! وہ عضو قلب ہے۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے قلب انسانی کو انسان کے بناؤ و بگاڑ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ آسان الفاظ میں اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق صالح انسان وہ ہے کہ جس کا قلب صالح بن جائے اور فاسد انسان وہ ہے کہ جس کا قلب فاسد ہو جائے۔ پس اسلام میں تزکیہ نفس کی بنیاد قلب ہے۔ کتاب وسنت میں قلب کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جسے ہم سائنسی معنی میں دل (Heart) کہتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلَى صُورِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ))²

”اللہ تعالیٰ تمہارے اجسام اور شکلوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے قلوب کو دیکھتے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے بعد اپنی انگلیوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔“

پس اللہ کے رسول ﷺ نے جسم انسانی میں اُس قلب کا مقام بھی متعین کر دیا کہ جو اصلاح نفس کی بنیاد ہے۔ آپ نے اس کے تعین کے لیے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی طرح ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، التَّقْوَى هَاهُنَا وَيُسِيرُ إِلَى

¹ صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، 1219/3

² صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم، 1986/4

صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ¹)

”مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ تو اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے رُسوا کرتا ہے اور نہ ہی اُسے حقیر خیال کرتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین دفعہ اشارہ فرمایا۔“

روایت کا سیاق (context) بتا رہا ہے کہ رویوں (attitudes) کی اصلاح کی بات ہو رہی ہے اور آپ نے اس اصلاح کے لیے تقویٰ کو بنیاد بنایا ہے۔ اور رویوں کی اصلاح تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور تقویٰ کا مقام انسان کا قلب ہے اور اس کے لیے آپ نے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ فرمایا۔

انسان کے بارے جدید علوم (Humanities) میں سے سائیکالوجی سے یہ اُمید کی گئی تھی کہ شاید وہ نفس انسانی کی اصلاح کے حوالہ سے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے گا لیکن چونکہ جدید نفسیات بھی مغربی فلسفے (Western Philosophy) کی کوکھ سے برآمد ہوئی ہے کہ جس میں فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ (Descartes 1596-1650) کے جملے ”I think, therefor I am“ سے شروع ہونے والی عقل پرستی (Rationalism) کو تقریباً خدا کا درجہ حاصل ہو چکا ہے لہذا جدید نفسیات کا یہ المیہ ہے کہ یہاں بھی اصلاح نفس کی کل بنیاد انسانی ذہن ہے۔

پس نفسیات میں رویوں کی اصلاح کا اصل موضوع بھی انسانی ذہن بن گیا بلکہ اس قدر غلو ہوا ہے کہ انسانی احساسات اور جذبات (Feelings and Emotions) کو بھی انسانی ذہن کی پیداوار مان لیا گیا اور وہ لوگ بیوقوف (idiot) قرار پانے لگے کہ جن کا یہ خیال ہو کہ اُن کے جذبات کا مخزن اُن کا دل ہے۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ یہ تحقیق کچھ آگے بڑھی تو بعض مذہبی اسکالرز نے تو انسانی دماغ میں بھی ایک چھوٹا سا قلب تلاش کر لیا اور بعض کو قلب انسانی میں ایک چھوٹا سا دماغ نظر آنے لگا۔ اِن دونوں قسم کے اسالیب (approaches) میں اصل بنیاد عقل پرستی ہے۔ مغرب

¹ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم، 4/1986

میں اس وقت انسانی جسم میں عقل کا افضل اور اشرف ترین حصہ ہونا ایک ایسا مسلمہ امر بن چکا ہے کہ اس سے انکار کرنے والے بیوقوف کہلانے لگے ہیں۔

اسلامی علم النفس (Islamic Psychology) کا موضوع ہی بالکل اور ہے اور اس کی ابتدا اور انتہا قلب ہے۔ علم فلسفہ کی تاریخ پر ایک نظر دوڑالیں اور سقراط (Socrates 469-399 BC) سے لے کر برٹینڈرسل (Bertrand Russell 1872-1970) تک دیکھ لیں کہ کتنے ہیں کہ جنہیں ان کی عقل نے اس یقین تک پہنچا دیا ہو کہ اس دنیا کا ایک خالق (Creator) ہے۔ یہ تو اصحاب عقل کا اختلاف ہے۔ دوسری طرف اصحاب قلب کو دیکھیں یعنی انبیاء و رسل کی جماعت کو تو آدم علیہ السلام سے لے کر محمد ﷺ تک سب کے سب ایک ہی فکر یعنی عقیدہ توحید پر نہ صرف متفق نظر آتے ہیں بلکہ اُس کے داعی بھی ہیں۔

وحی نبی کریم ﷺ کے قلب پر نازل ہوتی تھی نہ کہ عقل پر۔ اگر اللہ کی نظر میں عقل کی اہمیت زیادہ ہوتی تو وحی الہی کے نزول کا مقام عقل ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ﴿الشعراء: 194﴾

”اور یہ قرآن مجید رب العالمین کی طرف سے نازل کر دہ ہے۔ اس کو روح الامین نے نازل کیا ہے آپ ﷺ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔“

انسانی عمل کا اصل محرک (motive) اُس کا وہ جذبہ ہے کہ جو اُس کے قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ لہذا انسان کی کل حرکت کی وجہ اس کا قلب ہے۔ ایمان، یقین، اخلاص، تقویٰ، محبت، مودت، الفت، خوف، اُمید، شکر، رضا، ورع، انابت، خشوع، توکل، صبر، ارادہ، نفرت، بغض، کینہ، غصہ، غیظ، غضب، عداوت، کفر اور نفاق وغیرہ انسانی دل کے اعمال ہیں نہ کہ دماغ کے۔

کتاب و سنت کی نصوص میں ان اعمال کی نسبت قلب انسانی کی طرف کی گئی ہے اور کسی انسان کی اصلاح اور بگاڑ میں ان اعمال کی اہمیت سے انکار کسی طور ممکن نہیں ہے۔

پس قلب کی اصلاح کے بغیر نفس انسانی کی اصلاح کا تصور سراسر ایک غیر اسلامی تصور ہے اور وہ ہم سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْقَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْقَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ [الحج: 46]

”کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، کہ اُن کے دل ہوتے کہ جن سے وہ سمجھتے، اُن کے کان ہوتے کہ جن سے وہ سنتے۔ بلاشبہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“

اس آیت مبارکہ میں ﴿الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ کے الفاظ نے قلوب کا معنی نص صریح کی طرح واضح کر دیا ہے کہ قلوب سے اللہ کی مراد وہ دل ہیں جو سینے میں ہوتے ہیں۔ اسے اصول فقہ کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ متکلم نے اپنے کلام کی خود ہی تفسیر کر دی ہے اور جب متکلم اپنے کلام کی تفسیر کر دے تو وہ کلام مفسر (explicit) بن جاتا ہے کہ جس میں مخاطب (addressee) کی طرف سے کسی بھی قسم کی تاویل کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں تعقل¹ کی نسبت قلوب کی طرف کی گئی ہے جو کہ افعال قلوب میں سے ایک فعل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْفُرْقَانَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَفْقَالُهَا﴾ [محمد: 24]

”وہ قرآن مجید پر تدبر کیوں نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔“

اس آیت مبارکہ میں تدبر کی نسبت قلب کی طرف کی گئی ہے۔ اسی طرح شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے اور اس کا کام ہی انسان کی اصلاح میں رکاوٹ ڈالنا ہے، اُس کے طریقہ واردات کے بارے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِي يُؤْمِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ﴾ [الناس: 5]

”جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔“

¹ quality to differentiate between right and wrong, good and evil

اس آیت میں شیطان کے انسانی قلب میں وسوسہ ڈالنے کا بیان ہے اور قلب بھی وہ جو سینے میں ہوتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی اصلاح و بگاڑ میں اصل کردار قلب کا ہے نہ کہ عقل کا۔ عقل کا کردار ثانوی اور تابع کی حیثیت سے ہے۔

شیخ محمد بن ابراہیم التویمی کی کتاب ”موسوعة فقه القلوب“ اعمال قلوب پر ایک عمدہ کتاب ہے۔ اس موضوع پر مزید غور و فکر کے لیے قرآن مجید میں سے درج ذیل آیات اور مقامات ﴿الأنفال:24﴾، ﴿الحجرات:3﴾، ﴿التغابن:11﴾، ﴿ق:33﴾، ﴿البقرة:74﴾، ﴿الحج:54﴾، ﴿محمد:24﴾، ﴿الأعراف:179﴾ اور ﴿البقرة:283﴾ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

طہارت اور صفائی

طہارت اور صفائی دو قسم کی ہے۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ اسلام میں دونوں مطلوب ہیں۔ انسان اگر ظاہری طور صاف ستھرا رہے تو اس کا ایک اچھا اثر اس کے باطن پر پڑتا ہے اور اگر انسان کا باطن اچھا ہو تو اس کا ایک اچھا اثر اس کے ظاہر پر پڑتا ہے۔ اللہ عزوجل نے ظاہری طہارت کے لیے وضو کا حکم دیا لیکن اگر پانی میسر نہ ہو تو مٹی یا ریت سے تیمم کا حکم دیا ہے۔ وضو کی صورت میں ظاہری اعضا کی طہارت ہے جبکہ تیمم کی صورت میں باطن کی طہارت ہے۔ اگر ایک شخص نجس ہے اور وہ مٹی یا ریت میں ہاتھ مار کر اپنے چہرے پر مل لیتا ہے تو اس سے اس کے دل سے تکبر جاتا رہے گا پس تیمم کی صورت میں اسے باطنی طہارت حاصل ہوئی یعنی دل کی طہارت۔

پس اسلام میں قلب اور اعضا دونوں کی طہارت کے لیے احکام نازل کیے گئے ہیں۔ دل صاف نہ ہو تو ظاہری طہارت کا کچھ خاص فائدہ نہیں اور اگر ظاہر میں نجاست لگی ہو اور انسان اپنے دل کے صاف ہونے کا دعویدار ہو تو یہ بھی ایمان کے منافی نہیں ہے۔ طہارت اور صفائی کی اس قدر اہمیت ہے کہ اسے نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

«الطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ»¹

”حضرت ابوماک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: طہارت اور صفائی نصف ایمان ہے۔“

طہارت کو ایمان کی شاخ قرار دینے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ طہارت کا اصل تعلق انسان کے دل سے ہے کہ ایمان تو دل میں ہوتا ہے۔ پس پہلے دل پاک ہوتا ہے اور پھر جسم کی صفائی بھی ضروری ہے۔ اور دل کی طہارت یہ ہے کہ اسے کفر، شرک، شک، نفاق، سرکشی، ریا، تکبر، حسد، بغض، کینہ، سختی، عداوت، بغل، لالچ، بے صبری، کم ہمتی، سستی، بزدلی، مایوسی، ناامیدی، جھوٹ، بے وفائی، بدگمانی، حماقت، جہالت، خیانت، غصہ، غضب، انتقام، ظلم، غفلت، غلو، بے حیائی، نجاست، وسوسہ اور وہم وغیرہ سے پاک رکھنے کے لیے مجاہدہ کرے۔ اور اس طہارت کے حاصل کرنے کے لیے اللہ کے رسول ﷺ سے منقول یہ دعا کرتا ہے:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ، وَالْكَسَلِ، وَالْجُبْنِ، وَالْبُخْلِ، وَالْهَرَمِ، وَعَذَابِ الْقَبْرِ اللَّهُمَّ اتِّ نَفْسِي تَقْوَاهَا، وَزَكَّاهَا، أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا، أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا، اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ، وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ، وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا»²

”اے اللہ! میں کم ہمتی، سستی، بزدلی، کنجوسی، بہت زیادہ بڑھاپے اور قبر کے عذاب سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ! میرے نفس کو متقی بنا دے اور اس کا تزکیہ کر دے کہ آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو میرے نفس کا تزکیہ کر سکے۔ آپ ہی اس کے ذمہ دار اور آپ ہی اس کے مددگار ہیں۔ اے اللہ! میں آپ سے ایسے علم کی پناہ چاہتا ہوں کہ جو مجھے فائدہ نہ دے، اور ایسے دل سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جس میں خشوع نہ ہو، اور ایسے نفس سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جس کا پیٹ نہ بھرے، اور ایسی دعا سے آپ کی پناہ مانگتا

¹ صحیح مسلم، کتاب الطَّهَارَةِ، بَابُ فَطْلِ الْوُضُوءِ، 203/1

² صحیح مسلم، کتاب الذِّكْرِ وَالِدُعَاءِ وَالْتَوَكُّلِ وَالِاسْتِغْفَارِ، بَابُ التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا مَحِيلٌ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ يُعْمَلْ، 2088/4

ہوں کہ جو قبول نہ ہو۔“

اور جسم کی صفائی اور ستھرائی میں کئی ایک چیزیں شامل ہیں۔ کلی، مسواک اور ٹوتھ پیسٹ کے ذریعے اپنے منہ کی بدبو کو دور کرنا۔ منہ کی صفائی کا بہت سے لوگ دھیان نہیں کرتے لہذا جب کوئی ان سے بات چیت کر رہا ہوں تو ان کے منہ سے آنے والی بدبو سے اذیت محسوس کرتا ہے۔ منہ کی بدبو عموماً اس شخص کو نہیں محسوس ہوتی کہ جس کے منہ سے آرہی ہے جبکہ سامنے والے کو محسوس ہو رہی ہوتی ہے لہذا منہ کی صفائی کا خاص طور اہتمام کرنا چاہیے۔ منہ کی صفائی کا یہ معنی نہیں ہے کہ ایک دفعہ صبح برش کر لیا اور ایک دفعہ رات کو کر لیا۔ اس طرح کے برش کے باوجود منہ میں بدبو رہ جاتی ہے۔ منہ کی صفائی کا یہ معنی ہے کہ دن میں کم از کم پانچ مرتبہ ہر نماز کے وقت میں برش اور مسواک کا استعمال کرے۔ اور جب برش اور مسواک کرے تو خوب اچھی طرح دانتوں، زبان کے تالو اور حلق تک کو بھی صاف کرے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«يَسْتَنُّ بِسَوَاكٍ بِيَدِهِ يَقُولُ أُعْ أُعْ، وَالسَّوَاكُ فِي فَيْهِ، كَأَنَّهُ يَتَهَوَّعُ»¹
 ”نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے مسواک کرتے ہوئے ”ع“، ”ع“ کی آوازیں نکالتے تھے جیسا کہ آپ ﷺ فرماتے ہوئے ہوں اور مسواک آپ کے منہ میں ہوتی تھی۔“

احادیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہر نماز کے ساتھ مسواک فرماتے، جب بھی سوکر اٹھتے تو مسواک فرماتے اور جب بھی گھر میں داخل ہوتے تو مسواک فرماتے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «كَانَ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ بَدَأَ بِالسَّوَاكِ»²
 ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جب گھر میں داخل ہوتے تو سب سے پہلا کام مسواک کرتے تھے۔“

¹ صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب السَّوَاكِ، 58/1

² صحیح مسلم، کتاب الطَّهَارَةِ، باب السَّوَاكِ، 220/1

بعض اوقات اچھی طرح مسواک کرنے کے باوجود منہ میں بد بو رہ جاتی ہے تو یہ بد بو دراصل معدے کی ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا ہاضمہ اچھا نہیں ہوتا کہ ان کا کھانا جلد ہضم نہیں ہوتا تو ان کے معدے سے بد بو آتی ہے۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہاضمہ تو درست ہے لیکن کچھ ایسا کھالیا ہے کہ جو جلد ہضم نہیں ہو رہا لہذا وہ کھانا منہ سے بد بو آنے کا باعث بن جاتا ہے۔ معدے کی بد بو کا آسان علاج تو یہی ہے کہ پانی زیادہ پیے اور کھانا ہضم کرنے کے لیے کھانے کے بعد اجوائن اور سونف وغیرہ استعمال کرے۔

زیر ناف کے بال مونڈنا کہ عموماً ایسے مقام پر بالوں کے بڑھ جانے سے پسینہ جمع ہو جانے کی وجہ سے بد بو پیدا ہو جاتی ہے۔ زیر بغل کے بال مونڈنا اور بد بو دور کرنا کہ عموماً یہاں بھی پسینہ زیادہ آنے کی وجہ سے بد بو پیدا ہوتی ہے۔ استنجا کرنا کہ انسان بول و براز کے بعد ان مقامات کو اچھی طرح پانی سے صاف کرے۔ اور استنجا کے بعد اگر صابن بھی استعمال کرے تو ایسے لوگوں کی اللہ نے قرآن مجید میں تعریف بیان کی ہے جو طہارت کا خوب اہتمام کرنے والے اور اس میں مبالغہ کرنے والے ہیں۔¹ ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن کاٹنا۔ مونچھوں کے بال بڑے ہو جائیں تو انہیں کم کرنا۔ پسندیدہ یہ ہے کہ ہر جمعہ کے دن بالوں اور ناخنوں کی صفائی اور ستھرائی کا اہتمام کرے لیکن اگر کسی مصروفیت اور مجبوری کی وجہ سے وقت نہ مل سکا تو چالیس دن سے زیادہ موخر نہ کرے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وُقِّتَ لَنَا فِي قَصِّ الشَّارِبِ، وَتَقْلِيمِ الْأَظْفَارِ، وَتَنْفِ الْإِطِيطِ، وَحَلْقِ الْعَانَةِ، أَنْ لَا نَنْزِكَ أَكْثَرَ مِنْ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً»²

”ہمارے لیے مونچھیں کم کرنے، ناخنوں کے کاٹنے، بغل کے بال اکھیرنے اور زیر ناف بال مونڈنے میں چالیس دن کا انتہائی وقت مقرر کیا گیا۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے ان مقامات کی صفائی اور ستھرائی کو سنن فطرت میں شمار کیا ہے کہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور دین کا حکم نہ بھی ہوتا تو لوگ اپنی صالح فطرت کے

¹ التوبة: 9: 108

² صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب خضال الفطرة، 222/1

سبب ان مقامات کی صفائی اور ستھرائی کا لازماً دھیان رکھتے۔

طہارت کی معراج یہ ہے کہ انسان ہر وقت با وضو رہے اور وضو کرنے میں مبالغہ کرنے پر آخرت میں اجر و ثواب رکھا گیا ہے۔ وضو میں مبالغہ یہ ہے کہ وضو کے اعضا کو خوب اچھی طرح اور کچھ اوپر تک دھوئے کہ قیامت والے یہ اعضا روشن ہوں گے اور نور سے خوب چمک رہے ہوں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ أُمَّتِي يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوءِ، فَمَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ»¹

”میری امت کے لوگ قیامت والے دن میرے پاس اس حال میں لائے جائیں گے کہ ان کی پیشانیاں اور پاؤں وضو کے سبب سے خوب روشن ہوں گے۔ پس تم میں سے جو کوئی اپنے اس نور کو زیادہ کرنا چاہے تو وہ ضرور کرے۔“

جو لوگ طہارت کا اہتمام کرتے ہیں تو وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں اور اللہ ان سے محبت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں مسجد قبا کے نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے اور آپ ﷺ کو یہ کہا گیا ہے کہ آپ اس مسجد میں جا کر نماز پڑھا کریں اور اس مسجد کے نمازیوں کے بارے کہا گیا ہے کہ اللہ ان سے محبت رکھتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ طہارت کا خوب اہتمام رکھتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الْمَسْجِدُ أَسْبَسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ﴾ [التوبة: 108]

”البتہ وہ مسجد کہ جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس بات کی حقدار ہے کہ آپ وہاں قیام کریں۔ اس مسجد میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو طہارت کا خوب اہتمام رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ طہارت کا اہتمام کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔“

طہارت صرف استنجا اور وضو کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اچھا لباس پہننا، اچھا جوتا پہننا

¹ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب فضل الوضوء، وَالغُرُّ الْمُحَجَّلُونَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوءِ، 39/1

اور خوشبو لگانا بھی اس میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے کو نعمت سے نوازتے ہیں تو یہ پسند کرتے ہیں کہ بندہ اس نعمت کو استعمال بھی کرے۔ پس اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی نعمت سے نوازا ہو تو اسے اچھا پہننا اور ڈھنچا ہے البتہ فضول خرچی سے اجتناب کرے کہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ» قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبَرُ بَطَرُ الْحَقِّ، وَغَمَطُ النَّاسِ»¹

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا تو وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ بعض اوقات انسان کا دل کرتا ہے کہ وہ اچھے کپڑے پہنے یا اچھا جوتا پہنے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ یہ تکبر نہیں ہے بلکہ تکبر تو یہ ہے کہ انسان حق بات کو جھٹلا دے اور لوگوں کو حقیر جانے۔“

اخلاص کا وزن

اخلاص کا معنی ہے کہ بندہ اپنے دل کو اپنے مالک کے لیے خالص کر لے۔ بندے کا ایمان اور عمل صالح، اللہ کو راضی اور خوش کرنے کی نیت سے ہو۔ انسان اپنا ایمان اور اپنی سوچ، اپنا عمل اور اپنی عبادت، اپنا جینا اور مرنا، اللہ کے لیے اس طرح خالص کر دے کہ اس میں کوئی نفسانی خواہش اور دنیاوی مفاد شامل نہ ہو۔

اخلاص کو ہم آسان الفاظ میں یکسوئی بھی کہہ سکتے ہیں یعنی ہر چیز سے منقطع ہو کر اپنے دل کو اللہ ہی کی طرف یکسو کر لینا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾

¹ صحیح مسلم، کتابُ الايمان، باب تحريم الكبر ونباه، 93/1

[النحل: 120]

”ابراہیم علیہ السلام تو ایک امت تھے۔ اللہ کے فرمانبردار تھے۔ اور اللہ ہی کی طرف یکسو رہنے والے تھے۔ اور مشرکین میں سے نہ تھے۔“

دل کی توحید ”اخلاص“ ہے کہ ہر معاملے میں قلب کا تمام نفسانی خواہشات کو ترک کر کے اللہ کی طرف کامل طور یکسو ہو جانا۔ اور قلبی یکسوئی کا معنی یہ ہے کہ ہر لمحے اور ہر حال میں انسان کا دل اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ مثال کے طور آزمائش سے پہلے اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ آزمائش سے بچا کر رکھے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی دعا میں آزمائش سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ اور اگر آزمائش آجائے جیسا کہ ہر انسان کی تقدیر میں اللہ نے کچھ نہ کچھ آزمائش تو رکھی ہے، تو صبر اختیار کرے۔ اور جب آزمائش گزر جائے تو اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جائے۔ پس آزمائش سے پہلے قلب کا اللہ سے دعا کا تعلق ہو جبکہ آزمائش کی حالت میں صبر اور آزمائش کے بعد تسلیم و رضا کا حال ہو تو اسے قلبی یکسوئی کہتے ہیں۔

اخلاص کا تعلق انسان کی نیت اور ارادے سے ہے۔ اور نیت اور ارادے ہی کی درستگی پر اعمال کی قبولیت کا دار و مدار ہے۔ اللہ کے ہاں وہی عمل مقبول ہے کہ جس میں نیت اللہ کو پالینے کی ہو۔ اگر جہاد جیسے افضل عمل میں بھی مطلوب اللہ کی ذات نہ ہوگی تو اس کا کچھ اجر و ثواب نہ ہوگا۔ اگر جہاد سے مطلوب یہ ہو کہ لوگ مجھے مجاہد کہیں اور میدان جنگ میں میرے کارنامے زبان زد عام و خاص ہوں تو ایسا جہاد باعث وبال ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: أَرَأَيْتَ رَجُلًا غَزَا يَلْتَمِسُ الْأَجْرَ وَالذِّكْرَ، مَا لَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا شَيْءَ لَهُ» فَأَعَادَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، يَقُولُ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا شَيْءَ لَهُ» ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا، وَابْتَغَى بِهِ وَجْهَهُ»¹

¹ سنن النسائي، کتاب الجہاد، باب مَنْ غَزَا يَلْتَمِسُ الْأَجْرَ وَالذِّكْرَ، 25/6

”حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ کی اس شخص کے بارے کیا رائے ہے کہ جو اس لیے جنگ میں شریک ہوتا ہے کہ اسے آخرت میں اجر و ثواب بھی ملے اور دنیا میں بھی لوگ اس کو اچھے الفاظ میں یاد کریں۔ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسے شخص کے لیے آخرت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ صرف اسی نیک عمل کو قبول کرتے ہیں جو خالصتاً اس کو راضی کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔“

اور اللہ کو راضی اور خوش کرنے کے لیے چھوٹا سا عمل بھی کیا جائے گا تو اس کا اجر و ثواب بے انتہا ہوگا۔ پس اعمال میں وزن اس سے نہیں آئے گا کہ وہ عمل اپنی مقدار میں کتنا زیادہ ہے اور لوگوں کی نظروں میں کتنا بڑا ہے بلکہ اس سے آئے گا کہ اس عمل میں اخلاص اور اللہ کی رضا کتنی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا قَالَ عَبْدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قَطُّ مُخْلِصًا، إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، حَتَّى تُفْضِيَ إِلَى الْعَرْشِ، مَا اجْتَنَبَ الْكِبَائِرَ»¹

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب بھی کسی شخص نے اخلاص کے ساتھ کبھی بھی لا الہ الا اللہ پڑھا ہے تو اُس کے اس کلمے کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے ہیں یہاں تک کہ وہ عرش الہی تک جا پہنچا لیکن شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والوں میں سے ہو۔“

عام طور مذہبی لوگ کثرت اعمال پر زور دیتے ہیں نہ کہ اعمال کے معیار (quality) پر۔ ہمارے پاس دوسروں کی نیکی ماپنے کا ایک ہی آلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کتنی زیادہ نیکی کرتا ہے؟ حالانکہ نیک ہونے کا اصل معیار یہ ہے کہ اس کی نیکی کا کیفیت کیسی ہے؟

¹ سنن الترمذی، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَابُ دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَةَ، 575/5

لوگ لاکھوں کی تعداد میں کلمہ کا ورد کرتے ہیں جبکہ اللہ کے عرش تک پہنچنے کے لیے ایک دفعہ کا پڑھ لینا بھی کافی ہے لیکن یہ ایک دفعہ کا پڑھنا اخلاص کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے رات کے کسی وقت میں کھلے میدان میں یا اپنے گھر کی چھت پر چہل قدمی کرتے ہوئے آپ کی اوپر کی طرف اٹھے، اور چاند اور ستاروں سے جگمگاتا آسمان اللہ کی عظمت کا ایک حال آپ کے وجود میں طاری کر دے اور ایسے میں آپ کی زبان سے یہ کلمہ جاری ہو جائے تو یہ کلمہ اخلاص ہے کہ جس کے عرش تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص اخلاص سے کوئی نیک کام کرتا ہے تو اسے لازماً اس کا اجر و ثواب ملتا ہے، چاہے ظاہر میں اس کے نیک عمل کا نتیجہ اچھا نہ بھی نکلے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص نے اخلاص سے صدقہ کرنا چاہا تو سوچا کہ رات کے اندھیرے میں صدقہ کر دوں کہ صدقہ لینے والے کو بھی علم نہ ہو سکے کہ اسے کس نے دیا ہے؟ تو وہ صدقہ کی رقم لے کر گھر سے نکلا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: «لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ، فَوَضَعَهَا فِي يَدِ سَارِقٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصَدِّقَ عَلَى سَارِقٍ فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِي زَانِيَةٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصَدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلَى زَانِيَةٍ، فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، عَلَى زَانِيَةٍ؟ لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ، فَوَضَعَهَا فِي يَدِي غَنِيِّ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصَدِّقَ عَلَى غَنِيٍّ، فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، عَلَى سَارِقٍ وَعَلَى زَانِيَةٍ وَعَلَى غَنِيٍّ، فَأُتِيَ فَقِيلَ لَهُ: أَمَّا صَدَقَتُكَ عَلَى سَارِقٍ فَلَعَلَّهَا أَنْ يَسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِهِ، وَأَمَّا الزَّانِيَةُ فَلَعَلَّهَا أَنْ تَسْتَعِفَّ عَنْ زِنَاهَا، وَأَمَّا الْغَنِيُّ فَلَعَلَّهُ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ»¹

”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ میں آج لازماً

¹ صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب إِذَا تَصَدَّقَ عَلَى غَنِيٍّ وَهُوَ لَا يَعْلَمُ، 110/2-111

صدقہ کروں گا۔ پس وہ گھر سے باہر نکلا اور اس نے وہ صدقہ چپکے سے ایک چور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور صبح کے وقت شہر میں لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رات کسی نے چور کو صدقہ دیا ہے۔ اس شخص نے یہ باتیں سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ میں آج دوبارہ صدقہ کروں گا۔ پس وہ گھر سے باہر نکلا اور اس نے صدقہ کی رقم ایک طوائف کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دی۔ صبح کے وقت لوگ شہر میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ رات کسی نے طوائف کو صدقہ دیا ہے۔ اس شخص نے یہ باتیں سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ میں آج پھر صدقہ کروں گا۔ وہ گھر سے نکلا اور اس نے صدقہ کی رقم ایک امیر شخص کے ہاتھ میں تھما دی۔ صبح کو شہر میں لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رات کسی نے امیر پر صدقہ کیا ہے۔ اس شخص نے اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کا صدقہ کسی چور، طوائف اور امیر شخص کو پہنچ گیا۔ اس پر اس شخص کو یہ کہا گیا کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے اس صدقے کی بدولت اس چور کو یہ توفیق عطا فرمائیں کہ وہ چوری سے رک جائے، اور طوائف اپنی بدکاری سے باز آجائے اور امیر شخص اس سے شرمندہ ہو کر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والا بن جائے۔“

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگر انسان کے عمل میں اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے نیک عمل کو دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بنادیتے ہیں۔ لوگوں کی اصلاح کا ایک ذریعہ ان کو وعظ و نصیحت کرنا ہے اور دوسرا ذریعہ اپنے عمل کی اصلاح کرنا ہے کہ بہت سے لوگ آپ کی باتوں سے زیادہ آپ کے عمل سے ترغیب حاصل کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ اور انسان کا وہی عمل دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے کہ جس میں اخلاص اور عاجزی ہو۔

قیامت والے دن جب بندوں کے اعمال کا وزن کرنے کے لیے میزان قائم کیا جائے گا تو سب سے زیادہ وزن ان اعمال میں ہوگا کہ جن میں اخلاص ہوگا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَبْدَ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو، يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

«يَصَاحُ بِرَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رُؤُوسِ الْخَلَائِقِ. فَيُنْشَرُ لَهُ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ سَجَلًا، كُلُّ سَجَلٍ مَدَّ الْبَصَرِ، ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: هَلْ تُنْكِرُ مِنْ هَذَا شَيْئًا؟ فَيَقُولُ: لَا، يَا رَبِّ، فَيَقُولُ: أَظْلَمْتُكَ كَتَبْتِي الْحَافِظُونَ؟ فَيَقُولُ: لَا، ثُمَّ يَقُولُ: أَلَيْكَ عُذْرٌ، أَلَيْكَ حَسَنَةٌ؟ فَيَهَابُ الرَّجُلُ، فَيَقُولُ: لَا، فَيَقُولُ: بَلَى، إِنَّ لَكَ عِنْدَنَا حَسَنَاتٍ، وَإِنَّهُ لَا ظُلْمَ عَلَيْكَ الْيَوْمَ، فَتُخْرَجُ لَهُ بِطَاقَةٌ فِيهَا: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، قَالَ: فَيَقُولُ: يَا رَبِّ مَا هَذِهِ الْبِطَاقَةُ، مَعَ هَذِهِ السَّجَلَاتِ؟ فَيَقُولُ: إِنَّكَ لَا تُظْلَمُ، فَتُوضَعُ السَّجَلَاتُ فِي كِفَّةٍ، وَالْبِطَاقَةُ فِي كِفَّةٍ، فَطَاشَتِ السَّجَلَاتُ، وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ»¹

”حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ قیامت والے دن میری امت کے ایک شخص کو سب کے سامنے حساب کے لیے بلوایا جائے گا۔ اس کے سامنے اس کے گناہوں کے دفاتر کھولے جائیں گے تو وہ ننانوے ہوں گے اور ہر دفتر اتنا بڑا ہو گا کہ جہاں تک نگاہ جاسکتی ہے، وہاں تک پھیلا ہوا ہو گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال کریں گے کہ اے میرے بندے! کیا تجھے ان گناہوں میں سے کسی گناہ سے انکار ہے؟ [کہ وہ تیرا نہیں ہے اور فرشتوں نے غلطی سے لکھ لیا ہے]۔ تو وہ شخص کہے گا: نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا لکھنے والے فرشتوں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟ تو وہ جواب میں کہے گا کہ نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے کہ تو نے اتنے گناہ کیوں کیے ہیں؟ یا تیرے پاس کوئی نیکی ہے؟ تو وہ شخص دہشت زدہ ہو جائے گا اور کہے گا کہ مجھے یاد نہیں ہے کہ میرے پاس کوئی نیکی یا عذر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے فرمائیں گے کہ ہاں! ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی ہے اور آج ہم تمہارے ساتھ ظلم نہیں کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالیں گے کہ جس میں «أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ» لکھا ہوا ہو گا۔ تو وہ شخص کہے گا

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّہد، باب مَا يُرْجَى مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، 1437/2

کہ اے میرے مالک! اتنے گناہ اور ان کے مقابلے میں یہ نیکی، تو اس کا ان گناہوں سے کیا مقابلہ؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! آج تیرے ساتھ ظلم نہیں ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کے ننانوے دفاتر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں گے اور اس کی وہ نیکی دوسرے پلڑے میں تو نیکی والا پلڑا جھک جائے گا جبکہ گناہوں والا پلڑا اس نیکی کے وزن کے سبب ہوا میں اڑنا شروع کر دے گا۔“

کلمے کا ورد تو کروڑوں لوگ کرتے ہیں لیکن اس کلمے کے پڑھنے کا ایسا اجر و ثواب صرف اسی شخص کے حصے میں آئے گا کہ جس نے اسے مکمل اخلاص سے پڑھا ہو گا۔ اسی طرح کا معاملہ بقیہ نیک اعمال کا بھی ہے کہ بعض اوقات ایک عام سائیک عمل انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ اس میں اخلاص ہوتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَنَّ امْرَأَةً بَغِيًّا رَأَتْ كَلْبًا فِي يَوْمٍ حَارٍّ يَطْلِفُ بَيْتَهُ، فَقَدْ أَذْلَعَ لِسَانَهُ مِنَ الْعَطَشِ، فَتَزَعَّتْ لَهُ بِمُوقِهَا فَغَفِرَ لَهَا»¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک طوائف عورت نے سخت گرمی والے دن میں ایک کتے کو ایک کنویں کے گرد چکر لگاتے دیکھا اور وہ پیاس کی وجہ سے اپنی زبان لٹکائے ہوا تھا۔ اس عورت نے اس پر رحم کھاتے ہوئے اپنے موزے سے کنویں سے اس کے لیے پانی نکالا۔ اس عمل کی وجہ سے اس عورت کو معاف کر دیا گیا۔“

پس جب کسی نیک عمل کے کرنے پر دل آمادہ ہو اور اس کے کرنے میں دل کا سکون، اطمینان اور خوشی محسوس ہو رہی ہو تو اسے ہلکا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ لازم طور پر گزرنا چاہیے کہ یہ اخلاص والا عمل ہے جو میزان میں بہت بھاری ہو گا، چاہے دنیا میں یہ کتنا ہی حقیر سمجھا جاتا ہو۔

¹ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب فضل ساقی البہائم الْمُحْتَرَمَةِ وَأَطْعَامِهَا، 1761/4

تنہائی کی ریاکاری

قرآنی سلوک کے مطابق تزکیہ نفس کے لیے مجاہدہ کرنے والوں میں آخری رذیلہ اور نفس کا عیب یہی نظر آئے گا۔ امید ہے کہ جسے اللہ نے اس عیب سے پاک کر دیا، اسے اپنے صالحین بندوں میں شمار کر لیا۔

تنہائی کی ریاکاری یہ ہے کہ سالک¹ تنہائی کی عبادت کے دوران یہ سوچ رکھے کہ لوگ اُس کی اس عبادت پر کسی طرح مطلع ہو جائیں۔ مثلاً اگر کسی کو تہجد میں روزانہ ایک دو پارے پڑھنے کی توفیق نصیب ہوتی ہو تو وہ مجلس میں اس بات کے مواقع تلاش کرتا رہتا ہو کہ لوگوں کو غیر محسوس انداز میں اپنی تنہائی کی نیکی کے بارے بتلائے۔ یا تنہائی میں اللہ کے حضور میں رونا نصیب ہو تو اب خواہش یہ ہو کہ کسی طرح دوسروں کے علم میں آجائے کہ میں تنہائی میں بہت گریہ وزاری کرنے والوں میں سے ہوں۔

تنہائی کی ریاکاری کی ابتدا تنہائی کی نیکی کے ظاہر ہونے کی خواہش سے ہوتی ہے اور انتہا مجلس میں تنہائی کی نیکی کے اظہار سے۔ جب تنہائی میں نیکی کرتے ہوئے یہ سوچ بھی ہر معنی میں ختم ہو جائے کہ اللہ میری اس نیکی کو کسی پر ظاہر کرے تو اب تنہائی کا خالص اخلاص حاصل ہو گا۔ اور سالک مخلصین میں سے ہونے کے قابل ہو جائے گا۔ اللہ عز و جل اس شخص کو قیامت والے دن اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمائیں گے کہ جس نے اپنی تنہائی کو بھی ریاکاری سے پاک کر لیا۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ قیامت والے دن جن سات اشخاص کو اللہ کے عرش کا سایہ نصیب ہو گا، ان میں ایک وہ شخص ہو گا کہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ»²

”اور وہ شخص کہ جس نے اللہ کو یاد کیا، اس حال میں اس کا دل ہر چیز سے خالی

¹ پروردگار کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اطاعت کے راستے پر چلنے والا اور تزکیہ نفس کے لیے مجاہدہ کرنے والا۔

² موطا الإمام مالك، کتاب الشَّعْرِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُتَخَائِبِينَ فِي اللَّهِ، 952/2

تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔“

ریاکاری اور سوئے ظن

ایک دوست نے کہا کہ بعض لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ فیس بک پر اپنی نیکیاں بتلاتے پھرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس میں خرابی کیا ہے؟ کہنے لگے کہ صاف ریاکاری ہے، اور کیا! میں نے کہا کہ آپ اس مسئلے کا صرف ایک رخ دیکھ رہے ہیں، دوسرا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ دوسرا کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ سوئے ظن بھی ہے۔

کہنے لگے کہ یہ سوئے ظن والی بات سمجھ نہیں آئی۔ میں نے کہا کہ اس نے ریاکاری کی اور آپ نے سوئے ظن سے کام لیا، دونوں برابر ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ کیا بات ہوئی، میرا سوئے ظن تو توبہ ہو، جب اس کی ریاکاری صریح نہ ہو۔ میں نے کہا کہ ریاکاری، دل کا فعل ہے، اور اس کے بارے آخری فیصلہ اللہ عزوجل نے کرنا ہے کہ وہ ریاکار ہے یا نہیں؟ نہ کہ آپ کو۔

ہم اکثر اوقات دوسروں کی خامیوں پر نظر کرتے ہوئے اپنی خامی سے صرف نظر کیے رکھتے ہیں جبکہ یہ واقعی امر ہے کہ جبکہ آپ دوسروں کی خامی میں نظر کر رہے ہوتے ہیں تو اس وقت اگر آپ اپنے نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں تو فساد اور بگاڑ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور اب ہم اسے ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔

اب یہ طرز عمل تولائق تحسین (appreciable) ہے کہ اس نے اپنی نیکیوں کا اعلان کیا ہے تو میں اس کے اعلان کو دیکھ کر سوچوں کہ میں ایسا نہ کروں گا۔ پس اس طرح میں اس کی خامی کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنالوں۔ اور دوسرا رویہ یہ ہے کہ اس کی خامی کی ایسی توجیہ کروں کہ وہ خامی معلوم نہ ہو۔ اگر اس نے اپنی کسی نیکی کا اظہار کیا ہے تو شریعت میں بعض صورتوں میں نیکی کے اظہار کی گنجائش موجود ہے جبکہ دوسروں کو ترغیب دینا مقصد ہو نہ کہ اپنے آپ کو نیک ظاہر کرنا۔ پس یہ سوچ لیا جائے کہ وہ صاحب نیکی کی ترغیب دینے کے لیے ایسا کر رہے ہیں جیسا کہ سورۃ البقرہ آیت 271 کے بیان کے مطابق صدقہ اعلانیہ بھی دیا جاسکتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ پھر ریاکار کون ہے؟ میں نے کہا کہ ہمیں اپنے بارے زیادہ سوچنا چاہیے کہ ہم ریاکار ہیں یا نہیں؟ نہ کہ دوسروں کے بارے۔ باقی اگر کوئی شخص مہینے بھر میں اپنی ایک آدھ نیکی کو بیان کر دیتا ہے تو ایسا کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ہر کسی کو ایسا کر لینا چاہیے کہ نیکی اسی طرح سے پھیلتی ہے کہ ہم اپنے جیسوں سے ترغیب حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر اس اظہار پر کوئی ریاکاری کا شبہ ہو تو بعد میں استغفار کر لیں۔

البتہ یہ طرز عمل بھی درست نہیں ہے کہ نیکیاں دس ہوں اور سبھی کا اظہار کر دے۔ کچھ نیکیاں چھپا بھی لینی چاہیے، اپنے بیوی بچوں سے بھی، اپنے آپ سے بھی یعنی بائیں ہاتھ سے بھی جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایسے صدقہ کرو کہ تمہارے بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو تو قیامت والے دن اللہ کے عرش کے سائے میں ہو گے۔¹ اور نیکی کا اظہار اتنا بھی نہ ہو کہ ہر دوسرا شخص آپ کو ریاکار سمجھے۔ اگر ایسا ہو تو آپ ہلاکت کے گڑھے میں ہیں۔

سمجھدار ریاکاری

بعض اوقات ریاکاری اتنی سمجھدار ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ دوسروں کے ہاں پائی جاتی ہے، اپنے ہاں کبھی نہیں۔ یہ عموماً ان لوگوں میں ہوتا ہے کہ جو دوسروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ تصوف کے حلقوں سے جو لوگ نسبت رکھتے ہیں، انہیں اپنے علاوہ ہر شخص، ریاکار اور متکبر نظر آتا ہے۔

اس کتاب میں بعض مقامات پر راقم نے دوستوں کے ناموں کے ساتھ کچھ عملی مثالیں بیان کی تھیں تاکہ پڑھنے والوں کو ترغیب ملے لیکن بعد میں نظر ثانی کے دوران اس خیال سے اکثر ناموں کا ذکر نکال دیا کہ جنہیں تو متعلقہ شخص سے نسبت اور تعلق ہو گا، انہیں تو ان کی ذاتی زندگی کے ان واقعات سے فائدہ ہو گا لیکن جنہیں نسبت اور تعلق نہیں ہو گا تو وہ اسے ریاکاری پر محمول کریں گے اور خواہ مخواہ میں گناہ گار ہوں گے کہ سورۃ الحجرات آیت 12 میں سوئے ظن سے منع کیا گیا ہے۔

¹ صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب مَنْ جَلَسَ فِي الْمَسْجِدِ يَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ وَفُضِّلَ الْمَسَاجِدُ، 1/133

باقی ایک عام شخص اگر ترغیب کی غرض سے اپنی کسی نیکی کو بیان کرے اور دوسرا اسے متکبر کہے یا ریاکار، تو کچھ ملال نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہی احساس پیدا ہو کہ اگر کوئی کہہ رہا ہے تو تنہائی میں غور کر رہی لوں اور اپنی اصلاح کی تدبیر کر لوں۔ البتہ بعض اوقات آپ کا کسی ایسے مذہبی شخص سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے کہ جو آپ کو نہ صرف ریاکار اور متکبر بتلاتا ہے بلکہ ساتھ میں یہ بشارات بھی سنا دیتا ہے کہ تمہاری یہ بیماریاں لاعلاج بھی ہیں۔ تو ایسے شخص کے جواب میں یہی سوچ کر مطمئن ہو جائیں کہ اخلاص کی منزل کا کوئی رستہ ایسا نہیں ہے جو ریاکاری سے ہو کر نہ گزرتا ہو۔

اب کیا کہا جائے کہ یہ ریاکاری بھی بہت سمجھدار ہو گئی ہے کہ اگر میں اپنے پیر، شیخ اور بزرگ سے ان کی زبانی ان کی کسی نیکی کا تذکرہ سن لوں تو ان کے نیک ہونے کے یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اگر عام شخص سے یہ سن لوں کہ وہ اپنی کوئی نیکی بیان کر رہا ہے تو مجھے پہلے سے ہی یقین ہوتا ہے کہ وہ ریاکاری کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ جب ابن عربی اپنے آپ کو خاتم الاولیاء، شیخ احمد سرہندی اپنے آپ کو مجدد اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اپنے آپ کو قطب عالم کہتے ہیں تو وہ اس وقت ریاکار کیوں نہیں ہوتے؟ اس کا جواب متصوفین یوں دیتے ہیں کہ ان بزرگوں نے اپنا تزکیہ کر لیا تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ ان بزرگوں کو کیا آسمان سے ان کے تزکیہ ہو جانے کا سرٹیفکیٹ ملا تھا؟ اگر نہیں، تو عام شخص کے تزکیے کے بارے میں تردد کیوں ہے؟ اب تو ہمارے مذہبی حلقوں میں نفس کی برائیاں شمار کرنے میں جو گہرائی اور وسعت پائی جاتی ہے، وہ عموماً دوسروں کے نفس میں غور کرنے سے ہی پیدا ہوئی ہوتی ہے نہ کہ اپنے نفس میں لہذا اس کی تطبیق کا بہترین محل بھی دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اگر عام آدمی کا نیک ہونا ثابت ہو جائے تو بہت سوکے پیری مریدی کے کاروبار پر سوالیہ نشان کھڑا ہو جائے کہ اب اس کی کیا ضرورت باقی ہے؟

تصوف کے بعض حلقوں کی یہ مہربانی ہے کہ انہوں نے عام انسانوں کے گناہ گار ہونے کا تصور اتنی شدت سے ذہنوں میں بٹھا رکھا ہے کہ جتنی قوت سے بزرگوں اور

پیروں کے نیک ہونے کا یقین۔ پیر اور بزرگ کے متکبر اور ریاکار ہونے کا تصور جس طرح کفر سے کم نہیں ہے، اسی طرح عام شخص کے مخلص اور عاجز ہونے کی سوچ بھی کسی گناہ کبیرہ سے کم نہیں ہے۔ اللہ عزوجل سب کی حفاظت فرمائے۔

تکبر کی صورتیں

معاشرے میں تکبر کی کئی ایک صورتیں پائی جاتی ہیں کہ جن میں چند ایک یہ ہیں:

مال کے ذریعے تکبر:

مال کے ذریعے تکبر کرنا بادشاہوں، تاجروں، مالداروں اور امیروں میں ہوتا ہے۔ ایک مالدار شخص اپنے مال کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اگر مالدار شخص کسی غریب کو حقیر جانے یعنی اس کے پاس بیٹھنے، اس کے ساتھ کھانے پینے، اس کے ساتھ چلنے، اس سے گفتگو کرنے، اس کے گھر جانے، اس کے محلے میں جانے اور اس کے ساتھ دوستی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے تو بلاشبہ وہ اس تکبر میں مبتلا ہے۔ عموماً مالدار دین دار گھرانوں میں بھی یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ اس نوعیت کے تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر کسی دینی ادارے میں حفظ کی کلاس سے ایک مالدار دینی رجحان رکھنے والے خاندان نے اپنے بچے اس لیے اٹھالیے کہ اس ادارے میں ان کے ملازمین کے بچے بھی ساتھ ہی حفظ کر رہے تھے تو یہ تکبر کی ہی ایک علامت ہے۔ عام طور پر اس بارے میں یہاں یہ بنایا جاتا ہے کہ غریب کے بچوں میں تہذیب نہیں ہوتی لہذا ہمارے بچے ان سے غیر اخلاقی حرکات سیکھ سکتے ہیں حالانکہ اُمرا کے بچے جس قدر مہذب ہوتے ہیں، اس کا ایک جائزہ انگلش میڈیم اسکولوں سے فارغ ہونے والے بچوں کی چال چلن کی رپورٹوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اصل میں یہ تکبر ہے جس کی وجہ سے اُمرا اپنے بچوں کے لیے اپنے ملازمین کے بچوں کے ساتھ کھیلنے، پڑھنے اور بیٹھنے میں حجاب محسوس کرتے ہیں ورنہ تو بچے سبھی فطرتِ سلیمہ پر ہوتے ہیں جسے دینی ماحول مل جائے، اس کی تربیت ہو جاتی ہے۔ اور جسے توجہ نہ ملے تو وہ بگڑ جاتا ہے، چاہے غریب کا بچہ ہو یا امیر کا۔

حسن و جمال کے ذریعے تکبر:

حسن و جمال کے ذریعے تکبر کرنا عموماً عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ جب کوئی خاتون اللہ کی طرف سے عطا کیے گئے حسن پر اترائے اور دوسری خواتین کو اپنے سے کم تر سمجھے تو وہ تکبر کی اس قسم میں بلاشبہ مبتلا ہو چکی ہے۔ مثال کے طور کوئی خاتون دوسری خواتین کے خد و خال، رنگت اور پہننے اوڑھنے کے سلیقہ پر منفی تبصرے کرتی نظر آتی ہے کہ فلاں کو تو پہننے کا ڈھنگ ہی نہیں ہے، یا فلاں اپنی شکل و صورت میں بہت ہی سادی ہے، یا فلاں کے چہرے پر تو مسکینی ہی چھائی رہتی ہے، یا فلاں سٹائلش نہیں ہے وغیرہ۔ ایسے تمام تبصروں سے اگر تو کسی عورت کا مقصود اپنے آپ کو دوسری خواتین سے برتر ثابت کرنا ہے تو یہی تکبر ہے۔ اور اگر اس کے دل میں ان تبصروں کے وقت اپنی بڑائی موجود نہ ہو تو یہ غیبت ہے جو تکبر ہی کی طرح ممنوع ہے، اگرچہ حرمت میں اس کا گناہ تکبر سے کم ہے۔

خواتین کے نفسانی مسائل بہت زیادہ ہوتے ہیں کہ جن کے سبب یہ دین سے دور ہو جاتی ہیں۔ اب ہر خاتون دوسری خاتون کو اپنا وزن اور عمر کم بتلائے گی اور وزن بتلانے کے معاملے میں تو جھوٹ ایسے بولے گی جیسے نیکی کا کام ہو۔ ایک بار اس پر غور کر رہا تھا کہ مذہبی خواتین بھی عموماً ایسے معاملات میں بڑے وثوق سے جھوٹ بول لیتی ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے۔ پس وجہ یہی سمجھ آئی کہ اگر کسی خاتون کا وزن زیادہ ہے اور وہ اپنی کسی رشتہ دار خاتون کے پوچھنے پر اپنا اصل وزن بتلا دیتی ہیں تو انہیں معلوم ہے کہ خاندان کی عورتوں نے چسکے لے لے کر ان کے اس عیب کو موضوع بحث بنانا ہے لہذا بہتر ہے کہ ایک جھوٹ بول کر ان کی غیبتوں کے جان چھڑالو۔ کسی خاتون کے لیے یہ بہت اہم ہے کہ دوسری خواتین اس کے بارے کیا سوچتی اور تبصرہ کرتی ہیں لہذا اس کی زندگی میں دین کب، کتنا اور کیسا ہونا چاہیے بلکہ اس کی دنیا بھی کب، کتنی اور کیسی ہونی چاہیے، تو یہ دوسری خواتین طے کر رہی ہوتی ہیں اور یہ بے وقوفی کی انتہا ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ جو آپ کے نزدیک اہم ہے، آپ اس کو اہمیت دیں گے۔ آپ کو جو پسند ہے، آپ وہ

پہنیں اوڑھیں لیکن جب آپ دوسروں کے لیے پہننا اوڑھنا شروع کر دیں گے تو پھر یہ پریشانی تو ہوگی کہ دوسرے کیا تبصرہ کریں گے؟ اگر آپ کے نزدیک اپنی پسندیدگی سے زیادہ اہم دوسروں کی پسندیدگی ہے تو آپ دوسروں کی زندگی گزار رہے ہیں نہ کہ اپنی۔

مریدوں کی کثرت پر تکبر:

اپنے پیروکاروں کی کثرت کے ذریعے تکبر کرنا جیسا کہ علما، صوفیا، گدی نشینوں، خطباء، واعظین، مذہبی، سیاسی اور انقلابی جماعتوں کے قائدین میں ہوتا ہے۔ تکبر کی اس صورت میں ایک شخص اپنے پیروکاروں (followers) کی کثرت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً جب کوئی خطیب کسی دوسرے خطیب پر یہ تبصرہ کرے کہ اُسے تو منبر پر کھڑا ہونا ہی نہیں آتا، اُسے تو پیچہ ہی نہیں تقریر کیسے کرتے ہیں؟، وہ تو بس جمعہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں وغیرہ تو یہ خطیب بھی بلاشبہ تکبر کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔

بعض اوقات کسی پیر، خطیب اور مذہبی رہنما کے پیروکار بھی اس تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ پس اگر کسی مذہبی جماعت سے وابستہ کارکنان اپنی جماعت کے ممبران کی کثرت پر اتراتے نظر آتے ہوں، یا کسی پیر کے مرید اپنے پیر دوسرے پیروں کے مقابلے میں آسمان پر چڑھانے میں مصروف نظر آتے ہوں، یا کسی عالم دین کے شاگرد اپنے شیخ کے مقابلے میں دوسرے علما کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں، تو یہ سب بھی تکبر ہی کی صورتیں ہیں۔ گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ پیر و کار اپنے امام، پیر اور شیخ کو دوسروں سے بہتر قرار دیتے ہوئے دراصل یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ جب ہمارے امام، پیر اور شیخ تمہارے امام، پیر اور شیخ سے بہتر ہیں تو ہم بھی تم سے بہتر ہوئے۔

علم پر تکبر کرنا:

اپنے علم پر تکبر کرنا جیسا کہ بعض علما میں یہ مرض پایا جاتا ہے۔ یہ تکبر دوسرے علما پر بھی ہو سکتا ہے اور عوام پر بھی۔ بعض علما عوام الناس اور سائلین کے ساتھ بیٹھنا اپنے وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔ اور بعض علما، طالبان دین اور نوجوان علما کے ساتھ علمی تبادلہ

خیال میں عار محسوس کرتے ہیں۔ اور بعض علما کسی دیہاتی سائل کی رہنمائی کو اپنے وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ اور بعض علما دوسرے علما کے دلائل پر اس لیے توجہ نہیں دیتے اور ان کی تحقیق سے اس لیے استفادہ نہیں کرتے کہ وہ علم میں ان کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح علوم اسلامیہ میں مفتیوں اور پروفیسروں کی بھی اپنی اپنی دنیا ہے۔ مفتی صاحب کے ہاتھ کسی پروفیسر کی کتاب لگے گی تو وہ دیکھتے ہی یہ تبصرہ کریں گے کہ پروفیسروں کو دین کا کیا پتہ؟ اور پروفیسر صاحب کے ہاتھ مفتی صاحب کی تحقیق آئے گی تو وہ دیکھتے ہی کہیں گے کہ ہمارے مفتی حضرات ہزار سالہ پرانے علم میں زندگی گزار رہے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ علمی تکبر کے اس دریا میں فقہی مسالک کے پیروکاروں کی اکثریت سر تاپاؤں ڈوبی ہوئی ہے۔ ایک مسلک کے نمائندہ علما دوسرے مسلک کے علما کو حقیر جانتے ہیں اور انتہائی اخلاص سے یہ تکبر اپنے دل میں پالتے رہتے ہیں کہ علمی اعتبار سے اس جہاں میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اہل حدیث کا خیال ہے کہ دیوبند کے پاس حدیث کا علم کہاں، اور دیوبند یہ سمجھتے ہیں کہ اہل حدیث کو فقہ و اجتہاد سے کیا نسبت؟

اگر کسی عالم دین، شیخ الحدیث، مفتی اور پروفیسر صاحب کو مذہبی جلسہ و تقریب کے دوران سٹیج پر جگہ نہ ملے اور وہ عوام الناس کے ساتھ نیچے فرش پر بیٹھنے میں حجاب محسوس کریں تو یہ عالم دین، شیخ الحدیث، مفتی اور پروفیسر صاحب علمی تکبر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی عالم دین، شیخ الحدیث، مفتی اور پروفیسر صاحب کو مخاطب کرتے وقت القابات کا لحاظ نہ کیا جائے اور براہ راست ان کا نام لے لیا جائے اور وہ اس کو برا جانیں تو بلاشبہ یہ بھی تکبر ہی کی ایک قسم معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں عام طور پر تکبر کی یہ صورتیں نہیں ہوتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے ہر فعل کا محاسبہ اور ہر عمل کا تجزیہ کرتے رہنا چاہیے کہ میرا یہ فعل اور عمل کہیں میرے تزکیہ میں رکاوٹ تو نہیں بن رہا ہے؟ آپ ﷺ کا

فرمان ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ كِبَرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَزْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ»¹
 ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو۔ اور وہ شخص آگ میں داخل نہیں ہوگا کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان موجود ہو۔“

اب رائی کے دانے کے برابر تکبر تو بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اور اتنے تھوڑے تکبر کے بارے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہمارے اندر ہو گا لہذا اسے ختم کرنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ دین کے ایک طالب علم کے دل میں اگر تکبر پیدا ہو جائے تو اسے دور کرنے کے کئی راستے ہو سکتے ہیں بشرطیکہ طلب سچی ہو۔ اس بارے عظیم الرحمن عثمانی صاحب ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

”یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا، جب ایک نزدیکی سڑک سے گزرتے ہوئے کسی نے مہذب انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک کم عمر خوش شکل نوجوان ہاتھ میں صدقات کا ایک ڈبہ تھامے مسکرا رہا تھا: فلسطین کے بہن بھائیوں کی مالی مدد کیجیے۔ میں نے جیب سے کچھ پیسے اس کے حوالے کئے اور اسے رسمی طور پر سراہا۔ یہ نوجوان بلاشبہ بڑی جاذب شخصیت کا حامل محسوس ہوا۔ متناسب قد، پرسکون چہرہ، چہرے پر مسکراہٹ، وجیہہ داڑھی اور شانوں تک کے سنت کے مطابق بال۔ بات سے بات نکلی اور گفتگو طویل تر ہوتی چلی گئی۔ اپنے اس چھوٹے بھائی سے کتنی دیر بات ہوئی یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں مگر بوریت کا ذرا سا شائبہ تک نہ ہوا۔ ان ہی باتوں میں اس نے مجھے کہا کہ آپ قرآن حکیم پر غور ضرور کیا کیجیے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ غور و فکر کی تھوڑی بہت کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ مجھے قرآن کی کچھ سمجھ دے سکتا ہے؟ میں اندر ہی اندر مسکرایا، میرے نفس نے سرگوشی

¹ مسند الإمام أحمد بن حنبل: 30/7

کی کہ یہ کم عمر لڑکا تجھے قرآن کا کیا فہم دے سکے گا؟ تجھ سے تو خود کئی لوگ قرآن کا فہم سیکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ! رب العالمین مجھے معاف کریں۔ آمین) بہر کیف میں نے کہا ضرور بتاؤ۔ اب اس لڑکے نے جو قرآن حکیم کی آیات کی حکمتیں سمجھانا شروع کیا تو میں دم بخود رہ گیا۔ اس کا علم اور تدبر مجھ سے بیسیوں گنا زیادہ تھا۔ اس نے مختصر وقت میں مجھے قرآن پاک کے وہ مقامات سمجھائے جن کی جانب کبھی توجہ بھی نہ کی تھی۔ میں مؤدب ہو کر اب اس سے سوال پوچھنے لگا اور وہ مجھے نہایت اختصار سے جامع جواب دیتا گیا۔ جب بات مکمل ہوئی اور وقت رخصت قریب آنے لگا تو میں نے اس سے آخری درجے میں مرعوب ہوتے ہوئے گزارش کی کہ وہ قرآن کریم پر تدبر کی کوئی علمی نشست کا اہتمام کیوں نہیں کرتا؟ تاکہ مجھ سمیت دیگر لوگ اس کے علم سے مستفید ہوں؟ جواب میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ کوئی سال دو سال سے ایک نشست میں لیکچر دیتا رہا ہے جو کچھ ہی عرصے میں اتنا مقبول ہو گیا کہ شرکاء کی تعداد تین سو سے تجاوز کر گئی۔ میں نے مسرت سے کہا کہ تمہیں سننے کے بعد مجھے اس تعداد پر کوئی حیرت نہیں اور کیا تم مجھے بھی اس نشست میں شامل کر سکتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اب وہ دانستہ لیکچر نہیں دیتا اور اس کے لیکچر نہ دینے کی وجہ سے بہت سے شاگرد ناراض ہیں۔ میں نے وجہ دریافت کی تو اس نے مسکرا کر کہا کہ میں نے لیکچر دینا اس لئے عارضی طور پر معطل کر دیا ہے کیونکہ میرا نفس مجھے تنگ کرنے لگا تھا۔ میرے نفس نے مجھے یہ پیٹی پڑھانی شروع کر دی کہ تم تو بہت بڑے علامہ ہو، تم سے تو علما بھی سیکھنے آتے ہیں اور تمہارے علم کی تو کیا ہی بات ہے؟ میں نے بہت چاہا کہ اس نفس کو قابو کر سکوں مگر ناکام رہا۔ لہذا میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک اس نفس کو لگام نہیں دے لیتا، لیکچر نہیں دوں گا۔ اب کچھ ہفتوں سے افاقہ محسوس کر رہا ہوں اور جلد دوبارہ کلاس شروع کروں گا۔ میں اپنے اس بھائی کے لہجے سے چھلکتی سچائی اور اس کے تزکیہ نفس کی کوشش کو محسوس کر کے مسکرا رہا تھا۔ اس سے اس کا نمبر لیا تاکہ رابطہ

رکھا جاسکے مگر افسوس کہ شاید نمبر لکھنے میں کچھ غلطی کر گیا اور یہ پہلی ملاقات ہی میری اس سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اللہ پاک ہم سب کو نفس اور علم کے تکبر سے محفوظ رکھے۔ آمین!“

عاجزی کے احوال

نبی کریم ﷺ کے احوال میں سب سے غالب حال جو ہمیں ملتا ہے، وہ عاجزی کا حال ہے کہ بندگی کا جوہر عاجزی اور انکساری میں ہے۔ جس شخص کو عاجزی کا حال نصیب نہ ہوا، تو وہ بندگی کی لذت سے محروم رہا۔ اور بندہ جب تک عاجزی کے حال میں رہتا ہے، اس وقت تک بندگی کی مٹھاس چکھتا رہتا ہے۔ آپ ﷺ کے مقام کی کیا شان اور آپ کے رتبے کے کیا کہنے لیکن جب آپ اپنی دعاؤں میں اپنے رب سے مخاطب ہوتے ہیں تو عاجزی اور انکساری کا وہ حال دیکھنے کو ملتا ہے کہ انسان کانپ اٹھتا ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے ہیں، اور اپنے بارے فرما رہے ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ معلوم نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

آپ ﷺ کی ادعیہ ماثورۃ میں دراصل آپ کی عاجزی اور انکساری کے احوال منتقل ہوئے ہیں کہ جنہیں ہمارے ہاں فقہی تاویلات کی نذر کر دیا گیا حالانکہ وہ تو عین بندگی تھی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ نماز میں قیام، رکوع، قومہ اور تشهد کی حالت میں آپ ﷺ یہ دعائیں مانگا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلَهَ لِي إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي ذُنُوبِي جَمِيعًا إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ، وَالْمَرُءُ لَيْسَ إِلَيْكَ أَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ، تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ، وَإِذَا رَكَعَ، قَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ أَمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِي وَبَصَرِي وَمَعْي وَعِظَامِي وَعَصَبِي، وَإِذَا رَفَعَ، قَالَ: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ، مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ،

وَإِذَا سَجَدَ قَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ، سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ فَأَحْسَنَ صُورَتَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ، وَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ، وَإِذَا سَلَّمَ مِنَ الصَّلَاةِ، قَالَ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَسْرَفْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَالْمُؤَخِّرُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ¹

”قیام کی حالت میں سورہ فاتحہ سے پہلے آپ یہ دعا پڑھتے: اے اللہ! آپ بادشاہ ہیں، آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ مالک ہیں اور میں آپ کا غلام۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے اور مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے۔ پس آپ میرے تمام گناہوں کو معاف فرمادیں کہ آپ کے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کر سکے۔ اور بہترین اخلاق کی طرف میری رہنمائی فرمادیں کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو بہترین اخلاق کی طرف رہنمائی کر سکے۔ اور مجھے برے اخلاق سے دور رکھیں کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو مجھ سے برے اخلاق کو دور کر دے۔ پروردگار، میں حاضر ہوں جب بھی آپ پکاریں اور یہ میری سعادت ہے کہ آپ مجھے بلائیں۔ اور تمام خیر آپ کے ہاتھ میں ہے اور جو بھی شر ہے، وہ آپ کی طرف سے نہیں ہے۔ میں آپ کی وجہ سے ہوں اور آپ ہی کی طرف متوجہ ہوں۔ آپ بہت بابرکت اور بہت بلند ہیں۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں اور آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور جب آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم رکوع میں جاتے تو یہ دعا مانگتے: اے اللہ! میں نے آپ کے لیے رکوع کیا، میں آپ پر ایمان لایا، میں نے اپنے وجود کو آپ کے سامنے جھکا دیا، میری سماعت، میری بصارت، میرا دماغ، میری ہڈیاں اور میرے اعصاب تک آپ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ اور جب آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم رکوع سے کھڑے ہوتے تو یہ دعا مانگتے: اللہ عزوجل نے ہر اس بندے کی آواز سن لی ہے کہ جس نے اس کی حمد و ثنایان کی ہے۔ اے اللہ! آپ کی حمد و ثناء، اتنی کہ جس سے آسمان بھر جائیں، زمین بھر جائے، زمین اور آسمان کے مابین خلا بھر جائے، اور ان کے علاوہ جو چیز

¹ سنن أبي داود، أَبْوَابُ تَفْرِيعِ اسْتِغْفَاحِ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا يُسْتَفْتَحُ بِهِ الصَّلَاةُ مِنَ الدُّعَاءِ، 201/1

آپ چاہتے ہوں، وہ بھڑ جائے۔ اور جب آپ ﷺ سجدے میں جاتے تو یہ دعا مانگتے: اے اللہ! میں نے آپ کے لیے سجدہ کیا، میں آپ پر ایمان لایا، میں نے اپنے وجود کو آپ کے سامنے جھکا دیا، میرے چہرے نے اس ذات کے سامنے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا ہے کہ جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی شکل و صورت نکالی اور اس چہرے کی کیا ہی خوب شکل و صورت نکالی ہے۔ اور اس چہرے سے سماعت اور بصارت نکالی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بابرکت ہے جو بنانے والوں میں سب سے بہترین بنانے والا ہے۔ اور جب آپ ﷺ تشہد میں ہوتے تو سلام پھیرنے سے پہلے یہ دعا مانگتے: اے اللہ! میرے اگلے گناہوں کو معاف فرمادے، میرے پچھلے گناہوں کو معاف فرمادے۔ میرے چھپے ہوئے گناہوں کو معاف فرمادے، میرے اعلانیہ گناہوں کو معاف فرما دے۔ اور میں نے جو اپنی جان پر زیادتی کی ہے، اس کو معاف فرمادے۔ اور میرے ان گناہوں کو معاف فرمادے جو آپ زیادہ بہتر طور جانتے ہیں۔ آپ ہی ہیں جو بندگی میں آگے لے کر جانے والے ہیں اور آپ ہی ہیں جو بندگی میں پیچھے کر دینے والے ہیں۔ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔“

پس ہمیں بھی چاہیے کہ نماز میں ان مسنون دعاؤں کے ذریعے عاجزی کے وہ احوال حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ کریں کہ جو آپ ﷺ کی بندگی کا جوہر تھے۔ اور آپ کی عاجزی کے احوال حبیباً کہ وہ نماز میں تھے، ویسے ہی میدان جنگ میں بھی تھے۔ یہ آپ ﷺ کا کمال تھا۔ نماز میں تو اللہ کے سامنے عاجزی کے احوال حاصل ہو ہی جائیں گے کہ اللہ کے سامنے کیا تکبر لیکن جانی دشمن کی گردن قدموں میں ہوں اور پھر بھی عاجزی کے احوال زندہ رہیں، تو یہ عاجزی کے احوال کا انتہائی درجہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر جو خطبہ دیا تو اس کی ابتدا ان الفاظ سے فرمائی:

«لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ، صَدَقَ وَعْدُهُ، وَنَصَرَ عَبْدُهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَوَحْدَهُ»¹

¹ سنن أبي داود، كتاب الِئِيَات، بَابُ فِي دِيَةِ الْخَطَا شِبْهُ الْعَمْدِ، 185/4

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ اکیلا ہے، اس نے اپنے بندوں سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، اسی نے اپنے بندے کی مدد کی، اور اسی نے اکیلے تمام لشکروں کو شکست دی۔“

اب بدر، احد اور خندق کے میدانوں میں تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جا کر لڑے ہیں، احد میں ستر صحابہ اور آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ خندق میں پیٹ پر پتھر باندھ کر مدینے کا دفاع کیا لیکن جب مکہ فتح ہوا تو اپنا نام کہیں نہیں ہے، سب اللہ کی طرف منسوب کر دیا کہ اسی اکیلے نے دشمنوں کو شکست دی ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کی تواضع کے وہ احوال جو مخلوق کے ساتھ تھے، تو اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، أَنَّ امْرَأَةً كَانَتْ فِي عَقْلِهَا سَيِّئَةً، فَقَالَتْ: «يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ لِي إِلَيْكَ حَاجَةً، فَقَالَ: «يَا أُمَّ فُلَانٍ انْظُرِي أَيَّ السِّبْكِ شِئْتِ، حَتَّى أَقْضِيَ لَكَ حَاجَتَكَ» فَخَلَا مَعَهَا فِي بَعْضِ الطَّرِيقِ، حَتَّى فَرَعَتْ مِنْ حَاجَتِهَا»¹

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت کہ جس کی عقل کم تھی، اس نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ تو آپ ﷺ نے کہا: اے فلاں کی ماں! تم مجھے مدینہ کی جس گلی میں اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہو گی تو میں وہاں حاضر ہو جاؤں گا۔ پس آپ ﷺ اس عورت کے ساتھ گئے اور اس کا کام کر دیا۔“

اللہ کے رسول ﷺ تو فرض نماز مختصر کر دیں کہ بچے کی ماں کو اس کے رونے سے تکلیف نہ ہو اور یہاں خلیفہ مجاز صاحب سے ملنے کے لیے لوگ کئی کلو میٹر کا سفر طے کر کے آئے ہیں لیکن چونکہ وہ مراقبہ میں مصروف ہیں لہذا آپ گھنٹوں انتظار کی قطار میں لگ جائیں۔ آج کسی عالم دین، مفتی زمان، خلیفہ مجاز اور پیر طریقت کے پاس غریب لوگوں کے مسائل سننے کے لیے وہ اتنا وقت ہے کہ جتنا نبی کریم ﷺ نکالا کرتے تھے؟

¹ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب قُرْبِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ النَّاسِ وَتَرْكِهِمْ بِهِ، 1812/4

حسد کے مقامات

حسد (jealousy) کا معنی یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی پر اللہ کی کسی نعمت کی وجہ سے جلن اور کڑھن محسوس کرنا اور یہ خواہش رکھنا کہ وہ نعمت اس سے چھین جائے اور مجھے مل جائے۔ عموماً حسد نہ تو ان لوگوں سے پیدا ہوتا ہے کہ جنہیں انسان اپنے سے بہتر سمجھتا ہو اور نہ ان سے جو اس سے کمتر ہوں۔ حسد عام طور ہم مرتبہ، ہم مشرب، ہم مجلس اور ہم خیال لوگوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے عموماً یہ بہن بھائیوں، دوستوں اور رشتہ داروں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

حسد محض ایک منفی جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ محسود¹ کو نقصان پہنچانے کی عملی کوشش کا بیج بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاسد اپنے محسود کو ہمیشہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ نقصان بعض اوقات محسود کے قتل تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے ہی انہیں اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ اور نہ صرف بھائی کو اندھے کنویں میں ڈالا بلکہ اپنے والد کے بارے بھی برا گمان کرنے لگے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا نَحْنُ غُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (8) ﴿اقتُلُوا يُوسُفَ أَوْ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ﴾ [یوسف: 9]

”جب یوسف کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ بے شک یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہے جبکہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں۔ بلاشبہ ہمارے والد ایک صریح بھول میں مبتلا ہیں۔ تم یوسف کو قتل کر دو یا کسی جگہ پھینک دو تو تمہارے والد کی توجہ تمہارے لیے خالص ہو جائے گی۔ اور تم ایسا کرنے کے بعد نیک ہو جانا۔“

اولاد کے جوان ہونے کے بعد اولاد اور والدین میں جو شدید اختلافات

¹ جس سے حسد کیا گیا ہو۔

(clashes) سامنے آتے ہیں، اُن کا ایک بڑا سبب اولاد کا آپس کا حسد بھی ہوتا ہے۔ جب والدین اپنی اولاد میں کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں تو دوسری اولاد ایک تو اپنے اُس بھائی اور بہن سے حسد محسوس کرتی ہے کہ جسے اُن پر ترجیح دی جا رہی ہوتی ہے۔ اور دوسرا اپنے والدین سے بھی شکوہ رکھ لیتی ہے کہ جس کا اگر بوقت علان نہ کیا جائے تو وہ وقت کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

انسان کا جذبات پر تو اختیار نہیں ہوتا لہذا اگر والدین کو اپنی بعض اولاد سے زیادہ پیار ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر والدین عملاً بھی اولاد میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا شروع کر دیں تو اس سے اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں منع فرمایا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ گھریلو فساد کی صورت میں نکلتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ایک صحابی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ اپنے ایک بیٹے کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اِس لڑکے کی ماں کی خواہش ہے کہ میں اپنا فلاں باغ اِسے ہبہ (gift) کر دوں اور وہ یہ بھی چاہتی ہیں کہ آپ ﷺ اِس ہبہ پر گواہ بن جائے تاکہ وفات کے بعد بقیہ رشتہ دار اس میں وراثت کا دعویٰ نہ کریں۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ان کی اور بھی اولاد ہے تو انہوں نے بتلایا کہ ہاں اور بھی بچے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے کہا:

«أَكُلَّ بَنِيكَ قَدْ نَحَلْتَ مِثْلَ مَا نَحَلْتَ النُّعْمَانَ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَأَشْهَدْ عَلَى هَذَا غَيْرِي»، ثُمَّ قَالَ: «أَيْسُرُكَ أَنْ يَكُونُوا إِلَيْكَ فِي الْبَرِّ مَسْوَاءً؟» قَالَ: بَلَى، قَالَ: «فَلَا إِذَا»¹

”کیا تم نے اپنی بقیہ اولاد کو بھی ایسا ہی باغ ہبہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: نہیں۔ تو آپ ﷺ نے کہا: میں پھر اس پر گواہ نہیں بن سکتا۔ اور کیا تجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تیری ساری اولاد تجھ سے اچھا سلوک کرے؟ انہوں نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ آپ ﷺ نے کہا: پھر ایسا نہ کرو کہ بعض اولاد کو کچھ ہبہ کرو اور بعض کو نہ کرو۔“

علماء اور صوفیاء کے مابین بغض بھی حسد کے نمایاں مقامات میں شامل ہے۔ علما میں

¹ صحیح مسلم، کتاب الویات، باب کراهة تفضیل بغض الأولاد فی البیة، 1243/3

باہمی حسد کو اصطلاح میں ”معاصرت“ کہتے ہیں کہ عام طور علما اپنے معاصر علما کے علم و فضل کا اعتراف کرنے میں حد درجہ بخیل اور کنجوس ہوتے ہیں۔ اسی طرح افعال القلوب (actions of the heart) اگرچہ صوفیا کا خاص موضوع رہا ہے لیکن وہ بھی اس بیماری سے الاما شاء اللہ ہی محفوظ رہے۔ صوفیا کی سوانح (biographies) پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مریدین اپنے شیخ سے تعلق اور قرب کے حصول کی دوڑ میں آپس میں حسد کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ مولانا روم کے شیخ شمس تبریز کو تو ان کے مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل بھی کر دیا تھا۔¹ یہی وجہ ہے کہ صوفیا میں تو یہ بھی معروف ہے کہ کالمین میں سے بھی سب سے آخر میں جو دو چیزیں نکلتی ہیں وہ حسد اور حب جاہ ہیں۔

جس طرح بہن بھائیوں میں باہمی حسد کا ایک بڑا سبب والدین کا ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ہوتا ہے اسی طرح کسی پیر کے مریدوں اور شیخ کے شاگردوں میں حسد کی بڑی وجہ بھی ان کا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ہوتا ہے۔ مرید عموماً یہ برداشت نہیں کرتا کہ شیخ کی محبت اور میلان اس کی نسبت کسی اور مرید کی طرف زیادہ ہو۔ اور یہ صورت اس وقت زیادہ گھمبیر (complex) ہو جاتی ہے جبکہ شیخ کا جھکاؤ کسی نئے مرید کی طرف پر انوں کی نسبت زیادہ ہو جائے۔

حاسد سے اور کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم نظریہ ہی لگا دے گا اور یہ اس کا کم از کم شر ہے جو محسود کو پہنچتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی باقاعدہ تعلیم دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ [الفلق: 5]

”اور میں پناہ مانگتا ہوں حاسد کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے۔“

حسد سے بچنے کی بہترین تدبیر تو یہی ہے کہ انسان حاسدین کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرتا رہے۔ صبح و شام سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا تین بار ورد کرے اور دیگر اذکار مسنونہ کا بھی اہتمام کرے۔ اس کی ایک اور تدبیر یہ بھی ہے کہ جن رشتہ داروں،

¹ شبلی نعمانی، سوانح مولانا روم، نامی پریس، انڈیا، 1906ء، ص 18

دوستوں اور ساتھیوں (colleagues) کے بارے شبہ ہو کہ وہ آپ سے حسد کریں گے تو ان کے سامنے اپنی کامیابیاں (achievements) بیان نہ کریں۔ یہ علاج تو محسود کے لیے ہے کہ وہ اپنے آپ کو حاسدین کے شر سے کس طرح بچائے لیکن حاسد اپنا علاج کس طرح کرے۔ یعنی اگر کسی کو کسی سے حسد محسوس ہو اور وہ اس سے نجات چاہتا ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس بارے حدیث میں ایک بہترین تدبیر بتلائی گئی ہے کہ حاسد جس سے حسد محسوس کرے، اُسے تحفہ دینے کا اہتمام کرے کیونکہ تحفہ دینا انسان کے دل میں محبت کا بیج بونٹتا ہے۔ حسد کا جذبہ بغض سے پھوٹتا ہے اور بغض اور محبت دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا محال ہے۔ پس کسی سے حسد اور اس سے محبت ایک ہی دل میں ایک ساتھ قائم نہیں رہ سکتے۔ اگر تحفہ دینے کی استطاعت نہ ہو تو کم از کم محسود کو دھیان سے سلام کہنے کا اہتمام کرے تو اس سے بھی حسد جاتا رہے گا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

دَبَّ إِلَيْكُمْ ذَاءُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ: «الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ»، هِيَ الْخَالِقَةُ، لَا أَقُولُ تَخْلُقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَخْلُقُ الدِّينَ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا، وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا، أَفَلَا أُبَيِّنُكُمْ بِمَا يُنْبِتُ ذَلِكَ لَكُمْ؟ «أَفْسُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ»¹

”پہلی قوموں کی جو بیماریاں تمہاری طرف سنکتے ہوئے بڑھ رہی ہیں، ان میں حسد اور بغض شامل ہیں۔ اور یہ ایسی بیماریاں ہیں جو مونڈ دینے والی ہیں۔ اور میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ بالوں کو مونڈ دینے والی ہیں بلکہ دین کو مونڈ دینے والی بیماریاں ہیں۔ پروردگار کی قسم! تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مؤمن نہ کہلاؤ۔ اور اس وقت تک مؤمن نہیں کہلا سکتے جب تک کہ آپس میں محبت نہ رکھو۔ کیا میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتلا دوں کہ جو تمہارے مابین محبت قائم رکھے؟ اور وہ ہے آپس میں سلام کو رواج دینا۔“

حسد ایک ایسی عمومی بیماری ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی اس سے محفوظ ہو۔ یہی وجہ ہے

¹ سنن الترمذی، أبواب صفة القيامة والرقائق والورع، 4/664

کہ شریعت اسلامیہ میں رشک کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ رشک یہ ہے کہ کسی بھائی کی نعمت دیکھ کر یہ جذبہ پیدا ہو کہ اللہ عزوجل مجھے بھی ایسی نعمت عطا کرے۔ حسد میں تو اپنے بھائی کی نعمت چھین جانے کا بھی جذبہ ہوتا ہے جبکہ رشک میں یہ منفی جذبہ نہیں ہوتا۔ حسد سے بچنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس جذبے کو رشک کی طرف موڑ دیا جائے۔

مسلمانوں سے محبت

اللہ عزوجل نے ہمیں مسلمانوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور ان سے بغض رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلمانوں سے جو محبت ہوتی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے اور ایسی محبت ایمان کے کمال کی نشانی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ، وَأَبْغَضَ لِلَّهِ، وَأَعْطَى لِلَّهِ، وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ»¹

”جس نے اللہ کے لیے محبت رکھی اور اللہ کے لیے ہی نفرت رکھی۔ اور جس نے اللہ کے لیے ہی کسی کو کچھ دیا اور اللہ کے لیے ہی کسی سے کچھ روکا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔“

اگر کسی کے دل میں کسی بھی مسلمان بھائی کے لیے بغض نہ ہو تو یہ جنتی ہونے کی علامت ہے لہذا یہ بھی ایک کرنے کا کام ہے کہ ہم مسلمانوں کے بارے بغض کو اپنے دل سے نکالیں اور ان سے محبت کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: «يَطْلُعُ عَلَيْكُمُ الْآنَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَطَلَعَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ، تَنْطَفُ لِحَبَّتِهِ مِنْ وُضُوئِهِ، قَدْ تَعَلَّقَ نَعْلَيْهِ فِي يَدِهِ الشَّمَالِ، فَلَمَّا كَانَ الْعَدُو، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِثْلَ ذَلِكَ، فَطَلَعَ ذَلِكَ الرَّجُلُ مِثْلَ الْمَرَّةِ الْأُولَى. فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الثَّالِثُ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِثْلَ مَقَالَتِهِ أَيْضًا، فَطَلَعَ ذَلِكَ الرَّجُلُ عَلَى مِثْلِ خَالِهِ الْأُولَى، فَلَمَّا قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبِعَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ فَقَالَ: إِنِّي لَأَحِبُّ أَبِي فَأَقْسَمْتُ أَنْ لَا أَدْخُلَ عَلَيْهِ

¹ سنن أبي داود، كتاب السنّة، باب التّليّل على زيادّة الإيمان وتفضايه، 220/4

ثَلَاثًا، فَإِنْ رَأَيْتَ أَنْ تُؤْوِيَنِي إِلَيْكَ حَتَّى تَمْضِيَ فَعَلْتُ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ أَنَسُ: وَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُحَدِّثُ أَنَّهُ بَاتَ مَعَهُ بِلَيْلٍ ثَلَاثًا، فَلَمْ يَرَهُ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ شَيْئًا، غَيْرَ أَنَّهُ إِذَا تَعَارَّ وَتَقَلَّبَ عَلَى فِرَاشِهِ ذَكَرَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ وَكَثَّرَ، حَتَّى يَقُومَ لِصَلَاةِ الْفَجْرِ. قَالَ عَبْدُ اللَّهِ: غَيْرَ أَنِّي لَمْ أَسْمَعُهُ يَقُولُ إِلَّا خَبْرًا، فَلَمَّا مَضَتْ الثَّلَاثُ لَيْالٍ وَكِدْتُ أَنْ أَحْقِرَ عَمَلَهُ، قُلْتُ: يَا عَبْدَ اللَّهِ إِنِّي لَمْ يَكُنْ بَيْنِي وَبَيْنَ أَبِي غَضَبٌ وَلَا هَجَرٌ ثُمَّ، وَلَكِنْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَكَ ثَلَاثَ مَرَارٍ: يَطْلُعُ عَلَيْكُمْ الْآنَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَطَلَعْتَ أَنْتَ الثَّلَاثَ مَرَارٍ، فَأَرَدْتُ أَنْ أُوِيَّ إِلَيْكَ لِأَنْظُرَ مَا عَمَلُكَ، فَأَقْتَدَيْ بِهِ، فَلَمْ أَرُكَ تَعْمَلُ كَثِيرَ عَمَلٍ، فَمَا الَّذِي بَلَغَ بِكَ مَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: مَا هُوَ إِلَّا مَا رَأَيْتَ. قَالَ: فَلَمَّا وَلَّيْتُ دَعَانِي، فَقَالَ: مَا هُوَ إِلَّا مَا رَأَيْتَ، غَيْرَ أَنِّي لَا أَجِدُ فِي نَفْسِي لِأَخِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ غِشًّا، وَلَا أَحْسُدُ أَحَدًا عَلَى خَيْرٍ أَعْطَاهُ اللَّهُ إِيَّاهُ. فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ هَذِهِ الَّتِي بَلَغْتَ بِكَ، وَهِيَ الَّتِي لَا نُطِيقُ»

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک مرتبہ مسجد نبوی میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ آپ نے فرمایا کہ ابھی ایک ایسا شخص مسجد میں داخل ہوگا کہ جو جنتی ہے۔ تو تھوڑی دیر بعد ایک انصاری صحابی مسجد میں داخل ہوئے کہ جو اپنی داڑھی سے وضو کا پانی جھاڑ رہے تھے اور انہوں نے اپنا جو تالپے بائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے دن آپ ﷺ نے دوبارہ یہی بات بیان فرمائی اور وہی صحابی مسجد میں اسی حالت میں داخل ہوئے۔ تیسرے دن آپ ﷺ نے پھر یہی بات بیان فرمائی تو تیسرے دن بھی وہی صحابی مسجد میں اسی حالت میں داخل ہوئے۔ پس مجلس ختم ہونے کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان انصاری صحابی کا پیچھا کیا [کہ جن کو تین دن لگاتار اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی غیر موجودگی میں جنتی ہونے کی بشارت دی تھی اور ان کے گھر کے قریب پہنچ کر] حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میری اپنے والد صاحب سے لڑائی ہوئی ہے اور میں

نے یہ قسم کھائی ہے کہ تین دن اپنے گھر نہیں جاؤں گا تو کیا میں یہ تین دن آپ کے گھر رہ سکتا ہوں؟ تو ان انصاری صحابی نے انہیں اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان انصاری صحابی کے گھر تین راتیں گزاریں لیکن انہوں نے رات تہجد کے لیے کوئی قیام نہیں کیا البتہ اتنا تھا کہ جب رات کو بستر پر کروٹ بدلتے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور پھر صبح کی آذان کے وقت بیدار ہوتے۔ اور میں نے ان تین دنوں میں ان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ جب تین راتیں گزر گئیں تو مجھے ان کا عمل حقیر معلوم ہونے لگا تو میں نے ان انصاری صحابی سے کہا کہ میرے اور میرے والد صاحب کے مابین کوئی جھگڑا نہیں ہے، بس بات صرف اتنی تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کے بارے میں مرتبہ جنت کی بشارت دی تھی تو میں آپ کا عمل دیکھنے کے لیے آپ کے گھر رکھتا تھا کہ میں بھی وہ عمل کروں جو آپ کرتے ہیں لیکن مجھے آپ کا کوئی خاص عمل نظر نہیں آیا۔ تو آپ ہی بتائیں کہ آپ کا وہ کیا عمل ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کے بارے میں ایسی بات کہی ہے۔ تو ان انصاری صحابی نے کہا کہ بھائی میرا توجو عمل ہے، وہ تمہارے سامنے ہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان کی یہ بات سن کر اپنے گھر جانے کے لیے جب واپس مڑا تو انہوں نے مجھے بلوایا اور کہا کہ میرا عمل تو تم نے دیکھ ہی لیا البتہ ایک بات ہے کہ میرے دل میں کسی مسلمان کے لیے کینہ نہیں ہے۔ اور اللہ نے کسی مسلمان بھائی کو جو کچھ دیا ہے تو مجھے ان سے اس پر کوئی حسد نہیں ہوتا۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: یہی وہ بات ہے کہ جس کے سبب آپ کو یہ مرتبہ ملا اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔“

¹ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ خود بہت عبادت گزار تھے کہ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو قیام کرتے تھے اور اتنی عبادت کیا کرتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی عبادت کم کرنے کا حکم دیا تھا۔ تو ان کا خیال تھا کہ جنہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن لگاتار جنتی ہونے کی بشارت دی ہے تو ان کی کوئی خاص عبادت ہو گی اور وہی معلوم کرنے کی غرض سے انہوں نے ان انصاری صحابی کے ہاں تین راتیں گزاریں لیکن انہیں مایوسی ہوئی کہ وہ صبحی عشاء کی نماز پڑھ کے سوئے تھے اور پھر فجر کی آذان کے ساتھ بیدار ہوتے تھے۔

متقی اور دیندار لوگوں سے محبت رکھنا بھی نیکی کا عمل ہے اور نیک لوگوں سے محبت رکھنا ہی ایسا عمل ہے جو ہمارے ہر تعلق اور ہر عمل کو اللہ کی محبت پر کھڑا کر کے دکھا دے گا، ان شاء اللہ!۔ اللہ کی خاطر اللہ کی مخلوق سے محبت رکھنے کا کیا درجہ ہے تو اس بارے ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَنَّ رَجُلًا زَارَ أَخًا لَهُ فِي قَرْيَةٍ أُخْرَى، فَأَرْصَدَ اللَّهُ لَهُ، عَلَى مَذْرَجَتِهِ، مَلَكًا فَلَمَّا أَتَى عَلَيْهِ، قَالَ: أَتَيْنَ تُرِيدُ؟ قَالَ: أُرِيدُ أَخًا لِي فِي هَذِهِ الْقَرْيَةِ، قَالَ: هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا؟ قَالَ: لَا، غَيْرَ أَنِّي أَحْبَبْتُهُ فِي اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، قَالَ: فَإِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكَ، بِأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحْبَبَكَ كَمَا أَحْبَبْتُهُ فِيهِ»¹

”ایک شخص اپنے ایک دینی بھائی سے ملاقات کے لیے اپنی بستی سے دوسری بستی کی طرف نکلا کہ اللہ نے اس کے راستے میں ایک فرشتہ بھیجا کہ جس نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو اس شخص نے جواب دیا کہ میں فلاں بستی میں فلاں سے ملنے جا رہا ہوں۔ تو فرشتے نے پوچھا کہ کیا اس شخص نے تم پر کوئی احسان کیا تھا کہ تم اس سے ملنے جا رہے ہو۔ تو اس شخص نے جواب دیا کہ نہیں، اس کا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے۔ بس اللہ کے لیے مجھے اس سے محبت ہے لہذا اللہ کی محبت میں اس سے ملنے جا رہا ہوں۔ تو اس فرشتے نے کہا کہ میرے رب نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے اور یہ کہا ہے کہ جس طرح تو نے اس شخص سے اللہ کے لیے محبت رکھی، اسی طرح اللہ تجھ سے محبت رکھتا ہے۔“

پس کسی سے ہمارے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے تعلق کی بنیاد اللہ کی ذات ہونی چاہیے۔ اگر ظاہری تعلق یعنی لین دین اور دینا دلانا کسی کے ساتھ ہو تو اللہ کے لیے ہو کہ اللہ عز و جل نے رشتہ داروں اور مخلوق خدا سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور باطنی تعلق یعنی کسی سے محبت اور نفرت اگر ہو تو اس کا سبب بھی اپنی ذات نہ ہو بلکہ اللہ کا حکم ہو کہ جو اللہ کا زیادہ فرمانبردار ہو تو اس کی زیادہ محبت محسوس ہو۔

¹ صحیح مسلم، کتاب الزَّكَاةِ وَالصَّلَاةِ وَالْأَدَابِ، بَابُ فِي فَضْلِ الْخُبَرِ فِي اللَّهِ، 4/1988

اور جو اللہ کا نافرمان ہو تو اس کی کم محبت محسوس ہو اور جو اللہ کا باغی اور سرکش (rebel) ہو تو اس سے تو نفرت محسوس ہونا ایمان کا تقاضا (requirement) ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَاءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبْنَيْهِ لِأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنْتَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ [الممتحنة: 4]

”مسلمانو! تمہارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے، جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے بر ملا کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سب سے بالکل بیزار ہیں۔ ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں جب تک تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کے لیے بغض اور عداوت ظاہر ہو گئی۔“

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے کہ جو خلیل اللہ ہیں، ابو الانبیاء ہیں، جنہیں قرآن مجید نے انتہائی حلیم اور بردبار ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا لیکن ان کے دل میں بھی ان کافروں کے لیے بغض موجود ہے کہ جو اللہ کے باغی اور سرکش ہیں۔ اور یہ وہ کافر ہیں جن پر اہل ایمان نے دعوت و تبلیغ کے راستے حد درجہ حجت قائم کر دی ہے لیکن وہ جواب میں اہل ایمان کو اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ پس ظلم کرنے والے ایسے کافروں سے بغض رکھنا ایمان کی نشانی ہی نہیں، لازمی تقاضا بھی ہے۔

اور مسلمانوں سے جو دین کے نام پر بغض رکھا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر اپنے نفس کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ اللہ کے لیے۔ اس بارے اپنے احوال پر غور کرتے رہنا چاہیے تاکہ نفس کی اصلاح ہوتی رہے۔ جب کسی سے اللہ کے لیے اختلاف رکھا جاتا ہے یا کسی پر اللہ کے لیے نقد کی جاتی ہے تو ایسے رویے سامنے آتے ہیں جو ہمیں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی زندگی میں اپنے دشمنوں کے لیے ملتے ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ

ﷺ کے اکابر اصحاب یہ خواہش رکھتے تھے کہ کاش انہیں بھی اپنے دشمنوں کے بارے
وہی اخلاق ملیں جو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حصے میں آئے ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنا ایک
واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَجِئْتُ يَوْمًا مُبَشِّرًا لَهُ بِمَوْتِ أَكْبَرِ أَعْدَائِهِ، وَأَشَدِّهِمْ عَدَاوَةً وَأَذَى لَهُ.
فَنَهَرَنِي وَتَنَكَّرَ لِي وَاسْتَرْجَعَ. ثُمَّ قَامَ مِنْ قَوْمِهِ إِلَى بَيْتِ أَهْلِهِ فَعَزَّاهُمْ،
وَقَالَ: إِنِّي لَكُمْ مَكَانَهُ، وَلَا يَكُونُ لَكُمْ أَمْرٌ تَحْتَاجُونَ فِيهِ إِلَى مُسَاعَدَةٍ
إِلَّا وَسَاعَدْتُكُمْ فِيهِ. وَنَحَوْ هَذَا مِنَ الْكَلَامِ. فَسُرُّوا بِهِ وَدَعَوْا لَهُ.
وَعَظَّمُوا هَذِهِ الْحَالَ مِنْهُ.¹

”ایک دن میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے پاس آیا اور ان کو ان کے ایک
بہت بڑے دشمن کہ جو ان سے سخت عداوت رکھتا تھا اور انہیں بہت اذیت
پہنچاتا تھا، کے بارے کہا کہ خوش خبری ہو کہ اس کی وفات ہو گئی ہے۔ تو شیخ نے
مجھے ڈانٹ دیا، اور میری بات کو ناپسند جانا اور انا اللہ وانا الیہ راجعون کہا۔ پھر فوراً
اپنی جگہ سے اٹھے اور مرحوم کے گھر جا کر ان کے گھر والوں سے تعزیت کی اور
انہیں کہا کہ مرحوم کی جو حیثیت آپ کے گھر میں تھی، آج سے میری وہی
حیثیت سمجھیں لہذا آپ لوگوں کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں پوری
کروں گا۔ اور اس قسم کی باتیں کہیں کہ جنہیں سن کے مرحوم کے گھر والے
بہت خوش ہوئے اور انہوں نے شیخ کو دعائیں دیں۔ اور ان کی اس رویے سے
بہت متاثر ہوئے۔“

عجالت کافساد

اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کے لیے کچھ کیاں اور کوتاہیاں پیدا کیں تو اس میں
رکھ چھوڑی ہیں تاکہ وہ اپنی تربیت و تزکیہ کے ذریعے ان پر قابو حاصل کرے اور اپنے
امتحان میں کامیاب ٹھہرے۔ عجالت جسے ہم اپنی زبان میں جلد بازی کہتے ہیں، انسان کے
ان عیوب میں داخل ہے جو پیدا نشی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

¹ مدارج السالکین: 329/2

﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبياء: 37]

”انسان کو عجلت کے خمیر سے پیدا کیا گیا ہے۔“

ہم یہ بات اس پہلے بھی کر چکے ہیں کہ جو اوصاف انسان میں پیدا نشی ہوتے ہیں، انہیں ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ پیدا نشی اوصاف یا مزاج کا ختم کرنا ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی انسان سے تزکیہ نفس کا مطالبہ کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا﴾ ﴿7﴾ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴿8﴾ قَدْ أَفْلَحَ

مَنْ زَكَّاهَا ﴿9﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾ [الشمس: 10]

”اور قسم ہے نفس کی اور اس کے سنوارنے کی۔ اللہ نے انسان کے نفس میں اس کا تقویٰ اور فسق و فجور دونوں رکھ دیے ہیں۔ پس کامیاب وہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا۔ اور ناکام وہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو دبا دیا۔“

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تقویٰ اور فسق و فجور دونوں نفس انسانی میں پیدا نشی طور رکھے گئے ہیں۔ اور اس شخص کو کامیاب قرار دیا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو فسق و فجور سے پاک کر لیا اور اسے ناکام کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو فسق و فجور کے ساتھ خاک میں ملا دیا۔

نفس انسانی میں موجود پیدا نشی کمزوریوں کے ساتھ دو طرح سے معاملہ کیا جاسکتا ہے: ضبط اور امالہ۔ پہلی صورت یہ ہے کہ انہیں قابو میں لایا جائے اور دوسری یہ کہ انہیں نیکی کے رخ پر مائل کرنے کی کوشش کی جائے۔

عجلت انسانی مزاج کی ایک ایسی بیماری ہے جو نہ صرف نفس انسانی کے بگاڑ بلکہ معاشرے میں بھی فساد کا باعث بنتی ہے۔ یہ بیماری عموماً نوجوانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ عمر کے ساتھ انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ آ ہی جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بیماری مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس کا تعلق انسان کے مزاج سے ہے اور مزاج جذبات سے بنتا ہے اور جذبات کا پہلو عورتوں میں نسبتاً غالب ہوتا ہے۔

جدید دور کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ کمپیوٹر ازم کے عالمی نظام میں مارکیٹنگ نے عجلت کی کمزوری کو اسی طرح بھڑکا دیا ہے کہ جیسے پٹرول کے چھڑکنے سے سلگتا ہوا کوئلہ

بھڑک اٹھتا ہے۔ نیا موبائل، نیا آئی فون، نیا ٹیبلٹ، نیا لپ ٹاپ، نئی گاڑی ان میں سے کیا کچھ انسان کی ضرورت میں داخل ہے؟ لیکن اس کے باوجود انسانوں کی اکثریت ٹیلی ویژن ایڈز، اخباری اشتہارات اور شاہراہوں پر لگے بل بورڈز سے متاثر ہو کر وہ سب کچھ خرید لینے میں عجلت سے کام لیتی ہیں کہ جو نہ تو ان کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی ان میں اس کی خرید کی استطاعت (purchasing power) ہوتی ہے۔

جن کے پاس نئے ماڈل کی قوت خرید ہوتی ہے لیکن وہ ان کی ضرورت نہیں ہوتا تو ان کا معاملہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی اُس چیز سے اکتا جاتے ہیں اور اگلے ماڈل کا انتظار کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور جن کی قوت خرید نہیں ہوتی، وہ مہینے کے شروع میں خرید تو لیتے ہیں لیکن مہینے کے آخر میں قرض ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر پیدا نئی طور دنیاوی مال و متاع کی محبت رکھی ہے، اس سے انکار نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَالِ﴾ [آل عمران: 14]

”انسانوں کے لیے عورتوں، بیٹوں، سونے اور چاندی کے ڈھیروں، عمدہ گھوڑوں، مال مویشی اور کھیتی کی خواہش اور محبت خوبصورت بنا دی گئی ہے۔ لیکن یہ سب دنیا کا حقیر ساز و سامان ہے اور اللہ کے پاس عمدہ ٹھکانہ ہے۔“

یہ خواہشات اور ان کی محبت اللہ نے انسان میں رکھی ہیں، ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ اگر یہ ختم ہو جائیں تو آزمائش ختم ہو جائے۔ اور ان خواہشات کا ختم کرنا شریعت اسلامیہ کا مقصود بھی نہیں ہے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہم ان خواہشات کو کنٹرول اور مائل کریں۔ تو جلد بازی کی صفت کو قابو کرنا ایک مطالبہ ہے اور اس کو نیکی کی طرف مائل کرنا ایک دوسرا پہلو ہے۔

نیکی کے کاموں یا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو راضی کرنے میں جلدی کرنا شریعت اسلامیہ میں مطلوب ہے۔ پس دنیا کے معاملے میں عجلت کو ممکن حد تک قابو میں رکھیں اور اللہ

کو راضی کرنے کے معاملے میں عجلت سے کام لیں۔ تو ضبط اور امالہ ان دو طریقوں سے ہم اپنا تزکیہ نفس کر سکتے ہیں کہ دنیا کے معاملے میں عجلت کی صفت کو ضبط میں رکھنا سیکھیں اور دین کی طرف عجلت کی صفت کو مائل کرنے کے لیے مجاہدہ کریں۔

جلد بازی کا معاشرتی فساد کیا ہے؟ اس کے لیے ہمارے معاشرے کی ایک چھوٹی سی مثال ہی کافی ہے۔ اگر آپ بایک اور گاڑی پر سوار ہو کر شاہراہ پر ٹکلیں اور اپنے دائیں بائیں اور ٹریفک اشاروں کے مقامات پر خاص طور غور کریں تو آپ کو محسوس ہو گا جیسے ہر گاڑی اتنی جلدی میں ہے کہ جیسے فائر بریگیڈ کہیں آگ بجھانے کے لیے جا رہی ہو۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہر دوسرا شخص پریشان اور کشیدہ (tense) نظر آتا ہے۔ اس نے اُس کو کٹ (cut) مار دیا، سگنل یہاں کا کھلا تھا اور ٹریفک دوسری طرف کی جاری ہو گئی، اس کی بایک اُس کے بمپر سے کچھ مس (touch) کر گئی وغیرہ۔ یہ عجلت اکثر اوقات ٹریفک حادثات کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ کیا انسان اتنا کمزور ہے کہ وہ اپنے آپ کو یہ نہیں سمجھا سکتا کہ کیا ہوا اگر میں پانچ منٹ دیر سے پہنچ جاؤں۔ اگر کسی شخص کو دیر ہو رہی ہے اور اسے ضروری طور وقت پر پہنچنا ہے تو اسے اپنی تاخیر کے اسباب پر غور کرنا چاہیے تاکہ آئندہ دیر نہ ہونے کہ پریشانی میں بایک یا گاڑی دوڑا کر خود کو بھی پریشان کرے اور دوسروں کو بھی اذیت دے۔ اور تو اور اب اگر ایک ایم بی اے (MBA) بھی تیز ڈرائیونگ پر ٹوکنے کے جواب میں یہ کہے کہ میں جلدی میں ہوں اور مجھے دیر ہو رہی ہے تو اس کی ڈگری کے بارے آپ کیا تبصرہ کر سکتے ہیں؟ اسے تو دوسروں کی اصلاح کرنی تھی، معاشرے کو انتظام (management) سکھانا تھا نہ کہ خود کو بھی اپنے علم سے محروم رکھنا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«التَّائِي مِنَ اللَّهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ»¹

”ٹھہراؤ، اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت، شیطان کی طرف سے ہے۔“

روایت کا معنی یہ ہے کہ شیطان، انسان کی کمزوریوں کا استحصال (exploit)

¹ سلسلة الأحاديث الصحيحة: 404/4

کرتے ہوئے اسے خوب گمراہ کرتا ہے اور جن کمزوریوں کا وہ استحصال کرتا ہے، ان میں سے ایک عجلت بھی ہے۔

قناعت کی دولت

اللہ نے انسان کو جو کچھ اور جتنا دیا ہو، اس پر راضی رہنا انسان کی زندگی خوشحال بنادیتا ہے۔ دنیا میں تمام انسان مال و دولت، حسن و جمال، صلاحیت و اہلیت اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے کبھی بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ فرق اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسی فرق کی وجہ سے دنیا کا یہ نظام چل رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ [الزخرف: 32]

”اور ہم نے اس دنیا میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔“

اگر سب لوگ ایک ہی جیسے مال دار ہوتے تو ایک دوسرے کے کام کیسے آتے؟ یہ ضرورت اور مجبوری ہی ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کا کام کرتے ہیں۔

قناعت یہ نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور آزمائش سے نکلنے اور دنیا کمانے کے لیے محنت نہ کرے بلکہ قناعت یہ ہے کہ انسان کی محنت اور کوشش کے باوجود اسے اللہ کی طرف سے جو رزق ملے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور شکوہ نہ رکھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَوُزِقَ كِفَافًا وَقَنَعَهُ اللَّهُ»¹

”حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص فلاح پا گیا کہ جو اسلام لایا اور جسے اتنا رزق دیا گیا کہ جو کفایت کرنے والا تھا۔ اور اسے اس بارے اللہ نے قناعت کی دولت سے نوازا۔“

¹ سنن الترمذی، أبواب الزهد، باب ما جاء في الكفاف والصبر عليه، 575/4

اسی طرح اللہ نے انسان کی تقدیر میں جو کچھ حسن و جمال، وجاہت و مقام اور نعمت و آزمائش وغیرہ مقرر کر دیا ہے تو اُس پر راضی ہو جانے کا نام قناعت ہے۔ جن لوگوں میں قناعت نہیں ہوتی، وہ ذہنی اذیت کا شکار رہتے ہیں۔ انسان میں اگر قناعت کا وصف نہ ہو تو اُسے اپنی پیدائش اور اس دنیا میں آنے پر بھی اطمینان نہیں رہتا۔ یہ قناعت نہ ہونے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب لڑکے کو لڑکی بننے کا شوق ہے تو لڑکی کو لڑکا بننے کا جنون۔ اور سرجری کے راستے تبدیلی جنس (gender reassignment) پر اپنا وقت اور پیسہ دونوں ضائع کرتا رہتا ہے

قناعت کرنے والا شخص اصلاً امیر ہوتا ہے یعنی اُس کا دل امیر ہوتا ہے۔ عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں مال زیادہ ہو، وہاں کنجوسی اور بخیلی بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ جہاں مال کم ہو اور اللہ تعالیٰ ساتھ ہی قناعت کی دولت بھی عطا فرمادیں تو ایسا شخص حقیقی معنوں میں غنی کہلائے جانے کے لائق ہے۔ پس قناعت ایسی چیز ہے جو غریب کو امیر بنا دیتی ہے اور کنجوسی اور بخیلی ایسی شے ہے جو امیر کو غریب بنا دیتی ہے۔ اگر آپ میں قناعت ہے تو سوز و کی مہراں میں بیٹھ کر بھی اللہ کے شکر گزار ہوں گے اور اگر قناعت نہیں ہے تو ہنڈا سٹی کو بھی انجوائے نہیں کر پائیں گے کہ دل ہر وقت مر سیڈیز اور بی ایم ڈبلیو وغیرہ کے بارے سوچے گا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اصل غنی اس کو قرار دیا ہے کہ جو دل کا غنی ہو یعنی جس کا دل بڑا ہو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَيْسَ الْغَنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغَنَى غِنَى النَّفْسِ»¹

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ غنی مال و دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ غنی تو وہ ہے جو دل کا غنی ہے۔“

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّہد، باب القنّاعۃ، دار إحياء الكتب العربي، بیروت، 1386/2

شکر کی نعمت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کو شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کے تین درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کے نعمت ہونے کا احساس دل میں پیدا ہو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس احساس کے پیدا ہونے پر انسان اپنی زبان سے بھی اللہ کا شکر ادا کرے۔ اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان کے علاوہ اپنے عمل سے بھی شکر ادا کرے۔

کسی شاہراہ پر اگر آپ کسی بایک یا گاڑی والے سے لفٹ مانگیں اور وہ آپ کو لفٹ دے دے تو منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے آپ کے دل میں اس شخص کے لیے شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے درجہ میں آپ جزاکم اللہ، شکریہ، Thanks وغیرہ جیسے الفاظ ادا کر کے اپنے محسن کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو محض شکریہ ادا کرنے پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ بایک یا کار والے کو ساتھ میں دعائیں بھی دیتے ہیں مثلاً اللہ تمہیں خوش رکھے وغیرہ۔ تیسرے درجے میں یہ ہے کہ آپ کسی وقت اپنے اس محسن کو کسی مشکل میں گھرا ہوا دیکھیں تو اس سے نکلنے میں اس کے ساتھ عملی تعاون کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہمارے تعاون کی تو ہر گز ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ذات کسی قسم کے تعاون کی محتاج ہے لیکن اللہ کے لیے عمل سے شکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے وجود کو اس کے سامنے جھکا دیں اور اسے اس کا غلام بن کر دکھا دیں۔

انسان ہمیشہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں ہوتا ہے۔ یا تو نعمت اور آزمائش میں ہے تو اللہ کا شکر ادا کرے، یا تکلیف اور آزمائش میں ہے تو صبر کرے۔ جہاں تک اللہ کی نعمتوں کی بات ہے تو ہمارے ارد گرد بے شمار ایسی نعمتیں موجود ہوتی ہیں کہ جن کے بارے ہم یہ غور ہی نہیں کرتے کہ یہ بھی اللہ کی نعمتیں ہیں لہذا ان نعمتوں پر اللہ کے لیے شکر کا جذبہ بھی دل میں بیدار نہیں ہوتا۔ پس اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی عادت اسی وقت پختہ ہوگی جب ہمیں مالک کی نعمتوں کے نعمت ہونے کا شعور اور احساس حاصل ہو

گا۔ کسی شے کے بارے ذہن میں اللہ کی نعمت ہونے کا تصور ابھرے اور ساتھ ہی دل میں اس نعمت کے حوالے سے تشکر کے جذبات پیدا ہوں اور زبان پر کلمات شکر جاری ہو جائیں تو یہی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسانوں کو اپنی ذات اور ماحول میں بار بار غور کرنے کی جو دعوت دی ہے تو اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کو پہچان کر ان کا شکر ادا کرے۔

اگر کبھی گورمے بیکری میں کچھ خریدنے کے لیے جانے کا اتفاق ہو تو فوراً یہ احساس پیدا ہو کہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کے سپر اسٹورز کو باہر سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ وہ شیشوں کے پیچھے سجائی گئی ایسی رنگارنگ چیزوں کو دیکھتے ہیں کہ جن کے خریدنے کی حسرت ان کے دلوں میں سالوں سے چھپی ہوتی ہے لیکن وہ ان کی خریداری کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اور ایک ہم ہیں کہ پچھلے دس برسوں سے گورمے بیکری سے خریداری کر رہے ہیں یا ہر ماہ سپر اسٹور سے ٹرائی بھر سامان گھر لے جا رہے ہوں تو کبھی ایک بار بھی سپر اسٹور سے باہر نکلنے وقت اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا ہے کہ اُسی نے ہمیں اتنی استطاعت دی کہ ہم اُس کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور عمل سے شکریوں ادا ہو گا کہ سپر اسٹور سے نکلنے ہوئے کسی غریب اور مسکین کے ہاتھ میں کچھ رقم اس نیت سے پکڑا دیں کہ وہ بھی کبھی کچھ ویسا کھالے کہ جو آپ ہر دوسرے دن کھاتے ہوں۔

ن میں کتنی مرتبہ بیت الخلا جاتے ہیں۔ پچھلے دس برسوں میں بیت الخلا میں بیٹھے ہوئے کتنی بار ہمیں یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر یہ گندگی میرے جسم میں ہی رہ جاتی تو تکلیف اور اذیت سے میرا کیا حال ہوتا؟ اگر اس احساس کے ساتھ ہم بیت الخلا میں وقت گزاریں گے تو پھر بیت الخلا سے باہر نکلنے کی دعا پڑھنے میں جو کیفیت حاصل ہوگی، وہ بالکل ہی کسی اور نوعیت کی کیفیت ہوگی۔ بیت الخلا سے نکلنے وقت کی دعا یہ ہے:

«الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذَى وَعَافَانِي»¹

”تمام تعریفات اس اللہ کے لیے ہیں کہ جس نے مجھ سے اذیت کو دور کیا اور

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ وَشُحْبَتَا، بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ، 110/1

مجھے عافیت دی۔“

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ”ضعیف“ قرار دیا ہے۔¹ کسی شخص کو آپ بانیک یا کار پر لفت دیں اور اترتے وقت وہ آپ کا شکریہ بھی ادا نہ کرے تو آپ اس کے بارے کیا خیال کریں گے؟ بالکل یہی حال اس شخص کا بھی ہے کہ جو اللہ کی نعمتوں کو تو خوب استعمال کرے لیکن ان پر اللہ کا شکر گزار نہ ہو۔ شکر کا تعلق ہماری زندگی سے صرف اتنا رہ گیا ہے کہ کھانے کے بعد بس کھانے کی دعا پڑھ لی جائے تو اللہ کا شکر ادا ہو گیا جبکہ مالک کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾

[النحل: 34]

”اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو انہیں شمار نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ

¹ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو حسن جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے صالح قرار دیا ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت موقوفاً صحیح ہے۔ یہ واضح رہے کہ کسی روایت کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو عمل اس روایت میں منقول ہے، اس کا کرنا حرام ہے۔ روایت کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ثابت نہیں ہو سکی۔ اور وہ عمل کہ جس کی نسبت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو تو اس کا کرنا جائز بھی ہو سکتا ہے جبکہ اسے سنت سمجھ کر نہ کیا جائے۔ مثلاً ایک شخص اپنی زبان میں اللہ کی حمد و ثناء اور اللہ سے دعا مانگ سکتا ہے، چاہے وہ حمد و ثناء حدیث میں نہ ہو یا وہ دعا ان الفاظ میں حدیث میں منقول نہ ہے۔ پس مستحب تو یہی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں پر ہی اکتفا کیا جائے اور انہی کا التزام کیا جائے لیکن اگر کسی موقع و مناسبت کے اعتبار سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی دعا نہ ملے تو اپنے الفاظ میں دعا کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف مقامات پر اپنے الفاظ میں بھی اللہ کی حمد و ثناء کر لیتے تھے بلکہ اپنے الفاظ میں دعا بھی مانگ لیتے تھے جیسا کہ ایک صحابی نے جب رکوع سے اٹھنے پر اپنے الفاظ میں دعا مانگی تو آپ نے غار مکمل ہونے کے بعد ان کی دعا کی تعریف بیان کی اور کہا کہ میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ تمہارے ان کلمات کو اپنے رب تک پہنچانے کے لیے آپس میں لڑ رہے ہیں کہ ہر ایک کے خواہش ہے کہ وہ ان کلمات کو سب سے پہلے اللہ عزوجل تک پہنچائے کہ آپ کے بندے نے کسی قدر خوبصورت کلمات میں آپ کی حمد بیان کی ہے۔ غُثْ أَثْنِی، اَنْ رَجُلًا جَاءَ فَدَخَلَ الصَّفَّ وَقَدْ خَفَزَ النَّفْسُ، فَقَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، فَلَمَّا قَضَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاتَهُ قَالَ: «أَيُّكُمْ الْمَشْكُورُ بِالْكَلِمَاتِ؟» فَأَرَمَ الْقَوْمُ، فَقَالَ: «أَيُّكُمْ الْمَشْكُورُ؟ فَإِنَّهُ لَمْ يَقُلْ بَأْسًا» فَقَالَ رَجُلٌ: جِئْتُ وَقَدْ خَفَزَنِي النَّفْسُ فَقُلْتُهَا، فَقَالَ: «لَمَّا رَأَيْتُ أَثْنِي عَشْرًا — مَلَكًا يَتَبَيَّرُ وَنَهَا، أُمِّمَ بِرَفْعِهَا» [صحیح مسلم، کتاب المساجد ومَوَاضِعِ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا يَقَالُ بَيْنَ تَكْبِيرَةِ الْإِحْرَامِ وَالْقِرَاءَةِ 419/1]

انسان لازماً بہت ہی ظالم اور بہت زیادہ ناشکری کرنے والا ہے۔“
 تو اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ ہر لمحے ہم اللہ کی نعمتوں میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان نعمتوں کا شعور اور احساس نہیں ہوتا لہذا ہم ان پر شکر ادا کرنے کے عادی بھی نہیں ہوتے۔ آپ بچوں کی مثال ہی لے لیں۔ والدین ان کا کمرہ کھلونوں سے بھر بھی دیں تو بھی وہ نئے کھلونوں کے خواہشمند ہیں۔ چلیں! نئے کھلونے کی خواہش کر لیں لیکن یہ تو بد اخلاقی ہیں کہ اُن بیسیوں کھلونوں پر کوئی شکر ادا نہیں کیا جو والدین نے بغیر مطالبے کے خرید دیے اور اس ایک پر ناراضگی کا اظہار کیے بیٹھے ہیں جو والدین نے کسی سبب یا حکمت سے لے کر نہیں دیا۔ یہی معاملہ انسان کا اپنے خالق کے ساتھ ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی سینکڑوں نعمتوں کو انجوائے کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہمیں نہ تو ان کی قدر ہوتی ہے اور نہ ہی اس پر مالک کے شکر گزار ہوتے ہیں لیکن ایک نعمت جو ہمارے پاس نہیں ہوتی اور جس کے ہم طلب گار ہوتے ہیں، اس کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پروردگار سے شکایت ضرور کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ نعمت مل جائے تو پھر شکر تو دوچار دن کے لیے ہوتا ہے اور اس نعمت کا استعمال سالوں ہوتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم میں کسی کے پاس گاڑی کی نعمت نہیں تھی۔ ہم نے اللہ سے دعا کی اور اللہ نے کچھ عرصے بعد دے دی۔ تو اب کیا ایسا ہوتا ہے کہ ہم جب بھی گاڑی میں بیٹھیں تو اللہ کے شکر گزار ہوں۔ ہم نے دین کی ہر عبادت کی طرح نعمت پر شکر کو بھی مشینی (mechanical) بنا لیا ہے۔ بس گاڑی میں بیٹھنے کی دعا پڑھ لی تو شکر ادا ہو گیا۔ کیا کبھی گاڑی میں بیٹھے ہماری آنکھیں اللہ کی اس نعمت پر تشکر کے جذبے سے نم ہوئی ہیں؟ شکر تو وہ ہے جو پہلے دل میں پیدا ہو اور پھر زبان پر جاری ہو۔ صرف زبان پر جاری شکر تو ایک اخلاقی رسم (professional ethics) ہے اگرچہ کچھ نہ ہونے سے اس کا ہونا بھی بہتر ہے۔ ہم دراصل اللہ کا شکر اسی طرح ادا کرنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ جس طرح سیلز مین اپنے گاہک کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب ہم کسی نعمت کی دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس

نعمت کو دنیا کے معروف طریقوں کے مطابق ہمیں عطا کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آپ نے رات گاڑی کی دعا کی اور صبح سویرے فرشتے آپ کے دروازے پر ایک نئی کروڑا چھوڑ گئے۔ اللہ عزوجل آپ کے لیے دنیا میں ایسے حالات بناتے ہیں اور راستے کھولتے ہیں کہ وہ نعمت آپ کو حاصل ہو۔ اس لیے اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ جو نعمت مجھے حاصل ہوئی ہے، وہ میری محنت کا نتیجہ ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ کبھی کبھار نماز کے بعد اس بات پر سجدہ شکر ادا کر لینا چاہیے کہ اللہ عزوجل نے نماز پڑھنے کی توفیق دی۔ اور کبھی اس پر بھی سجدہ شکر ادا کر لینا چاہیے کہ اللہ نے شکر ادا کرنے کی توفیق دی ہے۔

صحت کی نعمت ہی کو لے لیں۔ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر اس وقت محسوس ہوتی ہے جبکہ ہم کسی ہسپتال کی زیارت (visit) کریں۔ اللہ کے نبی ﷺ کے زمانے میں اگر ہسپتال ہوتے ہیں تو آپ قبرستان کی طرح ان کی زیارت کا بھی حکم دیتے۔ اگر کسی دوست یا رشتہ دار کی عیادت کے لیے ہسپتال جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا بیمار ہو۔ اسی طرح کہیں کسی مسئلہ میں کورٹ کچہری کا چکر پڑ جائے تو لگتا ہے کہ آدھی دنیا تو یہاں ہی پھنسی ہوئی ہے۔ پس ہسپتال کے سامنے سے گزر جانا اور صحت کی نعمت کا شکر ادا نہ کرنا اور کورٹ کچہری کے سامنے سے گزرتے ہوئے سکون کی نعمت کا شکر ادا نہ کرنا، اگر ناشکری نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

فَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: «يُصْبِحُ عَلَى كُلِّ سَلَامَةٍ مِنْ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَيُجْزَى مِنْ ذَلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحَى»¹

”حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم صبح کرتے ہو تو تم پر ایک ایک جوڑ کے بدلے [بطور شکر] صدقہ ادا کرنا واجب ہے۔ اور

¹ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرہا، باب استیجاب صلاۃ الضحی، 498/1

دیکھو! سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے۔ الحمد للہ کہنا صدقہ ہے۔ لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔ اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے۔ برائی سے منع کرنا صدقہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس دن میں چاشت کی دو رکعت ادا کر لے تو اس نے اس دن کے ہر جوڑ کا شکر ادا کر دیا۔“

اللہ نے انسان میں اس قدر خیر رکھی ہے کہ اگر یہ اللہ کی نعمتوں کو سوچنا شروع کر دے تو اسے پروردگار کا شکر ادا کرنے کے لیے الفاظ نہ ملیں۔ ایک دوست کی صبح صبح کچن میں چائے بناتے ہوئے کچن، بیڈ روم، لاؤنج میں موجود اللہ کی نعمتوں پر نظر پڑی تو دل اس قدر تشکر کے جذبات سے بھر گیا کہ زبان سے شکر ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ کبھی سبحان اللہ و بجدہ کے کلمات پڑھے اور کبھی سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر کے، لیکن دل کو اطمینان نہیں آیا۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ سے منقول شکر گزاری کے یہ کلمات پڑھنا شروع کیے:

«سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ وَرِضَا نَفْسِهِ وَزِنَةَ عَرْشِهِ وَمَدَادَ كَلِمَاتِهِ»¹

”مالک! آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد ثنا کہ جتنی آپ کی مخلوق ہے۔ اور آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد ثنا کہ جتنی آپ کو پسند ہے۔ اور آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد ثنا کہ جتنا آپ کے عرش کا وزن ہے۔ اور آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد ثنا کہ جتنی آپ کے کلمات کو لکھنے کے لیے سیاہی درکار ہے۔“

یہ کلمات ادا کرنے پر بھی دل کو تسلی نہیں ہوئی کہ شکر ادا ہو گیا اور ذہن میں یہ بات رہ گئی ہے کہ اس سے بہتر بھی کچھ کلمات آپ ﷺ سے منقول ہوں گے۔ خیر اس وقت تو ذہن میں وہ کلمات نہیں آئے لیکن بعد میں آپ ﷺ کی سجدے کی ایک دعائیں وہ مطلوبہ کلمات مل گئے کہ جس کے الفاظ یہ ہیں:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ وَبِكَ

¹ صحیح مسلم، کتاب الذِّكْرِ وَالِدُعَاءِ وَالْتَوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ، بَابُ التَّسْبِيحِ أَوَّلُ النَّهَارِ وَعِنْدَ النَّوْمِ، 4/2090

مِنْكَ لَا أَحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ¹
 ”پروردگار! آپ کے غضب سے پناہ چاہتا ہوں آپ کی رضا کی سزا
 سے پناہ چاہتا ہوں آپ کے درگزر کی۔ اور آپ سے پناہ چاہتا ہوں آپ کی۔
 [میں آپ کی کیا ثنائیاں کروں]، میں آپ کی ثنائیاں نہیں کر سکتا، آپ کی ثناتو
 وہ ہے جو آپ خود کریں۔“

انسان جو کہ ایک ٹشو پیپر مانگنے پر اس کے دینے والے کا شکر گزار ہو سکتا ہے، وہ اپنے
 خالق کا شکر گزار کیسے نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا بشرطیکہ وہ خالق کے احسانات کے بارے بھی
 ایسے ہی سوچنا شروع کر دے جیسے کہ وہ انسانوں کے احسانات کے بارے غور کرتا ہے۔
 انسانوں میں تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی اچھے انسان سے چھوٹی سی بھلائی کر دیں تو ساری
 زندگی آپ کے احسان کے زیر بار رہتا ہے اور اسے یہ غم گھلائے رہتا ہے کہ کسی طرح
 اپنے محسن کے کام آ سکے، مگر یہ اچھے انسان بھی اچھے بندے نہیں ہیں کیونکہ یہ اپنے
 پروردگار کے بارے ایسے جذبات نہیں رکھتے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم
 پروردگار کے احسانات کو اس کی ذمہ داری سمجھتے ہیں جیسا کہ بچے اپنے والدین کے
 احسانات کو ان کی ذمہ داری سمجھ لیتے ہیں اور عموماً اسی سوچ کے نتیجے میں والدین کے شکر
 گزار نہیں ہوتے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اگر والدین نے کیا ہے تو کیا ہے، سارے والدین
 کرتے ہیں، یا یہ تو ان کی ذمہ داری تھی وغیرہ۔

یقیناً شکر اللہ کی نعمت ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ سے اُس کی اس نعمت کا سوال
 کریں کہ وہ ہمیں شکر گزار بنائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ [إبراهيم: 7]

”اور یاد رکھو تمہارے رب نے یہ اعلان فرمایا ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں
 تمہیں [نعمتوں میں] بڑھا دوں گا۔“

اللہ سے شکر کی نعمت کی توفیق مانگنے کے لیے ہر نماز کے بعد وہ دعا کرنی چاہیے جو
 آپ ﷺ کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

¹ صحیح مسلم، کتاب الصلوة، باب مَا يُقَالُ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، 352/1

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَ بِيَدِهِ، وَقَالَ: «يَا مُعَاذُ، وَاللَّهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ، وَاللَّهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ»، فَقَالَ: «أَوْصِيكَ يَا مُعَاذُ لَا تَدَعَنَّ فِي ذُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ تَقُولُ: اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»¹

”معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا: اے معاذ! اللہ کی قسم، مجھے اللہ کے لیے آپ سے محبت ہے۔ اللہ کی قسم، مجھے اللہ کے لیے آپ سے محبت ہے۔ اس کے بعد آپ نے کہا: اے معاذ! میں آپ کو وصیت کرتا ہوں کہ کسی بھی نماز کے بعد یہ کلمات کہنا ہر گز نہ چھوڑنا۔ اے اللہ! اپنا ذکر، اپنا شکر اور اپنی اچھی عبادت کرنے پر میری مدد فرما۔“

صبر کا مقام

صبر اور شکر دو ایسے رویے ہیں جو مسلمان کی کل زندگی کو محیط ہیں۔ انسان دو حالتوں میں سے کسی حالت سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو وہ کسی نعمت یا آسائش میں ہو گا تو اس صورت میں اس پر اپنے رب کا شکر واجب ہے، یا پھر وہ کسی مصیبت یا آزمائش میں ہو گا تو اس صورت میں اس پر خالق کے فیصلے پر صبر لازم ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ صُهَيْبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَخِيذٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ مَسْرَاءٌ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَاءٌ، صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ»²

”حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے ہر عمل میں خیر ہی خیر ہے۔ اور یہ رتبہ مومن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اگر بندہ مومن کو کوئی خوشی پہنچتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے تو یہ خوشی اس کے لیے خیر بن جاتی ہے اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ تکلیف بھی اس کے لیے

¹ سنن أبي داود، باب تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الْوُثْرِ، بَابٌ فِي الْإِسْتِغْفَارِ، 86/2

² صحيح مسلم، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالزَّوَالِقِ، بَابُ الْمُؤْمِنِ أَمْرُهُ كُلُّهُ خَيْرٌ، 2295/4

خیر بن جاتی ہے۔“

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ جس پر آزمائش نہ آتی ہو البتہ آزمائش کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے کیونکہ یہ دنیا جنت نہیں ہے بلکہ آزمائش کا گھر ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کی آزمائش جسمانی ہے اور کسی کی ذہنی۔ غریب کی آزمائش مالی (financial) ہو اور امیر کی نفسی (psychological) ہو کہ اسے ڈپریشن کے سبب نیند کی دوا لینی پڑتی ہو۔ کوئی ذاتی آزمائش سے گزر رہا ہوتا ہے اور کسی کو اولاد کی آزمائش سہنی پڑ رہی ہوتی ہے۔ اس لیے ایک بندہ مومن کے دل میں ایسا خیال نہیں آنا چاہیے کہ اللہ نے تمام آزمائش اسی کے لیے رکھ دی ہے کیونکہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی کی آزمائش زیادہ ہے اور کسی کی کم لیکن یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ آزمائش صرف غریب کے لیے ہے جبکہ امیر اس میں مبتلا نہیں ہے۔ حقیقی فرق یہ ہے کہ دنیا دار کے لیے آزمائش ایک مصیبت ہے جبکہ بندہ مومن کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ دنیا دار آزمائش سے تنگ آ کر خود کشی کا سوچے گا جو کہ حرام ہے جبکہ بندہ مومن آزمائش میں صبر کر کے اللہ کے ہاں درجات پالے گا۔ بندہ مومن کے لیے ادنیٰ درجے کی تکلیف مثلاً راستے میں ٹھوکر لگ جانا بھی اس کے صبر کی وجہ سے اس کے گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ، مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ، وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ»¹
 ”جب بندہ مومن کسی پریشانی، بیماری، رنج و ملال، غم، دکھ اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسے کاشا بھی چبھے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔“

اور مومن کی جس قدر آزمائش بڑی ہوگی، اس قدر اس کا اجر و ثواب اور درجہ بھی اللہ کے بڑا ہوگا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

¹ صحیح البخاری، کتاب المَرَضَى، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَفَّارَةِ الْمَرَضِ، 114/7

«عَظُمَ الْجَزَاءُ مَعَ عَظَمِ الْبَلَاءِ»¹

”بڑی آزمائش بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔“

اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم آزمائش سے بچ نہیں سکتے لہذا دو قسم کے رویے سامنے آتے ہیں۔ یا تو انسان آزمائش کا مقابلہ کرے اور صبر کے ذریعے درجات پالے یا پھر بے صبری کا مظاہرہ کرے اور اپنے خالق کی ناشکری کرے تو اس صورت میں اس کی آزمائش تو ٹلنے والی نہیں لیکن وہ اپنی دنیا کے ساتھ اپنی آخرت کا بھی ضرور نقصان کر لیتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ایک ایسی عورت سے گزر ہوا جو اپنے فوت ہونے والے بیٹے کی قبر کے پاس بیٹھی آواز سے رو رہی تھی تو آپ نے کہا:

«اتَّقِي اللَّهَ وَاصْبِرِي» قَالَتْ: إِلَيْكَ عَيِّي، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَبِّ بِمُصِيبَتِي، وَلَمْ تَعْرِفْهُ، فَقِيلَ لَهَا: إِنَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَتَتْ بَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بَوَائِينَ، فَقَالَتْ: لَمْ أَعْرِفْكَ، فَقَالَ: «إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدَمَةِ الْأُولَى»²

”اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور صبر کرو۔ چونکہ وہ خاتون آپ کو جانتی نہیں تھی لہذا اس نے جواب میں کہا: آپ اپنے کام سے کام رکھیں کیونکہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے، آپ کو اس کے درد کا احساس نہیں ہے۔ پس اس خاتون کو بعد میں بتایا گیا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں تو وہ آپ کے پیچھے آپ کے دروازے تک آئی اور اس نے آپ کے دروازے پر کوئی دربان نہیں دیکھا۔ پس اس خاتون نے آپ سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ کو جانتی نہیں تھی۔ آپ نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اصل صبر تو وہی ہے جس کا اظہار پہلی مرتبہ صدمہ پہنچنے پر ہوتا ہے [ورنہ بعد میں صبر تو سب کو آہی جاتا ہے کہ اس کے بغیر انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے]۔“

پس صبر میں یہ بات بہت اہم ہے کہ پہلی مرتبہ جب انسان کو کسی نقصان، آزمائش، بیماری، حادثے اور وفات وغیرہ کی کوئی خبر ملی ہے تو اس کے رد عمل میں اس کی زبان سے

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، 1338/2

² صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبر، 9/2

کیا الفاظ جاری ہوئے ہیں؟ ورنہ تو سال بعد تو ماں بھی اپنے بیٹے کی وفات پر روپیٹ کر خاموش ہو ہی جاتی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے اور انسان میں ایک خاص مقدار سے زیادہ دکھ کے اظہار کی استطاعت ہوتی بھی نہیں ہے۔

بعض اوقات ہم دنیاوی آزمائش پر تنگ آکر ناشکری کا ارتکاب کرنے لگ جاتے ہیں اور اگر ہمارے ذہن میں وہ احادیث تازہ رہیں کہ جن میں آزمائش پر آخرت میں بے حساب اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، تو یہ روایات انسان کے لیے صبر کا وہ اختیار کرنے میں ترغیب (motivation) کا باعث بن سکتی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرْصَتَ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِضِ»¹

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت والے دن جب آزمائش والوں کو ان کی آزمائش کے بدلے اجر دیا جائے گا تو اسے دیکھ کر دنیا میں عافیت میں رہنے والے یہ خواہش کریں گے کہ کاش دنیا میں ان پر اتنی آزمائش آتی کہ ان کے جسم لوہے کی قینچیوں سے چیر دیے جاتے۔“

قرآن مجید کے انداز سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنت تو محض صبر ہی کا بدلہ ہے اور آخرت میں جس نیکی پر سب سے زیادہ لوگوں کو جنت ملے گی، وہ صبر کی نیکی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ [المؤمنون:

[111]

”بے شک آج کے دن میں نے انہیں ان کے صبر کے بدلے یہ جزا دی ہے کہ وہی ہیں، جو کامیاب ہونے والے ہیں۔“

ایک اور جگہ صبر کرنے والوں پر اللہ کی طرف سے سلام بھیجا گیا ہے۔ ارشاد باری

¹ سنن الترمذی، أَبَوَابُ الزُّهْدِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 603/4

تعالیٰ ہے:

﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ [الرعد: 24]
 ”تم پر سلامتی ہو تمہارے صبر کی وجہ سے۔ پس کیا ہی خوب ہے آخرت کا گھر۔“

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جنت کے بالا خانے دنیا میں صبر کی وجہ سے ملیں گے:

﴿أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرَّةَ بِمَا صَبَرُوا﴾ [الفرقان: 75]
 ”یہی لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے جنت کے بالا خانے دیے جائیں گے۔“

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جنت اور جنت کی نعمتیں صبر کا بدلہ ہیں:
 ﴿وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا﴾ [الإنسان: 12]
 ”اور ان کے صبر کے سبب ان کا بدلہ جنت اور ریشم کا لباس ہو گا۔“
 ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ صبر والوں کو آخرت میں بے حساب نعمتیں ملیں گی:

﴿إِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: 10]
 ”محض صبر کرنے والوں کو ان کا بدلہ بے حساب دیا جائے گا۔“
 ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ اگر کسی کا ایمان ہو کہ اس پر آزمائش اللہ کی طرف سے ہی آئی ہے اور وہ اس پر صبر کرنا بھی چاہتا ہے تو اللہ عز و جل اس کے دل کو سکون عطا فرما دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ سَبِيلَهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [التغابن: 11]
 ”کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ کے حکم سے۔ اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔“
 اگر کسی وقت صبر کی ضرورت ہو اور صبر نہ ہو رہا ہو تو ان آیات کا معنی و مفہوم ذہن میں رکھتے ہوئے ورد کرے تو اللہ عز و جل صبر کی توفیق عطا فرمادیں گے، ان شاء اللہ!۔

اسی طرح انسانوں میں دو قسم کے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں کے رویوں سے تنگ ہونے کے باوجود ان سے میل جول کو ترک نہیں کرتے بلکہ صبر کی روش اختیار کرتے ہیں اور یہ مجاہدانہ مزاج ہے۔ اور دوسرے وہ جو لوگوں کی اذیت کی بنا پر ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں اور یہ صوفیانہ مزاج ہے۔ اگرچہ اسلام میں ان دونوں قسم کے رد عمل کا جواز موجود ہے لیکن پہلی صورت کو پسند کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ، وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ، وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ»¹

”وہ مومن جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی اذیت پر صبر کرتا ہے تو وہ اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا اور ان سے پہنچنے والی اذیت پر صبر نہیں کرتا۔“

بعض روایات کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص پر زیادہ آزمائش ہو تو اس کی ایک وجہ اس کی دینداری بھی ہوتی ہے یعنی دیندار شخص پر آزمائش ضرور آتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«يُنْتَلَى الْعَبْدُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ صَلَافًا، اشْتَدَّ بَلَاءُهُ، وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةً، ابْتَلِيَ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَمَا يَبْرُخُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ، حَتَّى يَنْزُكُهُ يَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ، وَمَا عَلَيْهِ مِنْ خَطِيئَةٍ»²

”انسان کی آزمائش اس کے دین کے حساب سے ہوتی ہے۔ پس اگر وہ دین میں مضبوط ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر اس کا دین نرم ہے تو اس کی آزمائش بھی نرم ہوتی ہے۔ بندہ مومن پر آزمائش آتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کے کھاتے میں کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔“

اور آزمائش میں انسان گر جاتا ہے تو اس گرنے سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ گرنا تو انسان کی زندگی کا حصہ ہے البتہ گرنے کے بعد گرا ہی رہنا تو یہ ایسا طرز عمل ہے کہ قابل

¹ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، 1338/2

² سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، 1334/2

مذمت ہے۔ گرنے کے بعد ہمت سے دوبارہ اٹھیں اور بندہ مومن کا گرنا تو ایسا ہوتا ہی نہیں ہے کہ وہ دوبارہ نہ اٹھ سکے جیسا کہ ایک روایت میں تو بندہ مومن کی عجیب مثال بیان کی گئی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَالْخَامَةِ مِنَ الزَّرْعِ، تُفْقِيئُهَا الرِّيحُ مَرَّةً، وَتَعْدِلُهَا مَرَّةً، وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالْأَزْزَةِ، لَا تَزَالُ حَتَّى يَكُونَ أَنْجِعَافُهَا مَرَّةً وَاحِدَةً»¹

”مومن کی مثال پودے کی سب سے پہلی نکلی ہوئی ہری شاخ جیسی ہے کہ ہوا یعنی آزمائش اسے کبھی جھکا دیتی ہے اور کبھی سیدھا کر دیتی ہے۔ اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت جیسی ہے کہ وہ سیدھا ہی کھڑا رہتا ہے اور آخر جب گرتا ہے تو ایک ہی جھٹکے سے اکھڑ ہی جاتا ہے۔“

ہمیں آزمائش سے اللہ کی پناہ مانگی چاہیے لیکن اگر آجائے تو پھر ثابت قدمی اور صبر کا مظاہرہ کرے اور اس بارے اللہ سے مدد طلب کرے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ آزمائش اور سختی میں یہ دعا مانگا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ لَا سَهْلَ إِلَّا مَا جَعَلْتَهُ سَهْلًا، وَأَنْتَ تَجْعَلُ الْحَزْنَ سَهْلًا إِذَا شِئْتَ»²

”یا اللہ! کچھ بھی آسان نہیں ہے سوائے اس کے کہ جسے آپ آسان بنادیں۔ اے اللہ! آپ جس کو چاہتے ہیں آسان بنا دیتے ہیں۔“

ہمارے دوست عظیم الرحمن عثمانی صبر اور شکر کو جمع کرنے کے بارے ایک خوبصورت واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”کوئی پندرہ سال قبل میرے بڑے بھائی کا ایک زبردست ایکسیڈنٹ ہوا جس میں اس کے جسم کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ ایک سال تک مختلف آپریشن ہوتے رہے اور جسم میں لوہے کی پلیٹیں ڈالی گئیں۔ اب وہ الحمد للہ الحمد للہ الحمد للہ پوری طرح تندرست ہے مگر اس دوران ایک قیامت پورے گھر پر

¹ صحیح بخاری، کتابُ المَرْضَى، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَفَّارَةِ الْمَرْضِ، 114/7

² محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُسْتِي، الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان، مؤسسة الرسالة،

بيروت، الطبعة الأولى، 1408 هـ - 1988 م، 255/3

گزرتی رہی۔ میں بھائی کے ساتھ ہی زیادہ وقت گزارتا تھا۔ ہسپتال میں جب شدت تکلیف سے وہ چیخیں مارتا تو میں بھی اس تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے نادانستہ اپنا جسم بری طرح نوچ لیتا۔ اس دوران بہت کچھ سیکھنے اور بہت کچھ غور کرنے کو بھی ملا۔ ایک روز بھائی کے پاس بیٹھا تھا اور اللہ پاک کی بیشمار نعمتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ بھائی کہنے لگے کہ اللہ رب العزت کی ان گنت نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت بیہوش ہو جانا ہے۔ میں نے حیرت سے استفسار کیا، بیہوش ہو جانا کیسے نعمت ہے؟ انہوں نے بتایا کہ جب تکلیف ایک حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو وہ خود بخود بیہوش ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اللہ پاک اپنے بندے کو اس کی حد سے زیادہ تکلیف میں نہیں ڈالتا اور حد گزرنے پر اسے درد سے عارضی طور پر بے نیاز کر دیتا ہے۔ اللہ اکبر! کتنی ہی بیشمار نعمتیں ایسی ہیں جنہیں ہم نعمتیں سمجھتے ہی نہیں۔ اسی دوران ایک آپریشن میں بھائی کے ہاتھ کی سرجری کی گئی۔ جب ہوش میں آئے تو ہاتھ مکمل کام کر رہا تھا مگر کوئی نرس دبی رہ جانے کی وجہ سے محسوس کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ لہذا اب نہ تو وہ کھولتی ہوئی گرم چائے اور تازہ برف میں کوئی فرق کر سکتا تھا، نہ ہی اسے یہ احساس ہوتا کہ کسی چیز کو اٹھانے کے لئے کتنی طاقت لگانا ضروری ہے؟ چنانچہ کبھی تو کسی چیز کو اتنی طاقت سے اٹھاتا کہ وہ دور جا گرے اور کبھی کسی ہلکی سی چیز کو اٹھا کر پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ سرجن نے دوبارہ آپریٹ کیا تو الحمد للہ! حساسیت ہاتھ میں واپس لوٹ آئی۔ اللہ اکبر! اس واقعہ سے قبل میں نے کبھی خیال بھی نہ کیا تھا کہ لمس محسوس کرنا اتنی عظیم نعمت ہے۔ میرے دوستو! اپنے رب کا کثرت سے شکر کیا کرو۔ ان نعمتوں کا جن کو تم جانتے ہو اور ان کا بھی جو تمہاری فہم سے اوچھل ہیں۔ شکایتیں نہ کرو، ناشکری نہ کرو، قدر کرنا سیکھو ان لاتعداد آسائشوں اور نعمتوں کا جنہیں بن مانگے تمہارے رب نے تمہیں عطا کر رکھا ہے۔ کم از کم دن میں ایک بار تودل سے پکارو... الحمد للہ!“

حیا کا وصف

انسانی اخلاق دو قسم پر ہیں۔ ایک فطری اور دوسرا دینی۔ حیا ایک ایسا وصف ہے کہ جو فطری اور دینی دونوں قسم کے اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ اگر انسان میں حیا نہ ہو تو نہ اس میں فطرت باقی ہے اور نہ ہی دین موجود ہے۔ حیا دار انسان میں لازماً ایمان ہو گا اور بے حیا میں کبھی ایمان نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«الْحَيَاءُ وَالْإِيمَانُ قُرْنَانَا جَمِيعًا، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الْآخَرُ»¹

”حیا اور ایمان دونوں ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ پس اگر ان میں سے ایک اٹھ

جائے تو دوسرا بھی اٹھ جاتا ہے۔“

ایک شخص کسی دوسرے شخص کو جو کہ اہل ایمان میں سے تھا، حیا اختیار کرنے کی نصیحت کر رہا تھا تو اس نصیحت کرنے والے کو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«دَعُهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ»²

”اسے چھوڑ دو کہ حیا تو ایمان کا حصہ ہے۔“

یعنی اب اہل ایمان کو حیا کی نصیحت کرو گے! حیا تو خود ایمان کا ایک شعبہ ہے اور ایمان تو حیا کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ پس یا تو اسے ایمان کی نصیحت کرو یا پھر حیا کی نصیحت ترک کر دو کہ ایمان کے بعد حیا کی نصیحت کے کیا معنی؟

حیا تمام فطری اخلاق کا مادہ (substance) اور بنیاد ہے کہ اگر کسی میں حیا نہیں ہے تو اس میں انسانیت (humanity) نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی اخلاق کا مادہ ہی موجود نہیں ہے چہ جائیکہ اخلاق موجود ہوں۔ حیا کے بغیر باخلاق ہونے کا ہر تصور بے معنی اور لغو ہے۔ بے حیا شخص کچھ بھی کر سکتا ہے اور آپ اس سے کچھ بھی کرنے کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

أَبُو مَسْعُودٍ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ

¹ الحاکم، أبو عبد الله محمد بن عبد الله النيسابوري، المستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولى، 1411 - 1990، 73/1

² الموطأ، کتاب حُسْنُ الْخُلُقِ، باب مَا جَاءَ فِي الْحَيَاءِ، 1331/5

النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النَّبُوَّةِ الْأُولَى: إِذَا لَمْ تَسْتَخِي فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ»¹
 ”حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ
 لوگوں کو پچھلے انبیاء نازل ہونے والی وحی میں سے جو باتیں ملی ہیں، ان میں سے
 ایک یہ بھی ہے کہ جب تجھ میں حیا ختم ہو جائے تو جو چاہے مرضی کر لے۔“
 حیا دراصل دل کی حیات ہے۔ پس جس دل میں حیا ہو تو اس میں زندگی ہے۔ اور
 جس قدر حیا رخصت ہوتی جائے، اسی قدر دل میں ویرانی اور وحشت جگہ پکڑتی جاتی
 ہے۔ حیا ایک ایسا وصف ہے کہ جس کے نتیجے میں ہمیشہ خیر پیدا ہوتی ہے اور خیر میں ہی
 خیریت ہے، ظاہر کی بھی اور باطن کی بھی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:
 عُمَرَانُ بْنُ حُصَيْنٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الْحَيَاءُ لَا
 يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ»²
 ”حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حیا
 تو صرف خیر پیدا کرتا ہے۔“

حیا صرف عورتوں سے مطلوب نہیں ہے بلکہ حیا کا مطالبہ مردوں سے بھی ہے۔ اور
 حیا کا تعلق صرف لباس سے نہیں ہے بلکہ حیا کا تعلق انسان کی گفتگو اور عمل سے بھی
 ہے۔ بے حیائی صرف یہ نہیں ہے کہ انسان اپنا ستر کھلا رکھے بلکہ بے حیائی یہ بھی ہے کہ
 انسان اپنے جیسے انسانوں کو شرمندہ کرنے کا باعث بنے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے گھر میں جب بعض صحابہ کی دعوت کی جاتی تھی تو دعوت
 کھانے کے بعد وہ کافی دیر آپ ﷺ کے گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے کہ جس
 سے آپ کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی تھی لیکن آپ ﷺ حیا کے سبب سے ان کو جانے کا
 نہیں کہتے تھے یہاں تک کہ اس بارے قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں۔³

¹ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب إِذَا لَمْ تَسْتَخِي فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ، 29/8

² الأدب المفرد: ص 444

³ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاءً وَلَسَكُنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْصَرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ [الأحزاب: 53]

بہر حال یہ تو حیا کے اعلیٰ مدارج ہیں لیکن کم از کم درجہ تو یہ ہے کہ اگر کسی بھائی سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اب اس کے معذرت کرنے سے پہلے ہی اس کو معاف کر دیں۔ ہمارے محلے کی مسجد کے ایک نمازی جو کہ نیک انسان تھے، ایک مرتبہ فجر کے بعد مسجد کے ہال میں اگلی صف میں ذکر و اذکار میں مصروف تھے کہ کچھ نمازی مسجد میں تاخیر سے آئے اور پچھلی صفوں میں نماز پڑھنے کے بعد انہی صاحب کی برائیوں میں مصروف ہو گئے لیکن ان غیبت کرنے والے نمازیوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ جن کی وہ غیبت کر رہے ہیں، وہ اگلی صف میں بیٹھے ہیں اور ان کی آوازیں ان تک پہنچ رہی ہیں۔ اب ان صاحب کو زور کا پیشاب آیا ہوا تھا اور وہ شوگر کے مریض بھی تھے لیکن اس لیے اپنی جگہ نہیں چھوڑ رہے تھے کہ مجھے دیکھ کر وہ لوگ شرمندہ نہ ہو جائیں کہ اسی کی تو برائیاں کر رہے تھے اور یہ اگلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ ان صاحب نے اسی تکلیف کی حالت میں کافی دیر گزار دی یہاں تک کہ وہ برائی کرنے والے مسجد سے چلے گئے اور یہ ان کے بعد مسجد سے باہر آئے۔

حیا کو اللہ کے رسول ﷺ نے دین اسلام کا کل اخلاق قرار دیا ہے۔ اگر ہم ایک لفظ میں دینی اخلاق کو جمع کرنا چاہیں تو وہ حیا کا لفظ ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لِكُلِّ دِينٍ خُلُقٌ، وَإِنَّ خُلُقَ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ»¹

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر دین کا ایک اخلاقی ضابطہ ہے اور اسلام کا اخلاقی ضابطہ حیا ہے۔“

کسی کام میں حیا شامل ہو جائے تو اس کی حیثیت خالق اور مخلوق دونوں کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے اور اگر کسی کام میں بے حیائی داخل ہو جائے تو اس کی حیثیت خالق اور مخلوق دونوں کی نگاہوں میں گر جاتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قَالَ: «مَا كَانَ

¹ البیهقی، أبو بکر، أحمد بن الحسین بن علی الخراسانی، شعب الإیمان، کتاب الحیاء، مکتبۃ الرشید للنشر والتوزیع بالریاض، الطبعة الأولى، 1423ھ-2003ء، 155/10

الْفُحْشُ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا شَانَهُ، وَلَا كَانَ الْحَيَاءُ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا زَانَهُ»

1

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کام میں بے حیائی داخل ہو جائے تو اس کی شان کم ہو جاتی ہے اور جس کام میں حیاشا شامل ہو جائے تو اس کی شان بڑھ جاتی ہے۔“

شجاعت کی عظمت

شجاعت اور بہادری ایک ایسا وصف ہے جو طبعی طور انسانوں میں پسندیدہ شمار ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص بزدلی کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی اپنے آپ کو ڈرپوک کہلوانا چاہتا ہے۔ بہادری ایک ایسا وصف ہے کہ بہادر انسان کا دشمن بھی اس کے اس وصف کی قدر کرتا ہے۔ اور بزدل انسان کے قریب ترین رشتہ دار بھی اسے ناپسند کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ذات میں شجاعت کا وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: «كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ النَّاسِ، وَكَانَ أَجْوَدَ النَّاسِ، وَكَانَ أَشْجَعَ النَّاسِ» وَلَقَدْ فَزَعَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَأَنْطَلَقَ نَاسٌ قِبَلَ الصَّوْتِ، فَتَلَقَّاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاجِعًا، وَقَدْ سَبَقَهُمْ إِلَى الصَّوْتِ، وَهُوَ عَلَى فَرَسٍ لِأَبِي طَلْحَةَ عُرِيٍّ، فِي غُنْفِهِ السَّيْفُ وَهُوَ يَقُولُ: «لَمْ تُرَاعُوا، لَمْ تُرَاعُوا» قَالَ: «وَجَدْنَا بَحْرًا، أَوْ إِنَّهُ لَبَحْرٌ»²

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ایک رات اہل مدینہ آواز سن کر گھبرا اٹھے اور کچھ لوگ اس آواز کی سمت تحقیق کے لیے نکلے۔ تو انہیں راستے میں اللہ کے رسول ﷺ ملے جو کہ ان سے پہلے اس آواز کی طرف اٹھے تھے اور اب واپس آرہے تھے۔ آپ ﷺ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار تھے اور آپ کی گردن میں تلوار

¹ سنن ابن ماجہ، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ الْجَلْمِ، 280/5

² صحیح مسلم، کتاب الفضائل، بَابُ فِي تَجَاعَةِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَتَقْدِيمِهِ لِلْحَرْبِ، 1802/4

لکھی ہوئی تھی اور آپ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور آپ نے اس گھوڑے کے بارے ارشاد فرمایا کہ یہ تو سمندر ہے سمندر۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے بزدلی کو ناپسند جانا ہے بلکہ اس سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ پس ہمیں بھی بزدلی سے اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

أَنَّ سَبْنَ مَالِكٍ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ، وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ، وَضَلَعِ الدِّينِ، وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ»¹

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ یہ کہا کرتے تھے: اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں غم اور سختی سے، عاجزی اور سستی سے، بزدلی اور بخیلی سے، قرض کے بوجھ اور لوگوں کے دباؤ سے۔“

بعض اوقات شجاعت کی کمی کی وجہ سے ایک شخص کسی دینی فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً زبان سے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا ایک دینی فرض ہے لیکن انسان بہت سے مواقع پر کسی انجانے خوف اور اندیشے کے سبب یہ فرض ادا نہیں کرتا اور برائی اور شر اس کے سامنے پھیلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کی تعریف کی ہے کہ جو ہیبت اور خوف کے مقام پر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَرَجُلٌ قَالَ إِلَى إِمَامٍ جَائِرٍ فَأَمَرَهُ وَنَهَاةً فَقَتَلَهُ»²

”شہداء کے امام حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ شخص بھی شہداء کا امام ہے کہ جس نے کسی ظالم حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر زبان سے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے منع کیا اور اُس حکمران نے اس پر اُسے قتل کر دیا۔“

¹ صحیح البخاری، کتاب اللِّغَوَاتِ، بَابُ الْإِسْتِعَاذَةِ مِنَ الْجُبْنِ، 79/8

² المستدرک علی الصحیحین: 215/3

خوش مزاجی

یہ ایک ایسی سنت ہے کہ جسے ہم بھلا چکے ہیں۔ اسلام سنجیدگی سے منع نہیں کرتا لیکن خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا، اللہ کے رسول ﷺ کے اخلاق میں سے ایک اہم وصف ہے۔ اگر کوئی شخص پریشان ہو تو اس کے ساتھ کوئی مزاح کی بات کر دینا کہ اس کا ذہن بٹ جائے تو یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ»¹

”حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تیرا اپنے بھائی کو مسکرا کر دیکھنا بھی تیرے لیے صدقہ کرنے کے برابر ہے۔“

ہر وقت تیوری چڑھا کر رکھنا اور چہرے پر سرد مہری کا راج کرنا کوئی دینی حکم نہیں ہے۔ مجلس میں نبی کریم ﷺ کے چہرے پر اکثر مسکراہٹ رہتی تھی جبکہ تنہائی میں خاص طور تہجد کی نماز میں آپ ﷺ اکثر رویا کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ، قَالَ: «مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ»²

”حضرت عبد اللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکرانے والا نہیں دیکھا۔“

نہ بہت زیادہ ہنسنے والے لوگ پسندیدہ ہوتے ہیں اور نہ ہی بہت رونے والوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ اعتدال اور توازن میں ہی زندگی کا حسن اور خوبصورتی ہے۔ ہنسا اور رونا دونوں انسانی زندگی کا لازم جزو ہیں اور ان دونوں میں توازن کا ہونا ضروری ہے۔ تنہائی میں اللہ کے سامنے رونا چاہیے اور مجلس میں مخلوق کے سامنے مسکرا نا چاہیے۔

بعض مذہبی لوگوں کے چہروں پر ہر وقت کی سنجیدگی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید

¹ سنن الترمذی، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في صنائع المعروف، 339/4

² سنن الترمذی، أبواب المتأقب، باب في بشاشة النبي صلى الله عليه وسلم، 601/5

اسلام پہننے ہنسانے سے منع کرنے اور رونے رولانے کا حکم دینے والا مذہب ہے حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ چھوٹے بچوں سے بھی خوش طبعی فرمالیتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ایک چھوٹے بھائی تھے کہ جن کا نام ابو عمیر تھا اور ان کے پاس ایک چڑیا تھی اور آپ ﷺ جب بھی ہمارے گھر تشریف لاتے تو ضرور پوچھتے:

«يَا أَبَا عَمِيرٍ، مَا فَعَلَ النُّعَيْرُ»¹

”اے ابو عمیر! آپ کی چڑیا کا کیا حال ہے؟“

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ماضی کے واقعات سنتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہنستے تھے جبکہ آپ ﷺ مسکراتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ، قَالَ: قُلْتُ لِحَبَابِ بْنِ سَمُرَةَ: أَكُنْتُ تُجَالِسُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: نَعَمْ كَثِيرًا، «كَانَ لَا يَقُومُ مِنْ مُصَلَّاهُ الَّذِي يُصَلِّي فِيهِ الصُّبْحُ، أَوْ الْغَدَاةَ، حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ، وَكَانُوا يَتَحَدَّثُونَ فَيَأْخُذُونَ فِي أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، فَيَضْحَكُونَ وَيَتَبَسَّمُونَ»²

”حضرت سماک بن حرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا تو انہوں نے کہا: بہت زیادہ۔ آپ ﷺ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد سورج طلوع ہونے تک مصلے پر بیٹھے رہتے تھے اور سورج طلوع ہونے کے بعد گھر چلے جاتے۔ اور اس دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اپنے دور جاہلیت کے واقعات سناتے تھے۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اس پر ہنستے تھے اور آپ صرف مسکراتے تھے۔“

اللہ کی محبت

انسان کے عمل کا سبب اس کا ارادہ ہوتا ہے اور انسان کے ارادے کا باعث اس کے

¹ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب الکثیۃ للصحی وُقِلَ أَنْ يُؤَلِّدَ لِلزَّجَلِ، 45/8

² صحیح مسلم، کتاب المساجد ومَوَاضِعِ الصَّلَاةِ، باب فَضْلِ الْجُلُوسِ فِي مُصَلَّاهُ بَعْدَ الصُّبْحِ، 463/1

جذبات ہوتے ہیں۔ کوئی بھی نیک عمل ایسا نہیں ہے کہ جس کے کرنے کے لیے آپ کو پہلے ارادہ نہ کرنا پڑے اور کوئی گناہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے انسان ارادہ کیے بغیر بچ پائے۔ پس نیکی کرنے اور گناہ سے بچنے کے لیے پہلا قدم ارادہ کرنا ہے۔

انسان بعض اوقات اپنے کسی ارادے پر عمل کر پاتا ہے اور بعض اوقات وہ ارادہ ہی رہ جاتا ہے اور اس پر عمل کی ہمت نہیں پڑتی۔ کسی ارادے پر عمل کی وجہ اس ارادے کی محبت ہوتی ہے۔ اگر کسی کام کی محبت انسان کے دل میں ہوگی تو وہ اسے کر گزرے گا اور اگر اس کے دل میں اس کے لیے محبت نہ ہوگی تو اس کا کرنا اس کے لیے بوجھ ہوگا لہذا اسے اس کے کرنے میں مشکل پیش آئے گی۔

انسان کو گناہ کرنا اسی وقت آسان لگتا ہے جبکہ گناہ کی محبت اس کے دل میں ہو۔ اور اگر گناہ کی نفرت اس کے دل میں ہوگی تو گناہ کرنا اس کے لیے بوجھ سے کم نہ ہوگا۔ اسی طرح انسان کو نیکی کرنا اسی وقت آسان لگتا ہے جبکہ نیکی کی محبت اس کے دل میں ہو۔ اور اگر نیکی کی محبت اس کے دل میں نہ ہوگی تو نیکی اس کے لیے بوجھ بن جائے گی۔ اگر نماز پڑھنا آپ کو آسان لگتا ہے تو نماز کی محبت آپ کے دل میں موجود ہے اور اگر نماز پڑھنا آپ کو بوجھ معلوم ہوتا ہے تو نماز کی محبت آپ کے دل میں نہیں ہے۔

پس نیکی کرنے اور گناہ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت دل میں ہو۔ اور نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت اسی وقت دل میں پیدا ہوگی جبکہ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو چکی ہو۔ پس اللہ کی محبت ہماری ہر نیکی کرنے کی اصل اور ہر گناہ سے بچنے کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اللہ کی محبت میں شرکت کو شرک قرار دیا ہے۔ اللہ کے علاوہ مخلوق میں سے کسی سے بھی اتنی محبت رکھنی جائز نہیں ہے کہ جتنی اللہ سے ہونی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ [البقرة: 165]

”اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں کہ جو اللہ کے غیر سے ایسے محبت رکھتے ہیں کہ جیسا اللہ سے محبت رکھنی چاہیے جبکہ اہل ایمان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ سب

سے زیادہ محبت اللہ ہی سے رکھتے ہیں۔“

پس اللہ کی محبت ہی وہ قوت محرکہ (driving force) ہے جو نیکی کو آپ کے لیے آسان بنا دیتی ہے اور گناہ کو مشکل۔ اور اللہ کی محبت کا پیدا کرنا تزکیہ کی طرف پہلا قدم ہے۔ اور یہی محبت ہے جو کہ اخلاق حسنہ کو محبوب بنا دیتی ہے اور رذائل نفس کو مبغوض۔ یہی محبت ہے جو آپ سے نیکی کروا لیتی ہے اور گناہ چھڑوا دیتی ہے۔ یہ محبت اگر سچی ہو تو بہت قیمتی متاع ہے، چاہے آپ کتنے ہی گناہ گار کیوں نہ ہوں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْخَطَّابِ، أَنَّ رَجُلًا عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اسْمُهُ عَبْدَ اللَّهِ، وَكَانَ يُلْقَبُ حِمَارًا، وَكَانَ يُضْحِكُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَلَدَهُ فِي الشَّرَابِ، فَأَتَى بِهِ يَوْمًا فَأَمَرَ بِهِ فَجُلِدَ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ: اللَّهُمَّ الْعَنَهُ، مَا أَكْثَرَ مَا يُؤْتِي بِهِ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا تَلْعَنُوهُ، فَوَاللَّهِ مَا عَلِمْتُ إِنَّهُ يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ»¹

”حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں ایک شخص تھا کہ جس کا نام عبد اللہ تھا لیکن لوگ مذاق میں اسے گدھا کہتے تھے۔ وہ شخص اللہ کے رسول ﷺ کو بہت ہنسایا کرتا تھا حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ اس پر شراب کی حد بھی نافذ فرما چکے تھے۔ پس ایک دن اسے شراب کی حالت میں آپ ﷺ کی مجلس میں لایا گیا اور آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ تو صحابہ میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ اس پر لعنت کرے کہ کتنی بار آپ ﷺ کی مجلس میں شراب پینے پر لایا گیا ہے۔ تو اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے کہا کہ اس شخص پر لعنت نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہے۔“

اب یہ کیسے معلوم ہو کہ میرے دل میں جو اللہ کی محبت ہے، وہ سچی ہے یا نہیں۔ اگر تنہائی میں اللہ کی یاد آئے تو آنکھیں اپنے رب کے دیدار کی پیاس میں نم ہو جائیں یا دل

¹ صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب مَا يَكْرَهُ مِنْ لَعْنِ شَارِبِ الْخَمْرِ، 158/8

اپنے مالک سے ملاقات کے لیے بے چین ہو جائے تو یہ محبت سچی ہے ورنہ تو ابھی ایک دعویٰ ہے کہ جسے حقیقت بنانے کی ضرورت ہے۔

تقویٰ کا لباس

تقویٰ کا مفہوم

تقویٰ کا لفظ وقایہ سے بنا ہے کہ جس کا معنی ڈھال ہے۔ ڈھال میدان جنگ میں دشمن کے وار سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اور تقویٰ بھی دراصل اللہ کا وہ ڈر اور خوف ہے کہ جس کے ذریعے انسان شیطان کے مکر و فریب اور چالوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اہل علم کا اس بارے اختلاف ہے کہ تقویٰ دل کا فعل ہے یا اعضا کا۔ تقویٰ کوئی جذبہ ہے کہ جو دل میں ہوتا ہے یا یہ ایک رویہ ہے کہ جس کا اظہار انسان کے عمل سے ہوتا ہے؟ کتاب و سنت کی نصوص میں تقویٰ کو جذبہ اور رویہ دونوں طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ تقویٰ دراصل دل کے افعال میں سے ایک فعل ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«التَّقْوَى هَاهُنَا وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ»

”تقویٰ یہاں ہوتا ہے اور یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ تین مرتبہ اپنے سینے کی طرف اشارہ فرما رہے تھے۔“

اور دل میں جب یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا اظہار لازماً انسان کے اعضا سے ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مجھے سامنے موجود اپنے بچے پر پیار آئے اور میں اس کی طرف اپنے ہاتھ نہ بڑھاؤں۔ جب بھی مجھے کسی سے محبت محسوس ہوتی ہے یا کسی سے ڈر لگتا ہے تو میرے اعضا سے اس محبت اور ڈر کا اظہار ہو کر رہتا ہے۔ پس یہی معاملہ تقویٰ کا بھی ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دل میں اللہ کا ڈر اور خوف ہو اور اعضا سے اس کا اظہار نہ ہو رہا ہو۔ جس کے دل میں تقویٰ ہو گا تو اس کے رویوں میں بھی لازماً تقویٰ ہو گا۔ پس تقویٰ کا تعلق دل کے علاوہ عمل سے بھی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

[المائدة: 2]

”اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔“

اس آیت مبارکہ میں تقویٰ سے مراد تقویٰ والے اعمال ہیں یعنی وہ اعمال کہ جن کی بنیاد اللہ کا ڈر اور خوف ہو۔ اگر آپ کسی بری عادت کو اللہ کے ڈر کی وجہ سے ترک کر دیتے ہیں تو یہ تقویٰ ہے۔ کس بری عادت کو تو اللہ کی محبت میں بھی ترک کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کی ذات سے اس لیے ڈرایا گیا ہے کہ انسان خوف کی کیفیت میں زیادہ مفید (productive) عمل کرتا ہے جیسا کہ ماہرین نفسیات کا کہنا بھی یہی ہے۔ انسان کے عمل اور رویے میں کتنا تقویٰ ہونا چاہیے، تو اس بارے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ

مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: 102]

”اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو و جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہر گز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ فرمانبردار ہو۔“

اب اس ڈرنے سے مراد صرف دل میں ڈرنا نہیں ہے بلکہ ایسا ڈر نا ہے کہ جس کا اثر انسان کے اعمال پر اس قدر ہو کہ وہ ہر حال میں اللہ کی فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ وہ حالت کہ جس میں انسان اللہ کی معصیت اور نافرمانی میں ہو، تقویٰ کی حالت نہیں ہوتی۔ اور اللہ عزوجل نے ہم سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جب ہماری موت واقع ہو تو اس وقت ہمیں تقویٰ کے حال میں ہونا چاہیے۔ اور تقویٰ کا حال کیا ہے؟ کہ اللہ کی فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ انسان جب بھی اللہ کے کسی حکم کو پورا کر رہا ہو مثلاً نماز پڑھ رہا ہے، تلاوت کر رہا ہے، ذکر کر رہا ہے، حج و عمرہ کر رہا ہے، زکوٰۃ و صدقہ ادا کر رہا ہے، ویلفیئر کا کام کر رہا ہے، دعوت و تبلیغ کا حکم پورا کر رہا ہے، ظالم کافروں سے جہاد کر رہا ہے، تو وہ تقویٰ کے کسی نہ کسی حال میں ہوتا ہے۔

تقویٰ کی اہمیت

تقویٰ کا لفظ قرآن مجید میں نو مرتبہ نقل ہوا ہے جبکہ تیسرے مرتبہ ان کا بیان ہے کہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے یا جنہیں تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اور قرآن مجید میں 69 مرتبہ امر کے صیغہ میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور قرآن مجید میں 53 مقامات ایسے ہیں کہ جہاں متقین کی صفات یا ان کے مقام اور مرتبے کا بیان ہے۔ ان اعداد و شمار سے قرآن مجید کی نظر میں تقویٰ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہر نبی نے اپنی قوم کو تقویٰ کی وصیت کی ہے۔ ہر نبی کی دعوت کے دو بڑے موضوع رہے ہیں: ایک اللہ کی عبادت کرنا کہ جسے ہم توحید بھی کہہ دیتے ہیں اور دوسرا اللہ ہی کا تقویٰ اختیار کرنا۔ اللہ عز و جل ہی کی عبادت کے بعد، تقویٰ اختیار کرنے کا حکم، قرآن مجید کے بڑے موضوعات میں سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنْ اتَّقُوا اللَّهَ﴾ [النساء: 131]

”اور ہم نے ان لوگوں کو بھی وصیت کی کہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمہیں بھی یہ وصیت کر رہے ہیں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔“

اسی طرح انبیاء کی دعوت کا بنیادی نکتہ عبادت کے علاوہ تقویٰ بھی رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 106]

”جب ان سے ان کے بھائی نوح علیہ السلام نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 124]

”جب ان سے ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمُ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 142]
 ”جب ان سے ان کے بھائی صالح عَلِيہِ السَّلَام نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمُ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 161]
 ”جب ان سے ان کے بھائی لوط عَلِيہِ السَّلَام نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

پس نبیوں کے تربیتی نظام اور قرآن مجید کے متعین کردہ راہ سلوک میں تقویٰ ہی ابتدا انتہا ہے۔ تقویٰ کی ابتدا یہ ہے کہ انسان فرائض کا اہتمام کرے اور حرام کاموں سے اجتناب کرے۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ شبہات سے بھی بچے اور دینی شعائر کی بھی تعظیم کرے۔ قرآن مجید کے بیان کردہ راہ سلوک کا یہ ابتدائی پتھر بھی ہے اور انتہائی منزل بھی۔ قرآن مجید کا کل راہ سلوک یہی تقویٰ ہے اور تقویٰ کا کل مقصود یہ ہے کہ متقی بن جائے۔ اب ہم لوگوں کو غوث، قطب، ابدال اور قلندر بنانے میں لگے ہیں کہ جن کا ذکر نہ تو قرآن مجید میں ہے اور نہ ہی احادیث میں۔ اور جن مقامات سلوک کا ذکر قرآن مجید میں ہے تو ان کی طرف بالکل بھی توجہ نہیں ہے۔ پس تصوف کے نام پر کچھ لوگوں نے قرآن مجید کے متوازی ایک نظام تربیت قائم کیا ہے کہ جس میں لوگ غوث، قطب، ابدال اور قلندر تو بنتے ہیں لیکن مریدوں کو مومن، محسن، متقی، عباد الرحمن وغیرہ بنانے کی فکر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید جہاں اپنے مقامات سلوک کا تذکرہ کرتا ہے، وہاں ان مقامات کو حاصل کرنے کے لیے رستے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ قرآن مجید نے جہاں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں کثرت سے متقین کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں کہ ان صفات کے ساتھ متصف ہو کر تم اس مقام بندگی پر فائز ہو سکتے ہو، کہ جو بندگی کاسب سے پہلا مقام بھی ہے اور سب سے اعلیٰ مقام بھی۔

قرآن مجید نے تقویٰ کا اس قدر کثرت سے حکم دیا ہے کہ اگر سفر کے لیے گھر سے نکلے تو ذرا راہ کے ساتھ ساتھ تقویٰ کی بھی وصیت کر دی۔ زور راہ سے مراد وہ ضروری اشیا

ہیں کہ جن کی ایک مسافر کورستے میں ضرورت پڑتی ہے۔ اگر آپ کو کہیں بھی سفر پر جانا ہے تو رستے کے لیے سامان تو باندھنا پڑتا ہے۔ اور رستے کے اس سامان میں اللہ عزوجل نے تقویٰ کو بھی شامل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ﴾ [البقرة: 197]

”اور [حج کے سفر میں] زادِ راہ لے لیا کرو جبکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔“

اسی طرح اگر کہیں انسان کے لباس کا تذکرہ آیا کہ اللہ عزوجل کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت لباس بھی ہے کہ انسان اس نعمت کے ساتھ اپنی زندگی کو خوبصورت بناتا ہے تو ساتھ میں ہی بہترین لباس، تقویٰ کو قرار دے دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِي سَوَاتِكُمْ وَرِيثًا وَلِبَاسُ

التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ﴾ [الأعراف: 26]

”اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے کہ جس سے تم اپنی شرم گاہوں کو چھپاتے ہو اور زینت حاصل کرتے ہو لیکن تقویٰ کا لباس تو وہ تو بہت ہی بہتر ہے۔“

تقویٰ کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح لباس تمہارے وجود کو ڈھانپ لیتا ہے اور انسان دن اور رات ہر دو اوقات میں لباس پہنے ہوتا ہے، اسی طرح تقویٰ کو بھی اپنا لباس بنالو کہ ہر حال میں تقویٰ کی چادر میں تمہارا نفس لپٹا ہوا ہو۔ جس طرح لباس تمہارے وجود سے جدا ہو تو تمہیں بے چینی شروع ہو جاتی ہے تو اسی طرح تقویٰ اگر تمہارے دل سے نکل جائے تو تم اضطراب کی کیفیت میں آ جاؤ۔

اللہ عزوجل کو ہم سے محض نیکی مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسی نیکی مطلوب ہے کہ جو تقویٰ کے ساتھ ہو۔ تقویٰ کے بغیر نیکی محض ایک رسم رہ جاتی ہے کہ جس سے انسانی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی نماز، روزہ، صدقہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ، تلاوت، ذکر، دعوت اور تبلیغ وغیرہ جیسے نیک اعمال آپ کی شخصیت میں تبدیلی لے کر آئیں تو یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ آپ ہر نیک عمل کی بنیاد تقویٰ کو بنا لیں۔ تقویٰ کسی بھی نیک عمل کی روح ہے اور تقویٰ کے بغیر نیکی ایسے ہی ہے جیسا کہ

روح کے بغیر مردہ جسم۔ تقویٰ دراصل عبادت کا ایک ایسا حال ہے کہ اگر وہ حاصل ہو جائے تو انسان کی عبادت قبولیت کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ اللہ کے لیے جانور ذبح کرنا کہ جسے ہم قربانی کہتے ہیں، ایک بہت بڑا نیک عمل ہے جو کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر پوری دنیا میں ذوق و شوق سے پورا کیا جاتا ہے۔ اور اس بارے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾ [الحج:

[37]

”اللہ عزوجل کو جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقویٰ پہنچتا ہے جو تم میں ہوتا ہے۔“

جانور کی گردن پر چھری پھیرتے وقت انسان یہ عزم کرے کہ جس طرح اس جانور کو اللہ کے لیے قربان کر دیا، اسی طرح اپنی ان خواہشات کو بھی اللہ کے لیے قربان کر دوں گا جو اس سے دور کرنے کا سبب بنتی ہوں۔ اور آج اگر اس جانور کا خون اللہ عزوجل کی خاطر بہایا ہے تو کبھی اللہ عزوجل کے لیے اپنا خون دینے کی ضرورت بھی پڑی، مثلاً جہاد وغیرہ میں، تو اسی طرح پیش کر دوں گا کہ جیسے اس جانور کا خون پیش کیا۔ تو یہ وہ جذبات اور سوچیں ہیں جو نیکی میں تقویٰ کو شامل کر دیتے ہیں۔ اور اگر قربانی کے اس عظیم عمل میں یہ سوچ غالب ہو کہ اس کا گوشت اتنے دنوں تک گھر کے فریزر میں اسٹاک کیا جاسکتا ہے تو یہ صرف رسم قربانی ہے کہ جس کی روح غائب ہے۔ اور قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ تو ہلا دینے والی ہے کہ اللہ عزوجل تو نیک عمل قبول ہی اس سے کرتے ہیں کہ جو اس نیک عمل میں تقویٰ رکھتا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ [المائدة: 27]

”اللہ عزوجل تو محض متقین سے ہی [نیک اعمال] قبول کرتے ہیں۔“

اور اللہ عزوجل کے ہاں جو مقام اور مرتبہ طے ہوتا ہے تو اس کا واحد معیار تقویٰ ہے۔ اللہ عزوجل کے ہاں فضیلت اور مقام کا معیار نہ تو کسی کا پیر طریقت ہونا ہے اور نہ ہی کسی کا قطب عالم ہونا، بلکہ اس کا متقی ہونا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنْ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقَاكُمْ﴾ [الحجرات: 13]

”بے شک اللہ عزوجل کے ہاں تم میں سے سب سے زیادہ مقام اور مرتبہ والا وہ ہے کہ جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔“

تقویٰ کے درجات

تقویٰ کے دو درجات ہیں۔ ایک بنیادی اور دوسرا انتہائی۔ بنیادی درجہ تو یہ ہے کہ انسان فرائض پر عمل پیرا ہو اور حرام سے اجتناب کرے۔ جو شخص بھی فرائض کو پورا کر رہا ہے اور حرام سے بچ رہا ہے تو وہ متقی ہے۔ اگر فرائض کی پابندی اور حرام سے اجتناب نہیں ہے تو پھر تقویٰ نہیں ہے، چاہے ساری رات سجدے کی حالت میں پڑا رہے اور سارا دن بھوکا پیاسا رہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا قول ہے:

«لَيْسَ تَقْوَى اللَّهِ بِصِيَامِ النَّهَارِ، وَلَا بِقِيَامِ اللَّيْلِ، وَالتَّخْلِيطِ فِيمَا بَيْنَ ذَلِكَ، وَلَكِنَّ تَقْوَى اللَّهِ تَرُكُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ، وَأَدَاءُ مَا افْتَرَضَ اللَّهُ، فَمَنْ رُزِقَ بَعْدَ ذَلِكَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ إِلَى خَيْرٍ»¹

”تقویٰ یہ نہیں ہے کہ انسان دن میں روزے سے رہے یا رات بھر تہجد پڑھے یا دنوں کا کام کرے بلکہ اصل تقویٰ تو یہ ہے کہ حرام کو چھوڑ دے اور فرض کو ادا کرے۔ اور فرض کی ادائیگی اور حرام سے اجتناب کے بعد اگر کسی کو مزید نیکی کی توفیق ملے تو وہ نور علی نور ہے۔“

پس تقویٰ کا بنیادی اور لازمی درجہ تو فرائض پر عمل پیرا ہونا ہے اور حرام سے اجتناب کرنا ہے۔ جو شخص یہ دو کام نہ کرے تو بھلے وہ ہوا میں اڑ کر دکھادے تو وہ اللہ کا ولی نہیں ہے بلکہ شیطان کا ولی ہے۔ ایک شخص نماز نہ پڑھے اور چرس پیے تو فاسق و فاجر تو ہو سکتا ہے لیکن متقی نہیں۔ متقی کہلوانے کے لیے ضروری ہے کہ ارکان اسلام نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر عمل پیرا ہو اور شرک، قتل، زنا، بے حیائی، چوری، ڈکیتی، سود، رشوت، کرپشن، جھوٹ، وعدہ خلافی، شراب نوشی اور منشیات وغیرہ کے استعمال کو ترک کرنے والا ہو۔

¹ البیہقی، أحمد بن الحسين بن علي، الزهد الكبير، مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت، الطبعة الثالثة،

اور تقویٰ کا اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ انسان شبہات سے بھی بچے یعنی جس کا حرام ہونا واضح نہ ہو لیکن اس کے حرام ہونے کا شبہ لاحق ہو جائے تو اس کو ترک کر دینا بھی تقویٰ ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْحَلَالُ يَتَنَّى، وَالْحَرَامُ يَتَنَّى، وَيَتَنَّهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنْ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعَرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ: كَرَاعٍ يَزْعَى حَوْلَ الْحَيِّ، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حَيٍّ، أَلَا إِنَّ حَيَّ اللَّهِ فِي أَرْضِهِ مَحَارِمُهُ، أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتِ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ»¹

”حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور ان دونوں کے مابین کچھ امور مشتبہات میں سے ہیں کہ جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔ پس جس نے اپنے آپ کو مشتبہات سے بچا لیا تو اس نے اپنے دین کو بھی بچا لیا اور اپنی عزت کو بھی محفوظ کر لیا۔ اور جو مشتبہات میں پڑ گیا تو قریب ہے کہ وہ حرام میں بھی پڑ جائے جیسا کہ ایک چرواہا کسی چراگاہ کے گرد اپنی بکریاں چراتا ہے [تو اس کی بکریاں اس میں داخل ہو سکتی ہیں]۔ سن لو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اس کی زمین میں وہ کام ہیں کہ جنہیں اس نے حرام قرار دیا ہے۔ خبردار! انسان کے جسم میں ایک لو تھڑا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ انسان کا دل ہے۔“

پس مشتبہ امور سے بچنا تقویٰ کا اعلیٰ تر درجہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی حلال اور مباح کام کے بارے اندیشہ ہو کہ یہ حرام تک جانے کا ذریعہ بن جائے گا تو اس حلال اور مباح سے اجتناب کرنا بھی تقویٰ میں شامل ہے۔ اگر آپ کو اندیشہ ہے کہ آپ انٹرنیٹ پر بیٹھیں گے تو اللہ کی حدود میں داخل ہو جائیں گے یعنی کسی فحش ویب سائٹ پر پہنچ جائیں گے تو آپ کے لیے انٹرنیٹ پر نہ بیٹھنا تقویٰ میں شامل ہے، چاہے انٹرنیٹ کے استعمال

¹ صحیح البخاری، کتابُ الإيمان، بابُ فَضْلِ مَنْ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ، 20/1

اور جائز ہونے کے فتاویٰ موجود ہوں۔ لیکن یہ سب تقویٰ وہ ہے جو اپنے لیے ہے نہ کہ دوسروں کے لیے۔ ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم بہترین تقویٰ چاہتے ہیں لیکن دوسروں کی ذات میں، اپنی ذات میں نہیں۔ اور صالح بننے کے لیے ضروری ہے کہ تقویٰ کی آئیڈیل صورتیں، میں اپنی ذات میں پیدا کر کے دکھا دوں نہ کہ دوسروں میں تلاش کرتا رہوں اور نہ ملنے پر ان کو تنقید کا نشانہ بناتا رہوں۔

قرآن مجید نے بھی تقویٰ کے گٹھے اور بڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ جب شراب کو حرام قرار دیا گیا تو اس وقت بعض مسلمانوں کو یہ اندیشہ لاحق ہو کہ جو شراب ہم نے پی لی ہے تو وہ تو ہمارے خون کا حصہ بن چکی ہے لہذا اس کی نجاست اور گندگی سے ہمارے وجود کی صفائی کیسے ممکن ہے؟ تو اس بارے ارشاد باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعُمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [المائدة: 93]

”اہل ایمان اور صالح عمل کرنے والوں پر اس بارے کوئی گناہ نہیں ہے کہ جو وہ کھاپی چکے ہیں جبکہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان اور عمل صالح میں بڑھ جائیں۔ اور پھر تقویٰ اور ایمان میں بڑھ جائیں۔ اور پھر مزید تقویٰ میں بڑھ جائیں اور درجہ احسان کو پہنچ جائیں۔ اور اللہ عز و جل درجہ احسان پر فائز ہونے والوں سے محبت کرتے ہیں۔“

تقویٰ جب اپنے اعلیٰ درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے مظاہر میں سے ایک اہم مظہر، اللہ کے شعائر کی تعظیم ہے۔ شعائر کا لفظ شعور سے بنا ہے اور اس سے مراد وہ اشیائیں کہ جنہیں دیکھتے ہی اللہ عز و جل کی ذات کا شعور حاصل ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ [الحج: 32]

”اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔“

پس شعائر سے مراد وہ اشیائیں کہ جن پر نظر پڑتے ہی اللہ یاد آجائے جیسا کہ بیت اللہ،

مسجد اور قرآن مجید وغیرہ ہیں۔ پس ان کی تعظیم کرنا بھی تقویٰ میں شامل ہے۔ اگرچہ یہ کوئی شرعی مسئلہ تو نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر میں موجود شیف میں جب کتابیں رکھے تو سب سے پہلے قرآن مجید رکھے، پھر حدیث کی کتابیں اور پھر دیگر کتب رکھے لیکن یہ ان آداب میں ضرور شامل ہے جو کہ تقویٰ کے اعلیٰ درجے کے ثمرات میں سے ہیں۔ پس بیت اللہ کی طرف اپنے پاؤں نہ پھیلانا، میز پر پڑی کتابوں میں قرآن مجید کو سب سے اوپر رکھنا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لکھے ہوئے نام کو زمین پر سے اٹھالینا اور سنبھال کر اونچی جگہ پر رکھ دینا، مسجد میں اونچی آواز سے بات نہ کرنا وغیرہ، اللہ کے شعائر کی تعظیم کرنے میں شامل ہے۔

تقویٰ کے ثمرات

قرآن مجید نے تقویٰ کے جو ثمرات بیان کیے ہیں تو وہ دنیاوی بھی ہیں اور اخروی بھی۔ متقی شخص کو ایک تو اس دنیا میں ہی کچھ انعامات کی صورت میں اس کے تقویٰ کا بدلہ دے دیا جاتا ہے اور دوسرا آخرت میں تو اس کے لیے خاص طور انعام و اکرام کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تقویٰ کے دنیاوی ثمرات میں سے یہ ہے کہ اللہ عز و جل انسان کے لیے اس کی آزمائش سے نکلنے کا رستہ اور آسانی پیدا فرمادیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (2) وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾

[الطلاق: 3]

”اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عز و جل اس کے لیے [آزمائش سے] نکلنے کا کوئی رستہ پیدا فرمادیں گے اور اس کو وہاں سے رزق دیں گے جہاں سے کہ اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾ [الطلاق: 4]

”اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عز و جل اس کے معاملے میں آسانی پیدا فرمادیں گے۔“

یہ آیات میاں بیوی میں جدائی اور طلاق کے سیاق میں بیان ہوئی ہیں۔ عموماً میاں

بیوی میں جدائی کے وقت ایک دوسرے کے حق میں صریح زیادتی ہو جاتی ہے لہذا نبھانہ ہونے کی صورت میں بہترین انداز میں علیحدہ ہو جانا تقویٰ میں شامل ہے۔ عموماً علیحدگی کی صورت میں شوہر کے گھر والے لڑکی کے جہیز کا سامان واپس نہ کریں یا شادی کی موقع پر جو تحفے تحائف لڑکی کو لڑکے والوں کے خاندان کی طرف سے دیے گئے تھے، انہیں واپس لینے کی کوشش کریں یا لڑکی والے علیحدگی کے بعد عدالت کے ذریعے بچے حاصل کر لیں اور باپ کو اپنے بچوں سے ملنے نہ دیں، تو یہ سب وہ کام ہیں جو تقویٰ کے منافی ہیں۔ اور جو شریک کار (partners) تقویٰ کے ساتھ علیحدہ ہوتے ہیں کہ لڑائی اور جھگڑے میں بھی ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے اللہ عزوجل آزمائش سے نکلنے کے رستے پیدا فرما دیتے ہیں اور ان کے دنیاوی معاملات کو ان کے حق میں آسان فرما دیتے ہیں۔

تقویٰ کے دنیاوی فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کوئی قوم تقویٰ اختیار کرتی ہے تو اللہ عزوجل اس کے لیے زمین اور آسمان کی برکات کھول دیتے ہیں اور اس کی معیشت پھلنے پھولنے لگتی ہے۔ کسی قوم کی معیشت کے بہتر ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ عزوجل اس کے لیے زمین اور آسمان کی برکات کھول دیں کہ زمین تیل، گیس اور دیگر معدنی ذخائر کی صورت میں اپنے خزانے اگل دے اور آسمان بارشوں کے ذریعے اس قوم کی نہروں اور دریاؤں کو جاری کر دے اور فصلوں اور باغات کو سونا بنا دے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک قوم دوسری اقوام کے وسائل اور ذرائع پر قبضہ کر کے اپنی معیشت کو تو بہتر بنالے لیکن دوسروں کی معیشت کا بیڑا غرق کر دے جیسا کہ کیمپنلارم میں دنیا کی کل دولت میں سے ایک بڑے حصے کا ارتکاز چند اقوام تو کجا، چند خاندانوں بلکہ چند افراد کے ہاتھوں میں ہو جاتا ہے کہ جس سے دنیا کے بڑے خطوں اور اقوام میں بدترین غربت جنم لیتی ہے۔ تقویٰ اختیار کرنے کی صورت میں اللہ عزوجل قدرتی وسائل اور ذرائع آمدن میں اضافہ فرما دیتے ہیں جو کہ معاشی خوشحالی کی حقیقی صورت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْمُرْيِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ [الأعراف: 96]
 ”اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم لازماً ان پر آسمان اور زمین کی برکات کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے انہیں اُس کے بدلے میں پکڑا جو کہ وہ کرتے تھے۔“

جہاں تک تقویٰ کے اخروی اور دینی فوائد کا تعلق ہے تو اللہ عز و جل دنیاوی اور دینی معاملات میں تقویٰ اختیار کرنے سے گناہ معاف فرمادیتے ہیں اور اجر و ثواب بڑھادیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا﴾ [الطلاق: 5]
 ”اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عز و جل اس کے گناہ دور کر دیں گے اور اس کے اجر کو بڑھادیں گے۔“

اس کے علاوہ قرآن مجید میں کئی ایک آیات ہیں کہ جن میں متقین کو صراحت کے ساتھ جنت کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا﴾ [مریم: 63]
 ”اس جنت کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے کہ جو متقی ہیں۔“
 اسی طرح قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر آخرت میں متقین کو جنت میں ملنے والے انعامات و اکرامات بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (45) ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ أَمِينٍ (46) وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (47) لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ﴾ [الحجر: 48]
 ”بے شک متقین باغات میں اور چشموں میں ہوں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ تم جنت میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اور ان کے دلوں میں جو کینہ ہو گا، اسے ہم کھینچ لیں گے اور وہ بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ انہیں اس جنت میں نہ تو کوئی تھکاوٹ طاری ہو گی اور نہ ہی وہ اس سے کبھی نکالے جائیں گے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ (51) فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (52) يَلْبَسُونَ مِنْ سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِينَ (53) كَذَلِكَ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ (54) يَدْخُلُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ (55) لَا يَذُقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ (56) فَضْلًا مِنْ رَّبِّكَ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ [الدخان: 57]

”بے شک متقین باعزت مقام میں ہوں گے۔ باغات اور چشموں میں۔ وہ باریک اور موٹا ریشم پہن کر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اسی طرح ہم موٹی آنکھوں والی حوریں ان کے نکاح میں دے دیں گے۔ وہ ان جنتوں میں ہر قسم کے پھل مانگے گئے امن کے ساتھ۔ اور وہ ان جنتوں میں کبھی موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے سوائے اس موت کے کہ جو پہلے ان پر آپچی اور ان کا رب انہیں جہنم کے عذاب سے بچالے گا۔ اور یہ سب آپ کے رب کا فضل ہے اور یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔“

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿الْأَخْلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (67) يَاعْبَادِ لَا خَوْفَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (68) الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ (69) ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ (70) يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (71) وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (72) لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ﴾ [الزخرف: 73]

”قیامت والے دن قریبی ترین دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔ اے میرے متقی بندو! آج کے دن تم پر نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی تم غمگیں ہو گے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور فرمانبردار رہے۔ [ان سے کہا جائے گا] تم اور تمہاری بیویاں جنت میں داخل ہو جاؤ کہ تم خوش کیے جاؤ گے۔ ان پر سونے کی رکابیاں اور پیالے

گھمائے جائیں گے اور ان رکابیوں اور پیالوں میں وہ ہوگا کہ جو ان کے جی چاہیں گے اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی اور تم ان جنتوں میں ہمیشہ رہو گے۔ اور یہ وہ جنت ہے کہ جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، اس کے بدلے میں کہ جو تم عمل کرتے تھے۔ تمہارے لیے اس میں کثرت سے میوے ہوں گے کہ جن میں سے تم کھاؤ گے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (15) أَخْذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ﴾
[الذاریات: 16]

”بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو ان کو ان کا رب دے رہا ہو گا تو وہ اسے لے رہیں ہوں گے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ (17) فَآكِهِينَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ (18) كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (19) مُتَّكِئِينَ عَلَى سُرُرٍ مَصْصُوفَةٍ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ﴾ [الطور: 20]

”بے شک متقین باغات اور نعمتوں میں ہوں گے۔ ان کا رب انہیں جو دے رہا ہو گا وہ اس پر خوش ہو رہے ہوں گے۔ اور ان کا رب انہیں جہنم کے عذاب سے بچالے گا۔ [اور ان سے کہا جائے گا کہ] تم کھاؤ اور پیو، جی بھر کر، اس کے بدلے میں کہ جو تم نیک عمل کرتے تھے۔ وہ بچھائے گئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم ان کے نکاح میں موٹی آنکھوں والی حوریں دیں گے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ (54) فِي مَقْعَدٍ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ [القمر: 55]

”بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ باعزت مقام میں، اپنے رب کے پاس، جو بادشاہ اور اقتدار والا ہے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ (41) وَفَوَاحٍ مِمَّا يَشْتَبُونَ (42) كُلُوا
وَأَشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (43) إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾
[المرسلات: 44]

”بے شک متقین سایوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو پھل وہ چاہیں گے،
ملیں گے۔ [اور ان سے کہا جائے گا کہ] تم کھاؤ اور پیو، جی بھر کر، اس کے
بدلے میں کہ جو تم نیک عمل کرتے تھے۔ ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ان
لوگوں کو کہ جو نیک اعمال کو خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ أُكُلُهَا دَائِمٌ
وَوَظَلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ﴾ [الرعد: 35]
”اس جنت کی مثال کہ جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ اس کے
دامن میں نہریں جاری ہیں، اس کے پھل اور سایے دائمی ہیں، یہ متقین کا
انجام ہے۔ اور کافروں کا انجام آگ ہے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ
مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِنْ حَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِنْ
عَسَلٍ مُصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ [محمد:
15]

”اس جنت کی مثال کہ جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ اس میں
ایسے پانی کی نہریں ہیں جو کبھی بدبودار نہ ہوگا، اور اس میں ایسے دودھ کی نہریں
ہیں کہ جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوگا، اور اس میں ایسی شراب کی نہریں ہیں کہ جو
پینے والوں کے لیے لذت بخش ہے، اور اس میں صاف ستھرے شہد کی نہریں
ہیں، اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل اور اپنے رب کی مغفرت ہے۔“
تقویٰ کے دینی ثمرات میں سے جنت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ انسان اللہ کا محبوب بن

جاتا ہے یعنی متقین وہ ہیں کہ جن سے اللہ محبت رکھتے ہیں اور جن سے اللہ محبت رکھے، ان کا کیا مقام ہوگا؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ [آل عمران: 76]
 ”کیوں نہیں! جس نے اپنے وعدے کو پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ عز و جل ایسے متقین سے محبت رکھتے ہیں۔“

اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تین مقامات پر اس بات کا بیان ہے کہ اللہ عز و جل متقین سے محبت رکھتے ہیں اور ہر مقام پر یہ بیان ایفائے عہد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ [التوبة: 4]
 ”پس تم ان [یعنی وعدہ نہ توڑنے والے مشرکین] سے کیے جانے والے وعدوں کو ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ عز و جل متقین سے محبت رکھتے ہیں۔“

ویسے تو اللہ کے ہر حکم میں تقویٰ کو ملحوظ رکھنا چاہیے لیکن قرآن مجید کی نص سے اشارتاً معلوم ہو رہا ہے کہ جو لوگ اپنے عہد (commitment) کو پورا کرنے میں اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ہر حال میں وعدہ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہی صفت انہیں اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے۔ یہی مضمون سورۃ توبہ، آیت 7 میں بھی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں تقویٰ کے دینی ثمرات میں اللہ کی معیت کا بھی ذکر ہے یعنی متقین کو اللہ کا ساتھ نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انسان اکیلے کوئی کام کرتے ہوئے گھبراہٹ یا وحشت محسوس کرتا ہے کہ تنہائی بعض اوقات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اور اگر اسے کوئی اچھا ساتھی اور دوست میسر آ جائے تو اس کی گھبراہٹ یا وحشت جاتی رہتی ہے۔ تو متقین وہ ہیں کہ جنہیں ہر لمحے اللہ کے ساتھ ہونے کی نعمت میسر رہتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَانْقُصُوا
 اللَّهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ [البقرة: 194]

”جو [مشرک] تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو لیکن اتنی کہ جتنی اس نے تم پر زیادتی کی۔ اور اللہ سے ڈر جاؤ، بلاشبہ اللہ عزوجل متقین کے ساتھ ہے۔“

قرآن مجید میں اللہ عزوجل کے متقین کے ساتھ ہونے کا بیان بھی تین مقامات پر ہے اور تینوں مقامات پر یہ بیان کفار اور مشرکین کے ساتھ لڑائی کے بعد ہے۔ لڑائی میں انسان کو ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بندہ مومن کی لڑائی بھی کسی سے نہیں ہوتی سوائے ان کفار اور مشرکین کے کہ جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور لڑائی میں پہلے کرتے ہیں لہذا ایسے ظالموں کے مقابلے میں اللہ عزوجل اپنے نیک بندوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ سورۃ توبہ میں آیت 36 اور 123 میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

متقین کی صفات

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر متقین کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ اسی لیے ہے کہ معلوم ہو کہ جس نے سلوک قرآنی میں متقین کے مقام کو پہنچنا ہے تو اسے کن مراحل سے گزر کر یہ مقام حاصل ہوگا؟ قرآن مجید کے سلوک اور تربیتی نظام میں مقام متقین ہی ابتدائی اور انتہائی مقام ہے، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ تقویٰ ہی ہے کہ جو اللہ عزوجل کی طرف سفر کا پہلا قدم بھی ہے اور آخری بھی۔ پس جس حال میں ایک سالک اللہ کی قرب کی منازل طے کرتا ہے، وہ تقویٰ کا حال ہے۔ سالک جس لمحے میں اس حال میں نہیں ہوتا، اس لمحے میں اللہ عزوجل کی طرف اس کا سفر رک جاتا ہے۔ قرآن مجید میں متقین کا مقام بیان کرنے کے بعد ان کی صفات کے بارے اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (133) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (134) وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ اللَّهُ فَعَسَىٰ أَلَّا اللَّهُ وَلَمْ يَصِرُوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

(135) أُولَئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنَعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿آل عمران: 136﴾

”اور تم اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑ لگا دو کہ جس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں جتنی ہے جو کہ متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔ وہ متقین جو کہ خرچ کرتے ہیں، تنگی میں بھی اور خوشحالی میں بھی، اور غصے کو پی جانے والے، اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ عزوجل ایسے خوبصورت عمل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ اور متقین وہ ہیں کہ جن سے اگر کوئی بے حیائی کا کام ہو جائے یا وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے، اور وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے جبکہ وہ جانتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور ایسی جنت ہے کہ جس کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی اور عمل کرنے والوں کا اجر کیا ہی خوب ہے۔“

مذکورہ بالا آیات میں متقین کی چار صفات بیان ہوئی ہیں کہ جن میں یہ چار صفات ہوں تو قرآن مجید کے بیان کے مطابق نہ صرف وہ متقی ہیں بلکہ جنت کے وارث بھی ہیں۔ ان میں سے پہلی صفت تو اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ متقین وہ ہیں، جو اللہ کے رستے میں ہر حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں، خوشحالی میں بھی اور تنگی میں بھی۔ ہمارے ہاں عام طور پر غلطی فہمی ہے کہ خرچ کرنے کا حکم امر اکو ہے حالانکہ خرچ کرنے کا حکم امیر اور غریب دونوں کو ہے، البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ امیر اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ کرے اور غریب اپنی استطاعت کے مطابق۔ جس کو ایک لاکھ کی استطاعت ہے، وہ ایک لاکھ کرے اور جسے ایک ہزار کی ہے، وہ ایک ہزار کرے اور جسے دس روپے کی ہے، وہ دس روپے کرے لیکن کرے ضرور۔ قرآن مجید اصلاح نفس کا جو منہج تجویز کرتا ہے، اس میں خرچ کرنے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ انسان کے نفس میں موجود تمام کمیوں اور کوتاہیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ اور دنیا کی محبت کا خلاصہ مال کی

محبت ہے۔ اور مال کی محبت پر جب اپنے پروردگار کی محبت کو ترجیح دے گا تو اس کے رستے میں مال خرچ کرے گا اور یہاں ہی سے اس کا تزکیہ شروع ہو جائے گا کہ تزکیہ دنیا اور مال کی محبت ختم کرنے کا نام نہیں ہے کہ وہ تورہ بنائیت ہے کہ جو اسلام میں ممنوع ہے بلکہ تزکیہ تو اللہ عزوجل کی محبت کو دنیا اور مال کی محبت پر غالب کرنے کا نام ہے۔

اور متقین کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ انتہائی غصے کو بھی پی جانے والے ہیں۔ انتہائی غصے کی صورت میں بھی تحمل اور برداشت سے کام لیتے ہیں اور اس کا اظہار نہیں کرتے۔ جب انسان شدید غصے میں ہوتا ہے تو عموماً اس کے اظہار میں معتدل نہیں رہ پاتا۔ بعض اوقات شدید غصے کی حالت میں یا تو آواز بہت اونچی ہو جاتی ہے یا آواز کانپنا شروع ہو جاتی ہے یا انسان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے یا انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے اور ان تمام حالات میں اس سے کسی معتدل رویے کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے لہذا شدید غصے کو پی جانے سے مراد یہی ہے کہ اس حالت میں بالکل خاموش ہو جائے، ایک لفظ بھی نہ بولے۔ اور تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اب یہ ممکن ہے کہ کسی پر شدید غصہ آئے اور انسان وقتی طور تو اسے دبا جائے لیکن اس شخص کو دل سے معاف نہ کرے تو اس سے انسان کے اندر ہی اندر اس شخص سے نفرت اور اس سے انتقام کی سوچ پروان چڑھتی رہے گی کہ جسے شیطان پھونکیں مار مار کر بڑھاتا رہے گا۔ اس طرح سے اپنا خون جلانے سے بہتر ہے کہ انسان اس شخص کو اس امید پر معاف کر دے کہ اللہ عزوجل اسے بھی معاف کرے گا یا اس کی کسی آزمائش کو دور کر دے گا یا اس کے درجات بلند کرے گا وغیرہ۔ تو شدید غصے کو پی جانا اور اس کا اظہار نہ کرنا ایک صفت ہے کہ جو نارمل رویے کے لیے ضروری ہے اور دل سے معاف کر دینا یہ ایک دوسری صفت ہے کہ جو انسان کی ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے۔

اور چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ اگر ان سے کوئی بے حیائی یا گناہ کا کام ہو جائے تو وہ فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید کا متقی کا تصور یہ نہیں ہے کہ ان سے گناہ نہیں ہو گا۔ گناہ تو فرشتوں سے نہیں ہوتا یا انبیاء سے نہیں ہوتا۔ ہم سب تو انسان ہیں کہ جو گناہ گار بھی ہے

کہ خود اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ تمام کے تمام بنو آدم بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہیں لیکن بہترین گناہ گار وہی ہیں کہ جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں۔¹ پس گناہ کا ہو جانا تقویٰ کے منافی نہیں ہے لیکن گناہ کر کے توبہ نہ کرنا یہ تقویٰ کے منافی ہے۔ اگر کسی شخص کو گناہ کرنے کے بعد گناہ پر شرمندگی اور ندامت نہیں ہوتی اور گناہ پر اصرار (insist) کیے چلا جاتا ہے تو یہ متقی نہیں ہے اور اگر کسی شخص کو گناہ کے ہوتے ہی ندامت اور شرمندگی کا احساس غالب ہو جائے اور وہ حالت استغفار میں چلا جائے تو یہ شخص متقی ہے۔ یہ اللہ عزوجل کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم سے گناہ ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ گناہ کے فوراً بعد ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ تو توبہ اور استغفار کے حال میں رہنا یہ متقین کی صفات میں سے ایک اہم صفت ہے۔

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ [البقرة: 177]

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف اپنے چہرے کر لو بلکہ نیکی تو اس کی ہے کہ جو اللہ پر ایمان لائے، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر۔ اور مال کی محبت کے باوجود اسے اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کے آزاد کروانے میں خرچ کرے۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ اور اپنے وعدوں کو پورا

¹ «كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ» [سنن ابن ماجہ، کتاب الزُّہد، باب ذِکْرِ التَّوْبَةِ،

کرنے والے جبکہ وہ وعدہ کریں، اور تنگ دستی میں اور بیماری میں اور جنگ کے حالات میں صبر کرنے، یہی لوگ ہیں کہ جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کہ متقین ہیں۔“

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (15) آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُحْسِنِينَ (16) كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (17) وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (18) وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ [الذاریات: 19]

”بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو ان کو ان کا رب دے رہا ہو گا تو وہ اسے لے رہیں ہوں گے کہ وہ اس سے پہلے نیک اعمال کو خوبصورتی سے کرنے والے تھے۔ اور وہ رات میں کم ہی سونے والے تھے۔ اور وہ سحری کے وقت میں استغفار کرنے والوں میں سے تھے۔ اور وہ کہ ان کے مال میں سوال کرنے والوں اور محروم لوگوں کا حصہ تھا۔“

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿الْأَخْلَاءَ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (67) يَاعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (68) الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ﴾ [الزخرف: 69]

”قیامت والے دن قریبی ترین دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔ اے میرے متقی بندو! آج کے دن تم پر نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی تم غمگیں ہو گے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور فرمانبردار رہے۔“

ان آیات مبارکہ میں ایک تو یہ بات کہی گئی ہے کہ جنت والے دن تمام رشتے ناطے ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے لیکن جو تعلق اور رشتہ تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہو گا تو وہ قیامت والے دن میں بھی ایک دوسرے کے نہ صرف قریب ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کے حق میں سفارش کریں گے۔ پس اگر دوستی کی بنیاد اللہ کا ڈر اور خوف ہو گا تو

ایسی دوستی قیامت والے دن بھی قائم رہے گی۔ اور دوسری بات یہ بیان کی کہ متقین وہ ہیں کہ جو قرآن مجید کی آیات پر ایمان رکھتے ہوں اور فرمانبرداری کی زندگی گزارتے ہوں۔ ایمان کے ساتھ ایک اور وصف جمع ہو جائے تو انسان متقی بن جاتا ہے اور وہ فرمانبرداری کی زندگی ہے کہ انسان اللہ کا فرمانبردار بن کر زندگی گزارے۔ فرمانبرداری سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے ہر حکم کو پورا کرنے کی کوشش کرے، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ پس جب انسان کی زندگی اس حال میں گزرے کہ وہ ہر لمحے میں اللہ کے کسی نہ کسی حکم کو پورا کر رہا ہو تو اس کو فرمانبرداری کی زندگی کہتے ہیں۔ اور پھر اگلی آیات میں ان متقین کو جنت کا وارث کہا گیا ہے۔

یہاں پھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید میں کتنی آیات ہیں کہ جن میں غوث، قطب، ابدال اور قلندر وغیرہ کو جنت کا وارث یا حقدار کہا گیا ہے، ایک بھی نہیں لیکن کیا یہ المیہ نہیں ہے کہ ہم نے ان اصطلاحات کی بنیاد پر ایک پورا نظام تربیت کھڑا کر دیا ہے کہ جن کا تذکرہ تک قرآن مجید یا احادیث نبویہ میں نہیں ملتا ہے۔ اور جن اصطلاحات اور مقامات سلوک سے قرآن مجید اور احادیث نبویہ بھرے پڑے ہیں، ان کا تذکرہ بھی ہمیں اس پورے نظام میں نہیں ملتا ہے مثلاً عباد الرحمن کا تذکرہ تصوف کی کس کتاب میں ہے یا کس سلسلے میں قرآن مجید کے بیان کردہ اس مقام سلوک کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے یا ہے۔ اس لیے ہم اپنی اس کتاب میں بار بار یہ توجہ دلا رہے ہیں کہ ہمیں اصلاح نفس کے جس پروگرام اور تربیت کے جس نظام کی ضرورت ہے، وہ جب تک قرآنی بنیادوں پر قائم نہ ہوگا، اس وقت تک معاشرے میں حقیقی تبدیلی نہیں آئے گی۔ تصوف کے نظام تربیت میں آپ کو قطب عالم تو بہت مل جائیں گے کہ جنہیں شاید کشف قبور بھی ہوتا ہو، وہ عالم برزخ کی سیر بھی کرتے ہوں، وہ قلب بھی جاری کر دیتے ہوں لیکن دوسری شدید غصے کی کیفیت میں، وہ وجد میں آ جاتے ہوں، وہ اپنے آپ کو قطب عالم کہلوانے پر عجیب خوشی محسوس کرتے ہوں، دل ان کے تکبر سے بھرے ہوں اور مصنوعی عاجزی کا اظہار کرتے نہ نکلتے ہوں، وہ اپنے مریدوں کو نیکی اور تقویٰ

میں اپنے کمتر اور حقیر سمجھتے ہوں، تو یہ سب کیا قطبیت ہے بھائی، ایسے قطب صاحب سے وہ ان پڑھ دیہاتی بھلا ہے کہ جو اللہ عزوجل سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے معاملے میں ڈرنے والا ہے وغیر ذلک کثیر۔ بھلے اسے اپنا لکھا ہوا نام بھی پڑھنا نہ آتا ہو لیکن یہی وہ متقین ہیں کہ جنہیں اللہ عزوجل نے اپنا اولیا قرار دیا ہے۔ تصوف کی پیداکی ہوئی سب سے بڑی غلط فہمی یہی ہے کہ انہوں نے اولیاء اللہ کا تصور غوث، قطب، ابدال، اور قلندر جیسی غیر شرعی اصطلاحات کے رستے مسح کر دیا ہے کہ جن کے حصول کے لیے آپ کو مراقبہ کرنا ہے، پاس انفاس میں وقت گزارنا ہے، سماع سے حال طاری کرنا ہے، وجد میں آنا ہے، قلب کو جاری کرنا ہے، کشف قبر کی مشق کرنی ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے کرتب سیکھنے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (62) الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾ [یونس: 63]

”خبردار! بلاشبہ اولیاء اللہ پر نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگیں ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے۔“

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کے مقامات سلوک کو بیان کر دیا جائے تو آج کل کے پیر طریقت اور قطب عالم سے زیادہ نیک ان کے مرید دکھائی دیں کہ پیر طریقت، قطب عالم اور قلندر بننے کے جتنے رستے، مجاہدے اور صفات ہیں، وہ سب کے سب ایک فن ہیں کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ کس طرح اپنے آپ کو دوسروں سے برتر ثابت کرنا ہے اور کسی طرح دوسروں کو اپنے نیچے لگانا ہے اور جو اس فن میں ماہر ہوں، وہ اس میدان کے فنکار ہیں۔

قرآنی سلوک کے مطابق اپنی تربیت کرنے والا کبھی اس درجہ بندی میں مبتلا نہیں ہو گا کہ جو تصوف کے حلقوں میں نظر آتی ہے کہ کوئی پہلے آسمان پر ہے تو کوئی ساتویں آسمان پر ہے بلکہ یہاں سب اللہ کے بندے ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں، رہنمائی کرنے والا بھی اتنا ہی محتاج ہے کہ جتنا کہ رہنمائی لینے والا کہ دونوں انسان ہیں اور دونوں گناہ گار ہیں تو ایک گناہ گار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے گناہ گار سے بیعت لے کر اس کے

تزکیہ کی ذمہ داری لے جبکہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ تزکیہ کرنے والا زیادہ گناہ گار ہے یا کروانے والا کیونکہ یہ توقیامت کے دن ہی معلوم ہوگا۔ امکان کیا بلکہ غالب گمان ہے کہ دنیا میں بہت سے تزکیہ کرنے والے قیامت والے دن معلوم ہو کہ انہیں اپنے بعض مریدوں سے تزکیہ کروانے کی ضرورت تھی۔ اب تو عجب تماشا ہے کہ ایک پیر کے مرید دوسرے پیر کے مریدوں کی بیعت تڑواتے ہیں تاکہ ان کے حلق ارادت میں اضافہ ہو، پیروں کی مریدوں کی تربیت سے زیادہ ان کی تعداد بڑھانے پر توجہ ہے، چند مرید کرنے کی خاطر بیرون ملک تک کے طویل سفر کیے جاتے ہیں، مرید اپنے پیروں کے فضائل میں تقابل ایسے کرتے ہیں جیسا کہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی پراڈکٹس کی ایڈورٹائمٹ کرتی ہیں وغیرہ۔ ہماری رائے میں تزکیہ کی بیعت صرف معصوم لے سکتا ہے جبکہ سلوک قرآنی میں غیر معصوم سالکین ایک دوسرے کی صحبت سے برابر استفادہ کرتے ہیں، کچھ تھوڑا اور کچھ زیادہ، چھوٹا بڑے سے سیکھتا ہے اور بڑا چھوٹے سے، شاگرد اپنے استاذ سے سیکھتا ہے اور استاذ اپنے شاگرد سے، جیسا کہ سورۃ العصر میں ہے:

﴿وَالْعَصْرِ (1) إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ (2) إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَّصَّوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر: 3]

”قسم ہے زمانے کی، بلاشبہ سب انسان خسارے میں ہیں، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔“

تقویٰ کا حصول

اس سلسلے کی آخری بحث یہ ہے کہ تقویٰ جب سلوک قرآنی کا ابتدائی اور انتہائی مقام ہے تو اس کے پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں؟ قرآن مجید نے تقویٰ کی دو قسموں کو بیان کیا ہے: ایک وہ جو انسان میں پیدا انشی طور موجود ہے اور دوسری وہ جسے انسان محنت اور مجاہدے سے حاصل کرتا ہے۔ تقویٰ کی جو صورت انسان میں پیدا انشی طور موجود ہے، وہ اس کا وہ شعور ہے جو اسے خیر اور شر میں تمیز عطا کرتا ہے۔ ہر انسان میں اللہ عزوجل نے ایک ترازو قائم کر دیا ہے جو اچھے اور برے میں تمیز

قائم کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا (7) فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (8) قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (9) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾ [الشمس: 10]

”اور قسم ہے نفس کی اور اس کو سنوارنے کی۔ پس اللہ عز و جل نے ہر نفس میں اس کا فسق و فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا ہے۔ پس جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا تو اس نے فلاح پائی اور جس نے اسے مٹی میں دبا دیا تو وہ نامراد ہو گیا۔“

ہر انسان میں ضمیر کی ایک عدالت قائم ہے جو اسے بتلاتی ہے کہ تم نے جھوٹ بول کر، وعدہ خلافی کر کے، دھوکا دے کر، ظلم کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب بعض انسان تو ضمیر کی آواز کو سن لیتے ہیں اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں تو یہی نفس کے تزکیے کا عمل ہے اور بعض انسان ضمیر کی اس آواز کو اپنے اندر ہی دبا دیتے ہیں اور بعض تو ضمیر ہی کو سلا دیتے ہیں تو یہ اپنے نفس کو مٹی میں دبانے کے مترادف ہے۔

تقویٰ کی دوسری صورت جو کہ کسی ہے، وہ بعض اعمال کے اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور بعض اعمال سے بڑھ جاتی ہے۔ جن اعمال سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے، ان میں سے ایک عمل ہدایت کے رستے کو اختیار کرنا اور اس پر چلنے کے لیے مجاہدہ کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ﴾ [محمد: 17]

”اور جن لوگوں نے ہدایت کے رستے کو اختیار کیا، اللہ عز و جل انہیں ہدایت میں بڑھادیتے ہیں اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا کرتے ہیں۔“

اسی طرح قرآن مجید کی آیات، خاص طور پر وعید والی آیات کہ جن میں اللہ عز و جل کی طرف سے اپنے بندوں کو ڈرایا گیا ہے، میں غور و فکر بھی تقویٰ کے حصول کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾ [البقرة: 187]

”اسی طرح ہم قرآن مجید کی آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔“

ایک اور مقام پر اسی بارے ارشاد ہے:

﴿وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ
أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا﴾ [طہ: 113]

”اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر نازل کیا اور اس میں ڈراوے کو
طرح طرح سے بیان کیا کہ وہ متقی بن جائیں یا ان کے لیے نصیحت پیدا ہو۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر روزے کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے تقویٰ
حاصل ہو۔ پس روزہ بھی تقویٰ حاصل کرنے کے ذرائع میں ایک اہم ذریعہ ہے۔ ارشاد
باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ [البقرة: 183]

”اے اہل ایمان! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر
فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

بلکہ عبادت کی کوئی بھی صورت ہو، اس پر عمل انسان میں تقویٰ پیدا کرتا ہے جیسا کہ
ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ﴾ [البقرة: 21]

”اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو کہ جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو بھی کہ
جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی تعظیم بھی ان امور میں شامل ہے کہ جن سے
تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ
اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِيَتَّقُوا لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ [الحجرات: 3]

”بے شک جو لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اپنی آوازوں کو دبا کر رکھتے
ہیں تو یہ وہی لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ عز و جل نے تقویٰ کے لیے
منتخب کر لیا ہے۔ اور ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔“

ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح ہم نے تقویٰ کے مقام کو قرآن مجید سے تفصیل سے واضح کیا ہے، اسی طرح قرآن مجید کے دیگر مقامات سلوک کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے تاکہ سلوک قرآنی کے مطابق لوگ اپنی شخصیت کی تعمیر اور نفس کی اصلاح کر سکیں اور یہی وہ شخصیت کی تعمیر اور نفس کی اصلاح ہے کہ جس پر آخرت میں انعام و اکرام اور کامیابی کی بشارتیں بھی دنیا میں ہی اللہ کی کتاب میں دے دی گئی ہیں۔



مصنف کی نئی کتاب

مکالمہ

مصنف کی نئی زیر ترتیب کتاب کا عنوان "مکالمہ" (dialogue) ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب:	علم اور وجود
دوسرا باب:	الحاد اور ایمان
تیسرا باب:	توحید اور شرک
چوتھا باب:	روایت اور جدیدیت
پانچواں باب:	سیرت اور تاریخ
چھٹا باب:	فلسفہ اور سائنس
ساتواں باب:	مذہب اور ریاست
آٹھواں باب:	لسانیات اور نفسیات
نواں باب:	معیشت اور معاشرت
دسواں باب:	تعلیم اور تحقیق
گیارہواں باب:	تصوف اور تزکیہ
بارہواں باب:	فنون لطیفہ
تیرہواں باب:	غلو اور اعتدال
چودہواں باب:	امن اور رواداری
پندرہواں باب:	اعلام اور شخصیات
سولہواں باب:	مسالک اور جماعتیں
سترہواں باب:	انکار حدیث اور حجیت حدیث

مصادر ومراجع

- ابن أبي شيبه، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان العباسي، الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، مكتبة الرشد، الرياض، 1409هـ
- ابن القيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، الوابل الصيب ورافع الكلم الطيب، دار عالم الفوائد، مكة المكرمة
- ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحلیم الحراني، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416هـ/1995ء
- ابن جوزي، عبد الرحمن علامه، منهاج القاصدين، تلخيص ابن قدامة مقدسى احمد بن محمد بن عبد الرحمن، مترجم محمد سليمان كيلاني، اداره معارف اسلامى، لاهور، 1985ء
- ابن حجر، أحمد بن علي أبو الفضل العسقلاني الشافعي، فتح الباري شرح صحيح البخاري، دار المعرفة، بيروت، 1379هـ
- ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، الفتوحات المكية، الهيئة المصرية العامة، مصر، 1975ء
- ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، فصوص الحكم، دار الكتاب العربي، بيروت
- ابن قدامة المقدسي، أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الحنبلي، المغني لابن قدامة، مكتبة القاهرة، القاهرة، 1388هـ-1968ء
- ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، إعلام الموقعين عن رب العالمين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1411هـ - 1991م
- ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت، 1994ء
- ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية والمعتلة، دار الحديث، القاهرة

- ابن کثیر، أبو الفداء إسماعیل بن عمر القرشي، تفسیر القرآن العظیم، دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة الثانية، 1420ھ-1999ء
- ابن ماجه، أبو عبد الله محمد بن یزید القزويني، سنن ابن ماجه، دار إحياء الكتب العربية، فیصل عیسی البابی الحلبي، مصر
- ابن نجیم المصري، البحر الرائق شرح كنز الدقائق، دار الكتاب الإسلامي، بیروت
- ابو الحسن علوی ندوی سید، سیرت سید احمد شهید، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو، نوان ایڈیشن، 2011ء
- أبو بكر بن أبي داود، كتاب المصاحف، الفاروق الحديث، مصر، الطبعة الأولى، 2002ء
- أبو داود، سليمان بن الأشعث السجستاني (المتوفى: 275ھ)، سنن أبي داود، المكتبة العصرية، بیروت
- ابوبکر غزنوی سید، داود غزنوی، فاران اکیڈمی، لاہور، 1994ء
- أحمد بن علي بن ثابت الرفاعي، البرهان المؤيد، دار الكتاب النفیس، بیروت، 1408ھ
- أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني، الزهد، دار الكتب العلمية، بیروت، لبنان، 1999ء
- أحمد بن ناصر الطیار، حياة السلف بين القول والعمل، دار ابن الجوزي، المملكة العربية السعودية، الطبعة الأولى، 1433ھ
- احمد حسن، ڈاکٹر، جامع الأصول ترجمه واضافه الوجيز فی أصول الفقه، مطبع مجتبائی، لاہور
- احمد رضا خان بریلوی، احکام شریعت، مطبوعه آگره، ہندوستان
- احمد رضا خان بریلوی، فتاوی رضویہ شریف، مطبوعه جامعہ نظامیہ، لاہور
- اسرار احمد، ڈاکٹر، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 1990ء

- اشرف علی تھانوی، مولانا، شریعت و طریقت، مرتب مولانا محمد دین چشتی، ادارہ اسلامیات، لاہور
- الألبانی، محمد ناصر الدین، بن الحاج نوح بن نجاتي بن آدم الأشقودري، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض، 1995ء
- الألبانی، محمد ناصر الدین، تحريم آلات الطرب، مؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الثالثة، 1426هـ/2005ء
- الألبانی، محمد ناصر الدین، صحيح الجامع الصغير وزياداته، المكتب الإسلامي، مصر
- الألوسي، شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني، روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، دار الكتب العلمية، بيروت، 1415هـ
- الأَجْرِيُّ، أبو بكر محمد بن الحسين بن عبد الله البغدادي، أخلاق العلماء، رئاسة إدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، السعودية
- البخاري، محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي (المتوفى: 256هـ)، صحيح البخاري، دار طوق النجاة، مصر، 1422هـ
- البخاري، محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي، الأدب المفرد، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الثالثة، 1409هـ - 1989ء
- البيهقي، أبو بكر، أحمد بن الحسين بن علي الخراساني، شعب الإيمان، مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض، الطبعة الأولى، 1423هـ-2003ء
- البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي الخراساني، الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد على مذهب السلف وأصحاب الحديث، دار الآفاق، بيروت، الطبعة الأولى، 1401هـ

- الترمذی، محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر، 1975ء
- الجاحظ، عمرو بن بحر اللیثی، البیان والتبیین، دار ومکتبة الهلال، بیروت، 1423ھ
- الحاکم، أبو عبد الله محمد بن عبد الله النیسابوری، المستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولى، 1411ھ - 1990ء
- خواجہ محمد قاسم، کراچی کا عثمانی مذہب اور اس کی حقیقت، ادارہ اشاعت القرآن والحديث، پاکستان
- الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايِمَاز، سير أعلام النبلاء، مؤسسة الرسالة، 1985ء
- الرَّبِيدِي، مُحَمَّد بن مُحَمَّد بن عبد الرزاق الحسيني، تاج العروس من جواهر القاموس، دار الهداية، بيروت
- سَيِّد نذير حسين محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مشعر باصطلاح صوفیہ ومعارج ومدارج اہل سلوک، ترجمہ: مولانا عبد العزیز صمدن فرخ آبادی، جریده الواقعة کراچی، شمارہ (5 / 6) شوال، ذیقعد 1433ھ/ ستمبر، اکتوبر 2012ء
- سید وقار علی شاہ، افکار وعقائد وفتاوی جماعت المسلمین رجسٹرڈ کراچی، ضیاء سنز پرنٹرز، پشاور، 2002ء
- الطبري، حمد بن جریر بن یزید الآملي، أبو جعفر، تاريخ الطبري = تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبري، دار التراث، بيروت، الطبعة الثانية، 1387ھ
- الطبري، محمد بن جریر بن یزید، جامع البیان فی تأویل القرآن، مؤسسة الرسالة، 2000ء
- عبد الرحمن بن ناصر البراك، شرح العقيدة الطحاوية، دار التدمرية، 2008ء

- عبد العزيز بن عبد الله بن باز، فتاوى نور على الدرب، المكتبة الشاملة، مكة المكرمة
- عبد العزيز بن عبد الله بن باز، مجموع فتاوى العلامة عبد العزيز بن باز، دار القاسم للنشر، الرياض
- عبد القيوم حقاني، مولانا، سوانح شيخ الاسلام حسين احمد مدني، القاسم اكيڈمی، نوشہرہ، 2005ء
- عبد الله بن المبارك الحنظلي، الزهد والرقائق لابن المبارك، دار الكتب العلمية، بيروت
- علي بن عثمان بن ابي على الجلابي الغزنوي الهجویری، كشف المحجوب، مترجم فضل دين گوهر، مزدور پرنٹنگ پریس، لاہور، 1972ء
- علي بن محمد، الملا القاري، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، دار الفكر، بيروت، 2002ء
- الغزالي، أبو حامد محمد بن محمد، إحياء علوم الدين، دار المعرفة، بيروت
- القاسم بن سلام بن عبد الله الهروي البغدادي، أبو عبيد، فضائل القرآن، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الأولى، 1415ھ-1995ء
- كتاب مقدس، بائبل سوسائٹی، انار کلی، لاہور
- محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُستي، صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية، 1414ھ - 1993ء
- محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُستي، الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 1408ھ - 1988ء
- المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني، الهداية في شرح بداية المبتدي، دار احياء التراث العربي،

بیروت

- مسلم بن الحجاج النیسابوری، صحیح مسلم، دار إحياء التراث العربی، بیروت
- أحمد سرهندي، مكتوبات حضرت مجدد ألف ثانی، مترجم مولانا سید زوار حسین شاه، مکتبه مجددیه، کراچی
- موسى بهتو، محمد، مراقبه، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدر آباد
- النووي، أبو زكريا محي الدين يحيى بن شرف، المجموع شرح المذهب، دار الفكر، بیروت
- النووي، أبو زكريا محي الدين يحيى بن شرف، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، دار إحياء التراث العربی، بیروت، 1392ھ
- Stephen Hawking, A Brief History of Time from Big Bang to Black Holes, USA: Bantam Books, 1998
- Alexander Berzin, Meditation Methods, Moscow: The Berzinarchives, 2005





شخصی تعارف:

نام: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

قلمی نام: ابوالحسن علوی

موبائل: 0300-4093026

ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk

پتہ برائے خط و کتابت: k-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور

تعلیم:

فاضل درس نظامی

ایم۔ اے عربی (پنجاب یونیورسٹی)

ایم۔ اے سیاسیات (پنجاب یونیورسٹی)

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی)

علمی و تحقیقی وابستگی

اسسٹنٹ پروفیسر، کامائٹس انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور

ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، ل-99 ماڈل ٹاؤن، لاہور

ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی، لاہور

مطبوعات

۱۔ چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت؟

۲۔ فکرِ غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

۳۔ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات

۵۔ ماہنامہ میثاق، ماہنامہ محدث، ماہنامہ الشریعہ، ماہنامہ الاحرار، ماہنامہ الاحیاء، سہ ماہی

حکمت قرآن، سہ ماہی نظریات و دیگر مجلات علمیہ میں تقریباً 110 تحقیقی، فکری اور اصلاحی مضامین

ویب چینج <http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html>